هٰذا بیانٌ للناس وهدًی وموعظةٌ للمتقین

# تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جلد سوم

سورۃ الکہف تا سورۃ الروم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

# تفہیم القرآن

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الکہف تا سورۃ الروم

جلد سوم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

# فہرست تصاویر ارض القرآن ونقشہ جات

# تفہیم القرآن

## الکہف

(۱۸)

# الکھف

**نام** اس سورہ کا نام پہلے رُکوع کی دسویں آیت اِذْ اَوَی الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں کہف کا لفظ آیا ہے۔

**زمانۂ نزُول** یہاں سے اُن سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جو مکّی زندگی کے تیسرے دَور میں نازل ہوئی ہیں۔ مکّی زندگی کو ہم نے چار بڑے بڑے دَوروں میں تقسیم کیا ہے، جن کی تفصیل سورۂ اَنعام کے دیباچے میں گزر چکی ہے۔ اس تقسیم کے لحاظ سے تیسرا دَور تقریباً ۵ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر قریب قریب ۱۰ نبوی تک چلتا ہے۔ اس دَور کو جو چیز دوسرے دَور سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے دَور میں تو قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تحریک اور جماعت کو دبانے کے لیے زیادہ تر تضحیک، اِستہزا، اعتراضات، الزامات، تخویف، اِطماع اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر اعتماد کر رکھا تھا، مگر اس تیسرے دَور میں انھوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار پوری سختی کے ساتھ استعمال کیے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک چھوڑ کر حَبَش کی طرف نکل جانا پڑا، اور باقی ماندہ مسلمانوں کو اور ان کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کو شِعْبِ ابی طالب میں محصور کر کے ان کا مکمل مَعاشی اور معاشرتی مُقاطَعہ کر دیا گیا۔ تاہم اس دَور میں دو شخصیتیں ——— ابوطالب اور اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ ——— ایسی تھیں جن کے ذاتی اثر کی وجہ سے قریش کے دو بڑے خاندان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ۱۰ نبوی میں ان دونوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ دَور ختم ہو گیا، اور چوتھا دَور شروع ہوا جس میں مسلمانوں پر مکے کی زندگی تنگ کر دی گئی، یہاں تک کہ آخرِ کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام مسلمانوں کو مکے سے نکل جانا پڑا۔

سورۂ کہف کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسرے دَور کے آغاز میں نازل ہوئی ہو گی جب کہ ظلم وستم اور مزاحمت نے شدّت تو اختیار کر لی تھی، مگر ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحابِ کہف کا قصّہ سنایا گیا، تاکہ ان کی ہمّت بندھے اور انھیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

**موضوع اور مضمون** یہ سورہ مشرکینِ مکہ کے تین سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے، جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے: اصحابِ کہف کون تھے؟ قصۂ خِضر کی حقیقت کیا ہے؟[1] اور ذوالقرنین کا کیا قصہ ہے؟ یہ تینوں قصّے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اسی لیے اہلِ کتاب نے امتحان کی غرض سے اِن کا انتخاب کیا تھا، تاکہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبی کی زبان سے ان کے سوالات کا پورا جواب دیا، بلکہ اُن کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصّوں کو پوری طرح اُس صورتِ حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اُس وقت مکے میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی:

۱- اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور اُن کا حال مکے کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رَوِیّہ کفارِ قریش کے رَوِیّے سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مُہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے، بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں ضمناً کفارِ مکہ کو یہ بھی بتایا کہ اصحابِ کہف کا قصہ عقیدۂ آخرت کی صحّت کا ایک ثبوت ہے۔ جس طرح خدا نے اصحابِ کہف کو ایک مدّتِ دراز تک موت کی نیند سلانے کے بعد پھر جِلا اُٹھایا، اُسی طرح اُس کی قدرت سے وہ بَعث بعد الموت بھی کچھ بعید نہیں ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔

۲- اصحابِ کہف کے قصے سے راستہ نکال کر اُس ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل پر گفتگو شروع کر دی گئی جو مکے کے سردار اور کھاتے پیتے لوگ اپنی بستی کی چھوٹی سی نومسلم جماعت کے ساتھ برت رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ نہ ان ظالموں سے کوئی مُصالَحت کرو اور نہ اپنے غریب ساتھیوں کے مقابلے میں اِن بڑے بڑے لوگوں کو کوئی اہمیت دو۔ دوسری طرف ان رئیسوں کو نصیحت کی گئی کہ اپنے چند روزہ عیشِ زندگانی پر نہ پھولو، بلکہ ان بھلائیوں کے طالب بنو جو اَبدی اور پائدار ہیں۔

۳- اسی سلسلۂ کلام میں قصۂ خِضر و موسیٰؑ کچھ اس انداز سے سنایا گیا کہ اس میں کفار کے سوالات کا جواب

---

[1] روایات میں آتا ہے کہ دوسرا سوال رُوح کے متعلق تھا، جس کا جواب سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۱۰ میں دیا گیا ہے۔ مگر سورۂ کہف اور بنی اسرائیل کے زمانۂ نُزول میں کئی سال کا فرق ہے، اور سورۂ کہف میں دو کے بجائے تین قصّے بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا سوال دراصل قِصّۂ خِضر سے متعلق تھا، نہ کہ رُوح سے متعلق۔ خود قرآن میں بھی ایک اشارہ ایسا موجود ہے جس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ ٦١)

بھی تھا اور مومنین کے لیے سامانِ تسلّی بھی۔ اس قصّے میں دراصل جو سبق دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی مَشِیَّت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے، وہ چونکہ تمھاری نظر سے پوشیدہ ہیں، اس لیے تم بات بات پر حیران ہوتے ہو کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ تو بڑا غضب ہوا! حالانکہ اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو تمھیں خود معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے، اور بظاہر جس چیز میں بُرائی نظر آتی ہے، آخرِکار وہ بھی کسی نتیجۂ خیر ہی کے لیے ہوتی ہے۔

۴- اس کے بعد قصّۂ ذوالقرنین ارشاد ہوتا ہے، اور اس میں سائلوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم تو اپنی اِتنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پُھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرمانروا اور ایسا زبردست فاتح اور اس قدر عظیم الشان ذرائع کا مالک ہو کر بھی اپنی حقیقت کو نہ بُھولا تھا اور اپنے خالق کے آگے ہمیشہ سرِتسلیم خم رکھتا تھا۔ نیز یہ کہ تم اپنی ذرا ذرا سی حویلیوں اور باغچیوں کی بہار کو لازوال سمجھ بیٹھے ہو، مگر وہ دُنیا کی سب سے زیادہ مستحکم دیوارِ تحفظ بنا کر بھی یہی سمجھتا تھا کہ اصل بھروسے کے لائق اللہ ہے نہ کہ یہ دیوار۔ اللہ کی مرضی جب تک ہے، یہ دیوار دشمنوں کو روکتی رہے گی، اور جب اُس کی مرضی کچھ اور ہو گی تو اس دیوار میں رخنوں اور شگافوں کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

اس طرح کفار کے امتحانی سوالات کو اُنھی پر پوری طرح اُلٹ دینے کے بعد خاتمۂ کلام میں پھر اُنھی باتوں کو دُہرا دیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوئی ہیں، یعنی یہ کہ توحید اور آخرت سراسر حق ہیں اور تمھاری اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ انھیں مانو، ان کے مطابق اپنی اصلاح کرو اور خدا کے حضور اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے دُنیا میں زندگی بسر کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمھاری اپنی زندگی خراب ہو گی اور تمھارا سب کچھ کیا کرایا اَکارت جائے گا۔

---

آیاتھا ۱۱۰ | سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ | ۱۲ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ سکتۃ ۝۱ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲ لا مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۝۳ لا وَّ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ ق مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی[۱] ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے، اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے[۲] اِس بات کا نہ اُنھیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا[۳] بڑی بات ہے جو ان کے مُنہ سے نکلتی ہے۔ وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔

۱- یعنی نہ اس میں کوئی اینچ پینچ کی بات ہے جو سمجھ میں نہ آ سکے، اور نہ کوئی بات حق و صداقت کے خطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے جسے ماننے میں کسی راستی پسند انسان کو تأمّل ہو۔

۲- یعنی جو خدا کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ اس میں عیسائی بھی شامل ہیں اور یہود بھی اور مشرکینِ عرب بھی۔

۳- یعنی ان کا یہ قول کہ فُلاں خدا کا بیٹا ہے، یا فُلاں کو خدا نے بیٹا بنا لیا ہے، کچھ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ ان کو خدا کے ہاں اولاد ہونے یا خدا کے کسی کو مُتبنّیٰ بنانے کا علم ہے، بلکہ محض اپنی عقیدت مندی کے غُلوّ میں وہ ایک من مانا حکم لگا بیٹھے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ وہ کیسی سخت گمراہی کی بات کہہ رہے ہیں، اور کتنی بڑی گستاخی اور افترا پردازی ہے جو اللہ ربّ العالمین کی جناب میں ان سے سرزد ہو رہی ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

اچھا، تو اے محمدؐ! شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اِس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔[۴] واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سرو سامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں، اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخرِ کار اِس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔[۵]

۴ - یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبتلا تھے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو رنج اُن تکلیفوں کا نہ تھا جو آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، بلکہ جو چیز آپؐ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ آپؐ اپنی قوم کو گمراہی اور اَخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آپؐ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذابِ الٰہی ہے۔ آپؐ ان کو اس سے بچانے کے لیے اپنے دن اور راتیں ایک کیے دے رہے تھے۔ مگر انھیں اصرار تھا کہ وہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہی رہیں گے۔ اپنی اس کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ "میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی روشنی کے لیے، مگر پروانے ہیں کہ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں، جل جانے کے لیے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں، مگر پروانے اس کی ایک نہیں چلنے دیتے۔ ایسا ہی حال میرا ہے، کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑتے ہو۔" (بخاری و مسلم، نیز تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الشعراء، آیت ۳)

اس آیت میں بظاہر تو بات اتنی ہی فرمائی گئی ہے کہ شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے کھو دو گے، مگر اسی میں ایک لطیف انداز سے آپؐ کو تسلّی بھی دے دی گئی کہ ان کے ایمان نہ لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس لیے تم کیوں اپنے آپؐ کو رنج و غم میں گُھلائے دیتے ہو؟ تمھارا کام صرف بشارت اور اِنذار ہے، لوگوں کو مومن بنا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ لہٰذا تم بس اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیے جاؤ۔ جو مان لے، اسے بشارت دے دو۔ جو نہ مانے، اسے بُرے انجام سے مُتنبّہ کر دو۔

۵ - پہلی آیت کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور ان دونوں آیتوں کا رُوئے سُخن کفار کی جانب ہے۔ نبیؐ کو ایک حرفِ تسلّی دینے کے بعد اب آپؐ کے منکرین کو مخاطَب کیے بغیر یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہ سرو سامان جو زمین کی سطح پر تم دیکھتے ہو اور جس کی دلفریبیوں پر تم فریفتہ ہو، یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض تمھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے مہیّا کی گئی ہے۔ تم

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ﴿٩﴾ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً

کیا تم سمجھتے ہو کہ غار[٦] اور کتبے[٧] والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟[٨] جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ "اے پروردگار! ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز

اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے تمھارے عیش و عشرت کے لیے فراہم کیا ہے، اس لیے تم زندگی کے مزے لُوٹنے کے سوا اور کسی مقصد کی طرف توجّہ نہیں کرتے، اور اسی لیے تم کسی سمجھانے والے کی بات پر کان بھی نہیں دھرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سامانِ عیش نہیں بلکہ وسائلِ امتحان ہیں، جن کے درمیان تم کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ تم میں سے کون اپنی اصل کو فراموش کر کے دنیا کی ان دلفریبیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور کون اپنے اصل مقام (بندگیِ ربّ) کو یاد رکھ کر صحیح رَوِیّے پر قائم رہتا ہے۔ جس روز یہ امتحان ختم ہو جائے گا، اسی روز یہ بساطِ عیش اُلٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔

٦ – عربی زبان میں "کہف" وسیع غار کو کہتے ہیں، اور "غار" کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اُردو میں غار "کہف" کا ہم معنیٰ ہے۔

٧ – "الرقیم" کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور وہ اَیلہ (یعنی عَقَبَہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ اور بعض قدیم مفسّرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحابِ کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" میں پہلے معنیٰ کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مَقام وہی ہے جسے بائبل کی کتابِ یشوع (باب ۱۸، آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نَبَطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتابِ یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے، اور خود اسی کتاب کے بیان کی رُو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اُردُن اور بحرِ لُوط کے مغرب میں واقع تھا، جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں، اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہوداہ اور اَدُومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تأمُّل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۶ء، جلد ۱۷، ص ۶۵۸) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔

٨ – یعنی کیا تم اس خدا کی قدرت سے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، اس بات کو کچھ بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو دو تین سو برس تک سُلائے رکھے اور پھر ویسا ہی جوان و تندرست جگا اُٹھائے جیسے وہ سوئے تھے؟ اگر سورج اور چاند اور زمین کی تخلیق پر تم نے کبھی غور کیا ہوتا تو تم ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ خدا کے لیے یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ

اور ہمارا معاملہ دُرست کر دے"، تو ہم نے انھیں اُسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سُلا دیا، پھر ہم نے انھیں اُٹھایا تاکہ دیکھیں، اُن کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدّتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔ ع
ہم ان کا اصل قصّہ تمھیں سُناتے ہیں۔[9] وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے

۹- اس قصّے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا، اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اِس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دَور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابنِ جَریر طَبَری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گِبَّن نے اپنی کتاب "تاریخِ زوال و سُقوطِ دولتِ روم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصّے کا جو خلاصہ دیا ہے، وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جُلتا ہے کہ دونوں قصّے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسّرین اس کا نام دَقْیُنُوس، یا دَقیانوس، یا دَقیُوس بتاتے ہیں، اور گِبَّن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈِیسِیَس (Decius) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرماں روائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم و ستم کرنے کے معاملے میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا نام ہمارے مفسرین اِفسُس یا اِفسُوس لکھتے ہیں، اور گِبَّن اس کا نام اِفسُس (Ephesus) بتاتا ہے، جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ترکی کے شہر اِزمیر (سمرنا) سے ۲۰-۲۵ میل بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: نقشہ نمبر ۲، صفحہ ۴۳) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے، اس کا نام ہمارے مفسّرین تیذوسیس لکھتے ہیں، اور گِبَّن کہتا ہے کہ ان کے بَعْث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا، جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا، اس کا نام ہمارے مفسّرین یَمْلِیخَا بتاتے ہیں اور گِبَّن اسے یَمْلِیخُس (Jamblchus) لکھتا ہے۔

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿١٤﴾ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا

تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔[۱۰] ہم نے ان کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اُٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبُود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔" (پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا:) "یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔

---

قصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈِیسِیَس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے، جب کہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدّت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو قصّۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن اُن کے قیامِ غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب ہم نے حاشیہ ۲۵ میں دے دیا ہے۔

اس سُریانی رِوایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبّن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے، اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے، اور اتنی مدّت کے اندر زبانی روایات کے ایک مُلک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غَلَطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(قصّۂ اصحابِ کہف کے متعلق مزید معلومات ضمیمہ نمبر ۱ میں بیان کی گئی ہیں جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔)

۱۰ – یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ﴿۱۵﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ

یہ لوگ ان کے معبُود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبُودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فُلاں غار میں چل کر پناہ لو[۱۱]۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سر و سامان مہیّا کر دے گا۔“

تم انھیں غار میں دیکھتے[۱۲] تو تمھیں یُوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اُتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں[۱۳]۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جس کو اللہ ہدایت

۱۱ – جس زمانے میں اِن خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی، اُس وقت شہر اِفِسُس ایشیائے کوچک میں بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا، جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا، اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصّہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ (مُلاحظہ ہو: سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، عنوان ............... ) شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا، اُس کا اندازہ اصحابِ کہف کے اُس فقرے سے کیا جا سکتا ہے، جو اگلے رُکوع میں آ رہا ہے، کہ ”اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی اپنی مِلّت میں واپس لے جائیں گے۔“

۱۲ – بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا کہ اس قرار دادِ باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان

فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا ﴿١٧﴾ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۖ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾ وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ

---

دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولیِّ مُرشِد نہیں پا سکتے۔ع تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔[14] اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر اُنھیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی۔[15]

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اُٹھا بٹھایا[16] تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: "کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسروں نے کہا: "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔"

---

ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا مجبورِ اُمرتد ہو جانے سے بچ سکیں۔

۱۳ – یعنی ان کے غار کا دہانہ شمال کے رُخ تھا، جس کی وجہ سے سورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی، اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

۱۴ – یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو اِن سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

۱۵ – یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے کتّے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدّت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔

۱۶ – یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دُنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ

نصف القرآن باعتبار عدد الحروف ان التاء بعد الیاء من النصف الاول و اللام الثانیۃ من النصف الاخیر ۱۲

پھر وہ بولے: "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکّہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں اُن لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملّت میں واپس لے جائیں گے، اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے"—اِس طرح ہم نے اہلِ شہر کو ان کے حال پر مُطّلع کیا[17]، تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچّا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آ کر رہے گی۔[18] (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اُس وقت وہ آپس میں اِس بات پر جھگڑ رہے تھے

عجیب کرشمۂ قدرت ان کا ایک طویل مدّت کے بعد جاگنا بھی تھا۔

۱۷- یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دُنیا بدل چکی تھی۔ بُت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدّت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدّن، لباس، ہر چیز میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی سج دھج، لباس، زبان، ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈِیسِیَس کے وقت کا سکّہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دکان دار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُریانی رِوایت کی رُو سے دکان دار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال لایا ہے۔ چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجّہ کیا اور آخرکار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص تو اُن پیروانِ مسیحؑ میں سے ہے جو دو سو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحابِ کہف خبردار ہوئے کہ وہ دو سو برس بعد سو کر اُٹھے ہیں، تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح

اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا

کہ اِن (اصحابِ کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا: ''اِن پر ایک دیوار چُن دو، ان کا رب ہی اِن کے معاملے کو بہتر جانتا ہے۔[19]'' مگر جو لوگ اُن کے معاملات پر غالب[20] تھے،

پرواز کر گئی۔

۱۸ – سُریانی روایت کے مطابق اُس زمانے میں وہاں قیامت اور عالَمِ آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رُومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے، جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ اِفِسُس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صَدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلّم کھلّا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا، اور مسیحی علما کے پاس اُس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ مَتّی، مَرقُس، لُوقا، تینوں انجیلوں میں صَدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اُس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہُوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے، جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیّت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: مَتّی باب ۲۲، آیت ۲۳ تا ۳۳۔ مرقُس، باب ۱۲، آیت ۱۸ تا ۲۷۔ لُوقا، باب ۲۰، آیت ۲۷ تا ۴۰) اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلّا بھاری ہو رہا تھا اور مومنینِ آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اُس وقت اصحابِ کہف کے بَعْث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بَعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔

۱۹ – فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحینِ نصاریٰ کا قول تھا۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ اصحابِ کہف جس طرح غار میں لیٹے ہوئے ہیں، اسی طرح انھیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔

۲۰ – اس سے مراد رُومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خُصوصاً رُومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیا پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیحؑ، مریمؑ اور حواریوں کے مجسّمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بَعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اِسی اِفِسُس کے مَقام پر منعقد ہو چکی تھی، جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت اور حضرت مریمؑ کے ''مادرِ خدا'' ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچّے پیروانِ مسیحؑ کے مقابلے میں اُس وقت

عَلٰۤى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًۢا بِالۡغَيۡبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَبۡعَةٌ

انھوں نے کہا: ”ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔“[21]

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کُتّا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب بے تُکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اَور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے

عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہِ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی اُمور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے عَلَم بردار تھے اور انھوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

**۲۱** — مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآنِ مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابرِ صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن اُن کی اِس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بَعْث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انھوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے اِستدلال کیا جا سکتا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن اللّٰہ تعالٰی زائرات القبور والمتخذین علیہا المسَاجد والسُرُج۔
(احمد، ترمذی، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ)

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءھم مساجد فانی انھٰکم عن ذٰلك۔
(مسلم)

خبردار رہو! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاؑ کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمھیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لعن اللّٰہ تعالٰی الیہود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیآءھم مساجد۔ (احمد، بخاری، مسلم، نَسائی)

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انھوں نے اپنے انبیاؑ کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

اِنَّ اُولٰئك اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علٰی قبرہ مسجدا وصوّروا فیہ تلك الصور اولٰئك شرار الخلق یوم القیٰمۃ۔
(احمد، بخاری، مسلم، نَسائی)

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۟ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ وَ

اور آٹھواں اُن کا کتا تھا[۲۲]۔ کہو: میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پُوچھو[۲۳]ع ———— اور دیکھو،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایتاً ذکر کیا گیا ہے، اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے ''ایشیائے کُوچک کے اِکتشافات'' (discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے، ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر اِفُسُس کے کھنڈروں سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریمؑ اور ''سات لڑکوں'' (یعنی اصحابِ کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

**۲۲** — اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نُزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں، وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے، اور اِمتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ تاہم چونکہ تیسرے قول کی تردید اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے، اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔

**۲۳** — مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصّے سے ملتے ہیں۔ اِس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچّے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دُنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے، اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اُٹھا دینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس ''عادتِ جاریہ'' کو لوگ ''قانونِ فطرت'' سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دُنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے، اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سُلا کر اس طرح اُٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس اِمتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ

لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؗ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَ قُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا

کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کر دوں گا۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے) اِلّا یہ کہ اللہ چاہے۔ اگر بھُولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو اور کہو: ”اُمید ہے کہ میرا رب اِس معاملے میں رُشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا“[۲۴] ــــــ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدّت کے شمار میں) ۹ سال

سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیأ اور کُتُبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انھوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انھیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے ــــــ یہ ہیں وہ اصل سبق جو آدمی کو اس قصّے سے لینے چاہییں، اور اس میں توجّہ کے قابل یہی اُمور ہیں۔ ان سے توجّہ ہٹا کر اِس کھوج میں لگ جانا کہ اصحابِ کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور ان کا کتا کس رنگ کا تھا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم ان میں نہ اُلجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجّہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی، تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

۲۴ – یہ ایک جملۂ معترضہ ہے جو پچھلی آیت کے مضمون کی مناسبت سے سلسلۂ کلام کے بیچ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پچھلی آیت میں ہدایت کی گئی تھی کہ اصحابِ کہف کی تعداد کا صحیح علم اللہ کو ہے اور اس کی تحقیق کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، لہٰذا خواہ مخواہ ایک غیر ضروری بات کی کھوج میں لگنے سے پرہیز کرو، اور اس پر کسی سے بحث بھی نہ کرو۔ اس سلسلے میں آگے کی بات ارشاد فرمانے سے پہلے جملۂ معترضہ کے طور پر ایک اور ہدایت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو دی گئی، اور وہ یہ کہ تم کبھی دعوے سے یہ نہ کہہ دینا کہ میں کل فلاں کام کر دوں گا۔ تم کو کیا خبر کہ تم وہ کام کر سکو گے یا نہیں۔ نہ تمھیں غیب کا علم، اور نہ تم

تِسۡعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَہٗ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَبۡصِرۡ بِہٖ وَ اَسۡمِعۡ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَ اتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ کِتَابِ رَبِّکَ ۚؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ۟ وَ لَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ

---

اور بڑھ گئے ہیں[۲۵]۔ تم کہو: اللہ ان کے قیام کی مدّت زیادہ جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اُسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سُننے والا! زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اُس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اے نبیؐ![۲۶] تمھارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے، اسے (جُوں کا تُوں) سُنا دو، کوئی اُس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے، (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردّ و بدل کرو گے تو) اُس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے[۲۷]۔ اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیّت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے

---

اپنے افعال میں ایسے خود مختار کہ جو کچھ چاہو کر سکو۔ اس لیے اگر کبھی بے خیالی میں ایسی بات زبان سے نکل بھی جائے تو فوراً مُتنبِّہ ہو کر اللہ کو یاد کرو اور اِن شاء اللہ کہہ دیا کرو۔ مزید برآں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس کام کے کرنے کو تم کہہ رہے ہو، آیا اس میں خیر ہے، یا کوئی دوسرا کام اس سے بہتر ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہا کرو کہ اُمید ہے، میرا رب اس معاملے میں صحیح بات، یا صحیح طرزِ عمل کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا۔

۲۵ – اس فقرے کا تعلّق ہمارے نزدیک جملۂ معترضہ سے پہلے کے فقرے کے ساتھ ہے۔ یعنی سلسلۂ عبارت یوں ہے کہ ”کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا، .......... اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور بعض لوگ اس مدّت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے ہیں۔“ اس عبارت میں تین سو اور تین سو نو سال کی تعداد جو بیان کی گئی ہے، ہمارے خیال میں یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو: اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدّت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی، تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنٰی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟[۲۸]

۲۶ – اصحابِ کہف کا قصّہ ختم کرنے کے بعد اب یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے، اور اس میں اُن حالات پر تبصرہ ہے جو اس وقت مکے میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔

۲۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کی خاطر قرآن میں کچھ ردّوبدل کر دینے اور سردارانِ قریش سے کچھ کم وبیش پر مُصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے منع فرما رہا تھا۔ بلکہ دراصل اس میں رُوئے سُخن کفارِ مکہ کی طرف ہے، اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اسے بے کم وکاست پہنچا دیں۔ تمھیں ماننا ہے تو اس پورے دین کو جُوں کا تُوں مانو جو خداوندِ عالَم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو۔ مگر یہ اُمید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمھیں راضی کرنے کے لیے اِس دین میں تمھاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو۔ یہ جواب ہے اُس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا، کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمھاری پوری بات مان لیں۔ آخر کچھ تو ہمارے آبائی دین کے عقائد اور رسم ورواج کی رعایت ملحوظ رکھو۔ کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمھاری مان لیں۔ اس پر سمجھوتا ہو سکتا ہے اور برادری پھُوٹ سے بچ سکتی ہے۔ قرآن میں ان کے اس مطالبے کا متعدّد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یونس کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ ”جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔“

۲۸ – ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق، قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صُہیبؓ اور عمّارؓ اور خبّابؓ اور ابنِ مسعودؓ جیسے غریب لوگ، جو تمھاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انھیں ہٹاؤ تو ہم تمھاری مجلس میں آ سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر تمھارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب وروز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، ان کی معیّت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم اِن مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ دنیوی ٹھاٹ باٹ رکھنے والے لوگ تمھارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بھی بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر سنانا دراصل سردارانِ قریش کو مقصود ہے، کہ تمھاری یہ دکھاوے کی شان وشوکت، جس پر تم پھول رہے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں کچھ قدر وقیمت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے

وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ۙ

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو[۲۹] جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار افراط وتفریط پر مبنی ہے[۳۰]۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے[۳۱]۔

---

رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ ٹھیک یہی معاملہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ ۚ، ''ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو رذیل لوگ ہیں، وہ بے سوچے سمجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔'' اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ، ''میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا''، اور وَلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيۡرًا ؕ، ''جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انھیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے۔'' (ہود، آیات ۲۷-۲۹-۳۱۔ نیز سورۂ اَنعام، آیت ۵۲۔ اور سورۃ الحِجر، آیت ۸۸)

**۲۹ –** یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ جھکو، اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو۔ یہاں ''اطاعت'' کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

**۳۰ –** وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اَخلاقی حُدود کو توڑ کر بگ ٹٹ چلنے والا ہے۔'' دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے۔ جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے، اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حُدود ناآشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حُدود ناآشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مُطاع بھٹکے، اسی میں مُطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔

**۳۱ –** یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اصحابِ کہف کا قصّہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحابِ کہف کے جو واقعات اُوپر بیان ہوئے ہیں، ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انھوں نے کس طرح اُٹھ کر دوٹوک بات کہہ دی کہ ''ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔'' اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مُصالحت پر آمادہ نہ ہوئے، بلکہ انھوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ ''ہم اُس کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے۔'' اور کس طرح انھوں نے اپنی قوم اور اس کے معبُودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سروسامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انھیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدانخواستہ

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۗ وَإِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۗ بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ إِنَّا لَا نُضِيْعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لَپٹیں انھیں گھیرے میں لے چکی ہیں[۳۲]۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضُع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا[۳۳] ہوگا اور ان کا منہ بُھون ڈالے گا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بُری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

ہماری قوم ہم کو اپنی ملّت کی طرف پھیر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ اِن واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے ـــــ اور سنانا دراصل مخالفینِ اسلام کو مقصود ہے ـــــ کہ اِن مشرکین اور منکرینِ حق سے مُصالَحت قطعاً خارج از بحث ہے۔ جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے، اسے بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کر دو۔ مانتے ہیں تو مانیں، نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے۔ جنھوں نے مان لیا ہے، خواہ وہ کم سِن نوجوان ہوں، یا بے مال و زر فقیر، یا غلام اور مزدور، بہر حال وہی قیمتی جواہر ہیں، انھی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا، اور ان کو چھوڑ کر اُن بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں، مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔

**۳۲**- سُرادِق کے اصل معنیٰ ہیں: قناتیں اور سراپردے، جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ لیکن جہنّم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سُرادِق سے مراد اس کے وہ بیرونی حُدود ہیں جہاں تک اس کی لَپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ''اس کے سُرادِق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔'' بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنیٰ میں لیا ہے، یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالَمِ آخرت میں جہنّم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے۔ لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے منہ موڑنے والے ظالم یہیں سے جہنّم کی لپیٹ میں آ چکے ہیں اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

**۳۳**- لغت میں مُہل کے مختلف معنیٰ بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنیٰ ''تیل کی تلچھٹ'' بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ ''لاوے'' کے معنیٰ میں آتا ہے، یعنی زمین کے وہ مادّے جو شدّتِ حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنیٰ پیپ اور لہو کے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ لَهُمۡ جَنَّٰتُ عَدۡنٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهِمُ ٱلۡأَنۡهَٰرُ يُحَلَّوۡنَ فِيهَا مِنۡ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٖ وَيَلۡبَسُونَ ثِيَابًا خُضۡرٗا مِّن سُندُسٖ وَإِسۡتَبۡرَقٖ مُّتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى ٱلۡأَرَآئِكِۚ نِعۡمَ ٱلثَّوَابُۚ وَحَسُنَتۡ مُرۡتَفَقٗا ﴿٣١﴾ ۞ وَٱضۡرِبۡ لَهُم مَّثَلٗا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ أَعۡنَٰبٖ وَحَفَفۡنَٰهُمَا بِنَخۡلٖ وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعٗا ﴿٣٢﴾ كِلۡتَا ٱلۡجَنَّتَيۡنِ ءَاتَتۡ أُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِم مِّنۡهُ شَيۡـٔٗاۚ وَفَجَّرۡنَا خِلَٰلَهُمَا نَهَرٗا ﴿٣٣﴾ وَكَانَ لَهُۥ ثَمَرٞ فَقَالَ لِصَٰحِبِهِۦ وَهُوَ يُحَاوِرُهُۥٓ أَنَا

ان کے لیے سدا بہار جنّتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں[۳۴] گے، باریک ریشم اور اَطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور اُونچی مسندوں[۳۵] پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام! ع

اے محمدؐ! اِن کے سامنے ایک مثال پیش کر دو[۳۶]۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور اُن کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پُھولے اور بار آور ہونے میں انھوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اُن باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اُسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسایے سے بات کرتے ہوئے بولا:

۳۴- قدیم زمانے میں بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے تھے۔ اہلِ جنّت کے لباس میں اس چیز کا ذکر کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ وہاں ان کو شاہانہ لباس پہنائے جائیں گے۔ ایک کافر و فاسق بادشاہ وہاں ذلیل وخوار ہوگا، اور ایک مومن وصالح مزدور وہاں بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے رہے گا۔

۳۵- اَرائک جمع ہے اَرِیکہ کی۔ اَرِیکہ عربی زبان میں ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر چتر لگا ہوا ہو۔ اس سے بھی یہی تصور دلانا مقصود ہے کہ وہاں ہر جنتی تختِ شاہی پر متمکن ہوگا۔

۳۶- اس مثال کی مناسبت سمجھنے کے لیے پچھلے رُکوع کی وہ آیت نگاہ میں رہنی چاہیے جس میں مکے کے متکبر سرداروں کی اس بات کا جواب دیا گیا تھا کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آ کر نہیں بیٹھ سکتے، انھیں ہٹا دیا جائے تو ہم آ کر سنیں گے کہ تم کیا کہنا

اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ‌ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ ﴿۳۵﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآٮِٕمَةً ۙ وَّلَٮِٕنۡ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ؕ ﴿۳۷﴾ لٰـكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ

''میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔'' پھر وہ اپنی جنّت میں داخل ہوا[۳۷] اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا: ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اِس سے بھی زیادہ شان دار جگہ پاؤں گا[۳۸]۔'' اُس کے ہمسایے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا: ''کیا تو کفر کرتا ہے اُس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا[۳۹]؟ رہا میں، تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنی جنّت میں داخل

چاہتے ہو۔ اس مقام پر وہ مثال بھی نگاہ میں رہے جو سورۂ القلم، آیات ۱۷ تا ۳۳ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ نیز سورۂ مریم، آیات ۷۳-۷۴، سورۂ المومنون، آیات ۵۵ تا ۶۱، سورۂ سبا، آیات ۳۴ تا ۳۶، اور حٰم سجدہ، آیات ۴۹-۵۰ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۳۷- یعنی جن باغوں کو وہ اپنی جنّت سمجھ رہا تھا۔ کم ظرف لوگ، جنھیں دنیا میں کچھ شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے، ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انھیں دنیا ہی میں جنّت نصیب ہو چکی ہے، اب اور کون سی جنت ہے جسے حاصل کرنے کی وہ فکر کریں۔

۳۸- یعنی اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے بھی تو میں وہاں اس سے بھی زیادہ خوش حال رہوں گا، کیونکہ یہاں میرا خوش حال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں خدا کا محبوب اور اس کا چہیتا ہوں۔

۳۹- اگرچہ اُس شخص نے خدا کی ہستی سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ وَّلَٮِٕنۡ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىۡ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کا قائل تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے ہمسایے نے اسے کفر باللہ کا مجرم قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر باللہ محض ہستیِ باری کے انکار ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ تکبُّر اور فخر و غرور اور انکارِ آخرت بھی اللہ سے کفر ہی ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ بس میں ہی میں ہوں، میری دولت اور شان و شوکت کسی کا عَطِیَّہ نہیں بلکہ میری قوت و قابلیت کا نتیجہ ہے، اور میری دولت

جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

ع ۵ ۱۷

ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ،لاقوۃ اِلّا باللہ[۴۰]؟ اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنّت سے بہتر عطا فرما دے،اور تیری جنّت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے،یا اس کا پانی زمین میں اُتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔'' آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر اُلٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ '' کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہوتا'' ـــــ نہ ہُوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا،اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ ـــــ اُس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے،انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے،اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے ؏

لازوال ہے،کوئی اس کو مجھ سے چھیننے والا نہیں،اور کسی کے سامنے مجھے حساب دینا نہیں،وہ اگر خدا کو مانتا بھی ہے،تو محض ایک وجود کی حیثیت سے مانتا ہے،اپنے مالک اور آقا اور فرماں روا کی حیثیت سے نہیں مانتا۔حالانکہ ایمان باللہ اسی حیثیت سے خدا کو ماننا ہے،نہ کہ محض ایک موجود ہستی کی حیثیت سے۔

۴۰ – ''یعنی جو کچھ اللہ چاہے وہی ہوگا۔میرا اور کسی کا کچھ زور نہیں ہے۔ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ ہی کی

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ

اور اے نبیؐ! اِنھیں حیاتِ دُنیا کی حقیقت اِس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خُوب گھنی ہوگئی، اور کل وہی نباتات بُھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اُڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۴۱] یہ مال اور یہ اولاد محض دُنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرایش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور اُنھی سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ فکر اُس دن کی ہونی چاہیے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے،[۴۲] اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے،[۴۳] اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا،[۴۴] اور سب کے سب تمھارے رب کے حُضور صف در صف پیش کیے جائیں گے۔

توفیق و تائید سے چل سکتا ہے۔''

۴۱ – یعنی وہ زندگی بھی بخشتا ہے اور موت بھی۔ وہ عُروج بھی عطا کرتا ہے اور زوال بھی۔ اس کے حکم سے بہار آتی ہے تو خزاں بھی آ جاتی ہے۔ اگر آج تمھیں عیش اور خوش حالی میسّر ہے تو اس غَرّے میں نہ رہو کہ یہ حالت لازوال ہے۔ جس خدا کے حکم سے یہ کچھ تمھیں ملا ہے، اسی کے حکم سے سب کچھ تم سے چِھن بھی سکتا ہے۔

۴۲ – یعنی جب کہ زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور پہاڑ اس طرح چلنے شروع ہوں گے جیسے بادل چلتے ہیں۔ اِس کیفیت کو ایک دوسرے مقام پر قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ (النمل: ۸۸) ''تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ سخت جمے ہوئے ہیں۔ مگر وہ چلیں گے اس طرح جیسے بادل چلتے ہیں۔''

۴۳ – یعنی اس پر کوئی روئیدگی اور کوئی عمارت باقی نہ رہے گی، بالکل ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ یہ وہی بات ہے جو اِس سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی تھی کہ ''جو کچھ اس زمین پر ہے، اسے ہم نے لوگوں کی آزمایش کے لیے ایک عارضی آرایش

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ

ع ۶ ۵ ۱۸

—— لو دیکھ لو، آ گئے نا تم ہمارے پاس اُسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔[۴۵] تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمھارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے ۔ نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔ جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔[۴۶] ع

یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔[۴۷]

---

بنایا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بالکل ایک بے آب و گیاہ صحرا بن کر رہ جائے گی۔“

۴۴ – یعنی ہر انسان جو آدمؑ سے لے کر قیامت کی آخری ساعت تک پیدا ہوا ہے، خواہ ماں کے پیٹ سے نکل کر اس نے ایک ہی سانس لیا ہو، اُس وقت دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور سب کو ایک وقت میں جمع کر دیا جائے گا۔

۴۵ – یعنی اُس وقت منکرینِ آخرت سے کہا جائے گا کہ دیکھو، انبیاؑ کی دی ہوئی خبر سچّی ثابت ہوئی نا۔ وہ تمھیں بتاتے تھے کہ جس طرح اللہ نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا، مگر تم اسے ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بتاؤ، اب دوبارہ تم پیدا ہو گئے یا نہیں؟

۴۶ – یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہوگا کہ آدمی کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے، یا بے گناہ پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔

۴۷ – اس سلسلۂ کلام میں قصّۂ آدمؑ و ابلیس کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود گمراہ انسانوں کو ان کی اس حماقت پر متنبّہ

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

وہ جنّوں میں سے تھا، اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔[۴۸] اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اُس کو اور اس کی ذُرِّیّت کو اپنا سرپرست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی بُرا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں نے آسمان وزمین پیدا کرتے وقت اُن کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود اُن کی اپنی تخلیق میں انھیں شریک کیا تھا۔[۴۹] میرا یہ کام نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں۔

کرنا ہے کہ وہ اپنے رحیم وشفیق پروردگار اور خیر خواہ پیغمبروں کو چھوڑ کر اپنے اُس اَزلی دشمن کے پھندے میں پھنس رہے ہیں جو اوّل روزِ آفرینش سے ان کے خلاف حسد رکھتا ہے۔

۴۸- یعنی ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنّوں میں سے تھا، اسی لیے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لیے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرتاً مطیع فرمان ہیں: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (التحریم: ۶) ”اللہ جو حکم بھی ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جو اُن کو حکم دیا جاتا ہے۔“ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (النحل: ۵۰) ”وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے رب سے جو اُن کے اوپر ہے۔ ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔“ بخلاف اس کے، جِنّ انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے، جسے پیدائشی فرماں بردار نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ کفر وایمان اور طاعت ومعصیت، دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اسی حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنّوں میں سے تھا، اس لیے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح اُن تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عُموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا، اور فرشتہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ معلم الملکوت۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الحِجر، آیت ۲۷- اور الجن، آیات ۱۳-۱۵)۔

رہا یہ سوال کہ جب ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو پھر قرآن کا یہ طرزِ بیان کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، پس ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا“؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کے معنیٰ یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقاتِ ارضی بھی انسان کی مطیعِ فرمان بن جائیں جو کُرۂ زمین کی عمل داری میں فرشتوں کے زیرِ انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سربسجود ہوئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ (لفظ ابلیس کے معنیٰ کے لیے مُلاحظہ ہو: المومنون، حاشیہ ۷۳)

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾ ع وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ

ع ۷/۴ ۱۹

پھر کیا کریں گے یہ لوگ اُس روز جب کہ اِن کا رب اِن سے کہے گا کہ پکارو اب اُن ہستیوں کو جنھیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔[50] یہ ان کو پکاریں گے، مگر وہ اِن کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے۔[51] سارے مجرم اُس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انھیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔ ع

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ اُن کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حُضور معافی چاہنے سے آخر اُن کو

۴۹ – مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین آخر تمھاری طاعت و بندگی کے مستحق کیسے بن گئے؟ بندگی کا مستحق تو صرف خالق ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان شیاطین کا حال یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق میں شریک ہونا تو درکنار، یہ تو خود مخلوق ہیں۔

۵۰ – یہاں پھر وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے بھی کئی جگہ قرآن میں گزر چکا ہے کہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے احکام اور رہنمائی کا اتباع کرنا دراصل اس کو خدائی میں اللہ کا شریک ٹھیرانا ہے، خواہ آدمی اُس دوسرے کو زبان سے خدا کا شریک قرار دیتا ہو، یا نہ قرار دیتا ہو۔ بلکہ اگر آدمی اُن دوسری ہستیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی امرِالٰہی کے مقابلے میں ان کے اوامر کا اتباع کر رہا ہو، تب بھی وہ شرک کا مجرم ہے۔ چنانچہ یہاں شیاطین کے معاملے میں آپ علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ہر ایک ان پر لعنت کرتا ہے، مگر اس لعنت کے باوجود جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، قرآن اُن سب کو یہ الزام دے رہا ہے کہ تم شیاطین کو خدا کا شریک بنائے ہوئے ہو۔ یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ شرکِ عملی ہے، اور قرآن اس کو بھی شرک ہی کہتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۹۱-۱۴۵۔ الانعام، حاشیہ ۸۷-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱۔ ابراھیم، حاشیہ ۳۲۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۷۔ المومنون، حاشیہ ۴۱۔ الفرقان، حاشیہ ۵۶۔ القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳۔ یٰسٓ، حاشیہ ۵۳۔ الشوریٰ، حاشیہ ۳۸۔ الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

۵۱ – مفسّرین نے اس آیت کے دو مفہوم بیان کیے ہیں: ایک وہ جو ہم نے اُوپر ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا

الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ

کس چیز نے روک دیا؟ اِس کے سوا اَور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے، یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں![۵۲]

رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اَور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں۔[۵۳] مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انھوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو، جو انھیں کی گئیں، مذاق بنالیا ہے۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے منہ پھیرے اور اُس بُرے انجام کو بُھول جائے جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے؟ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیے ہیں جو انھیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے،

---

مفہوم یہ ہے کہ ''ہم ان کے درمیان عداوت ڈال دیں گے۔'' یعنی دنیا میں ان کے درمیان جو دوستی تھی، آخرت میں وہ سخت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔

**۵۲** – یعنی جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے، قرآن نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ دل اور دماغ کو اپیل کرنے کے جتنے مؤثّر طریقے اختیار کرنے ممکن تھے، وہ سب بہترین انداز میں یہاں اختیار کیے جا چکے ہیں۔ اب وہ کیا چیز ہے جو انھیں قبولِ حق میں مانع ہو رہی ہے؟ صرف یہ کہ انھیں عذاب کا انتظار ہے۔ جوتے کھائے بغیر سیدھے نہیں ہونا چاہتے۔

**۵۳** – اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ رسولوں کو ہم اسی لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ بے وقوف لوگ ان پیشگی تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اسی انجامِ بد کو دیکھنے پر مُصِرّ ہیں جس سے رسول انھیں بچانا چاہتے ہیں۔

وَفِيٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

ع ۸ ۲۰

اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔[۵۴]

تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انھیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج دیتا۔ مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے۔[۵۵]

یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمھارے سامنے موجود ہیں۔[۵۶] انھوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ع

---

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو عذاب ہی دیکھنا منظور ہے تو پیغمبر سے اس کا مطالبہ نہ کریں، کیونکہ پیغمبر عذاب دینے کے لیے نہیں بلکہ عذاب سے پہلے صرف خبردار کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

۵۴ – یعنی جب کوئی شخص یا گروہ دلیل و حجت اور خیر خواہانہ نصیحت کے مقابلے میں جھگڑالو پن پر اُتر آتا ہے، اور حق کا مقابلہ جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیاروں سے کرنے لگتا ہے، اور اپنے کرتُوتوں کا بُرا انجام دیکھنے سے پہلے کسی کے سمجھانے سے اپنی غَلَطی ماننے پر تیار نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ پھر اس کے دل پر قفل چڑھا دیتا ہے اور اس کے کان ہر صدائے حق کے لیے بہرے کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ نصیحت سے نہیں مانا کرتے، بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں گر کر ہی انھیں یقین آتا ہے کہ وہ ہلاکت تھی جس کی راہ پر وہ بڑھے چلے جا رہے تھے۔

۵۵ – یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے قصور سرزد ہو، اُسی وقت پکڑ کر اسے سزا دے ڈالے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ مجرموں کے پکڑنے میں وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا اور مدّتوں ان کو سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر سخت نادان ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو غلط معنیٰ میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ خواہ کچھ ہی کرتے رہیں، ان سے کبھی باز پرس ہو گی ہی نہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝۶۰ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ

(ذرا اِن کو وہ قصّہ سُناؤ جو موسیٰؑ کو پیش آیا تھا) جب کہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ”میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔“[57] پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا

۵۶ - اشارہ ہے سَبا اور ثمود اور مَدیَن اور قومِ لُوط کے اُجڑے دیاروں کی طرف، جنھیں قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں آتے جاتے دیکھا کرتے تھے، اور جن سے عرب کے دوسرے لوگ بھی خوب واقف تھے۔

۵۷ - اس مرحلے پر یہ قصّہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بیں نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے، اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنھیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرماں برداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی کُنہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں اُلجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجا نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں، اور بسا اوقات سخت آزمایشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مَشِیَّت کا پردہ اُٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی، تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے، کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عَوفی کی ایک روایت ہمیں ضرور ملتی ہے جس میں وہ ابنِ عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا۔ لیکن ابنِ عباسؓ سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کُتُبِ حدیث میں منقول ہیں، وہ اس بیان کی تائید نہیں کرتیں، اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ کبھی مصر میں رہے تھے۔ بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خُروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تِیہ میں گزرا۔ اس لیے یہ روایت تو قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ جب ہم خود اس قصّے کی تفصیلات پر غور کرتے

فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ

میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سُرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا: ''لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے

ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں: ایک، یہ کہ یہ مُشاہَدات حضرت موسیٰؑ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دَور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغازِ نبوت ہی میں انبیا علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم وتربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے، یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو اِن مشاہدات کی ضرورت اُس زمانے میں پیش آئی ہو گی جب کہ بنی اسرائیل کو بھی اُسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکۂ معظّمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (واللعلم عند اللّٰہ) کہ اس واقعے کا تعلق اُس دور سے ہے جب کہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اُوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے بازپُرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا! ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتّٰی کہ خود حضرت موسیٰؑ یہ پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ''اَے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان وشوکت اور مال ودولت دے رکھی ہے، اَے پروردگار! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۰۸)

اگر ہمارا یہ قیاس دُرست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰؑ کا یہ سفر سُودان (سوڈان) کی جانب تھا، اور مجمع البحرین سے مراد وہ مَقام ہے جہاں موجودہ شہر خُرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحرالاَبیَض اور البحرالاَزرَق آ کر ملتی ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: نقشہ ۱، صفحہ ۳۴) حضرت موسیٰؑ نے اپنی پوری زندگی جن علاقوں میں گزاری ہے، ان میں اس ایک مقام کے سوا اور کوئی مجمع البحرین نہیں پایا جاتا۔

بائبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تَلمُود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت موسیٰؑ کے بجائے رَبّی یہوحانان بن لاوِی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ رَبّی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاسؑ کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دُنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔ (The Talmud Selections by H. Polano, pp. 313-316) ممکن ہے کہ خُروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو، اور صدیوں بعد انھوں نے قصّے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں۔ تَلمُود کی اسی روایت سے متاثّر ہو کر مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو تَلمُود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جا سکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقے سے کیا گیا ہو گا، اور پھر جب کہ معتبر احادیث میں حضرت اُبَیؓ بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصّے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت

لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ

سفر میں تو ہم بُری طرح تھک گئے ہیں۔" خادم نے کہا: "آپ نے دیکھا! یہ کیا ہُوا؟ جب ہم اُس چٹان کے

موسیٰؑ پیغمبرِ بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمُود کا بیان لائقِ التفات نہیں رہتا۔

مستشرقینِ مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآنِ مجید کے اس قصّے کے بھی مآخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصّوں پر اُنگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نقل کر کے یہ قصّہ بنا لیا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اُوپر بذریعۂ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک، داستانِ گلگامیش، دوسرے، سکندر نامۂ سُریانی، اور تیسرے، وہ یہودی روایت جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بدطینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں، اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہر حال مُنزّل مِنَ اللہ تو نہیں ماننا ہے، اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فُلاں فُلاں مقامات سے چُرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرزِ تحقیق میں یہ لوگ اِس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گِھن آنے لگتی ہے، اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر۔ ان کی اس متعصّبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالبِ علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

اوّل، یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جُلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انھی کتابوں سے ماخوذ ہے؟

دوسرے، یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں آپ لوگوں نے قرآنِ مجید کے قصّوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دی ہیں، اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کُتُب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکے میں اُس وقت موجود تھا اور مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار اُن دو تین سفروں پر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لائے تھے؟ اور اعلانِ نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپؐ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

تیسرے، یہ کہ کفارِ مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سَرقے کا پتا نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انھیں تو بار بار تحدّی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن مُنزّل مِنَ اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ؗ وَمَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖۗ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖۗ فَارْتَدَّا عَلٰۤی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤی اَنْ تُعَلِّمَنِ

پاس ٹھیرے ہوئے تھے، اُس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بُھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔" موسیٰؑ نے کہا: "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی۔[58]" چنانچہ وہ دونوں اپنے نقشِ قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔[59]

موسیٰؑ نے اس سے کہا: "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی

ہوتو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے مُعاصر دشمنانِ اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دِہی نہ کر سکے، جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار، شک ہی کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج معاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہرحال ہے ناکہ قرآن مُنزّل مِنَ اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے اُنھی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی رِوایات سے مسخ ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا، اور کیوں صرف اِسی ایک امکان کو بِنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن اُن قصّوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصّب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا، وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مُستشرِقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالبِ علم کے لیے قابلِ التفات نہیں ہے۔

۵۸ – یعنی منزلِ مقصود کا یہی نشان تو ہم کو بتایا گیا تھا۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا

مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع فَانْطَلَقَا ۜ وقفة حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ

ع ۹ ۱۱ ۲۱

تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟" اس نے جواب دیا: "آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو، آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔" موسیٰؑ نے کہا "ان شاء اللہ، آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔" اس نے کہا: "اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں، جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔" ع

اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی۔" اس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ

یہ سفر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور ان کو منزلِ مقصود کی علامت یہی بتائی گئی تھی کہ جہاں ان کے ناشتے کی مچھلی غائب ہو جائے، وہی مقام اس بندے کی ملاقات کا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔

**۵۹** – اس بندے کا نام تمام معتبر احادیث میں خَضِر بتایا گیا ہے۔ اس لیے اُن لوگوں کے اقوال کسی التفات کے مستحق نہیں ہیں جو اسرائیلی رِوایات سے متاثّر ہو کر حضرت الیاسؑ کی طرف اس قصّے کو منسوب کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول نہ صرف اس بنا پر غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے متصادم ہوتا ہے، بلکہ اس بنا پر بھی سراسر لغو ہے کہ حضرت الیاسؑ، حضرت موسیٰؑ کے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے خادم کا نام بھی قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں ذکر ہے کہ وہ حضرت یوشعؑ بن نُون تھے جو بعد میں حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ ہوئے۔

إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿٧٣﴾ فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِن لَّدُنِّي عُذْرًا ﴿٧٦﴾ فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴿٧٧﴾ قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ

الجزء ۱۶

---

تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰؑ نے کہا: "بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں۔"

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی، حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا۔" اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟" موسیٰؑ نے کہا: "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پُوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے، اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔"

پھر وہ آگے چلے، یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اُس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے۔" اُس نے کہا: "بس میرا تمھارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمھیں ان باتوں

بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ع ۱۲

حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اَخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلۂ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اِس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے اِن بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمھارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمھارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے[۶۰]۔'' ع

۶۰ – اس قصّے میں ایک بڑی پیچیدگی ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے۔ حضرت خِضرؑ نے یہ تین کام جو کیے ہیں، ان میں سے تیسرا کام تو خیر شریعت سے نہیں ٹکراتا، مگر پہلے دونوں کام یقیناً اُن احکام سے متصادم ہوتے ہیں جو ابتدائے

عہدِ انسانیت سے آج تک تمام شرائعِ الٰہیہ میں ثابت رہے ہیں۔ کوئی شریعت بھی کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کی مملوکہ چیز کو خراب کر دے، اور کسی مُتَنفِّس کو بے قصور قتل کر ڈالے۔ حتّٰی کہ اگر کسی انسان کو بطریقِ الہام بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کشتی کو آگے جا کر ایک غاصب چھین لے گا، اور فلاں لڑکا بڑا ہو کر سرکش اور کافر نکلے گا، تب بھی اس کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں سے کسی شریعت کی رُو سے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس الہامی علم کی بنا پر کشتی میں چھید کر دے اور ایک بے گناہ لڑکے کو مار ڈالے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ حضرت خَضِرؑ نے یہ دونوں کام اللہ کے حکم سے کیے تھے، فی الواقع اس پیچیدگی کو کچھ بھی رفع نہیں کرتا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حضرت خَضِرؑ نے یہ کام کس کے حکم سے کیے تھے۔ ان کا حکمِ الٰہی سے ہونا تو بالیقین ثابت ہے، کیونکہ حضرت خَضِرؑ خود فرماتے ہیں کہ ان کے یہ افعال ان کے اختیاری نہیں ہیں بلکہ اللہ کی رحمت ان کی محرک ہوئی ہے، اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ خود فرما چکا ہے کہ حضرت خَضِرؑ کو اللہ کی طرف سے ایک علمِ خاص حاصل تھا۔ پس یہ امر تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ کام اللہ کے حکم سے کیے گئے تھے۔ مگر اصل سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے اِن احکام کی نوعیت کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ تشریعی احکام نہ تھے، کیونکہ شرائعِ الٰہیہ کے جو بنیادی اُصول قرآن اور اس سے پہلے کی کُتُبِ آسمانی سے ثابت ہیں، ان میں کبھی کسی انسان کے لیے یہ گنجایش نہیں رکھی گئی کہ وہ بلا ثبوتِ جرم کسی دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ احکام اپنی نوعیت میں اللہ تعالیٰ کے اُن تکوینی احکام سے مشابہت رکھتے ہیں جن کے تحت دنیا میں ہر آن کوئی بیمار کر ڈالا جاتا ہے اور کوئی تندرست کیا جاتا ہے، کسی کو موت دی جاتی ہے اور کسی کو زندگی سے نوازا جاتا ہے، کسی کو تباہ کیا جاتا ہے اور کسی پر نعمتیں نازل کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ تکوینی احکام ہیں تو ان کے مخاطَب صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں، جن کے بارے میں شرعی جواز وعَدَمِ جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی اختیار کے بغیر صرف اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل کرتے ہیں۔ رہا انسان، تو خواہ وہ بلا ارادہ کسی تکوینی حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنے اور خواہ الہاماً اس طرح کا کوئی غیبی علم اور حکم پا کر اس پر عمل درآمد کرے، بہر حال وہ گناہگار ہونے سے نہیں بچ سکتا اگر وہ کام جو اس نے کیا ہے، کسی حکمِ شرعی سے ٹکراتا ہو۔ اس لیے کہ انسان بحیثیت اس کے کہ وہ انسان ہے، احکامِ شرعیہ کا مکلّف ہے، اور اُصولِ شریعت میں کہیں یہ گنجایش نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لیے محض اس بنا پر احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعۂ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعۂ علمِ غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابر صوفیہ بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علّامہ آلُوسیؒ نے تفصیل کے ساتھ عبدالوہّاب شَعْرانی، مُحیُ الدین ابنِ عَرَبی، مُجدِّدِ الفِ ثانی، شیخ عبدالقادر جِیلانی، جُنَید بغدادی، سَرِّی سَقَطی، ابوالحسین النُّوری، ابوسعید الخَرّاز، ابوالعباس احمد الدِّینَوَری اور امام غَزّالی رحمہم اللہ جیسے نامور بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحبِ الہام تک کے لیے جائز نہیں ہے جو نَصِّ شرعی کے خلاف ہو۔ (رُوح المعانی، ج ۱۶، ص ۱۶-۱۸)

اب کیا ہم یہ مان لیں کہ اس قاعدۂ کُلّیہ سے صرف ایک انسان مستثنٰی کیا گیا ہے، اور وہ ہیں حضرت خَضِرؑ؟ یا

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳ۭ

اور اے محمدؐ! یہ لوگ تم سے ذُوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں[61]۔ ان سے کہو: میں اس کا کچھ حال تم کو سُناتا ہوں[62]۔

---

یہ سمجھیں کہ خضرؑ کوئی انسان نہ تھے، بلکہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیّتِ الٰہی کے تحت (نہ کہ شریعتِ الٰہی کے تحت) کام کرتے ہیں؟

پہلی صورت کو ہم تسلیم کر لیتے اگر قرآن بالفاظِ صریح یہ کہہ دیتا کہ وہ "بندہ"، جس کے پاس حضرت موسیٰؑ اس تربیت کے لیے بھیجے گئے تھے، انسان تھا۔ لیکن قرآن اس کے انسان ہونے کی تصریح نہیں کرتا، بلکہ صرف عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کے الفاظ بولتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اُس بندے کے انسان ہونے کو مُستلزم نہیں ہیں، قرآنِ مجید میں متعدّد جگہ فرشتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہُوا ہے، مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ انبیاء، آیت ۲۶ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۱۹۔ پھر کسی صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی ایسا ارشاد منقول نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ حضرت خضرؑ کو نوعِ انسانی کا ایک فرد قرار دیا گیا ہو۔ اس باب میں مستند ترین روایات وہ ہیں جو عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس، عن اُبیّ بن کعب، عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی سند سے ائمۂ حدیث کو پہنچی ہیں۔ ان میں حضرت خضرؑ کے لیے صرف رَجُل کا لفظ آیا ہے، جو اگرچہ مرد انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر انسانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں یہ لفظ جنّوں کے لیے مستعمل ہو چکا ہے، جیسا کہ سورۂ جنّ میں ارشاد ہوا ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ جنّ یا فرشتہ یا کوئی اور غیر مرئی وجود جب انسانوں کے سامنے آئے گا تو انسانی شکل ہی میں آئے گا اور اس حالت میں اس کو بشر یا انسان ہی کہا جائے گا۔ حضرت مریمؑ کے سامنے جب فرشتہ آیا تھا تو قرآن اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے کہ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "وہاں انھوں نے ایک مرد کو پایا" حضرت خضرؑ کے انسان ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم "خضرؑ" کو انسان نہ مانیں بلکہ فرشتوں میں سے، یا اللہ کی کسی اور ایسی مخلوق میں سے سمجھیں جو شرائع کی مکلّف نہیں ہے بلکہ کارگاہِ مشیّت کی کارکن ہے۔ متقدمین میں سے بھی بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے، جسے ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ماوَرْدی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

**۶۱** — وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ کا عطف لامحالہ پچھلے قصّے ہی پر ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قصہ موسیٰ و خضر بھی لوگوں کے سوال ہی کے جواب میں سنایا گیا ہے، اور یہ بات ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے کہ اس سورہ کے یہ تینوں اہم قصے دراصل کفارِ مکہ نے اہلِ کتاب کے مشورے سے امتحاناً دریافت کیے تھے۔

**۶۲** — یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ "ذوالقرنین"، جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، کون تھا۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا، لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے۔

ہیں، وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرماں روا خُورَس (خُسْرَو یا سائرس) کی طرف ہے، اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے، مگر بہرحال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیّت کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

قرآنِ مجید جس طرح اُس کا ذکر کرتا ہے، اس سے ہم کو چار باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس کا لقب ذوالقرنین (لغوی معنیٰ "دو سینگوں والا") کم از کم یہودیوں میں، جن کے اشارے سے کفارِ مکہ نے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، ضرور معروف ہونا چاہیے۔ اس لیے لامحالہ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے اسرائیلی لٹریچر کی طرف رُجوع کرنا پڑے گا کہ وہ "دو سینگوں والے" کی حیثیت سے کس شخصیت یا سلطنت کو جانتے تھے۔

(۲) وہ ضرور کوئی بڑا فرمانروا اور فاتح ہونا چاہیے جس کی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچی ہوں، اور تیسری جانب شمال یا جنوب میں بھی وسیع ہوئی ہوں۔ ایسی شخصیتیں نُزولِ قرآن سے پہلے چند ہی گزری ہیں اور لامحالہ انھی میں سے کسی میں اس کی دوسری خصوصیّات ہمیں تلاش کرنی ہوں گی۔

(۳) اُس کا مِصداق ضرور کوئی ایسا فرمانروا ہونا چاہیے جس نے اپنی مملکت کو یاجوج و ماجوج کے حملوں سے بچانے کے لیے کسی پہاڑی دَرّے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہو۔ اس علامت کی تحقیق کے لیے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہو گا کہ یاجوج و ماجوج سے مراد کون سی قومیں ہیں، اور پھر یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ان کے علاقے سے متصل کون سی ایسی دیوار کبھی دنیا میں بنائی گئی ہے اور وہ کس نے بنائی ہے۔

(۴) اس میں مذکورۂ بالا خصوصیات کے ساتھ ایک یہ خصوصیت بھی پائی جانی چاہیے کہ وہ خدا پرست اور عادل فرمانروا ہو، کیونکہ قرآن یہاں سب سے بڑھ کر اس کی اِسی خصوصیّت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان میں سے پہلی علامت آسانی کے ساتھ خورس پر چسپاں کی جا سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفۂ دانی اِیل میں دانیال نبی کا جو خواب بیان کیا گیا ہے، اس میں وہ یونانیوں کے عُروج سے قبل مِیڈیا اور فارس کی مُتَّحِدہ سلطنت کو ایک مینڈھے کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ تھے۔ یہودیوں میں اس "دو سینگوں والے" کا بڑا چرچا تھا، کیونکہ اسی کی ٹکر نے آخر کار بابِل کی سلطنت کو پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی۔ (تفہیم القرآن، جلد ۲ ص ۵۹۸-۵۹۹)

دوسری علامت بڑی حد تک اُس پر چسپاں ہوتی ہے، مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی فتوحات بلاشبہ مغرب میں ایشیائے کُوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بَلْخ) تک وسیع ہوئیں، مگر شمال یا جنوب میں اس کی

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا

اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سروسامان کیا حتّٰی کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا[۶۳] تو اس نے

کسی بڑی مہم کا سراغ ابھی تک تاریخ سے نہیں ملا ہے، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ ایک تیسری مہم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ تاہم اس مہم کا پیش آنا بعید از قیاس نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کی رُو سے خُورس کی سلطنت شمال میں کاکیشیا (قفقاز) تک وسیع تھی۔

تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب متحقق ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد رُوس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ہَن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے تھے۔ لیکن یہ ابھی تک ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ خُورس ہی نے یہ استحکامات تعمیر کیے تھے۔

آخری علامت قدیم زمانے کے معروف فاتحوں میں اگر کسی پر چسپاں کی جاسکتی ہے تو وہ خُورس ہی ہے۔ کیونکہ اس کے دشمنوں تک نے اس کے عدل کی تعریف کی ہے، اور بائبل کی کتاب عَزرا اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ضرور ایک خدا پرست اور خدا ترس بادشاہ تھا جس نے بنی اسرائیل کو ان کی خدا پرستی ہی کی بنا پر بابِل کی اسیری سے رہا کیا اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے بیت المَقدِس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس بنا پر ہم یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نُزولِ قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحینِ عالم گزرے ہیں، ان میں سے خُورس ہی کے اندر ’’ذوالقرنین‘‘ کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں، لیکن تعیُّن کے ساتھ اسی کو ذُوالقرنین قرار دے دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خُورس ہے۔

تاریخی بیان کے لیے صرف اتنا ذکر کافی ہے کہ خُورس ایک ایرانی فرمانروا تھا جس کا عُروج ۵۴۹ ق م کے قریب زمانے میں شروع ہوا۔ اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال) اور لیڈیا (ایشیائے کُوچک) کی سلطنتوں کو مسخر کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابِل کو بھی فتح کرلیا، جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستے میں مُزاحم نہیں رہی۔ اُس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صُغد (موجودہ تُرکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک، اور دوسری طرف تھریس اور مَقدُونیا تک وسیع ہوگیا، اور شمال میں اس کی سلطنت قَفقاز (کاکیشیا) اور خُوارِزم تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابعِ فرمان تھی۔

**۶۳ –** غروبِ آفتاب کی حد سے مراد، جیسا کہ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے: اقصٰی ما یسلك فيه من الارض من ناحية المغرب ہے، نہ کہ آفتاب غروب ہونے کی جگہ۔ مراد یہ ہے کہ وہ مغرب کی جانب ملک پر ملک فتح کرتا ہوا خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا جس کے آگے سمندر تھا۔

---

تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۥ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا

سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا[۶۴] اور وہاں اُسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: ”اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ اِن کے ساتھ نیک رَوِیّہ اختیار کرے۔“[۶۵] اس نے کہا: ”جو اِن میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو اِن میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔“

پھر اُس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی، یہاں تک کہ طُلوعِ آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طُلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دُھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے

۶۴ – یعنی وہاں غروبِ آفتاب کے وقت ایسا محسُوس ہوتا تھا کہ سورج سمندر کے سیاہی مائل گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اگر فی الواقع ذوالقرنین سے مراد خُورس ہی ہو تو یہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہوگا جہاں بحرِ اِیجِیَن چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس قیاس کی تائید یہ بات بھی کرتی ہے کہ قرآن یہاں بحر کے بجائے عین کا لفظ استعمال کرتا ہے، جو سمندر کے بجائے جھیل یا خلیج ہی پر زیادہ صحّت کے ساتھ بولا جا سکتا ہے۔

۶۵ – ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات براہِ راست وحی یا الہام کے ذریعے ہی سے ذوالقرنین کو خطاب کر کے فرمائی ہو، حتّٰی کہ اس سے ذوالقرنین کا نبی یا مُحدَّث ہونا لازم آئے۔ بلکہ یہ ارشاد زبانِ حال کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ ذوالقرنین اُس وقت فتح یاب ہو کر اس علاقے پر قابض ہوا تھا۔ مفتوح قوم اس کے بس میں تھی۔ اللہ نے اس صورتِ حال میں اس کے ضمیر کے سامنے یہ سوال رکھ دیا کہ یہ تیرے امتحان کا وقت ہے۔ یہ قوم

سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾

نہیں کیا ہے[٦٦]۔ یہ حال تھا اُن کا، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا، اُسے ہم جانتے تھے۔

پھر اُس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا، یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا[٦٧] تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی[٦٨]۔ اُن لوگوں نے کہا کہ "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج[٦٩] اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟"

تیرے آگے بے بس ہے۔ تُو ظلم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور شرافت کا سلوک کرنا چاہے تو یہ بھی تیرے اختیار میں ہے۔

٦٦ – یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہُوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہنچ گیا جہاں مہذب دُنیا کی سرحد ختم ہوگئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار، خیمے بنانا تک نہ جانتی تھیں۔

٦٧ – چونکہ آگے یہ ذکر آرہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یاجوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لیے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد کاکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحرِ خَزَر (کیسپین یا [قَزوِین]) اور بحرِ اَسْوَد کے درمیان واقع ہیں۔

٦٨ – یعنی اس کی زبان ذوالقرنین اور اس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔ سخت وحشی ہونے کے سبب سے نہ کوئی ان کی زبان سے واقف تھا اور نہ وہ کسی غیر زبان سے واقف تھے۔

٦٩ – یاجوج ماجوج سے مراد، جیسا کہ اُوپر حاشیہ ٦٢ میں اشارہ کیا جاچکا ہے، ایشیا کے شمالی مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اُٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رُخ کرتے رہے ہیں۔ بائبل کی کتابِ پیدایش (باب ١٠) میں ان کو حضرت نوحؑ کے بیٹے یافَث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حِزقی اِیل کے صحیفے (باب ٣٨ و ٣٩) میں ان کا علاقہ روس اور تُوبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس اُن سے مراد سِیتھِین قوم لیتا ہے، جس کا علاقہ بحرِ اَسْوَد کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جِیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾

اس نے کہا: ”جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں[70]۔ مجھے لوہے کی چادریں لا کر دو۔“ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتّیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سُرخ ہوگئی تو اس نے کہا: ”لاؤ، اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا اُنڈیلوں گا۔“ (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا: ”یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے[71] گا، اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے[72]۔“

کے شمال میں بحرِ خزر کے قریب آباد تھے۔

۷۰ – یعنی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کو غارت گروں کے حملے سے بچاؤں۔ اس کام کے لیے تم پر کوئی الگ ٹیکس لگانا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ ملک کا جو خزانہ اللہ تعالیٰ نے میرے حوالے کیا ہے، وہ اس خدمت کے لیے کافی ہے۔ البتہ ہاتھ پاؤں کی محنت سے تم کو میری مدد کرنی ہوگی۔

۷۱ – یعنی اگرچہ میں نے اپنی حد تک انتہائی مستحکم دیوار تعمیر کی ہے، مگر یہ لازوال نہیں ہے۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے، یہ قائم رہے گی، اور جب وہ وقت آئے گا جو اللہ نے اس کی تباہی کے لیے مقدر کر رکھا ہے تو پھر اس کو پارہ پارہ ہونے سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔ ”وعدے کا وقت“ ذومعنیٰ لفظ ہے۔ اس سے مراد اس دیوار کی تباہی کا وقت بھی ہے، اور وہ ساعت بھی جو اللہ نے ہر چیز کی موت اور فنا کے لیے مقرر فرما دی ہے، یعنی قیامت۔ (اس دیوار کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے مُلاحظہ ہو: ضمیمہ ۲)

۷۲ – یہاں پہنچ کر ذوالقرنین کا قصّہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصّہ اگرچہ کفارِ مکہ کے امتحانی سوال پر سنایا گیا ہے مگر

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

ع ۱۱ ۱۹ ۲

اور اُس[۷۳] روز ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دُوسرے سے گُتھم گُتھا ہوں اور صُور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ اور وہ دن ہوگا جب ہم جہنّم کو کافروں کے سامنے لائیں گے، اُن کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سُننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ ع

تو کیا[۷۴] یہ لوگ، جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے، یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں[۷۵]؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔

قصّۂ اصحابِ کہف اور قصّۂ موسیٰ وخِضر کی طرح اس کو بھی قرآن نے اپنے قاعدے کے مطابق اپنے مدعا کے لیے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ذوالقرنین، جس کی عظمت کا حال تم نے اہلِ کتاب سے سنا ہے، محض ایک فاتح ہی نہ تھا، بلکہ توحید اور آخرت کا قائل تھا، عدل وانصاف اور فیاضی کے اُصولوں پر عامل تھا، اور تم لوگوں کی طرح کم ظرف نہ تھا، کہ ذرا سی سرداری ملی اور سمجھ بیٹھے کہ ہم چُومن دیگرے نیست۔

۷۳ – یعنی قیامت کے روز۔ ذوالقرنین نے جو اشارہ قیامت کے وعدۂ برحق کی طرف کیا تھا، اسی کی مناسبت سے یہ فقرے اُس کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

۷۴ – یہ پوری سورت کا خاتمۂ کلام ہے اس لیے اس کی مناسبت ذوالقرنین کے قصّے میں نہیں بلکہ سورت کے مجموعی مضمون میں تلاش کرنی چاہیے۔ سورت کا مجموعی مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور دُنیا پرستی چھوڑ کر آخرت پر یقین لانے کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر قوم کے بڑے بڑے سردار اپنی دولت اور شوکت وحشمت کے زَعم میں نہ صرف آپؐ کی اس دعوت کو ردّ کر رہے تھے، بلکہ اُن چند راستی پسند انسانوں کو بھی، جنھوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی، ظلم وستم اور تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس پر وہ ساری تقریر کی گئی جو شروع سورہ سے یہاں تک چلی آرہی ہے، اور اسی تقریر کے دوران میں یکے بعد دیگرے اُن تین قصّوں کو بھی، جنھیں مخالفین نے امتحاناً دریافت کیا تھا،

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝١٠٣ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝١٠٤ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝١٠٥

اَے محمدؐ! ان سے کہو: کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دُنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجُہد راہِ راست سے بھٹکی رہی[۷۶] اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حُضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں[۷۷] گے۔

ٹھیک موقع پر نگینوں کی طرح جَڑ دیا گیا۔ اب تقریر ختم کرتے ہوئے پھر کلام کا رُخ اسی مدّعا کی طرف پھیرا جا رہا ہے جسے تقریر کے آغاز میں پیش کیا گیا تھا، اور جس پر رُکوع ۴ سے ۸ تک مسلسل گفتگو کی جا چکی ہے۔

۷۵ – یعنی کیا یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان کا خیال یہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رَوِش ان کے لیے نافع ہوگی؟

۷۶ – اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا، یہ کہ ”جن کی ساری سعی وجُہد دُنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی“۔ یعنی انھوں نے جو کچھ بھی کیا، خدا سے بے نیاز اور آخرت سے بے فکر ہو کر صرف دنیا کے لیے کیا۔ دنیوی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھا۔ دنیا کی کامیابیوں اور خوش حالیوں ہی کو اپنا مقصود بنایا۔ خدا کی ہستی کے اگر قائل ہوئے بھی تو اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ اس کی رضا کیا ہے اور ہمیں کبھی اس کے حضور جا کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ اپنے آپ کو محض ایک خود مختار وغیر ذمہ دار حیوانِ عاقل سمجھتے رہے، جس کے لیے دُنیا کی اس چراگاہ سے تمتّع کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔

۷۷ – یعنی اس طرح کے لوگوں نے دنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے کیے ہوں، بہر حال وہ دُنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اپنے قصر اور محلات، اپنی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں، اپنے کارخانے اور معمل، اپنی سڑکیں اور ریلیں، اپنی ایجادیں اور صنعتیں، اپنے علوم وفنون اور اپنی آرٹ گیلریاں، اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے ہیں، ان میں سے تو کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے، کہ خدا کی میزان میں اس کو رکھ سکیں۔ وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے، وہ صرف مقاصدِ عمل اور نتائجِ عمل ہیں۔ اب اگر کسی کے سارے مقاصد دُنیا تک محدود تھے، اور نتائج بھی اس کو دُنیا ہی میں مطلوب تھے، اور دُنیا میں وہ اپنے نتائجِ عمل دیکھ بھی چکا ہے، تو اس کا سب کیا کرایا دنیائے فانی کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔ آخرت میں جو کچھ پیش کر کے وہ کوئی وزن پا سکتا ہے، وہ تو لازماً کوئی ایسا ہی کارنامہ ہونا چاہیے جو اس نے خدا کی رضا کے لیے کیا ہو، اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے کیا ہو، اور اُن نتائج کو مقصود بنا کر کیا ہو جو آخرت میں نکلنے والے ہیں۔ ایسا کوئی کارنامہ اگر اس کے حساب میں نہیں ہے تو وہ ساری دوڑ دھوپ بلاشبہ اَکارت گئی جو اس نے دنیا میں کی تھی۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع

ان کی جزا جہنّم ہے اُس کفر کے بدلے جو انھوں نے کیا اور اُس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، ان کی میزبانی کے لیے فردوس[۷۸] کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اُس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو اُن کا جی نہ چاہے[۷۹] گا۔

اَے محمدؐ! کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں[۸۰] لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے۔

اَے محمدؐ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا اُمیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔ ع

۷۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۰۔

۷۹ – یعنی اُس حالت سے بہتر اور کوئی حالت ہوگی ہی نہیں کہ جنت کی زندگی کو اس سے بدل لینے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی خواہش پیدا ہو۔

۸۰ – ''باتوں'' سے مراد اس کے کام اور کمالات اور عجائبِ قدرت وحکمت ہیں۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۸۔

# تفہیم القرآن

## مریم

(۱۹)

# مریم

**نام** اس سورت کا نام آیت وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں حضرت مریمؑ کا ذکر آیا ہے۔

**زمانۂ نُزُول** اس کا زمانۂ نزول ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا ہے۔ معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین اسلام جب نَجاشی کے دربار میں بلائے گئے تھے، اس وقت حضرت جعفرؓ نے یہی سورت بھرے دربار میں تلاوت کی تھی۔

**تاریخی پَس منظر** جس دَور میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس کے حالات کی طرف ہم کسی حد تک سورۂ کہف کے دیباچے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن وہ مختصر اشارہ اِس سورہ کو اور اس دَور کی دوسری سورتوں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے ہم ذرا اُس وقت کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

قریش کے سردار جب تضحیک، اِستہزا، اِطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریکِ اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے، تو انھوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور مَعاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے قبیلے کے نومسلموں کو تنگ پکڑا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دے کر، حتّٰی کہ سخت جسمانی اذیتیں دے دے کر انھیں اسلام چھوڑنے پر مجبُور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خُصوصیّت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور مَوالی، جو قریش والوں کے تحت زیردست کی حیثیت سے رہتے تھے، بُری طرح پِیسے گئے۔ مثلاً بلالؓ، عامرؓ بن فُہَیرہ، اُمِ عُبَیسؓ، زِنّیرہؓ، عَمّارؓ بن یاسرؓ اور ان کے والدین وغیرہم۔ ان لوگوں کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکے کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دُھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے، ان سے کام لیا جاتا اور اُجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت خَبّابؓ بن اَرَتؓ کی یہ رِوایت موجود ہے کہ:

”میں مکے میں لوہار کا کام کرتا تھا، مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اُجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اُجرت نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔“

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے، ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوششیں کی جاتیں، اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے، ان کو ہر طریقے سے ذلیل ورُسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خَبّابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سایے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپؐ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟" یہ سن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپؐ نے فرمایا: "تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے، اُن پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھِسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صَنعا سے حَضرَموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔" (بخاری)

یہ حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الٰی ارض الحبشة فان بھا ملکًا لا یُظلَم عندہ احد وھی ارض صدق حتی یجعل اللّٰہ لکم فرجًا مما انتم فیه۔ "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمھاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔"

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مَردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حَبَش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی، یہاں تک کہ ۸۳ مرد، ۱۱ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے، اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اِس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کُہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سَلَمہ بن ہِشَام، اس کے چچازاد بھائی ہِشَام بن ابی حُذَیفہ اور عَیّاش بن ابی ربیعہ اور اس کی چچازاد بہن حضرت اُمِّ سَلَمہ، ابوسفیان کی بیٹی اُمِّ حبیبہ، عُتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے سگے بھائی ابوحُذَیفَہ، سُہَیل بن عَمرو کی بیٹی سَہلہ، اور اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اسی لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعے سے متأثّر نہ ہُوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخرِ کار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعے سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰؓ بنت حَثْمَہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی، اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمرؓ آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے: ''عبداللہ کی ماں! جا رہی ہو؟'' میں نے کہا: ''ہاں، خدا کی قسم! تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا۔ خدا کی زمین کُھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔'' یہ سن کر عمرؓ کے چہرے پر رِقّت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے، اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ ''خدا تمھارے ساتھ ہو۔''

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عَمْرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نَجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ نے (جو خود مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہرِ سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انھوں نے نجاشی کے اَعیانِ سلطنت میں خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ ''ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں، اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انھوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔'' ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ ''ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے، ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔'' مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ ''اس طرح تو میں انھیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے، ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انھیں بُلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔'' چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے، ہم تو

وہی بے کم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ ''یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دُنیا کے دوسرے اَدیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمھارا نیا دین ہے کیا؟'' اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی، جس میں پہلے عربِ جاہلیّت کی دینی، اَخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپؐ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ ''ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمھارے نبی پر اُترا ہے۔'' حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصّہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا، یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ ''یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، خدا کی قسم! میں تمھیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔''

دوسرے روز عَمْرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ ''ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عَمْرو کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسولؐ نے سکھائی۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عَمْرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تأمّل کہا کہ هو عبدُاللّٰه ورسوله وروحُهٗ وكلمتهٗ القاها الٰى مريَمَ العذراء البتول ''وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کَلِمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا۔'' نجاشی نے سن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا: ''خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔'' اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں رشوت نہیں لیتا، اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

**موضوع اور مضمون** اس تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اس سورہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اوّلین بات نمایاں ہو کر ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے

اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرّہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زادِراہ کے طور پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی، تاکہ عیسائیوں کے ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

پہلے دو رُکوعوں میں حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا قصّہ سنانے کے بعد پھر تیسرے رکوع میں حالاتِ زمانہ کی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا قصّہ سنایا گیا ہے، کیونکہ ایسے ہی حالات میں وہ بھی اپنے باپ اور خاندان اور اہلِ ملک کے ظلم سے تنگ آ کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے ایک طرف کفارِ مکّہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان ابراہیمؑ کی پوزیشن میں ہیں، اور تم لوگ اُن ظالموں کی پوزیشن میں ہو جنھوں نے تمھارے باپ اور پیشوا ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن سے نکل کر تباہ نہ ہوئے بلکہ اور زیادہ سر بلند ہو گئے، ایسا ہی انجام نیک تمھارا انتظار کر رہا ہے۔

اس کے بعد چوتھے رُکوع میں دوسرے انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، مگر انبیاؑ کے گزر جانے کے بعد ان کی اُمّتیں بگڑتی رہی ہیں، اور آج مختلف اُمتوں میں جو گمراہیاں پائی جا رہی ہیں، یہ اسی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔

آخری دو رُکوعوں میں کفارِ مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مُژدہ سنایا گیا ہے کہ دُشمنانِ حق کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبُوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

---

آیاتہا ۹۸ سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿٣﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٤﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ

ک، ہ، ی، ع، ص۔ ذکر[1] ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریّاؑ[2] پر کی تھی، جب کہ اُس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔

اُس نے عرض کیا: ”اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھُل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی

۱ – تقابُل کے لیے سورۂ آلِ عمران، رکوع ۴ پیشِ نظر رہے جس میں یہ قصّہ دوسرے الفاظ میں بیان ہو چکا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد ۱، ص ۲۴۶-۲۵۰)

۲ – یہ حضرت زکریّاؑ جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، حضرت ہارونؑ کے خاندان سے تھے۔ ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے نظامِ کہانت (priesthood) کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا، اور تیرھواں قبیلہ (یعنی لاوِی بن یعقوبؑ کا گھرانا) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی اصل وہ خاندان جو ”مَقدِس میں خداوند کے آگے بخور جلانے کی خدمت“ اور ”پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام“ کرتا تھا، حضرت ہارونؑ کا خاندان تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوِی مَقدِس کے اندر نہیں جاسکتے تھے، بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے، سَبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے، اور مَقدِس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مَقدِس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھی خاندانوں میں سے ایک اَبِیّاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریّاؑ تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مَقدِس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتابِ تواریخ

مِنۡ وَّرَآءِیۡ وَکَانَتِ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا فَہَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیۡ وَیَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ ٭ۖ وَاجۡعَلۡہُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾ یٰزَکَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِۣ اسۡمُہٗ یَحۡیٰی ۙ لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِیًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا وَّقَدۡ بَلَغۡتُ مِنَ الۡکِبَرِ عِتِیًّا ﴿۸﴾ قَالَ کَذٰلِکَ ۚ قَالَ رَبُّکَ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ وَّقَدۡ خَلَقۡتُکَ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ تَکُ شَیۡئًا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَۃً ؕ

بُرائیوں کا خوف ہے[۳]، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی پائے[۴]، اور اے پروردگار! اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔"

(جواب دیا گیا:) "اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہوگا۔ ہم نے اِس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا[۵]۔"

عرض کیا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سُوکھ چکا ہوں؟"

جواب ملا: "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا[۶]۔"

زکریاؑ نے کہا: "پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔"

---

اوّل، باب ۲۳ و ۲۴)

۳- مطلب یہ ہے کہ اَبیّاہ کے خاندان میں میرے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دینی اور اَخلاقی حیثیت سے اس منصب کا اہل ہو جسے مَیں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آگے جو نسل اُٹھتی نظر آ رہی ہے، اس کے لچھن بگڑے ہوئے ہیں۔

۴- یعنی مجھے صرف اپنی ذات ہی کا وارث مطلوب نہیں ہے بلکہ خانوادۂ یعقوبؑ کی بھلائیوں کا وارث مطلوب ہے۔

۵- لُوقا کی انجیل میں الفاظ یہ ہیں: "تیرے کُنبے میں کسی کا یہ نام نہیں۔" (۱:۶۱)

قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ۝۱۱

فرمایا: ”تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تُو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔“

چنانچہ وہ محراب[7] سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔[8]

۶ – حضرت زکریاؑ کے اس سوال اور فرشتے کے جواب کو نگاہ میں رکھیے، کیونکہ آگے چل کر حضرت مریمؑ کے قصّے میں پھر یہی مضمون آ رہا ہے، اور اس کا جو مفہُوم یہاں ہے وہی وہاں بھی ہونا چاہیے۔ حضرت زکریاؑ نے کہا کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ ”ایسا ہی ہوگا“، یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود تیرے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حوالہ دیا کہ جس خدا نے تجھے نیست سے ہست کیا، اُس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تجھ جیسے شیخِ فانی سے ایک ایسی عورت کے ہاں اولاد پیدا کر دے جو عمر بھر بانجھ رہی ہے۔

۷ – محراب کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۳۶۔

۸ – اس واقعے کی جو تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کے سامنے قرآن کی رِوایَت کے ساتھ مسیحی روایت بھی رہے۔ درمیان میں قوسین کی عبارتیں ہماری اپنی ہیں:

”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹) اَبِیّاہ کے فریق میں سے زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارونؑ کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام اَلِیشِبَع (Elizabeth) تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کے اولاد نہ تھی، کیونکہ اَلِیشِبَع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے مُوافق اس کے نام کا قرعہ نکلا، کہ خداوند کے مَقدِس میں جا کر خوشبو جلائے۔ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی، کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مَذبَح کی داہنی طرف کھڑا ہوا اُس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی۔ مگر فرشتے نے اس سے کہا: اے زکریاہ! خوف نہ کر، کیونکہ تیری دُعا سن لی گئی (حضرت زکریاؑ کی دعا کا ذکر بائبل میں کہیں نہیں ہے) اور تیرے لیے تیری بیوی اَلِیشِبَع کے بیٹا ہوگا۔ تُو اس کا نام یُوحنّا (یعنی یحییٰ) رکھنا، اور تجھے خوشی و خُرّمی ہوگی، اور بہت سے لوگ اس کی پیدایش کے سبب سے خوش ہوں گے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝۱۲ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا

"اے یحییٰؑ! کتابِ الٰہی کو مضبوط تھام[9] لے۔"

ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم"[10] سے نوازا، اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی[11]

ہوگا (سورۂ آلِ عمران میں اس کے لیے لفظ سَیِّدًا استعمال ہوا ہے)، ہرگز نہ مَے نہ کوئی اور شراب پیے گا (تَقِیًّا)، اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القُدس سے بھر جائے گا (وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا)، اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف، جواُن کا خدا ہے، پھیرے گا۔ اور وہ ایلیّاہ (الیاس علیہ السلام) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔"

"زکریاہ نے فرشتے سے کہا: "میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔" فرشتے نے جواب میں اس سے کہا: "میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں، اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے اِن باتوں کی خوش خبری دوں۔ اور دیکھ، جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں، تو چُپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا، اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا، جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی، یقین نہ کیا۔ (یہ بیان قرآن سے مختلف ہے۔ قرآن اسے نشانی قرار دیتا ہے، اور لُوقا کی روایت اسے سزا کہتی ہے۔ نیز قرآن صرف تین دن کی خاموشی کا ذکر کرتا ہے، اور لوقا کہتا ہے کہ اس وقت سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش تک حضرت زکریاؑ گونگے رہے۔) اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مَقدِس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مَقدِس میں رُؤیا دیکھی ہے، اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔" (لُوقا، باب ۱، آیت ۵ تا ۲۲)

۹ - بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ اس فرمانِ الٰہی کے مطابق حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے اور جوانی کی عمر کو پہنچے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ سِنِّ رُشد کو پہنچے تو کیا کام اُن سے لیا گیا۔ یہاں صرف ایک فقرے میں اس مشن کو بیان کر دیا گیا ہے جو منصبِ نبوت پر مامور کرتے وقت ان کے سُپرد کیا گیا تھا۔ یعنی وہ تورات پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور بنی اسرائیل کو اس پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔

۱۰ - "حکم"، یعنی قوتِ فیصلہ، قوتِ اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت، اور اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار۔

۱۱ - اصل میں لفظ حَنَان استعمال ہوا ہے جو قریب قریب مامتا کا ہم معنیٰ ہے۔ یعنی ایک ماں کو جو غایت درجے

وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾
وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع

وقف لازم

اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبّار نہ تھا اور نہ نافرمان۔
سلام اُس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے، اور جس روز وہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے[12] ع

کی شفقت اپنی اولاد پر ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہے، وہ شفقت حضرت یحییٰؑ کے دل میں بندگانِ خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

**۱۲ –** حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں، جس سے سورۂ آلِ عمران اور اس سورہ کے مختصر اشارات کی توضیح ہو گی۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے، اور یُوحنّا کی روایت کے مطابق انھوں نے شرق اُردُن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

''میں، جیسا یَسعِیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔'' (یُوحنّا ۱: ۲۳)

مَرقُس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے، یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے، تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ اُن کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے۔ (مَرقُس ۱: ۴ – ۵) اسی بنا پر ان کا نام یُوحنّا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔ (متّی ۲۱: ۲۶) مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ ''جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں یُوحنّا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔'' (متّی ۱۱: ۱۱)

وہ اُونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے، اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متّی ۳: ۴) اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ مُنادی کرتے پھرتے تھے کہ ''توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔'' (متّی ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عُموماً حضرت مسیحؑ کا ''ارہاص'' کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ (آلِ عمران: ۳۹)

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے۔ (متّی ۹: ۱۴۔ لُوقا ۵: ۳۳۔ لُوقا ۱۱: ۱) وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ''جس کے پاس دو کُرتے ہوں وہ اُس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے، اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔'' محصول لینے والوں نے پوچھا کہ اُستاد! ہم کیا کریں؟ تو انھوں نے فرمایا: ''جو تمھارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔'' سپاہیوں نے پوچھا: ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا: ''نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔'' (لوقا ۳: ۱۰ – ۱۴)

وقف لازم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

اور اے محمدؐ! اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو،[۱۳] جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہوگئی تھی اور پردہ ڈال کر اُن سے چُھپ بیٹھی تھی۔[۱۴] اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی

بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علما، فریسی اور صَدُوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا: ''اے سانپ کے بچّو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟...... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے......اب درختوں کی جڑوں پر کلھاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا، وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔'' (مَتّی ۳: ۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فِسق و فُجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فِلِپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس جُرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راست باز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰؑ جو اَخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں، وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہوگئی۔ آخرِکار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پالیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا، جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا: مانگ، کیا مانگتی ہے؟ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا: کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: مجھے یُوحنّا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہُوا، مگر محبُوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے ردّ کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰؑ کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (مَتّی ۱۴: ۳-۱۱۔ مَرقُس ۶: ۱۷-۲۸۔ لُوقا ۳: ۱۹-۲۰)

۱۳ – تقابُل کے لیے تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۴۲، ۵۵، النساء، حاشیہ ۱۹۰-۱۹۱۔

۱۴ – سورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المَقدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریّاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمّے لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہوگئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب، جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں بیت المَقدِس کے شرقی حصّے میں واقع تھی اور انھوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے

بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُونُ لِى غُلٰمٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِى بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

---

شکل میں نمودار ہو گیا۔

مریمؑ یکایک بول اُٹھی کہ ”اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔“

اُس نے کہا: ”میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔“

مریمؑ نے کہا: ”میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا؟ جب کہ مجھے کسی بَشَر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔“

فرشتے نے کہا: ”ایسا ہی ہو گا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں[15] اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔

---

والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی مُوافقت کی خاطر مَكَانًا شَرْقِيًّا سے مُراد ناصرہ لیا ہے، انھوں نے غَلَطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

**۱۵** - جیسا کہ ہم حاشیہ ٦ میں اشارہ کر آئے ہیں، حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ ”ایسا ہی ہوگا“، ہرگز اس معنیٰ میں نہیں ہوسکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا، باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اُوپر انھی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے، اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہؑ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا، تو فرشتہ اُن کو جواب دیتا ہے کہ كَذٰلِكِ ”ایسا ہی ہوگا“۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر كَذٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہُوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا

وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ۝٢١ فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝٢٢ فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ۝٢٣ فَنَادٰٮهَا مِنۡ تَحۡتِهَاۤ اَلَّا تَحۡزَنِىۡ قَدۡ جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِيًّا ۝٢٤ وَهُزِّىۡۤ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ

اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔"

مریمؑ کو اس بچّے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مَقام پر چلی گئی[16]۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی: "کاش! میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا[17]۔" فرشتے نے پائینتی سے اس کو پکار کر کہا: "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اِس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اُوپر تر و تازہ

---

کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، اور اسی معنٰی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔

۱۶ - دُور کے مقام سے مراد بیتِ لَحم ہے۔ حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المَقدِس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں، تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دُور دراز مَقام پر چلی جاتیں۔

۱۷ - ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت

رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ ۚ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ ۚ

کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی[۱۸]۔"

پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے: "اے مریمؑ! یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارونؑ کی بہن[۱۹]! نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی[۱۹الف]۔"

ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر اُن کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انھیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپالیا، اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے اُن سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اُسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہُوا کرتا۔

۱۸- مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدایش پر جو کوئی بھی معترض ہو، اُس کا جواب اب ہمارے ذمّے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلونٹی کا بچہ اگر دُنیا کے معروف طریقے پر پیدا ہو تو آخر اُسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

۱۹- ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ انھیں ظاہری معنیٰ میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے، یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُخْتَ ھٰرُوْنَ کے معنیٰ "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے، مثلاً قبیلۂ مُضَر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مُضَر کے بھائی!) اور قبیلۂ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی!) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض رِوایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنیٰ منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنیٰ کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اِس معنیٰ کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعے سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا، اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن

فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ‌ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُـكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰٮنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ‏ ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِىۡ مُبٰرَكًا

مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔
لوگوں نے کہا: ''ہم اِس سے کیا بات کریں جو گھوارے میں پڑا ہوا ایک بچّہ ہے؟''[20]
بچہ بول اُٹھا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا

گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا، وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اُصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نَسائی اور ترمِذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے، اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنٰی لازماً ''ہارون کی بہن'' ہی ہیں۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے، کہ نَجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہؓ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ''تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیا اور صلحا کے نام پر رکھتے تھے؟'' حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

**۱۹، الف** — جو لوگ حضرت عیسٰیؑ کی معجزانہ پیدایش کے منکر ہیں، وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور اُن پر یہ طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟

**۲۰** — قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ''ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔'' یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسٰیؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی، اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گھوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع محل اور سِیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا، وہ محسوس کر لے گا کہ یہ محض ایک مُہمَل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے، وہ تو بچے کی پیدایش کے وقت پیش آئی تھی، نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰، دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گھوارے میں ایک نوزائیدہ بچّے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گھوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود

اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَّبَرًّا ۢبِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ ۭ

جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا[۲۰الف]، اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا، اور جب کہ میں مروں، اور جب کہ زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں[۲۱]۔"

یہ ہے عیسیٰؑ ابنِ مریم، اور یہ ہے اُس کے بارے میں وہ سچّی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے[۲۲]۔

حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔

**۲۰، الف**— یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ اُن کو عیسیٰؑ ابنِ مریم کہا گیا ہے۔

**۲۱** — یہ ہے وہ ''نشانی'' جو حضرت عیسیٰؑ کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو، جو بیت المَقدِس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا، تا کہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجُّہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا، تا کہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۟ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۟ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۟ وَ اَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۟ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ

وقف لازم

(اور عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ) ''اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔[23]'' مگر پھر مختلف گروہ[24] باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے وہ وقت بڑی تباہی کا ہوگا جب کہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے، اُس روز تو اُن کے کان بھی خوب سُن رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی، مگر آج یہ ظالم کُھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے محمدؐ! اِس حالت میں، جب کہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں، اِنھیں اس دن سے ڈرا دو جب کہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ آخر کار ہم ہی زمین

اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جو دُنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۴۴، ۵۳۔ النساء، حاشیہ ۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۸-۸۹-۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳)

۲۲- یہاں تک جو بات عیسائیوں کے سامنے واضح کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش نے اُن کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا، اُسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انھیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، دونوں ایک ایک طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن ہی کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کا غُلُو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں، اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔

ع ۲ ۲۵ ۵

وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ

اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری طرف ہی پلٹائے جائیں گے۔[۲۵]ع

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصّہ بیان کرو،[۲۶] بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ (انھیں ذرا اُس موقع کی یاد دلاؤ) جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابّا جان! آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابّا جان! میرے

۲۳ – یہاں عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام انبیا علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور اُنھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمھاری اپنی ایجاد ہے۔ تمھارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۶۸۔ مائدہ، حاشیہ ۱۰۰-۱۰۱، ۱۳۰۔ جلد چہارم۔ الزُّخرُف، حواشی ۵۷-۵۸)

۲۴ – یعنی عیسائیوں کے گروہ۔

۲۵ – یہاں وہ تقریر ختم ہوتی ہے جو عیسائیوں کو سنانے کے لیے نازل فرمائی گئی تھی۔ اِس تقریر کی عظمت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی اس کو پڑھتے وقت وہ تاریخی پَس منظر نگاہ میں رکھے جو ہم نے اِس سورہ کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ یہ تقریر اُس موقع پر نازل ہوئی تھی جب کہ مکے کے مظلوم مسلمان ایک عیسائی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے جا رہے تھے، اور اس غرض کے لیے نازل کی گئی تھی کہ جب وہاں مسیحؑ کے متعلق اسلامی عقائد کا سوال چھڑے تو یہ "سرکاری بیان" عیسائیوں کو سنا دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کسی حال میں بھی حق و صداقت کے معاملے میں مداہنت برتنا نہیں سکھایا ہے۔ پھر وہ سچّے مسلمان جو حبش کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، اُن کی قوتِ ایمانی بھی حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے عین دربارِ شاہی میں ایسے نازک موقع پر اُٹھ کر یہ تقریر سنا دی جب کہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر اُنھیں ان کے دشمنوں کے سُپرد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اُس وقت اس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا یہ بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جائے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قسائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرّہ برابر تأمّل نہ کیا۔

قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾ یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ

پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابّا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں[۲۷]، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابّا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"

باپ نے کہا: "ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبُودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دُوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔"

ابراہیمؑ نے کہا: "سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے[۲۷الف] دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے،

۲۶ — یہاں سے خطاب کا رُخ اہلِ مکّہ کی طرف پھر رہا ہے جنھوں نے اپنے نوجوان بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو اُسی طرح خدا پرستی کے جرم میں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ اور بھائی بندوں نے دیس نکالا دیا تھا۔ اس غرض کے لیے دوسرے انبیاؑ کو چھوڑ کر خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ قریش کے لوگ ان کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور انھی کی اولاد ہونے پر عرب میں اپنا فخر جتایا کرتے تھے۔

۲۷ — اصل الفاظ ہیں: لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ، یعنی "شیطان کی عبادت نہ کریں۔" اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے والد اور قوم کے دوسرے لوگ عبادت بتوں کی کرتے تھے، لیکن چونکہ اطاعت وہ شیطان کی کر رہے تھے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی اِس اطاعتِ شیطان کو بھی عبادتِ شیطان قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت محض پوجا اور پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتے ہوئے بھی اس کی بندگی بجا لائے تو وہ اُس کی عبادت کا مجرم ہے، کیونکہ شیطان بہرحال کسی زمانے میں بھی لوگوں کا "معبُود" (بمعنٰی معروف) نہیں رہا ہے، بلکہ اس کے نام پر ہر زمانے میں لوگ لعنت ہی بھیجتے رہے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم،

إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ ۚ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ﴿٥١﴾

میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔“

پس جب وہ اُن لوگوں سے اور اُن کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اُس کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچّی ناموری عطا کی۔[28] ع

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا۔ وہ ایک چیدہ[29] شخص تھا اور رسول نبی[30] تھا۔

الکہف، حاشیہ ۴۹-۵۰)

۲۷، الف- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۱۲۔

۲۸- یہ حرفِ تسلّی ہے اُن مہاجرین کے لیے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اُلٹے سربلند و سرفراز ہو کر رہے، اُسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے، بلکہ وہ عزت پاؤ گے جس کا تصور بھی جاہلیت میں پڑے ہوئے کفارِ قریش نہیں کر سکتے۔

۲۹- اصل میں لفظ مُخْلَص استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ”خالص کیا ہوا“۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے شخص تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا کر لیا تھا۔

۳۰- ”رسول“ کے معنیٰ ہیں ”فرستادہ“، ”بھیجا ہوا“۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ یا تو ان ملائکہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کارِ خاص پر بھیجے جاتے ہیں، یا پھر اُن انسانوں کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے خلق کی طرف اپنا پیغام

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ

ہم نے اُس کو طُور کے داہنی جانب سے پکارا[31] اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا[32]، اور اپنی مہربانی سے

پہنچانے کے لیے مامور فرمایا۔

''نبی'' کے معنٰی میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نَبَا سے مُشتق قرار دیتے ہیں، جس کے معنٰی ''خبر'' کے ہیں، اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنٰی ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادّہ نبو ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔ اور اس معنٰی کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے: ''بلند مرتبہ'' اور ''عالی مقام''۔ ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبئ ہے، جس کے معنٰی طریق اور راستے کے ہیں، اور انبیاؑ کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

پس کسی شخص کو ''رسول نبی'' کہنے کا مطلب یا تو ''عالی مَقام پیغمبر'' ہے، یا ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر''، یا پھر ''وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے''۔

قرآنِ مجید میں یہ دونوں الفاظ بالعُموم ہم معنٰی استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخصیت کو کہیں صرف رسول کہا گیا ہے، اور کہیں صرف نبی، اور کہیں رسول اور نبی ایک ساتھ۔ لیکن بعض مَقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اصطلاحی فرق ہے۔ مثلاً سورۂ حج، رُکوع ۷ میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ...... ''ہم نے تم سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ نبی مگر......'' یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول اور نبی دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں، جن کے درمیان کوئی معنوی فرق ضرور ہے۔ اسی بنا پر اہلِ تفسیر میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ اس فرق کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطعی دلائل کے ساتھ کوئی بھی رسول اور نبی کی الگ الگ حیثیتوں کا تعیُّن نہیں کر سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے، یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا بالفاظِ دیگر، انبیاؑ میں سے رسول کا لفظ اُن جلیل القدر ہستیوں کے لیے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاؑ کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سُپرد کیا گیا تھا۔ اِسی کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت ابو اُمامہؓ سے اور حاکم نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی، اور انبیاؑ کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا اس کے ضعف کو بڑی حد تک دُور کر دیتا ہے۔

**۳۱** — کوہِ طور کے داہنی جانب سے مراد اس کا مشرقی دامن ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ مَدیَن سے مصر جاتے ہوئے اُس راستے سے گزر رہے تھے جو کوہِ طُور کے جنوب سے جاتا ہے، اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو ''داہنی جانب''

مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

---

اس کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنا کر اُسے (مددگار کے طور پر) دیا۔

اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچّا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔[۳۳]

اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اُسے ہم نے بلند مقام پر اُٹھایا تھا۔[۳۴]

---

فرمایا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بجائے خود پہاڑ کا کوئی دایاں یا بایاں رُخ نہیں ہوتا۔

**۳۲** – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۲۰۶۔

**۳۳** – حضرت ادریسؑ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی تھے۔ مگر اکثریت اس طرف گئی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ہم کو ایسی نہیں ملی جس سے ان کی شخصیت کے تعیُّن میں کوئی مدد ملتی ہو۔ البتہ قرآن کا ایک اشارہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے متقدم ہیں۔ کیونکہ بعد والی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ انبیا جن کا ذکر اُوپر گزرا ہے، آدمؑ کی اولاد، نوحؑ کی اولاد، ابراہیمؑ کی اولاد اور اسرائیلؑ کی اولاد سے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ، عیسیٰ اور موسیٰ علیہم السلام تو بنی اسرائیل میں سے ہیں، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اولادِ ابراہیمؑ سے ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اولادِ نوحؑ سے، اس کے بعد صرف حضرت ادریسؑ ہی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اولادِ آدمؑ سے ہیں۔

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حَنُوک (Enoch) بتایا گیا ہے، وہی حضرت ادریسؑ ہیں۔ ان کے متعلق بائبل کا بیان یہ ہے:

”اور حَنُوک پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا، اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حَنُوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا............ اور وہ غائب ہوگیا، کیونکہ خدا نے اسے اُٹھا لیا۔“

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوحٖ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَٱجۡتَبَيۡنَآۚ إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْۤ سُجَّدٗاۤ وَبُكِيّٗا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِ

السجدۃ ۵

یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور اسرائیلؑ کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سُنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ سجدہ
پھر ان کے بعد وہ ناخَلَف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا[۳۵] اور خواہشاتِ نفس

(پیدائش، باب ۵، آیت ۲۱-۲۴)

تَلۡمُود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو خدا کے فرشتے نے حَنُوک کو، جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پکارا کہ "اے حَنُوک! اُٹھو، گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر ان کو وہ راستہ بتاؤ جس پر ان کو چلنا چاہیے، اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انھیں عمل کرنا چاہیے۔" یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انھوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسلِ انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ حَنُوک ۳۵۳ برس تک نسلِ انسانی پر حکمراں رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر خدا کی رحمتیں برستی رہیں۔ (The Talmud Selections, pp 18-21)

۳۴- اس کا سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا، لیکن اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر یہ بات ہمارے ہاں بھی مشہور ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ بائبل میں تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہو گئے، کیونکہ "خدا نے ان کو اُٹھا لیا"، مگر تَلۡمُود میں اس کا ایک طویل قصّہ بیان ہوا ہے، جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ "حَنُوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے۔"

۳۵- یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پروائی برتنے لگے۔ یہ ہر اُمّت کے زوال و انحطاط کا پہلا

فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ إِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدۡنِ ِالَّتِيۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ إِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَأۡتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا إِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِيۡ نُوۡرِثُ

کی پیروی کی[۳۶]، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کرلیں، وہ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں، جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے درپردہ وعدہ کر رکھا ہے[۳۷]۔ اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سُنیں گے، جو کچھ بھی سُنیں گے ٹھیک ہی سُنیں گے[۳۸]۔ اور ان کا رزق انھیں پیہم صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنّت جس کا وارث

قدم ہے۔ نماز وہ اوّلین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شب و روز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محوَر سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندھن ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دُور اور دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے، حتّٰی کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلّق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدۂ کُلیّہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا ہے۔

۳۶ – یہ تعلق باللہ کی کمی اور اس کے فُقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ نماز کی اضاعت سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی، خواہشاتِ نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کے اَخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکامِ الٰہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہو کر رہا۔

۳۷ – یعنی جس کا وعدہ رحمٰن نے اس حالت میں کیا ہے کہ وہ جنتیں ان کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔

۳۸ – اصل میں لفظ ’’سلام‘‘ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: عیب اور نَقص سے محفوظ۔ جنت میں جو نعمتیں انسان کو میسّر ہوں گی، ان میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں کوئی بیہودہ اور فضول اور گندی بات سننے میں نہ آئے گی۔ وہاں کا پورا معاشرہ ایک ستھرا اور سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ ہوگا، جس کا ہر فرد سلیم الطبع ہوگا۔ وہاں کے رہنے والوں کو غیبتوں اور گالیوں اور فحش گانوں اور دوسری بُری آوازوں کی سماعت سے پوری نجات مل جائے گی۔ وہاں آدمی جو کچھ بھی سنے گا، بھلی اور معقول اور بجا باتیں ہی سُنے گا۔ اِس نعمت کی قدر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دُنیا میں فی الواقع ایک پاکیزہ اور ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ کیونکہ وہی یہ محسوس

مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾

ع ١٥

---

ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو بنائیں گے جو پرہیز گار رہا ہے۔

[٣٩] اے محمدؐ! ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمھارا رب بُھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ پس تم اُس کی بندگی کرو اور اُسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو[٤٠]۔ کیا ہے کوئی ہستی تمھارے علم میں اس کی ہم پایہ؟[٤١] ع

انسان کہتا ہے: کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟

---

کر سکتا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسی گندی سوسائٹی میں رہنا کتنی بڑی مصیبت ہے جہاں کسی وقت بھی اس کے کان جھوٹ، غیبت، فتنہ و فساد، شرارت، گندگی اور شہوانیت کی باتوں سے محفوظ نہ ہوں۔

**٣٩** – یہ پورا پیراگراف ایک جملۂ معترضہ ہے جو ایک سلسلۂ کلام کو ختم کر کے دوسرا سلسلۂ کلام شروع کرنے سے پہلے ارشاد ہُوا ہے۔ اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ سورت بڑی دیر کے بعد ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہے جب کہ نبیؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بڑے اضطراب انگیز حالات سے گزر رہے ہیں۔ حضورؐ کو اور آپؐ کے صحابیوں کو ہر وقت وحی کا انتظار ہے، تاکہ اس سے رہنمائی بھی ملے اور تسلّی بھی حاصل ہو۔ جوں جوں وحی آنے میں دیر ہو رہی ہے، اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ اس حالت میں جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے وہ فرمان سناتے ہیں جو موقع کی ضرورت کے لحاظ سے فوراً درکار تھا۔ پھر آگے بڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اشارے سے یہ چند کلمات اپنی طرف سے کہتے ہیں، جن میں اتنی دیر تک اپنے حاضر نہ ہونے کی معذرت بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرفِ تسلی بھی، اور ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی تلقین بھی۔

یہ صرف کلام کی اندرونی شہادت ہی نہیں ہے بلکہ متعدّد روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں جنھیں ابنِ جَریر، ابنِ کثیر اور صاحبِ رُوح المعانی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

**٤٠** – یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں، ان کا

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

---

کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم! ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی[۴۲] گھیر لائیں گے، پھر جہنّم کے گرد لا کر انھیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔ پھر ہر گروہ میں سے ہر اُس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا،[۴۳] پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنّم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنّم پر وارد نہ ہو،[۴۴] یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ پھر ہم اُن لوگوں کو بچا لیں گے جو (دُنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اُسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

---

صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیّت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمھارے سُپرد کی گئی ہے۔

۴۱ - اصل میں لفظ سَمِی استعمال ہوا ہے، جس کے لُغوی معنیٰ ’’ہم نام‘‘ کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو الٰہ ہے، کیا کوئی دُوسرا الٰہ بھی تمھارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر تمھارے لیے اس کے سوا اور راستہ ہی کون سا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے حکم کے بندے بن کر رہو۔

۴۲ - یعنی اُن شیاطین کو جن کے یہ چیلے بنے ہوئے ہیں اور جن کے سکھائے پڑھائے میں آ کر انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں جہاں ہمیں خدا کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔

۴۳ - یعنی ہر باغی گروہ کا لیڈر۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ۬ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ

اِن لوگوں کو جب ہماری کُھلی کُھلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: ''بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شان دار ہیں؟''[۴۵] حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان وشوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اِن سے کہو: جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اُسے رحمٰن ڈھیل دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے ـــــ خواہ وہ عذابِ الٰہی ہو یا قیامت کی گھڑی ـــــ تب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھّا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہِ راست اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے[۴۶]، اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے

۴۴۔ ''وارد ہونے'' کے معنیٰ بعض روایات میں ''داخل ہونے'' کے بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے کسی کی سند بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی۔ اور پھر یہ بات قرآنِ مجید اور اُن کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنینِ صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مزید برآں لغت میں بھی ورود کے معنیٰ دخول کے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر توسب کا ہوگا مگر، جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے، پرہیزگار لوگ اس سے بچا لیے جائیں گے اور ظالم اس میں جھونک دیے جائیں گے۔

۴۵۔ یعنی ان کا اِستدلال یہ تھا کہ دیکھ لو، دُنیا میں کون اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔

عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا‌ ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا لَهُمۡ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا‌ ؕ سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ وَيَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

پھر تو نے دیکھا اُس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا[47]؟ کیا اسے غیب کا پتا چل گیا ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ —— ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے، اسے ہم لکھ لیں[48] گے اور اس کے لیے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سرو سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے، وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا۔

اِن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں، تاکہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں[49]۔ کوئی پشتیبان نہ ہو گا۔ وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں[50] گے اور اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے۔ ع

کس کے گھر زیادہ شان دار ہیں؟ کس کا معیارِ زندگی زیادہ بلند ہے؟ کس کی محفلیں زیادہ ٹھاٹ سے جمتی ہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہمیں میسّر ہے اور تم اس سے محروم ہو تو خود سوچ لو کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم باطل پر ہوتے اور یوں مزے اُڑاتے، اور تم حق پر ہوتے اور اس طرح خستہ و درماندہ رہتے؟ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حواشی ۳۷-۳۸۔

۴۶ - یعنی ہر آزمایش کے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کو صحیح فیصلے کرنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشتا ہے، اُن کو بُرائیوں اور غلطیوں سے بچاتا ہے، اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے وہ برابر راہِ راست پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

۴۷ - یعنی وہ کہتا ہے کہ تم مجھے خواہ کتنا ہی گمراہ و بدکار کہتے رہو اور عذابِ الٰہی کے ڈراوے دیا کرو، میں تو آج بھی تم سے زیادہ خوش حال ہوں اور آیندہ بھی مجھ پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہے گی۔ میری دولت دیکھو، میری وجاہت اور ریاست دیکھو،

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ ؕ لَقَدْ جِئْتُمْ

وقف لازم وقف لازم

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے اِن منکرینِ حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انھیں خُوب خُوب (مُخالفتِ حق پر) اُکسا رہے ہیں؟ اچھا، تو اب اِن پر نزولِ عذاب کے لیے بے تاب نہ ہو۔ ہم اِن کے دن گِن رہے ہیں[51]۔ وہ دن آنے والا ہے جب متّقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حُضور پیش کریں گے، اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنّم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔ اُس وقت لوگ کوئی سِفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے، بجز اُس کے جس نے رحمٰن کے حُضور سے پروانہ حاصل کرلیا ہو۔[52]

وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ـــــ سخت بے ہُودہ بات ہے جو

---

میرے نامور بیٹوں کو دیکھو، میری زندگی میں آخر تمھیں کہاں یہ آثار نظر آتے ہیں کہ میں خدا کا مغضوب ہوں؟ ـــــ یہ مکے میں کسی ایک شخص کے خیالات نہ تھے بلکہ کفارِ مکہ کا ہر شیخ اور سردار اسی خبط میں مبتلا تھا۔

۴۸ — یعنی اس کے جرائم کے ریکارڈ میں اس کا یہ کلمۂ غرور بھی شامل کرلیا جائے گا اور اس کا مزا بھی اسے چکھنا پڑے گا۔

۴۹ — اصل میں لفظ عِزًّا استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ان کے لیے سببِ عزت ہوں۔ مگر عزت سے مراد عَرَبی زبان میں کسی شخص کا ایسا طاقت ور اور زبردست ہونا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے، اور ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے سببِ عزت بننا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اس کی حمایت پر ہو، جس کی وجہ سے اس کا کوئی مخالف اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

۵۰ — یعنی وہ کہیں گے کہ نہ ہم نے کبھی اِن سے کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ یہ احمق لوگ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔

۵۱ — مطلب یہ ہے کہ اِن کی زیادتیوں پر تم بے صبر نہ ہو۔ اِن کی شامت قریب آ لگی ہے۔ پیمانہ بھرا چاہتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی مہلت کے کچھ دن باقی ہیں، انھیں پورا ہو لینے دو۔

۵۲ — یعنی سِفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔

شَيْـًٔا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ

تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں، سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے اُن کو شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔

یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں محبّت پیدا کر دے گا[۵۳]۔ پس اے محمدؐ! اِس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمھاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم

آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمٰن سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور خدا سے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے، وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہوں گے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔

۵۳ – یعنی آج مکے کی گلیوں میں وہ ذلیل و رُسوا کیے جا رہے ہیں، مگر یہ حالت دیرپا نہیں ہے۔ قریب ہے وہ وقت جب کہ اپنے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے وہ محبوبِ خلائق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھنچیں گے۔ دُنیا ان کے آگے

الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع

النصف ع ۶ ۱۲ ۹

پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو، یا اُن کی بِھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟ع

پلکیں بچھائے گی۔ فِسق و فُجور، رعونت اور کِبر، جھوٹ اور ریاکاری کے بل پر جو سیادت و قیادت چلتی ہو، وہ گردنوں کو چاہے جھکا لے، دلوں کو مسخّر نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس جو لوگ صداقت، دیانت، اخلاص اور حُسنِ اَخلاق کے ساتھ راہِ راست کی طرف دعوت دیں، ان سے اوّل اوّل چاہے دُنیا کتنی ہی اُپرائے، آخرکار وہ دلوں کو موہ لیتے ہیں اور بد دیانت لوگوں کا جھوٹ زیادہ دیر تک ان کا راستہ روکے نہیں رہ سکتا۔

---

# تفہیم القرآن

## طٰہٰ

(۲۰)

# طٰہٰ

**زمانۂ نزول** اِس سورت کا زمانۂ نزول سورۂ مریم کے قریب زمانے ہی کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہجرتِ حبشہ کے زمانے میں یا اس کے بعد نازل ہوئی ہو۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے یہ نازل ہو چکی تھی۔

اُن کے قبولِ اسلام کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر روایت یہ ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تو راستے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمھاری اپنی بہن اور بہنوئی اِس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں اُن کی بہن فاطمہؓ بنتِ خَطّاب اور ان کے بہنوئی سعیدؓ بن زید بیٹھے ہوئے حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ سے ایک صحیفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی ان کی بہن نے صحیفہ فوراً چھپا لیا۔ مگر حضرت عمرؓ اس کے پڑھنے کی آواز سُن چکے تھے۔ انھوں نے پہلے کچھ پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد بہنوئی پر پل پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے بچانا چاہا تو انھیں بھی مارا، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ آخرکار بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا کہ ہاں، ہم مسلمان ہو چکے ہیں، تم سے جو کچھ ہو سکے کرلو۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کا خون بہتے دیکھ کر کچھ پشیمان سے ہوگئے اور کہنے لگے کہ اچھا، مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن نے پہلے قسم لی کہ وہ اسے پھاڑ نہ دیں گے۔ پھر کہا کہ تم جب تک غسل نہ کرلو، اس پاک صحیفے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور پھر وہ صحیفہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں یہی سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ پڑھتے پڑھتے یک لخت ان کی زبان سے نکلا: ''کیا خوب کلام ہے۔'' یہ سنتے ہی حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ، جو ان کی آہٹ پاتے ہی چھپ گئے تھے، باہر آگئے اور کہا کہ ''بخدا! مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے نبی کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا۔ کل ہی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا! ابوالحکم بن ہِشَام (ابوجہل) یا عمر بن خَطّاب، دونوں میں سے کسی کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اے عمر! اللہ کی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو۔'' اس فقرے نے رہی سہی کسر پوری کر دی، اور اسی وقت حضرت خَبّابؓ کے ساتھ جا کر حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرلیا۔ یہ ہجرتِ حبشہ سے تھوڑی مدّت بعد ہی کا قصّہ ہے۔

**موضوع و مَبحَث** سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اَے محمدؐ! یہ قرآن تم پر کچھ اس لیے نازل نہیں کیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے تم کو ایک مصیبت میں ڈال دیا جائے۔ تم سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ پتھر کی چٹانوں سے دودھ کی نہر نکالو، نہ ماننے والوں کو منوا کر چھوڑو، اور ہٹ دھرم لوگوں کے دلوں میں ایمان

پیدا کر کے دکھاؤ۔ یہ تو بس ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے، تاکہ جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور جو اس کی پکڑ سے بچنا چاہے، وہ سُن کر سیدھا ہو جائے۔ یہ مالکِ زمین و آسمان کا کلام ہے، اور خدائی اس کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

اس تمہید کے بعد یکایک حضرت موسیٰؑ کا قصّہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ محض ایک قصّے کی شکل میں بیان ہوا ہے۔ وقت کے حالات کی طرف اس میں کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ مگر جس ماحول میں یہ قصّہ سنایا گیا ہے، اس کے حالات سے مل جُل کر یہ اہلِ مکہ سے کچھ اور باتیں کرتا نظر آتا ہے، جو اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے بین السُّطور سے ادا ہو رہی ہیں۔ اُن باتوں کی تشریح سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ عرب میں کثیر التعداد یہودیوں کی موجودگی اور اہلِ عرب پر یہودیوں کے علمی و ذہنی تَفَوُّق کی وجہ سے، نیز روم اور حبش کی عیسائی سلطنتوں کے اثر سے بھی، عربوں میں بالعُموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھنے کے بعد اب دیکھیے کہ وہ باتیں کیا ہیں جو اس قصّے کے بین السطور سے اہلِ مکہ کو جتائی گئی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت اس طرح عطا نہیں کیا کرتا کہ ڈھول تاشے اور نفیریاں بجا کر ایک خلق اکٹھی کر لی جائے اور پھر باقاعدہ ایک تقریب کی صورت میں یہ اعلان کیا جائے کہ آج سے فلاں شخص کو ہم نے نبی مقرر کیا ہے۔ نبوت تو جس کو بھی دی گئی ہے، کچھ اسی طرح بصیغۂ راز دی گئی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔ اب تمھیں کیوں اس بات پر اچنبھا ہے کہ محمدؐ یکایک نبی بن کر تمھارے سامنے آ گئے اور اس کا اعلان نہ آسمان سے ہوا، نہ زمین پر فرشتوں نے چل پھر کر اس کا ڈھول پیٹا۔ ایسے اعلانات پہلے نبیوں کے تقرر پر کب ہوئے تھے کہ آج ہوتے؟

(۲) جو بات آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) ٹھیک وہی بات منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سکھائی تھی۔

(۳) پھر جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی سرو سامان اور لاؤ لشکر کے تنِ تنہا قریش کے مقابلے میں دعوتِ حق کا عَلَم بردار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی یکایک اتنے بڑے کام پر مامور کر دیے گئے تھے کہ جا کر فرعون جیسے جبّار بادشاہ کو سرکشی سے باز آنے کی تلقین کریں۔ کوئی لشکر اُن کے ساتھ بھی نہیں بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے ایسے ہی عجیب ہیں۔ وہ مَدْیَن سے مصر جانے والے ایک مسافر کو راہ چلتے پکڑ کر بلا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جا، اور وقت کے سب سے بڑے جابر حکمران سے ٹکرا جا۔ بہت کیا تو اس کی درخواست پر اس کے بھائی کو مددگار کے طور پر دے دیا۔ کوئی فوج فرّا اور ہاتھی گھوڑے اِس کارِ عظیم کے لیے اس کو نہیں دیے گئے۔

(۴) جو اعتراضات اور شبہات اور الزامات اور مکر و ظلم کے ہتھکنڈے اہلِ مکہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں، اُن سے بڑھ چڑھ کر وہی سب ہتھیار فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں

استعمال کیے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ کس طرح وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہوا اور آخر کار کون غالب آ کر رہا؟ خدا کا بے سروسامان نبی؟ یا لاؤ لشکر والا فرعون؟ اس سلسلے میں خود مسلمانوں کو بھی ایک غیر ملفوظ تسلّی دی گئی ہے کہ اپنی بے سروسامانی اور کفارِ قریش کے سروسامان پر نہ جائیں، جس کام کے پیچھے خدا کا ہاتھ ہوتا ہے، وہ آخرِ کار غالب ہی ہو کر رہتا ہے۔ اِسی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے ساحرانِ مصر کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب حق اُن پر منکشف ہو گیا تو وہ بے دھڑک اُس پر ایمان لے آئے، اور پھر فرعون کے انتقام کا خوف انھیں بال برابر بھی ایمان کی راہ سے نہ ہٹا سکا۔

(۵) آخر میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک شہادت پیش کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں اور معبُودوں کے گھڑے جانے کی ابتدا کس مضحکہ انگیز طریقے سے ہوا کرتی ہے، اور یہ کہ خدا کے نبی اِس گِھناؤنی چیز کا نام و نشان تک باقی رہنے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ پس آج اس شرک اور بُت پرستی کی جو مخالفت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں، وہ نبوت کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

اِس طرح قصّۂ موسیٰؑ کے پیرایے میں اُن تمام معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اُس وقت اُن کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی کش مکش سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر وعظ کیا گیا ہے کہ بہر حال یہ قرآن ایک نصیحت اور یاددہانی ہے جو تمھاری اپنی زبان میں تم کو سمجھانے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اس پر کان دھرو گے اور اس سے سبق لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود بُرا انجام دیکھو گے۔

پھر آدم علیہ السلام کا قصّہ بیان کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جس رَوِش پر تم لوگ جا رہے ہو، یہ دراصل شیطان کی پیروی ہے۔ اَحیاناً شیطان کے بہکائے میں آ جانا تو خیر ایک وقتی کمزوری ہے جس سے انسان بمشکل ہی بچ سکتا ہے۔ مگر آدمی کے لیے صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ جب اس پر اس کی غَلَطی واضح کر دی جائے تو وہ اپنے باپ آدمؑ کی طرح صاف صاف اس کا اعتراف کر لے، توبہ کرے، اور پھر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے۔ غَلَطی اور اس پر ہٹ اور نصیحت پر نصیحت کیے جانے پر بھی اُس سے باز نہ آنا، اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مارنا ہے، جس کا نقصان آدمی کو خود ہی بھگتنا پڑے گا، کسی دوسرے کا کچھ نہ بگڑے گا۔

آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اِن منکرینِ حق کے معاملے میں جلدی اور بے صبری نہ کرو۔ خدا کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و انکار پر فوراً نہیں پکڑ لیتا، بلکہ سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے۔ لہٰذا گھبراؤ نہیں، صبر کے ساتھ اِن لوگوں کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جاؤ، اور نصیحت کا حق ادا کرتے رہو۔

اسی سلسلے میں نَماز کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ اہلِ ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا ہوں جو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہیں۔

---

۱۳۵ آیاتہا

سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ

رکوعاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝٤ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝٥ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝٦ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ

طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے[1]۔ نازل کیا گیا ہے اُس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہے[2]۔ مالک ہے اُن سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں، اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔ تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ تو چُپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے[3]۔ وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی خدا

۱ – یہ فقرہ پہلے فقرے کے مفہوم پر خود روشنی ڈالتا ہے۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کو نازل کر کے ہم کوئی اَن ہونا کام تم سے نہیں لینا چاہتے۔ تمھارے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے اُن کو منوا کر چھوڑو، اور جن کے دل ایمان کے لیے بند ہو چکے ہیں ان کے اندر ایمان اُتار کر ہی رہو۔ یہ تو بس ایک تذکیر اور یاد دہانی ہے، اور اس لیے بھیجی گئی ہے کہ جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو، وہ اسے سن کر ہوش میں آ جائے۔ اب اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں خدا کا کچھ خوف نہیں، اور جنھیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ان کے پیچھے پڑنے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں۔

۲ – یعنی پیدا کرنے کے بعد کہیں جا کر سو نہیں گیا ہے بلکہ آپ اپنے کارخانۂ تخلیق کا سارا انتظام چلا رہا ہے، خود اس ناپیدا کنار سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے، خالق ہی نہیں ہے بالفعل حکمراں بھی ہے۔

۳ – یعنی کچھ ضروری نہیں ہے کہ جو ظلم و ستم تم پر اور تمھارے ساتھیوں پر ہو رہا ہے اور جن شرارتوں اور خباثتوں سے تمھیں نیچا دکھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ان پر تم بآوازِ بلند ہی فریاد کرو۔ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم پر کیا کیفیت گزر رہی ہے۔ وہ تمھارے دلوں کی پکار تک سن رہا ہے۔

إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ﴿٨﴾ وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿٩﴾ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ﴿١١﴾ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾

نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں[۴]۔

اور تمھیں کچھ موسیٰؑ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی[۵] اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ "ذرا ٹھیرو! میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمھارے لیے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اِس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے[۶]۔"

وہاں پہنچا تو پکارا گیا: "اے موسیٰؑ! میں ہی تیرا رب ہوں، جُوتیاں اُتار دے[۷]۔ تو وادیِ مقدس طُویٰ میں ہے[۸]۔

۴ – یعنی وہ بہترین صفات کا مالک ہے۔

۵ – یہ اُس وقت کا قصّہ ہے جب حضرت موسیٰؑ چند سال مَدیَن میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو (جن سے مَدیَن ہی میں شادی ہوئی تھی) لے کر مصر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کی سرگزشت سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک مصری ہلاک ہو گیا تھا اور اس پر انھیں اپنی گرفتاری کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، تو وہ مصر سے بھاگ کر مَدیَن میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔

۶ – ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا زمانہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے سے گزر رہے تھے۔ دُور سے ایک آگ دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ یا تو وہاں سے تھوڑی سی آگ مل جائے گی، تاکہ بال بچوں کو رات بھر گرم رکھنے کا بندوبست ہو جائے، یا کم از کم وہاں سے یہ پتا چل جائے گا کہ آگے راستہ کدھر ہے۔ خیال کیا تھا دُنیا کا راستہ ملنے کا، اور وہاں مل گیا عقبیٰ کا راستہ۔

۷ – غالباً اسی واقعے کی وجہ سے یہودیوں میں یہ شرعی مسئلہ بن گیا کہ جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے فرمایا: خالفوا الیهود فانهم لا یُصلّون فی نعالهم ولا خفافهم، "یہودیوں کے خلاف عمل کرو۔ کیونکہ وہ جوتے اور چمڑے کے موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے۔" (ابوداؤد) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضرور جوتے ہی پہن کر نماز پڑھنی چاہیے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اس لیے دونوں طرح عمل کرو۔ ابوداؤد میں عَمرؓو بن عاص کی روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مُسندِ احمد اور ابوداؤد

وَاَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى ﴿١٣﴾ اِنَّنِىۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِىۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِىۡ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ

اور میں نے تجھ کو چُن لیا ہے، سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔[9] قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اُس کا وقت

میں ابوسعید خُدریؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو جوتے کو پلٹ کر دیکھ لے۔ اگر کوئی گندگی لگی ہو تو زمین سے رگڑ کر صاف کر لے اور انھی جوتوں کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔“ ابوہُریرہؓ کی روایت میں حضورؐ کے یہ الفاظ ہیں: ”اگر تم میں سے کسی نے اپنے جوتے سے گندگی کو پامال کیا ہو تو مٹی اس کو پاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔“ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کی روایت میں ہے: یطھرہ ما بعدہ، یعنی ”ایک جگہ گندگی لگی ہوگی تو دوسری جگہ جاتے جاتے خود زمین ہی اس کو پاک کر دے گی۔“ ان کثیر التعداد روایات کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام اَوزاعیؒ اور اسحاق بن راہَویہؒ وغیرہ فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ جوتا ہر حال میں زمین کی مٹی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایک ایک قول امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی اس کی تائید میں ہے۔ مگر امام شافعیؒ کا مشہور قول اِس کے خلاف ہے۔ غالباً وہ جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو ادب کے خلاف سمجھ کر منع کرتے ہیں، اگرچہ سمجھا یہی گیا ہے کہ ان کے نزدیک جوتا مٹی پر رگڑنے سے پاک نہیں ہوتا۔ (اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں چٹائی تک کا فرش نہ تھا، بلکہ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا ان احادیث سے اِستدلال کر کے اگر کوئی شخص آج کی مسجدوں کے فرش پر جوتے لے جانا چاہے تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ البتہ گھاس پر یا کُھلے میدان میں جوتے پہنے پہنے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو میدان میں نمازِ جنازہ پڑھتے وقت بھی جوتے اُتارنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ دراصل احکام سے ناواقف ہیں۔)

٨- عام خیال یہ ہے کہ ”طُویٰ“ اس وادی کا نام تھا۔ مگر بعض مفسرین نے ”وادیِ مقدسِ طُویٰ“ کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ ”وہ وادی جو ایک ساعت کے لیے مقدس کر دی گئی ہے۔“

٩- یہاں نماز کی اصلی غرض پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی خدا سے غافل نہ ہو جائے، دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر اُس کو اِس حقیقت سے بےفکر نہ کر دیں کہ میں کسی کا بندہ ہوں، آزاد و خودمختار نہیں ہوں۔ اس فکر کو تازہ رکھنے اور خدا سے آدمی کا تعلق جوڑے رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے، جو ہر روز کئی بار آدمی کو دُنیا کے ہنگاموں سے ہٹا کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ نماز قائم کر تاکہ مَیں تجھے یاد کروں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَاذۡكُرُوۡنِىۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ ”مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔“

ضمناً اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس شخص کو بھول لاحق ہو جائے، اسے جب بھی یاد آئے، نماز ادا کر لینی چاہیے۔ حدیث میں حضرت اَنَسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من نسی صلاۃ فلیصلّھا اذا ذکرھا لا کفارۃ

أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَىٰهُ فَتَرْدَىٰ ﴿١٦﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَـٰمُوسَىٰ ﴿١٧﴾ قَالَ هِىَ عَصَاىَ أَتَوَكَّؤُا۟ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِى وَلِىَ فِيهَا مَـَٔارِبُ أُخْرَىٰ ﴿١٨﴾

مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفّس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے[10]۔ پس کوئی ایسا شخص جو اُس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا ہے، تجھ کو اُس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے، ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا —— اور اے موسیٰؑ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے[11]؟"

موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتّے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں[12]۔"

---

لھا الا ذٰلك۔ "جو شخص کسی وقت کی نماز بھول گیا ہو، اُسے چاہیے کہ جب یاد آئے ادا کر لے، اِس کے سوا اس کا کوئی کفّارہ نہیں ہے۔" (بخاری، مسلم، احمد) اسی معنیٰ میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، جسے مسلم، ابوداؤد اور نَسائی وغیرہ نے لیا ہے۔ اور ابوقتادہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا: "اگر ہم نماز کے وقت سو گئے ہوں تو کیا کریں؟" آپؐ نے فرمایا: "نیند میں کچھ قصور نہیں، قصور تو جاگنے کی حالت میں ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص بھول جائے یا سو جائے تو جب بیدار ہو یا جب یاد آئے، نماز پڑھ لے۔" (ترمذی، نَسائی، ابوداؤد)

**۱۰** — توحید کے بعد دوسری حقیقت، جو ہر زمانے میں تمام انبیا علیہم السلام پر منکشف کی گئی اور جس کی تعلیم دینے پر وہ مامور کیے گئے، آخرت ہے۔ یہاں نہ صرف اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ساعتِ منتظرہ اِس لیے آئے گی کہ ہر شخص نے دُنیا میں جو سعی کی ہے، اس کا بدلہ آخرت میں پائے۔ اور اس کے وقت کو مخفی بھی اس لیے رکھا گیا ہے کہ آزمائش کا مدّعا پورا ہو سکے۔ جسے عاقبت کی کچھ فکر ہو، اس کو ہر وقت اِس گھڑی کا کھٹکا لگا رہے، اور یہ کھٹکا اسے بے راہ روی سے بچاتا رہے۔ اور جو دُنیا میں گم رہنا چاہتا ہو، وہ اس خیال میں مگن رہے کہ قیامت ابھی کہیں دُور دُور بھی آتی نظر نہیں آتی۔

**۱۱** — یہ سوال طلبِ علم کے لیے نہ تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کو بھی معلوم تھا کہ موسیٰؑ کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ پوچھنے سے مقصود یہ تھا کہ لاٹھی کا لاٹھی ہونا حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں اچھی طرح مُستحضَر ہو جائے اور پھر وہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیں۔

**۱۲** — اگرچہ جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ حضور! یہ لاٹھی ہے، مگر حضرت موسیٰؑ نے اس سوال کا جو لمبا جواب دیا، وہ ان کی اُس وقت کی قلبی کیفیت کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب آدمی کو کسی بہت

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾

ع ۱ ۲۴ ۱۰

فرمایا: ”پھینک دے اس کو موسیٰؑ۔“

اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دَوڑ رہا تھا۔

فرمایا: ”پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہُوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف[13] کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے۔“ ع

بڑی شخصیّت سے بات کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ اپنی بات کو طول دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اُسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اُس کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل رہے۔

۱۳ – یعنی روشن ایسا ہوگا جیسے سورج ہو، مگر تمھیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بائبل میں یدِ بَیضا کی ایک اور ہی تعبیر کی گئی ہے جو وہاں سے نکل کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گئی۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے جب بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو پورا ہاتھ بَرَص کے مریض کی طرح سفید تھا، پھر جب دوبارہ اُسے بغل میں رکھا تو وہ اصلی حالت پر آ گیا۔ یہی تعبیر اِس معجزے کی تَلمُود میں بھی بیان کی گئی ہے، اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ فرعون کو برص کی بیماری تھی جسے وہ چھپائے ہوئے تھا، اس لیے اس کے سامنے یہ معجزہ پیش کیا گیا کہ دیکھ، یوں آناً فاناً برص کا مرض پیدا بھی ہوتا ہے اور کافور بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو ذوقِ سلیم اس سے اِبا کرتا ہے کہ کسی نبی کو برص کا معجزہ دے کر ایک بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے۔ دوسرے اگر فرعون کو مخفی طور پر برص کی بیماری تھی تو یدِ بیضا صرف اُس کی ذات کے لیے معجزہ ہو سکتا تھا، اس کے درباریوں پر اس معجزے کا کیا رُعب طاری ہوتا۔ لٰہذا صحیح بات وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کی کہ اس ہاتھ میں سورج کی سی چمک پیدا ہو جاتی تھی جسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ قدیم مفسرین میں سے بھی بہتوں نے اس کے یہی معنیٰ لیے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ

موسیٰؑ نے عرض کیا: ”پروردگار! میرا سینہ کھول دے[14]، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سُلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں[15]، اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر

۱۴ – یعنی میرے دل میں اس منصبِ عظیم کو سنبھالنے کی ہمت پیدا کر دے، اور میرا حوصلہ بڑھا دے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا کام حضرت موسیٰؑ کے سپرد کیا جا رہا تھا جس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی، اس لیے آپ نے دعا کی کہ مجھے وہ صبر، وہ ثبات، وہ تحمل، وہ بے خوفی اور وہ عزم عطا کر جو اس کام کے لیے درکار ہے۔

۱۵ – بائبل میں اس کی جو تشریح بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: ”اے خداوند! میں فصیح نہیں۔ نہ تو پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا۔ بلکہ رُک رُک کر بولتا ہوں اور میری زبان کُند ہے۔“ (خُروج ۴: ۱۰) مگر تلمُود میں اِس کا ایک لمبا چوڑا قصّہ بیان ہوا ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ بچپن میں جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے گھر پرورش پا رہے تھے، ایک روز انھوں نے فرعون کے سر کا تاج اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بچے نے یہ کام بالارادہ کیا ہے، یا یہ محض طفلانہ فعل ہے۔ آخرکار یہ تجویز کیا گیا کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ، دونوں ساتھ رکھے جائیں۔ چنانچہ دونوں چیزیں لا کر سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰؑ نے اُٹھا کر آگ منہ میں رکھ لی۔ اس طرح ان کی جان تو بچ گئی، مگر زبان میں ہمیشہ کے لیے لکنت پڑ گئی۔

یہی قصّہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گیا۔ لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اُٹھا کر منہ میں لے جا سکے۔ بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ منہ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آ سکتی ہے؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور ان کو اندیشہ لاحق تھا کہ نبوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے اگر تقریر کی ضرورت کبھی پیش آئی (جس کا انھیں اُس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا) تو ان کی طبیعت کی جھجک مانع ہو جائے گی۔ اس لیے انھوں نے دعا فرمائی کہ یا اللہ! میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ میں اچھی طرح اپنی بات لوگوں کو سمجھا سکوں۔ یہی چیز تھی جس کا فرعون نے ایک مرتبہ ان کو طعنہ دیا کہ ”یہ شخص تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔“ (لَا يَكَادُ يُبِيْنُ۔ الزُّخرُف: ۵۲) اور یہی کمزوری تھی جس کو محسوس کر کے حضرت موسیٰؑ نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ کو مددگار کے طور پر مانگا۔ سورۂ قصص میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً۔ ”میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اُس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج۔“ آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی یہ کمزوری دُور ہو گئی تھی اور وہ خوب زور دار تقریر کرنے لگے تھے، چنانچہ قرآن میں اور بائبل میں ان کی بعد کے دَور کی جو تقریریں

اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ

مقرر کر دے۔ ہارون، جو میرا بھائی ہے۔[۱۶] اُس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے۔"

فرمایا: "دیا گیا جو تو نے مانگا اے موسیٰؑ! ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا۔[۱۷] یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا، ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعے سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچّے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا اور اسے میرا دشمن اور اس بچّے کا دشمن اُٹھا لے گا۔

آئی ہیں، وہ کمال فصاحت وطلاقتِ لسانی کی شہادت دیتی ہیں۔

یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے۔ رسول ہمیشہ شکل، صورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوئے ہیں، جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متأثّر کرنے والا ہوتا تھا۔ کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں بھیجا جا سکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے، یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۱۶ – بائبل کی رِوایت کے مطابق حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ سے تین برس بڑے تھے۔ (خُروج ۷:۷)

۱۷ – اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو ایک ایک کر کے وہ احسانات یاد دلاتا ہے جو پیدائش کے وقت سے لے کر اس وقت تک اس نے ان پر کیے تھے۔ اِن واقعات کی تفصیل سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف اشارات کیے گئے ہیں جن سے مقصود حضرت موسیٰؑ کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم اُسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور اُسی کام کے لیے آج تک خاص طور پر سرکاری نگرانی میں پرورش پاتے رہے ہو جس پر اب تمھیں مامور کیا جا رہا ہے۔

وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۟ اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۟ وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۚ۟ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ۟ اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚۖ۟ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۟

میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبّت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔ یاد کر جب کہ تیری بہن چل رہی تھی، پھر جا کر کہتی ہے: ”میں تمھیں اُس کا پتا دُوں جو اِس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے؟“ اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا، تاکہ اُس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو۔ اور (یہ بھی یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، ہم نے تجھے اِس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمایشوں سے گزارا اور تو مَدیَن کے لوگوں میں کئی سال ٹھیرا رہا۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تُو آ گیا ہے اَے موسیٰؑ۔ میں نے تجھ کو اپنے کام کا بنالیا ہے۔ جا، تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور دیکھو! تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس، کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے[18]۔“

۱۸- آدمی کے راہِ راست پر آنے کی دو ہی شکلیں ہیں: یا تو وہ تفہیم و تلقین سے مطمئن ہو کر صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے، یا پھر بُرے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جاتا ہے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَآ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَآ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی ﴿۴۶﴾ فَاۡتِیٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّکَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ ؕ قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰی ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰی مَنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۴۸﴾

---

دونوں نے عرض کیا[۱۸الف]: ”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پِل پڑے گا۔“ فرمایا: ”ڈرو مت، میں تمھارے ساتھ ہوں، سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں، اور سلامتی ہے اُس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اُس کے لیے جو جُھٹلائے اور منہ موڑے[۱۹]۔“

---

۱۸، الف — معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ مصر پہنچ گئے اور حضرت ہارونؑ عملاً ان کے شریکِ کار ہو گئے۔ اس وقت فرعون کے پاس جانے سے پہلے دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ گزارش کی ہو گی۔

۱۹ — اس واقعے کو بائبل اور تلمود میں جس طرح بیان کیا گیا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجیے، تاکہ اندازہ ہو کہ قرآنِ مجید انبیا علیہم السلام کا ذکر کس شان سے کرتا ہے اور بنی اسرائیل کی روایات میں ان کی کیسی تصویر پیش کی گئی ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ پہلی مرتبہ جب خدا نے موسیٰؑ سے کہا کہ ”سو اب آ، میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے“ تو حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا: ”میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں؟“ پھر خدا نے حضرت موسیٰؑ کو بہت کچھ سمجھایا، ان کی ڈھارس بندھائی، معجزے عطا کیے، مگر حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا تو یہی کہا کہ ”اے خداوند! میں تیری منّت کرتا ہوں، کسی اور کے ہاتھ سے، جسے تو چاہے، یہ پیغام بھیج۔“ (خروج ۴:۱۳) تلمود کی روایت اس سے بھی چند قدم آگے جاتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان سات دن تک اِسی بات پر ردّ و کد ہوتی رہی۔ اللہ کہتا رہا کہ نبی بن، مگر موسیٰؑ کہتے رہے کہ میری زبان ہی نہیں کھلتی تو میں نبی کیسے بن جاؤں۔ آخر اللہ میاں نے کہا: میری خوشی یہ ہے کہ تو ہی نبی بن۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ لُوط کو بچانے کے لیے آپ نے فرشتے بھیجے، ہاجرہ جب سارہ کے گھر سے نکلی تو اس کے لیے پانچ فرشتے بھیجے، اور اب اپنے خاص بچوں (بنی اسرائیل) کو مصر سے نکلوانے کے لیے آپ مجھے بھیج رہے ہیں۔ اس پر خدا ناراض ہو گیا اور اس نے رسالت میں ان کے ساتھ ہارونؑ کو شریک کر دیا اور موسیٰؑ کی اولاد کو محروم کر کے کہانت کا منصب ہارونؑ کی اولاد کو دے دیا — یہ کتابیں ہیں جن کے متعلق بے شرم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان سے یہ قصے نقل کر لیے گئے ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ

فرعون نے کہا: ”اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اَے موسیٰؑ؟“[21]

موسیٰؑ نے جواب دیا: ”ہمارا رب وہ[22] ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی،

**۲۰** – یہاں قصّے کی اِن تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح فرعون کے پاس پہنچے اور کس طرح اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۳ میں گزر چکی ہیں، اور آگے سورۂ شُعَراء، رکوع ۲ – ۳، سورۂ قصص، رکوع ۴، اور سورۂ نازعات، رکوع ۱ میں آنے والی ہیں۔

فرعون کے متعلق ضروری معلومات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔

**۲۱** – دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحبِ دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے، اس لیے فرعون نے انھی کو مخاطَب کیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ خطاب کا رُخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارونؑ کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور خطابت کے پہلو میں حضرت موسیٰؑ کے ضعف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہلِ مصر کا رب تو میں ہوں۔ سورۂ نازعات میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى، ”اے اہلِ مصر! تمھارا ربِّ اعلیٰ میں ہوں۔“ سورۂ زُخرُف میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے: يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ، ”اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟“ (آیت ۵۱) سورۂ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں بِنکارتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ، ”اے سردارانِ قوم! میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور بھی الٰہ ہے۔ اے ہامان! ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تیار کرا، تاکہ میں ذرا اُوپر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کسے الٰہ بنا رہا ہے۔“ (آیت ۳۸) سورۂ شُعَراء میں وہ حضرت موسیٰؑ کو ڈانٹ کر کہتا ہے: لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿﴾، ”اگر تُو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا۔“ (آیت ۲۹)

اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبُود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رَع یا راع) کے اَوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا، اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ ”واحد مرکزِ پرستش“ ہونے کا نہ تھا، بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریّے کے اعتبار سے دراصل پوری نوعِ انسانی کی سیاسی رُبوبیّت و خداوندی کا مدعی تھا، اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اُس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرماں روا ہو جس کا نمائندہ آ کر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔ بعض لوگوں کو اُس کی لن ترانیوں سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ

ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾

پھر اس کو راستہ بتایا۔[۲۳]"

فرعون بولا: "اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں، ان کی پھر کیا حالت تھی؟[۲۴]"

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر تھا اور خود خدا ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ مگر یہ بات قرآن سے ثابت ہے کہ وہ عالَمِ بالا پر کسی اور کی حکمرانی مانتا تھا۔ سورۃ المومن، آیات ۲۸ تا ۳۴ اور سورۂ زُخرُف، آیت ۵۳ کو غور سے دیکھیے۔ یہ آیتیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ہستی سے اُس کو انکار نہ تھا۔ البتہ جس چیز کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ تھا، وہ یہ تھی کہ اس کی سیاسی خدائی میں اللہ کا کوئی دخل ہو اور اللہ کا کوئی رسول آ کر اُس پر حکم چلائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حاشیہ ۵۳)

**۲۲** – یعنی ہم ہر معنیٰ میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار، آقا، مالک، حاکم، سب کچھ ہمارے نزدیک وہی ہے۔ کسی معنیٰ میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔

**۲۳** – یعنی دُنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل وصورت، جو قوت وصلاحیت، اور جو صفت وخاصیّت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دُنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصّے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

پھر اس نے ایسا نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اُسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اُڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اُگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں، ہادی اور معلّم بھی ہے۔

اِس بے نظیر، جامع ومختصر جملے میں حضرت موسیٰؑ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اُس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا۔ دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں آ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجودِ خاص کے لیے اللہ کا ممنونِ احسان ہے، اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحے کے لیے زندہ تک نہیں رہ سکتا جب تک اس کا دل اور اس کے پھیپھڑے اور اس کا معدہ وجگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے چلے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں، اِسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے اشارتاً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

موسیٰؑ نے کہا: "اُس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوِشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چُوکتا ہے نہ بُھولتا ہے۔"[25]

انکار تھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے، اور جو ہر چیز کو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالم گیر منصبِ ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے۔ اور انسان کی شُعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہوسکتی جو مچھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انھیں سیدھا راستہ بتائے۔

۲۴ – یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا، اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو صدہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آرہے ہیں، ان کی تمھارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے؟ کیا ان سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟ یہ تھا فرعون کے پاس حضرت موسیٰؑ کی اس دلیل کا جواب۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جواب اُس نے بربنائے جَہالت دیا ہو، اور ہوسکتا ہے کہ بربِنائے شرارت۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی وہ خود بھی اس بات پر جھلّا گیا ہو کہ اِس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہلِ دربار اور عام اہلِ مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے۔ اہلِ حق کی تبلیغ کے خلاف ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لیے بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ خُصوصاً اُس زمانے میں جب کہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے کام لیا جارہا تھا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون کی اس مکّاری کا ذکر یہاں بالکل برمحل تھا۔

۲۵ – یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اس وقت دیا، اور اس سے حکمتِ تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے۔ فرعون کا مقصد، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، سامعین کے، اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنّم کا ایندھن بنیں گے، تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰؑ کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا۔ اس لیے آنجناب نے کمالِ دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے۔ آپؑ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں۔ ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے۔ نہ خدا کی نگاہ سے کوئی چیز بچی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظے سے کوئی شے محو ہوئی ہے۔ ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے، اس کو وہی جانتا ہے۔ مجھے اور تمھیں یہ فکر نہیں

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۵۴﴾ ع مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾

وہی[26] جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور اُس میں تمھارے چلنے کو راستے بنائے، اور اُوپر سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعے سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔[27] ع اِسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اِسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے، اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں[28] گے۔

---

ہونی چاہیے کہ ان کا مَوقِف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا مَوقِف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

**۲۶** – اندازِ کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا جواب ''نہ بھُولتا ہے'' پر ختم ہوگیا، اور یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ شرح و تذکیر ارشاد ہوئی ہے۔ قرآن میں اس طرح کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ کسی گزرے ہوئے یا آیندہ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے جب کسی شخص کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے بعد متصلاً چند فقرے وعظ و پند، یا شرح و تفسیر، یا تفصیل و توضیح کے طور پر مزید ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور صرف اندازِ کلام سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ اس شخص کا قول نہیں ہے جس کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول ہے۔

واضح رہے کہ اس عبارت کا تعلق صرف قریب کے فقرے ''میرا رب نہ چُوکتا ہے نہ بھُولتا ہے'' سے ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰؑ کے پورے کلام سے ہے، جو رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ سے شروع ہوا ہے۔

**۲۷** – یعنی جو لوگ عقلِ سلیم سے کام لے کر جستجوئے حق کرنا چاہتے ہوں، وہ اِن نشانات کی مدد سے منزلِ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ نشانات اُن کو بتا دیں گے کہ اس کائنات کا ایک رب ہے اور رُبوبیّت ساری کی ساری اسی کی ہے۔ کسی دوسرے رب کے لیے یہاں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

**۲۸** – یعنی ہر انسان کو لازماً تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ ایک مرحلہ موجودہ دُنیا میں پیدایش سے لے کر موت تک کا۔ دوسرا مرحلہ موت سے قیامت تک کا۔ اور تیسرا قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کا مرحلہ۔ یہ تینوں مرحلے اِس

وَلَقَدۡ اَرَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں[29] دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔ کہنے لگا: ”اے موسیٰؑ! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے مُلک سے نکال باہر کرے[30]؟ اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادُو لاتے ہیں۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اِس قرار داد سے پھریں گے، نہ تو پھریو۔ کُھلے میدان میں سامنے آ جا۔“

آیت کی رُو سے اِسی زمین پر گزرنے والے ہیں۔

**۲۹** – یعنی آفاق و انفُس کے دلائل کی نشانیاں بھی، اور وہ معجزات بھی جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے تھے۔ قرآن میں متعدِد مقامات پر حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریریں بھی موجود ہیں جو انھوں نے فرعون کو سمجھانے کے لیے کیں، اور وہ معجزات بھی مذکور ہیں جو اس کو پے در پے دکھائے گئے۔

**۳۰** – جادو سے مراد عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ ہے جو سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء کی تفصیلات کے بموجب حضرت موسیٰؑ نے پہلی ہی ملاقات کے وقت بھرے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس معجزے کو دیکھ کر فرعون پر جو بدحواسی طاری ہوئی، اس کا اندازہ اس کے اِسی فقرے سے کیا جا سکتا ہے کہ ”تُو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔“ دُنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا اور نہ بعد میں کبھی پیش آیا کہ کسی جادُوگر نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک فتح کر لیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں سیکڑوں ہزاروں جادُوگر موجود تھے جو تماشے دکھا دکھا کر انعام کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھرتے تھے۔ اس لیے فرعون کا ایک طرف یہ کہنا کہ تو جادُوگر ہے، اور دوسری طرف یہ خطرہ ظاہر کرنا کہ تو میری سلطنت چھین لینا چاہتا ہے، کھلی ہوئی بدحواسی کی علامت ہے۔ دراصل وہ حضرت موسیٰؑ کی معقول و مدلّل تقریر، اور پھر ان کے معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہلِ دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی عوام و خواص اس سے متأثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس نے جھوٹ اور فریب اور تعصّبات کی انگیخت سے کام نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے کہا: یہ معجزہ نہیں جادو ہے اور ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اِسی طرح لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو! ذرا دیکھو، یہ تمھارے باپ دادا کو گمراہ اور جہنمی ٹھیراتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، یہ پیغمبر ویغمبر کچھ نہیں ہے، اقتدار کا بھوکا ہے، چاہتا ہے کہ یوسف کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمراں ہو جائیں اور قبطی قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔ اِن

قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَاَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى

موسیٰؑ نے کہا: ”جشن کا دن طے ہوا، اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔“[31]
فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آ گیا۔[32]
موسیٰؑ نے (عین موقع پر گروہِ مقابل کو مُخاطَب کر کے) کہا:[33] ”شامت کے مارو، نہ جُھوٹی تہمتیں

ہتھکنڈوں سے وہ دعوتِ حق کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ (مزید تشریحات کے لیے تفہیم القرآن، جلد دوم کے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: الاعراف، حواشی ۸۷-۸۸-۸۹۔ یونُس، حاشیہ ۷۵) اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ہر زمانے میں برسرِ اقتدار لوگوں نے داعیانِ حق کو یہی الزام دیا ہے کہ وہ دراصل اقتدار کے بھوکے ہیں اور ساری باتیں اسی مقصد کے لیے کر رہے ہیں۔ اس کی مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۱۱۰، ۱۲۳۔ یونُس، آیت ۷۸۔ المومنون، آیت ۲۴۔

**۳۱-** فرعون کا مدّعا یہ تھا کہ ایک دفعہ جادوگروں سے لاٹھیوں اور رسّیوں کا سانپ بنوا کر دکھا دوں تو موسیٰؑ کے معجزے کا جو اثر لوگوں کے دلوں پر ہوا ہے، وہ دُور ہو جائے گا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی منہ مانگی مراد تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ الگ کوئی دن اور جگہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جشن کا دن قریب ہے، جس میں تمام ملک کے لوگ دارالسلطنت میں کھنچ کر آ جاتے ہیں۔ وہیں میلے کے میدان میں مقابلہ ہو جائے، تاکہ ساری قوم دیکھ لے۔ اور وقت بھی دن کی پوری روشنی کا ہونا چاہیے، تاکہ شک و شبہ کے لیے کوئی گنجایش نہ رہے۔

**۳۲-** فرعون اور اس کے درباریوں کی نگاہ میں اس مقابلے کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اسی کے فیصلے پر اپنی قسمت کا فیصلہ معلّق سمجھ رہے تھے۔ تمام ملک میں آدمی دوڑا دیے گئے کہ جہاں جہاں کوئی ماہر جادوگر موجود ہو، اُسے لے آئیں۔ اسی طرح عوام کو بھی جمع کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی گئی، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اکٹھے ہوں اور اپنی آنکھوں سے جادو کے کمالات دیکھ کر عصائے موسیٰؑ کے رُعب سے محفوظ ہو جائیں۔ کُھلّم کُھلّا کہا جانے لگا کہ ہمارے دین کا انحصار اب جادوگروں کے کرتب پر ہے۔ وہ جیتیں تو ہمارا دین بچے گا، ورنہ موسیٰؑ کا دین چھا کر رہے گا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ شعراء، رکوع ۳)

اس مقام پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مصر کے شاہی خاندان اور طبقۂ امرا کا مذہب عوام کے مذہب سے کافی مختلف تھا۔ دونوں کے دیوتا اور مندر الگ الگ تھے، مذہبی مراسم بھی یکساں نہ تھے، اور زندگی بعدِ موت کے معاملے میں بھی، جس کو مصر میں بہت بڑی اہمیّت حاصل تھی، دونوں کے عملی طریقے اور نظری انجام میں بہت بڑا امتیاز پایا جاتا تھا۔ (مُلاحظہ ہو Toynbee کی A Study of History، صفحہ ۳۱-۳۲) علاوہ بریں مصر میں اس سے پہلے جو مذہبی انقلابات رُونما ہوئے تھے، ان کی بدولت وہاں کی آبادی میں متعدّد ایسے عناصر پیدا ہو چکے تھے جو ایک مشرکانہ مذہب کی بہ نسبت ایک توحیدی مذہب کو ترجیح دیتے تھے، یا دے سکتے تھے۔ مثلاً خود بنی اسرائیل اور ان کے

اللّٰہِ کَذِبًا فَیُسۡحِتَکُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰی ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ بَیۡنَہُمۡ وَاَسَرُّوا النَّجۡوٰی ﴿۶۲﴾ قَالُوۡۤا اِنۡ ہٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیۡدٰنِ اَنۡ

باندھو اللہ پر،[۳۴] ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمھارا ستیاناس کر دے گا۔ جھُوٹ جس نے بھی گھڑا، وہ نامراد ہوا۔"

یہ سُن کر اُن کے درمیان اختلافِ رائے ہو گیا[۳۵] اور وہ چُپکے چُپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخرِ کار کچھ لوگوں نے کہا کہ[۳۶] "یہ دونوں تو محض جادُوگر ہیں۔ اِن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادُو کے

---

ہم مذہب لوگ آبادی کا کم از کم دس فی صد حصّہ تھے۔ اس کے علاوہ اُس مذہبی انقلاب کو ابھی پورے ڈیڑھ سو برس بھی نہ گزرے تھے جو فرعون اَمینوفس یا اَخناتُون (۱۳۷۷-۱۳۶۰ ق م) نے حکومت کے زور سے برپا کیا تھا، جس میں تمام معبُودوں کو ختم کر کے صرف ایک معبُود آتُون باقی رکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس انقلاب کو بعد میں حکومت ہی کے زور سے اُلٹ دیا گیا، مگر کچھ نہ کچھ تو اپنے اثرات وہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ اِن حالات کو نگاہ میں رکھا جائے تو فرعون کی وہ گھبراہٹ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اس موقع پر اسے لاحق تھی۔

۳۳- یہ خطاب عوام سے نہ تھا جنھیں ابھی حضرت موسیٰؑ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ معجزہ دکھاتے ہیں یا جادُو، بلکہ خطاب فرعون اور اس کے درباریوں سے تھا جو انھیں جادوگر قرار دے رہے تھے۔

۳۴- یعنی اُس کے معجزے کو جادو اور اس کے پیغمبر کو ساحر کذّاب نہ قرار دو۔

۳۵- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنی کمزوری کو خود محسوس کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ دکھایا ہے، وہ جادُو نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس مقابلے میں ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے آئے تھے، اور جب عین موقع پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو للکار کر مُتنبّہ کیا تو ان کا عزم یکایک متزلزل ہو گیا۔ ان کا اختلافِ رائے اس امر میں ہُوا ہو گا کہ آیا اِس بڑے تہوار کے موقع پر، جب کہ پورے ملک سے آئے ہوئے آدمی اکٹھے ہیں، کھلے میدان اور دن کی پوری روشنی میں یہ مقابلہ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر یہاں ہم شکست کھا گئے اور سب کے سامنے جادو اور معجزے کا فرق کھل گیا تو پھر بات سنبھالے نہ سنبھل سکے گی۔

۳۶- اور یہ کہنے والے لازماً فرعونی پارٹی کے وہ سر پھرے لوگ ہوں گے جو حضرت موسیٰؑ کی مخالفت میں ہر بازی کھیل جانے پر تیار تھے۔ جہاں دیدہ اور معاملہ فہم لوگ قدم آگے بڑھاتے ہوئے جھجک رہے ہوں گے، اور یہ سر پھرے جوشیلے لوگ کہتے ہوں گے کہ خواہ مخواہ کی دُور اندیشیاں چھوڑ دو اور جی کڑا کر کے مقابلہ کر ڈالو۔

يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ

زور سے تم کو تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں[۳۷]۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کرلو اور ایکا کر کے میدان میں[۳۸] آؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا، وہی جیت گیا۔"

جادُوگر[۳۹] بولے: "موسیٰؑ! تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں؟"

موسیٰؑ نے کہا: "نہیں، تم ہی پھینکو۔"

یکایک اُن کی رسّیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادُو کے زور سے موسیٰؑ کو دَوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں[۴۰]، اور موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گیا[۴۱]۔ ہم نے کہا: "مت ڈر، تو ہی غالب

۳۷- یعنی اُن لوگوں کا دارومدار دو باتوں پر تھا: ایک، یہ کہ اگر جادُوگر بھی موسیٰؑ کی طرح لاٹھیوں سے سانپ بنا کر دکھا دیں گے تو موسیٰؑ کا جادوگر ہونا مجمعِ عام میں ثابت ہو جائے گا۔ دوسرے، یہ کہ وہ تعصّبات کی آگ بھڑکا کر حکمران طبقے کو اندھا جوش دلانا چاہتے تھے اور یہ خوف انھیں دلا رہے تھے کہ موسیٰؑ کا غالب آجانا تمھارے ہاتھوں سے ملک نکل جانے اور تمھارے مثالی (ideal) طریقِ زندگی کے ختم ہو جانے کا ہم معنیٰ ہے۔ وہ ملک کے بااثر طبقے کو ڈرا رہے تھے کہ اگر موسیٰؑ کے ہاتھ اقتدار آ گیا تو یہ تمھاری ثقافت، اور یہ تمھارے آرٹ، اور یہ تمھارا حسین و جمیل تمدّن، اور یہ تمھاری تفریحات، اور یہ تمھاری خواتین کی آزادیاں (جن کے شان دار نمونے حضرت یوسفؑ کے زمانے کی خواتین پیش کر چکی تھیں) غرض وہ سب کچھ جس کے بغیر زندگی کا کوئی مزا نہیں، غارت ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد تو نری "مُلّائیت" کا دَور دَورہ ہو گا، جسے برداشت کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔

۳۸- یعنی اِن کے مقابلے میں مُتَّحِدہ محاذ پیش کرو۔ اگر اس وقت تمھارے درمیان آپس ہی میں پھوٹ پڑ گئی اور عین مقابلے کے وقت مجمعِ عام کے سامنے یہ ہچکچاہٹ اور سرگوشیاں ہونے لگیں تو ابھی ہوا اُکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھ لیں گے کہ تم خود اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ دلوں میں چور لیے ہوئے مقابلے پر آئے ہو۔

الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا

رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی اِن کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔[۴۲] یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں، یہ تو جادُوگر کا فریب ہے، اور جادُوگر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے۔'' آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادُوگر سجدے میں گرا دیے گئے[۴۳] اور پکار اُٹھے:

۳۹ – بیچ کی یہ تفصیل چھوڑ دی گئی کہ اِس پر فرعون کی صفوں میں اعتماد بحال ہوگیا اور مقابلہ شروع کرنے کا فیصلہ کر کے جادُوگروں کو احکام دے دیے گئے کہ میدان میں اُتر آئیں۔

۴۰ – سورۂ اعراف میں بیان ہوا تھا کہ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ ''جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینکے تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور انھیں دہشت زدہ کر دیا'' (آیت ۱۱۶) یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ اثر صرف عام لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا، خود حضرت موسیٰؑ بھی سِحر کے اثر سے متأثّر ہوگئے تھے۔ ان کی صرف آنکھوں ہی نے یہ محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاٹھیاں اور رسّیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔

۴۱ – معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جونہی حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ''پھینکو'' کا لفظ نکلا، جادُوگروں نے یک بارگی اپنی لاٹھیاں اور رسّیاں ان کی طرف پھینک دیں، اور اچانک ان کو یہ نظر آیا کہ سیکڑوں سانپ دوڑتے ہوئے ان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اِس منظر سے فوری طور پر اگر حضرت موسیٰؑ نے ایک دہشت اپنے اندر محسوس کی ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ انسان بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، انسانیت کے تقاضے اُس سے مُنفک نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت موسیٰؑ کو یہ خوف لاحق ہوا ہو کہ معجزے سے اس قدر مشابہ منظر دیکھ کر عوام ضرور فتنے میں پڑ جائیں گے۔

اس مَقام پر یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ قرآن یہاں اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادُو سے متأثّر ہوسکتا ہے۔ اگرچہ جادُوگر اس کی نبوت سلب کر لینے، یا اس کے اُوپر نازل ہونے والی وحی میں خلل ڈال دینے، یا جادُو کے اثر سے اس کو گمراہ کر دینے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن فی الجملہ کچھ دیر کے لیے اس کے قُویٰ پر یک گونہ اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی کھل جاتی ہے جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادُو کا اثر ہونے کی روایات پڑھ کر نہ صرف اُن روایات کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمام حدیثوں کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرانے لگتے ہیں۔

۴۲ – ہوسکتا ہے کہ معجزے سے جو اژدہا پیدا ہوا تھا، وہ ان تمام لاٹھیوں اور رسّیوں ہی کو نگل گیا ہو جو سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن جن الفاظ میں یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں اس واقعے کو بیان کیا گیا ہے، اُن سے بظاہر گمان یہی ہوتا ہے کہ اس نے لاٹھیوں اور رسّیوں کو نہیں نگلا، بلکہ اُس جادُو کے اثر کو باطل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔

اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿٧٠﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۖ اِنَّهٗ

"مان لیا ہم نے ہارونؑ اور موسیٰؑ کے ربّ[44] کو۔"

فرعون نے کہا: "تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اس کی اجازت دیتا؟ معلوم

---

سورۂ اَعراف اور شعراء میں الفاظ یہ ہیں کہ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ "جو جھوٹ وہ بنا رہے تھے، اس کو وہ نگلے جا رہا تھا۔" اور یہاں الفاظ یہ ہیں کہ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا "وہ نگل جائے گا اُس چیز کو جو انھوں نے بنا رکھی ہے۔" اب یہ ظاہر ہے کہ ان کا جھوٹ اور ان کی بناوٹ لاٹھیاں اور رسّیاں نہ تھیں، بلکہ وہ جادُو تھا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ جدھر جدھر وہ گیا، لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل کر اس طرح پیچھے پھینکتا چلا گیا کہ ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر پڑی رہ گئی۔

۴۳ – یعنی جب انھوں نے عصائے موسیٰ کا کارنامہ دیکھا تو انھیں فوراً یقین آ گیا کہ یہ یقیناً معجزہ ہے، اُن کے فن کی چیز ہرگز نہیں ہے، اس لیے وہ اس طرح یک بارگی اور بے ساختہ سجدے میں گرے جیسے کسی نے اُٹھا اُٹھا کر اُن کو گرا دیا ہو۔

۴۴ – اس کے معنٰی یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰؑ اور جادُوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰؑ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ، خالقِ زمین و آسمان کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر فی الواقع اژدہا بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو برسرِ عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اژدہا بن جانا معجزہ نہیں ہے، بلکہ محض جادُو کا کرتب ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہاں فرعون اور جادُوگر اور سارے تماشائی عوام و خواص معجزے اور جادُو کے فرق سے واقف تھے، اور امتحان اِس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰؑ جو کچھ دکھا رہے ہیں، یہ جادُو کی قسم سے ہے، یا اُس معجزے کی قسم سے جو ربّ العالَمین کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادُوگروں نے اپنے جادُو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ "ہم نے مان لیا، موسیٰؑ ہم سے زیادہ باکمال ہے"، بلکہ انھیں فوراً یقین آ گیا کہ موسیٰؑ واقعی اللہ ربّ العالَمین کے سچّے پیغمبر ہیں، اور وہ پکار اُٹھے کہ ہم اُس خدا کو مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰؑ اور ہارونؑ آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجمعِ عام پر اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے، اور پھر پورے ملک پر اس کا کیسا زبردست اثر ہوا ہوگا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی میلے میں یہ مقابلہ اِس اُمید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاٹھی سے سانپ بنا دینا موسیٰؑ کا کوئی نرالا کمال نہیں ہے، ہر جادُوگر یہ کرتب دکھا لیتا ہے، تو موسیٰؑ کی ہوا اُکھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اُسی پر اُلٹ پڑی، اور قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے

لَاُقَطِّعَنَّ ... لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

ہوگیا کہ یہ تمھارا گُروہے جس نے تمھیں جادُوگری سکھائی تھی۔[45] اچھا، اب میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سَمتوں سے کٹواتا ہوں[46] اور کھجور کے تنوں پر تم کو سُولی دیتا ہوں[47]۔ پھر تمھیں پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔[48]" (یعنی میں تمھیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰؑ۔) جادُوگروں نے جواب دیا: "قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا

سامنے خود جادُوگروں ہی نے بالاتفاق اِس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰؑ جو کچھ دکھا رہے ہیں، یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے، یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

۴۵ – سورۂ اعراف میں الفاظ یہ ہیں: اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ، "یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے، تاکہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دو۔" یہاں اس قول کی مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ تمھارے درمیان صرف ملی بھگت ہی نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمھارا سردار اور گُرو ہے، تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے، اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے اور اسے اُس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاسی انقلاب برپا کر دو۔

۴۶ – یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں۔

۴۷ – صلیب یا سولی دینے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ ایک لمبا شہتیر سا لے کر زمین میں گاڑ دیتے تھے، یا کسی پرانے درخت کا تنا اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اس کے اوپر کے سرے پر ایک تختہ آڑا کر کے باندھ دیتے تھے۔ پھر مجرم کو اُوپر چڑھا کر اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلا کر آڑے تختے کے ساتھ کیلیں ٹھونک دیتے تھے۔ اس طرح مجرم تختے کے بل لٹکا رہ جاتا تھا اور گھنٹوں سسک سسک کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب دیے ہوئے یہ مجرم ایک مدّت تک یونہی لٹکے رہنے دیے جاتے تھے، تاکہ لوگ انھیں دیکھ دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

۴۸ – یہ ہاری ہوئی بازی جیت لینے کے لیے فرعون کا آخری داؤں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جادوگروں کو انتہائی خوف ناک سزا سے ڈرا کر ان سے یہ اقبال کرالے کہ واقعی یہ اُن کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت تھی اور وہ ان سے مل کر

وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ﴿۷۴﴾ وَمَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ

الثلثۃ

کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں[۴۹]، تُو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اِسی دُنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اُس جادوگری سے، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔" حقیقت[۵۰] یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حُضور حاضر ہوگا، اُس کے لیے جہنّم ہے جس میں وہ نہ جیے گا نہ مرے گا[۵۱]۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کیے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں

سلطنت کے خلاف سازش کر چکے تھے۔ مگر جادوگروں کے عزم و استقامت نے اُس کا یہ داؤں بھی اُلٹ دیا۔ انھوں نے اتنی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو کر دُنیا بھر کو یہ یقین دلا دیا کہ سازش کا الزام محض بگڑی ہوئی بات بنانے کے لیے ایک بے شرمانہ سیاسی چال کے طور پر گھڑا گیا ہے، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ سچّے دل سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں۔

۴۹ – دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم اُن روشن نشانیوں کے مقابلے میں جو ہمارے سامنے آ چکی ہیں، اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تجھے ترجیح دیں۔"

۵۰ – یہ جادُوگروں کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے۔ اندازِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ عبارت جادُوگروں کے قول کا حصّہ نہیں ہے۔

۵۱ – یعنی موت اور زندگی کے درمیان لٹکتا رہے گا۔ نہ موت آئے گی کہ اس کی تکلیف اور مصیبت کا خاتمہ کر دے، اور نہ جینے کا ہی کوئی لطف اسے حاصل ہوگا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دے سکے۔ زندگی سے بیزار ہوگا، مگر موت نصیب نہ ہوگی۔ مرنا چاہے گا مگر مر نہ سکے گا۔ قرآنِ مجید میں دوزخ کے عذابوں کی جتنی تفصیلات دی گئی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ خوفناک

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ؕ ﴿۷۸﴾ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ؏

ہم [۵۲] نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے سمندر میں سے سُوکھی سڑک بنا لے، [۵۳] تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔

پیچھے سے فرعون اپنا لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر اُن پر چھا گیا، جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ [۵۴] فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی۔ [۵۵]

صورتِ عذاب یہی ہے جس کے تصوّر سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔

**۵۲ –** بیچ میں اُن حالات کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو اس کے بعد مصر کے طویل زمانۂ قیام میں پیش آئے۔ ان تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، رکوع ۱۵-۱۶، سورۂ یُونس، رکوع ۹، سورۂ مومن، رکوع ۳ تا ۵، اور سورۂ زُخرف، رکوع ۵۔

**۵۳ –** اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرِ کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہوگئے۔ اُس زمانے میں نہرِ سویز موجود نہ تھی۔ بحرِ احمر سے بحرِ روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کُھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آ پہنچا جب کہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۂ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین

کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گِھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ، ''اپنا عصا سمندر پر مار۔'' فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، ''فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہوگیا۔'' اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصّہ، اُوپر کی آیت کے مطابق خشک ہوکر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر رہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے، وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور بیچ کا حصّہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۷)

۵۴ – سورۂ شُعَراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اتر آیا۔ (آیت ۶۴-۶۶) یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ (آیت ۵۰) اور سورۂ یونُس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اُٹھا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ ''میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں۔'' مگر اس آخری لمحے کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا: آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً، ''اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا۔ اچھا، آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں، تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے۔'' (آیات ۹۰-۹۲)

۵۵ – بڑے لطیف انداز میں کفارِ مکہ کو مُتنبّہ کیا جا رہا ہے کہ تمھارے سردار اور لیڈر بھی تم کو اسی راستے پر لیے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کوئی صحیح رہنمائی نہ تھی۔

اِس قصّے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے، تاکہ اُن لوگوں کے جھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصّے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خُروج (Exodus) میں اِس قصّے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کے حسبِ ذیل اجزا قابلِ توجُّہ ہیں:

(۱) باب ۴، آیت ۲-۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔ اور آیت ۱۷ میں انھی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ''تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا۔'' مگر آگے جا کر نہ معلوم یہ لاٹھی کس طرح حضرت ہارونؑ کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارونؑ ہی لاٹھی کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

(۲) باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰؑ کی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سرے سے اُس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی رُبوبیّت کے مسئلے پر اُن کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی۔ فرعون کہتا ہے کہ ''خداوند کون ہے کہ میں اُس کی بات کو مان کر بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا۔''

مگر حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اِس کے سوا کچھ جواب نہیں دیتے کہ "عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے۔" (باب ۵، آیت ۲-۳)

(۳) جادوگروں سے مقابلے کی پوری داستان بس اِن چند فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے:

"اور خداوند نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ، تو ہارونؑ سے کہنا کہ اپنی لاٹھی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دے، تاکہ وہ سانپ بن جائے۔ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور انھوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا، اور ہارونؑ نے اپنی لاٹھی فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادُوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادُوگروں نے بھی اپنے جادُو سے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ انھوں نے بھی اپنی اپنی لاٹھی سامنے ڈالی اور وہ سانپ بن گئیں۔ لیکن ہارونؑ کی لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی۔" (باب ۷، آیت ۸-۱۲)

اِس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کر کے دیکھ لیا جائے کہ قصّے کی ساری روح یہاں کس بُری طرح فنا کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جشن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ چیلنج کے بعد مقابلہ ہونا، اور پھر شکست کے بعد جادُوگروں کا ایمان لانا، جو قصّے کی اصل جان تھا، سرے سے یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ بنی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ مطالبہ صرف یہ تھا: "ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزلِ بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔" (باب ۵، آیت ۳)

(۵) مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصّل حال باب ۱۱ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی مفید معلومات، اور قرآن کے اِجمال کی تفصیلات بھی ہمیں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ متعدّد عجیب باتیں بھی۔ مثلاً باب ۱۴ کی آیت ۱۶ میں حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا جاتا ہے کہ "اور تو اپنی لاٹھی (جی ہاں، اب لاٹھی حضرت ہارونؑ سے لے کر پھر حضرت موسیٰؑ کو دے دی گئی ہے) اُٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھا اور اسے دو حصّے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔" لیکن آگے چل کر آیت ۲۱-۲۲ میں کہا جاتا ہے کہ "پھر موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھایا، اور خداوند نے رات بھر تُند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصّے ہو گیا، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے، اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔" یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رُونما ہو گیا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔ اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھڑا کر دیا اور بیچ میں سے خشک راستہ بنا دیا۔ کیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کرشمے دکھاتی ہے؟

تلمُود کا بیان نسبتاً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہِ راست علمِ وحی کی بنا پر واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، اور دوسری جگہ صدیوں کی سینہ بسینہ

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ عَدُوِّکُمْ وَ وٰعَدْنٰکُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ﴿۸۰﴾ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَ

اے[56] بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے نجات دی، اور طور کے دائیں جانب[57] تمھاری حاضری کے لیے وقت مقرر کیا[58] اور تم پر مَن و سَلوٰیٰ اُتارا[59] ـــــ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور

رِوایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہوگئی ہے۔ مُلاحظہ ہو:

The Talmud Selections, H. Polano, pp 150-54.

۵۶ – سمندر کو عبور کرنے سے لے کر کوہِ سینا کے دامن میں پہنچنے تک کی داستان بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۶–۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ اور وہاں یہ بھی گزر چکا ہے کہ مصر سے نکلتے ہی بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے ایک مندر کو دیکھ کر اپنے لیے ایک بناوٹی خدا مانگ بیٹھے تھے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۸)

۵۷ – یعنی طور کے مشرقی دامن میں۔

۵۸ – سورۂ بَقرہ، رکوع ۶، اور سورۂ اعراف، رکوع ۱۷ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت کا ہدایت نامہ عطا کرنے کے لیے چالیس دن کی میعاد مقرر کی تھی، جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا کیے گئے۔

۵۹ – مَن وسَلوٰیٰ کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۷۳۔ الاعراف، حاشیہ ۱۱۹۔ بائبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی، اس وقت مَن و سلویٰ کا نُزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ (خُروج، باب ۱۶۔ گنتی، باب ۱۱، آیت ۷–۹۔ یشوع، باب ۵، آیت ۱۲) کتابِ خُروج میں مَن و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

> ''اور یوں ہُوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اَوس پڑی ہوئی تھی، اور جب وہ اَوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے: مَنْ؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔'' (باب ۱۶، آیت ۱۳–۱۵)

> ''اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام مَنْ رکھا، اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزا شہد کے بنے ہوئے پُوئے کی طرح تھا۔'' (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

لَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ‌ ۚ وَمَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّىۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰى ﴿۸۲﴾ وَمَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ

اسے کھا کر سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب ٹُوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹُوٹا، وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اُس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں[60]۔

[61] اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰؑ[62]؟

اُس نے عرض کیا: ”وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حُضور آ گیا ہوں اے میرے رب! تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔“

فرمایا: ”اچھا، تو سنو! ہم نے تمھارے پیچھے تمھاری قوم کو آزمایش میں ڈال دیا

”لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کُوٹ لیتے تھے، پھر اُسے ہانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزا تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اَوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَنّ بھی گرتا تھا۔“ (باب ۱۱، آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَنّ ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک دشت نوَردی کی تھی۔ مَنّ اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے مَنّ کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔

۶۰ – یعنی مغفرت کے لیے چار شرطیں ہیں۔ اوّل، توبہ، یعنی سرکشی و نافرمانی یا شرک و کفر سے باز آ جانا۔ دوسرے، ایمان، یعنی اللہ اور رسول اور کتاب اور آخرت کو صدقِ دل سے مان لینا۔ تیسرے، عملِ صالح، یعنی اللہ اور رسول کی ہدایات کے مطابق نیک عمل کرنا۔ چوتھے، اہتدا، یعنی راہِ راست پر ثابت قدم رہنا اور پھر غلط راستے پر نہ جا پڑنا۔

۶۱ – یہاں سے سلسلۂ بیان اُس واقعے کے ساتھ جُڑتا ہے جو ابھی اُوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل سے

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ فَرَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ

اور سامری[63] نے انھیں گمراہ کر ڈالا"۔

موسیٰؑ سخت غصّے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اُس نے کہا:

---

یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ تم طُور کے دائیں جانب ٹھیرو، اور چالیس دن کی مدّت گزرنے پر تمھیں ہدایت نامہ عطا کیا جائے گا۔

۶۲ – اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طُور کی جانبِ اَیمن میں، جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اکیلے روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ اُس موقع پر جو معاملات خدا اور بندے کے درمیان ہوئے، ان کی تفصیلات سورۂ اعراف، رکوع ۱۷ میں درج ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا دیدارِ الٰہی کی اِستِدعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، پھر اللہ کا ایک پہاڑ پر ذرا سی تجلّی فرما کر اسے ریزہ ریزہ کر دینا اور حضرت موسیٰؑ کا بے ہوش ہو کر گر پڑنا، اس کے بعد پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا ہونا، یہ سب اسی وقت کے واقعات ہیں۔ یہاں ان واقعات کا صرف وہ حصہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔ اس کے بیان سے مقصود کفارِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ ایک قوم میں بت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا کرتا ہے، اور اللہ کے نبی اس فتنے کو اپنی قوم میں سر اُٹھاتے دیکھ کر کیسے بے تاب ہو جایا کرتے ہیں۔

۶۳ – یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو، یا نسل کی طرف، یا مَقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السَّامِرِيُّ کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سامری قبیلے، یا نسل، یا مَقام کے بہت سے لوگ موجود تھے، جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اِس مَقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اُن اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مِشنریوں، اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ، معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولتِ اسرائیل کا دارالسلطنت "سامریہ" اِس واقعے کے کئی صدی بعد ۹۲۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سُن گُن پالی ہوگی، اس لیے اُنھوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصّہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اِسی طرح کی باتیں اِن لوگوں نے ہامان کے معاملے میں بنائی ہیں، جسے قرآن فرعون

يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۬ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ ﴿٨٦﴾

''اے میری قوم کے لوگو! کیا تمھارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟[64] کیا تمھیں دن لگ گئے ہیں؟[65] یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اُوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟[66]''

کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اور عیسائی مشنری اور مُستشرِقین اسے اخسویرس (شاہِ ایران) کے درباری امیر ''ہامان'' سے لے جا کر ملا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدّعیانِ علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص، یا قبیلہ، یا مقام ہوا کرتا تھا، اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص، یا قبیلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ سُمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص ''سمر'' نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا۔ اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا، اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا۔ (۱-سلاطین، باب ۱۶، آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے ''سمر'' نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری، اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

۶۴ - ''اچھا وعدہ نہیں کیا تھا'' بھی ترجمہ ہوسکتا ہے۔ متن میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تمھارے رب نے تمھارے ساتھ جتنی بھلائیوں کا وعدہ بھی کیا ہے، وہ سب تمھیں حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تمھیں مصر سے بخیریت نکالا، غلامی سے نجات دی، تمھارے دشمن کو تہس نہس کیا، تمھارے لیے اِن صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں سایے اور خوراک کا بندوبست کیا۔ کیا یہ سارے اچھے وعدے پورے نہیں ہوئے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمھیں شریعت اور ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، کیا تمھارے نزدیک وہ کسی خیر اور بھلائی کا وعدہ نہ تھا؟

۶۵ - دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''کیا وعدہ پورا ہونے میں بہت دیر لگ گئی کہ تم بے صبر ہوگئے؟'' پہلے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ ابھی ابھی جو عظیم الشان احسانات کر چکا ہے، کیا اُن کو کچھ بہت زیادہ مدّت گزر گئی ہے کہ تم انھیں بھول گئے؟ کیا تمھاری مصیبت کا زمانہ بیتے قرنیں گزر چکی ہیں کہ تم سرمست ہو کر بہکنے لگے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب صاف ہے کہ ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے وفا ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی ہے جس کو تم اپنے لیے عذر اور بہانہ بنا سکو۔

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا

انھوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لَد گئے تھے اور ہم نے بس اُن کو پھینک[۶۷] دیا تھا"—— پھر[۶۸] اِسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مُورت بنا کر نکال لایا جس میں سے

۶۶ – اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر قوم اپنے نبی سے کرتی ہے۔ اُس کے اتباع کا وعدہ۔ اس کی دی ہوئی ہدایت پر ثابت قدم رہنے کا وعدہ۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنے کا وعدہ۔

۶۷ – یہ اُن لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا، وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لَد گئے تھے"، اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے، وہ اس صحرا نوَردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگنے کو لے لیے تھے، اور اِس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لُوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اَخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطورِ خود اسے انجام دیا ہو، بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی۔ بائبل کی کتاب خُروج میں ارشاد ہوتا ہے:

> "خدا نے موسیٰؑ سے کہا...... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور اُن کو کہہ...... کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے، بلکہ تمھاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لُوٹ لو گے۔" (باب ۳، آیت ۱۴ تا ۲۲)
>
> "اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا...... سو اب تُو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ اُن میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے، اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا۔" (باب ۱۱، آیت ۱-۳)

لَهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ۬ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ

ع ۱۳

بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اُٹھے: "یہی ہے تمھارا خدا اور موسیٰؑ کا خدا، موسیٰؑ اِسے بھول گیا۔" کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ اُن کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ع

ہارونؑ (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ "لوگو! تم اِس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمھارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔" مگر اُنھوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اسی کی

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کے کہنے کے مُوافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے، اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزّت بخشی کہ جو کچھ انھوں نے مانگا، اُنھوں نے دے دیا۔ سو انھوں نے مصریوں کو لُوٹ لیا۔" (باب ۱۲، آیت ۳۵-۳۶)

افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اِس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے، اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اِسی لُوٹ کا بوجھ تھا۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے "اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا" کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات کو لادے پھرنے سے لوگ تنگ آ گئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات قرار پائی ہو گی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے، پھر اِن کو گلا کر اینٹوں اور سلاخوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے، تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جا سکے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لا لا کر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہو گا۔

۶۸ — یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی عبارت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ قوم کا جواب "پھینک دیا تھا" پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورتِ واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پیش آنے والے فتنے سے بے خبر، اپنے اپنے زیور لا لا کر ڈھیر کرتے چلے گئے، اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ بعد میں زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمّے لے لی، اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی مورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اِس طرح سامری نے قوم کو دھوکا

عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ

پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسٰیؑ واپس نہ آجائے۔[69]"

موسٰیؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارونؑ کی طرف پلٹا اور) بولا: "ہارونؑ! تم نے جب دیکھا تھا کہ

دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصور وار ہوں، یہ تمھارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔

۶۹ — بائبل اِس کے برعکس حضرت ہارونؑ پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہِ عظیم انھی سے سرزد ہوا تھا:

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسٰیؑ نے پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارونؑ کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ، ہمارے لیے دیوتا بنا دے، جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اِس مرد موسٰیؑ کو، جو ہم کو مُلکِ مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے اُن سے کہا: تمھاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں، ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ اُن کے کانوں سے سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر ان کو ہارونؑ کے پاس لے آئے۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے: اے اسرائیل! یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارونؑ نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اُس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہو گی۔" (خُروج، باب ۳۲، آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اِس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہو، اور بعد کے لوگوں نے اِس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خَلط مَلط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مُستَشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، بچھڑے کو خدا اُن کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا، اور ان کے دامن سے اِس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال! اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اِسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے اس کے بعد بنی لاوِی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے اُنھیں قتل کیا جائے، اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اُس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبانی تھے تو انھیں اس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟ کیا بنی لاوِی یہ نہ کہتے کہ موسٰی! ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں

اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ﴿۹۳﴾ قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَ لَا بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ یٰسَامِرِیُّ ﴿۹۵﴾

یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمھارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟[۷۰]"

ہارونؑ نے جواب دیا: "اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ،[۷۱] مجھے اِس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا: تم نے بنی اسرائیل میں پھُوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔[۷۲]"

موسیٰؑ نے کہا: "اور سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟"

---

اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے، حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا؟ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے، میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔" [خروج، ۳۲: ۳۳] لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کا نام نہ مٹایا گیا۔ بلکہ اِس کے برعکس ان کو اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مَقدِس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔ (گنتی، باب ۱۸، آیت ۱-۷) کیا بائبل کی یہ اندرونی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟

۷۰- حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جاتے وقت، اور اپنی جگہ حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی سرداری سونپتے وقت حضرت موسیٰؑ نے دیا تھا۔ سورۂ اعراف میں اسے اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ "اور موسیٰؑ نے (جاتے ہوئے) اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور دیکھو، اصلاح کرنا، مفسدوں کے طریقے کی پیروی نہ کرنا۔" (آیت ۱۴۲)

۷۱- ان آیات کے ترجمے میں ہم نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ چھوٹے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے بڑے تھے، اور حضرت ہارونؑ بڑے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔

۷۲- حضرت ہارونؑ کے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قوم کا مجتمع رہنا اس کے راہِ راست پر رہنے سے زیادہ اہمیّت رکھتا ہے، اور اتحاد چاہے وہ شرک ہی پر کیوں نہ ہو، افتراق سے بہتر ہے، خواہ اس کی بنا حق اور باطل ہی کا اختلاف ہو۔

قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ يَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾

اس نے جواب دیا: "میں نے وہ چیز دیکھی جو اِن لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اُٹھالی اور اُس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سُجھایا[۷۳]۔"

اس آیت کا یہ مطلب اگر کوئی شخص لے گا تو قرآن سے ہدایت کے بجائے گمراہی اخذ کرے گا۔ حضرت ہارونؑ کی پوری بات سمجھنے کے لیے اس آیت کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ وہاں وہ فرماتے ہیں کہ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِىۡ وَكَادُوۡا يَقۡتُلُوۡنَنِىۡ ۖ فَلَا تُشۡمِتۡ بِىَ الۡاَعۡدَآءَ وَلَا تَجۡعَلۡنِىۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ۝ "میری ماں کے بیٹے! اِن لوگوں نے مجھے دبالیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ میں مجھے شمار نہ کر۔" اب ان دونوں آیتوں کو جمع کر کے دیکھیے تو صورتِ واقعہ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس گمراہی سے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر انھوں نے آنجناب کے خلاف سخت فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تُل گئے۔ مجبوراً آپ اس اندیشے سے خاموش ہو گئے کہ کہیں حضرت موسیٰؑ کے آنے سے پہلے یہاں خانہ جنگی برپا نہ ہو جائے، اور وہ بعد میں آ کر شکایت کریں کہ تم اگر اس صورتِ حال سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے تو تم نے معاملات کو اس حد تک کیوں بگڑنے دیا، میرے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ سورۂ اعراف والی آیت کے آخری فقرے سے یہ بھی مُترشّح ہوتا ہے کہ قوم میں دونوں بھائیوں کے دشمنوں کی ایک تعداد موجود تھی۔

۷۳ – اس آیت کی تفسیر میں دو گروہوں کی طرف سے عجیب کھینچ تان کی گئی ہے۔

ایک گروہ، جس میں قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے مفسرین کی بڑی اکثریت شامل ہے، اس کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ "سامری نے رسول یعنی حضرت جبریل کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور ان کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر مٹی اُٹھالی تھی، اور یہ اسی مٹی کی کرامت تھی کہ جب اسے بچھڑے کے بُت پر ڈالا گیا تو اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور جیتے جاگتے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگی۔" حالانکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی باز پُرس کے جواب میں سامری نے یہ بات بنائی۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امرِ واقعی، اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے سمجھ بیٹھے۔

دوسرا گروہ، سامری کے قول کو ایک اور ہی معنیٰ پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ "مجھے رسول، یعنی حضرت موسیٰؑ میں، یا اُن کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہ آئی۔ اس لیے میں نے ایک حد تک اُس کے نقشِ قدم کی پیروی کی، مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا۔" یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اَصفہانی کو سوجھی تھی، پھر امام رازیؒ نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اور اب طرزِ جدید کے مفسرین بالعُموم اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن مُعمّوں اور پہیلیوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ صاف اور عام فہم عربیِ مبین میں نازل ہوا ہے، جس کو ایک عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے کے مطابق سمجھ سکے۔ کوئی شخص جو عربی زبان کے معروف

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ

موسیٰؑ نے کہا: "اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھُونا۔[۷۴] اور

محاورے اور روزمرہ سے واقف ہو، کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ سامری کے اس مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے عربِ مبین میں وہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جو آیتِ زیرِ تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ نہ ایک عام عرب ان الفاظ کو سن کر کبھی وہ مطلب لے سکتا ہے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں سے کسی لفظ کے وہ مختلف مفہومات تلاش کر لینا جو مختلف محاوروں میں اس سے مراد لیے جاتے ہوں، اور ان میں سے کسی مفہوم کو لا کر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دینا جہاں ایک عام عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کرے گا، زباں دانی تو نہیں ہو سکتا، البتہ سُخَن سازی کا کرتب ضرور مانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کرتب فرہنگِ آصفیہ ہاتھ میں لے کر اگر کوئی شخص خود اِن حضرات کی اُردو تحریروں میں، یا آکسفورڈ ڈکشنری لے کر ان کی انگریزی تحریروں میں دکھانے شروع کر دے، تو شاید اپنے کلام کی دو چار ہی تاویلیں سن کر یہ حضرات چیخ اُٹھیں۔ بالعموم قرآن میں ایسی تاویلیں اُس وقت کی جاتی ہیں جب کہ ایک شخص کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑی بے احتیاطی ہو گئی، لاؤ میں ان کی بات اس طرح بنا دوں کہ ان کی غلطی کا پردہ ڈھک جائے اور لوگوں کو ان پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

اس طرزِ فکر کو چھوڑ کر جو شخص بھی اِس سلسلۂ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا، وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا، جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ بلکہ اس پر مزید یہ جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک پُر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریلؑ ہی ہوں، جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور مکّاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ذہنی رشوت دینی چاہتا تھا، تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پُھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطورِ واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لُغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پُر فریب افسانے کو سنتے ہی انھوں نے اس کے منہ پر مار دیا۔

۷۴ — یعنی صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلّقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، بلکہ یہ ذمّہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دُور ہی سے لوگوں کو

لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ

تیرے لیے بازپُرس کا ایک وقتِ مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اِس خدا کو جس پر تو ریجھا ہُوا تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو! تمھارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اُس کا علم حاوی ہے۔"

اے محمدؐ! [۷۵] اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سُناتے ہیں، اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک "ذِکر" (درسِ نصیحت) عطا کیا ہے۔ [۷۶] جو کوئی اِس سے منہ موڑے گا، وہ قیامت کے روز سخت بارِ گناہ اُٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے،

مُطّلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائبل کی کتاب اَحبار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں، اُن میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو، اُس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں، اور وہ اپنے اُوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چِلّا چِلّا کر کہے: "ناپاک ناپاک۔" جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے، وہ ناپاک رہے گا، اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے، اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔" (باب ۱۳، آیت ۴۵-۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا، یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہو گی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے، اُسی طرح اِس اَخلاقی کوڑھ کے مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مُطّلع کرتا رہے کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔

۷۵ – موسیٰ علیہ السلام کا قصّہ ختم کر کے اب پھر تقریر کا رُخ اُس مضمون کی طرف مڑتا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پلٹ کر سورہ کی اُن ابتدائی آیات کو پڑھ لیجیے جن کے بعد یکایک حضرت موسیٰؑ

وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا

اور قیامت کے دن اُن کے لیے (اِس جُرم کی ذمّہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دِہ بوجھ[۷۷] ہوگا، اُس دن جب کہ صُور پھُونکا جائے گا[۷۸] اور ہم مجرموں کو اِس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں[۷۹] گی، آپس میں چُپکے چُپکے کہیں گے کہ دُنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن

کا قصّہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے آپ کی سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آ جائے گی کہ سورہ کا اصل موضوعِ بحث کیا ہے، بیچ میں قصّۂ موسیٰؑ کس لیے بیان ہوا ہے، اور اب قصّہ ختم کر کے کس طرح تقریر اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہی ہے۔

۷۶ - یعنی یہ قرآن، جس کے متعلق آغازِ سورہ میں کہا گیا تھا کہ یہ کوئی اَن ہونا کام تم سے لینے اور تم کو بیٹھے بٹھائے ایک مَشقّت میں مبتلا کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا ہے، یہ تو ایک یاد دہانی اور نصیحت (تذکرہ) ہے ہر اُس شخص کے لیے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو۔

۷۷ - اس میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ جو شخص اس درسِ نصیحت، یعنی قرآن سے منہ موڑے گا اور اس کی ہدایت و رہنمائی قبول کرنے سے انکار کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بھیجنے والے خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اُس کی یہ حماقت دراصل اس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہوگی۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ کوئی شخص، جس کو قرآن کی یہ نصیحت پہنچے اور پھر وہ اسے قبول کرنے سے پہلو تہی کرے، آخرت میں سزا پانے سے بچ نہیں سکتا۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ کسی قوم، کسی ملک، کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ جب تک یہ قرآن دُنیا میں موجود ہے، جہاں جہاں، جس جس ملک اور قوم کے، جس شخص کو بھی یہ پہنچے گا، اس کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوں گے۔ تیسرا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ یا تو اس کو ماننے اور اس کی پیروی اختیار کرے۔ یا اس کو نہ ماننے اور اس کی پیروی سے منہ موڑ لے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام آگے آ رہا ہے۔ اور دوسرا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہے جو اِس آیت میں بتا دیا گیا ہے۔

۷۸ - صُور، یعنی نرسنگھا، قرنا، یا بوق۔ آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور ہدایات دینے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ اور اصطلاحیں استعمال فرماتا ہے جو خود انسانی زندگی میں اسی سے ملتے جُلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان الفاظ اور اصطلاحوں کے استعمال سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہے، نہ یہ کہ ہم سلطنتِ الٰہی کے نظم کی مختلف چیزوں کو بعینہٖ ان محدود معنوں میں لے لیں، اور ان محدود صورتوں کی چیزیں سمجھ لیں جیسی کہ وہ ہماری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک لوگوں کو جمع کرنے اور اہم باتوں کا اعلان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی چیز پھونکی جاتی رہی ہے جو صور یا بگل سے ملتی جُلتی ہو۔

عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً

گزارے ہوں[80] گے ـــــ ہمیں[81] خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اُس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا، وہ کہے گا کہ

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت کے روز پھونکی جائے گی جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے کی سی ہوگی۔ ایک دفعہ وہ پھونکی جائے گی اور سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ دوسری دفعہ پھونکنے پر سب جی اُٹھیں گے اور زمین کے ہر گوشے سے نکل نکل کر میدانِ حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۱۰۶)

**۷۹ –** اصل میں لفظ "زُرْقًا" استعمال ہوا ہے جو اَزْرَق کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود اَزْرَق (سفیدی مائل نیلگوں) ہو جائیں گے، کیونکہ خوف و دہشت کے مارے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو ازرق العین (کرنجی آنکھوں والے) کے معنیٰ میں لیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شدّتِ ہول سے ان کے دیدے پتھرا جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے حدقۂ چشم کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

**۸۰ –** دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "موت کے بعد سے اِس وقت تک تم کو مشکل ہی سے دس دن گزرے ہوں گے۔" قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی دنیوی زندگی کے متعلق بھی یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی، اور موت سے لے کر قیامت تک جو وقت گزرا ہوگا، اس کے متعلق بھی ان کے اندازے کچھ ایسے ہی ہوں گے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ○ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ○ "اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے: ایک دن یا دن کا ایک حصہ رہے ہوں گے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔" (المومنون، آیات ۱۱۲–۱۱۳) دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "اور جس روز قیامت قائم ہو جائے گی تو مجرم لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم (موت کی حالت میں) ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں پڑے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دُنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا، وہ کہیں گے کہ کتاب اللہ کی رُو سے تو تم یوم البعث تک پڑے رہے ہو، اور یہ وہی یوم البعث ہے، مگر تم جانتے نہ تھے۔" (الروم، آیات ۵۵–۵۶) ان مختلف تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی، دونوں ہی کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے۔ دُنیا کی زندگی کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی اُمیدوں کے بالکل خلاف جب انھیں آخرت

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا

نہیں، تمھاری دُنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی ع ــــــــــ یہ لوگ[82] تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب ان کو دُھول بنا کر

کی اَبدی زندگی میں آنکھیں کھولنی پڑیں گی، اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کر کے نہیں آئے ہیں، تو انتہا درجے کی حسرت کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور کفِ افسوس ملیں گے کہ چار دن کے لطف وسَرَّت اور فائدہ ولذت کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلھاڑی مار لی۔ موت کے بعد سے قیامت تک کا وقت انھیں اس لیے تھوڑا نظر آئے گا کہ زندگی بعدِ موت کو وہ دُنیا میں غیر ممکن سمجھتے تھے اور قرآن کے بتائے ہوئے عالَمِ آخرت کا جغرافیہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ ان کے ذہن میں اُترا ہی نہ تھا۔ یہی تصورات لیے ہوئے دُنیا میں احساس وشُعور کی آخری ساعت انھوں نے ختم کی تھی۔ اب جو اچانک وہ آنکھیں ملتے ہوئے دُوسری زندگی میں بیدار ہوں گے اور دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو ایک بِگل یا نرسنگھے کی آواز پر مارچ کرتے پائیں گے، تو وہ شدید گھبراہٹ کے ساتھ اندازہ لگائیں گے کہ فُلاں ہسپتال میں بے ہوش ہونے، یا فلاں جہاز میں ڈوبنے، یا فلاں مَقام پر حادثے سے دوچار ہونے کے بعد سے اِس وقت تک آخر کتنا وقت لگا ہوگا۔ اُن کی کھوپری میں اُس وقت یہ بات سمائے گی ہی نہیں کہ دُنیا میں وہ جاں بحق ہو چکے تھے اور اب یہ وہی دُوسری زندگی ہے جسے ہم بالکل لَغوبات کہہ کر ٹھٹھوں میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھے گا کہ شاید میں چند گھنٹے یا چند دن بے ہوش پڑا رہا ہوں، اور اب شاید ایسے وقت مجھے ہوش آیا ہے، یا ایسی جگہ اتفاق سے پہنچ گیا ہوں جہاں کسی بڑے حادثے کی وجہ سے لوگ ایک طرف کو بھاگے جا رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ آج کل کے مرنے والے صاحب لوگ صور کی آواز کو کچھ دیر تک ہوائی حملے کا سائرن ہی سمجھتے رہیں۔

**۸۱** – یہ جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سامعین کے اس شبہے کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے کہ آخر اُس وقت میدانِ حشر میں بھاگتے ہوئے لوگ چپکے چپکے جو باتیں کریں گے، وہ آج یہاں کیسے بیان ہو رہی ہیں۔

**۸۲** – یہ بھی جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سورت ایک الہامی تقریر کے انداز میں سنائی جا رہی ہوگی، اس وقت کسی نے مذاق اُڑانے کے لیے یہ سوال اُٹھایا ہوگا کہ قیامت کا جو نقشہ آپ کھینچ رہے ہیں، اُس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بھر کے لوگ کسی ہموار میدان میں بھاگے چلے جا رہے ہوں گے۔ آخر یہ بڑے بڑے پہاڑ اس وقت کہاں چلے جائیں گے؟ اس سوال کا موقع سمجھنے کے لیے اس ماحول کو نگاہ میں رکھیے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ مکہ جس مَقام پر واقع ہے، اس کی حالت ایک حوض کی سی ہے جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ سائل نے انھی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہوگی۔ اور وحی کے اشارے سے جواب برملا اسی وقت یہ دے دیا گیا کہ یہ پہاڑ کُوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے جیسے ریت کے ذرّے، اور ان کو دُھول کی طرح اُڑا کر

رَبِّیْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَیَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ

اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے[83]۔ اُس روز سب لوگ مُنادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے، کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی، ایک سرسراہٹ[84] کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اُس روز شفاعت

سا ری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس میں کوئی اُونچ نیچ نہ رہے گی، کوئی نشیب و فراز نہ ہو گا، اس کی حالت ایک ایسے صاف فرش کی سی ہو گی جس میں ذرا سا بل اور کوئی معمولی سی سلوٹ تک نہ ہو۔

**۸۳** — عالَمِ آخرت میں زمین کی جو نئی شکل بنے گی، اسے قرآنِ مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انشقاق میں فرمایا: اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، "زمین پھیلا دی جائے گی۔" سورۂ انفطار میں فرمایا: اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ "سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔" جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی تہیں پھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر اُتر جائے گا۔ سورۂ تکویر میں فرمایا: اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ "سمندر بھر دیے جائیں گے، یا پاٹ دیے جائیں گے۔" اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔ اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ عالَمِ آخرت میں یہ پورا کُرۂ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، نشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔ یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورۂ ابراہیم، آیت ۴۸ میں فرمایا: یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ، "وہ دن جب کہ زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی۔" اور یہی زمین کی وہ شکل ہو گی جس پر حشر قائم ہو گا اور اللہ تعالیٰ عدالت فرمائے گا۔ پھر اس کی آخری اور دائمی شکل وہ بنا دی جائے گی جس کو سورۂ زُمر، آیت ۷۴ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝ یعنی "متقی لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پورے کیے اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم اس جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔" اِس سے معلوم ہوا کہ آخر کار یہ پورا کُرہ جنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہوں گے۔ اُس وقت پوری زمین ایک مُلک ہو گی۔ پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گے۔ (واضح رہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ میں سے ابنِ عباسؓ اور قتادہؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جنّت اِسی زمین پر ہو گی، اور سورۂ نجم کی آیت عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ۝

الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ

کارگر نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سُننا پسند کرے[85] ــــــ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دُوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے[86] ــــــ لوگوں کے سر اُس

کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جنت ہے جس میں اب شہدا کی ارواح رکھی جاتی ہیں)۔

۸۴ – اصل میں لفظ "ھَمْس" استعمال ہوا ہے، جو قدموں کی آہٹ، چپکے چپکے بولنے کی آواز، اُونٹ کے چلنے کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز، بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ اور چپکے چپکے بات کرنے والوں کی کُھسر پُھسر کے، نہیں سنی جائے گی۔ ایک پُرہیبت سماں بندھا ہوا ہوگا۔

۸۵ – اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک، وہ جو متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا، یہ کہ "اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ کسی کے حق میں رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو۔" الفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی، کجا کہ کوئی سِفارش کے لیے بطورِ خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے، اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الٰہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدّد مقامات پر کھول کر بتادی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟" (بقرہ، آیت ۲۵۵) اور: یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○ "وہ دن جب کہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔" (النبا، آیت ۳۸) دوسری طرف ارشاد ہوا: وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ○ "اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے، بجز اس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر (رحمٰن) راضی ہو، اور وہ اُس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔" (الانبیاء، آیت ۲۸) اور کَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ○ "کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی، بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے۔" (النجم، آیت ۲۶)

۸۶ – یہاں وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیا یا اولیا، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دُنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کیسی کیسی ذمّہ داریوں کے بار لے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے،

لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا ھَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾

حَیّ وقیُّوم کے آگے جُھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اُس وقت کسی ظلم کا بارِ گناہ اُٹھائے ہوئے ہو۔ اور کسی ظلم یا حق تلفی کا خطرہ نہ ہوگا اُس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اِس کے ساتھ وہ مومن[۸۷] بھی ہو۔

اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اس کا مَوقِف کیا ہے۔ نیک ہے تو کیسا نیک ہے، اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے۔ معافی کے قابل ہے یا نہیں۔ پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیا اور صلحا کو سِفارش کی کھلی چھٹی دے دی جائے، اور ہر ایک جس کے حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا، اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لائیں گے، دراں حالے کہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں، ان کے نامۂ اعمال کیسے ہیں۔ دُنیا میں جو افسر کچھ بھی احساسِ ذمّہ داری رکھتا ہے، اس کی رَوِش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصوروار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نافرض شناس، رشوت خوار اور خلقِ خدا کو تنگ کرنے والا ہے، میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے، وہ کس قدر صحیح، معقول اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے، جو دُنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انھیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انھیں بولنے کی اجازت دے گا، صرف اُسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی برحق ہو، جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشادِ ربّانی صاف بتا رہا ہے۔ بونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دُنیا میں سیکڑوں، ہزاروں بندگانِ خدا کے حُقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اُٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور! اسے انعام سے سرفراز فرمائیں، یہ میرا خاص آدمی ہے۔

۸۷ - یعنی وہاں فیصلہ ہر انسان کے اوصاف (merits) کی بنیاد پر ہوگا۔ جو شخص کسی ظلم کا بارِ گناہ اُٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے ظلم اپنے خدا کے حُقوق پر کیا ہو، یا خلقِ خدا کے حقوق پر، یا خود اپنے نفس پر، بہر حال یہ چیز اسے کامیابی کا منہ نہ دیکھنے دے گی۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان اور عملِ صالح (محض عملِ صالح نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح، اور محض ایمان بھی نہیں بلکہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان) لیے ہوئے آئیں گے، اُن کے لیے وہاں نہ تو اس امر کا کوئی

وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفۡنَا فِيۡهِ مِنَ الۡوَعِيۡدِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ اَوۡ يُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِكۡرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ ۚ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ۫ وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

اور اے محمدؐ! اِسی طرح ہم نے اِسے قرآنِ عَرَبی بنا کر نازل کیا ہے[88] اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات کی ہیں، شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اِس کی بدولت پیدا ہوں۔[89]

پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہِ حقیقی۔[90]

اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو، جب تک کہ تمھاری طرف اُس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے، اور دُعا کرو کہ اَے پروردگار! مجھے مزید علم عطا کر۔[91]

اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم ہو گا، یعنی خواہ مخواہ بے قصور ان کو سزا دی جائے گی، اور نہ اسی امر کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جائے گا اور ان کے جائز حُقوق مار کھائے جائیں گے۔

۸۸ – یعنی ایسے ہی مضامین اور تعلیمات اور نصائح سے لبریز۔ اِس کا اشارہ ان تمام مضامین کی طرف ہے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض قریبی مضمون کی طرف جو اُوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلۂ بیان اُن آیات سے جُڑتا ہے جو قرآن کے متعلق آغازِ سورہ اور پھر قصّۂ موسیٰؑ کے اختتام پر ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ”تذکرہ“ جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، اور وہ ”ذِکر“ جو ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو عطا کیا ہے، اِس شان کا تذکرہ اور ذِکر ہے۔

۸۹ – یعنی اپنی غفلت سے چونکیں، بھولے ہوئے سبق کو کچھ یاد کریں، اور ان کو کچھ اِس امر کا احساس ہو کہ کن راہوں میں بھٹکے چلے جا رہے ہیں اور اس گمراہی کا انجام کیا ہے۔

۹۰ – اِس طرح کے فقرے قرآن میں بالعُموم ایک تقریر کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کلام کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ہو۔ اندازِ بیان اور سِیاق وسَباق پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک تقریر ختم ہو گئی ہے اور وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ سے دوسری تقریر شروع ہوتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں گی، اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ الٰہی کے تحت ان کو ایک سورہ میں جمع کر دیا ہو گا۔ جمع کرنے کی وجہ دونوں کے مضمون کی مناسبت ہے جس کو ابھی ہم واضح کریں گے۔

۹۱ – فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ ۚ پر تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رخصت ہوتے ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر خبردار کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اب وہ اس کا نوٹس لے رہا ہے۔ بات کیا تھی جس پر

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبۡلُ فَنَسِيَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهُۥ عَزۡمٗا ﴿١١٥﴾ ع

ہم[92] نے اِس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا[93] تھا، مگر وہ بھُول گیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا[94]۔ ع

یہ تنبیہ کی گئی، اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے دُہرانے کی کوشش فرمارہے ہوں گے۔ اس کوشش کی وجہ سے آپؐ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہوگی۔ سلسلۂ اخذِ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپؐ کو پیغامِ وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے، اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپؐ کرتے ہیں، اس سے منع کر دیا جائے۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ کا یہ حصہ ابتدائی زمانے کی وحیوں میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے میں، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی اخذِ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی، آپؐ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے، اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی فقرہ اِس پر آپؐ کو مُتنبّہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورۂ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی ہوا تھا، اور اس پر سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپؐ کو ٹوکا گیا کہ لَا تُحَرِّكۡ بِهِۦ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهِۦٓ ۝ إِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهُۥ وَقُرۡءَانَهُۥ ۝ فَإِذَا قَرَأۡنَٰهُ فَٱتَّبِعۡ قُرۡءَانَهُۥ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهُۥ ۝ ”اسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اِسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے، لہٰذا جب ہم اسے سنا رہے ہوں تو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔“ سورۂ اعلیٰ میں بھی آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم اسے پڑھوا دیں گے اور آپؐ بھولیں گے نہیں: سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰٓ۔ بعد میں جب آپؐ کو پیغاماتِ وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہوگئی تو اس طرح کی کیفیات آپؐ پر طاری ہونی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تنبیہ ہمیں نہیں ملتی۔

**۹۲** – جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، یہاں سے ایک الگ تقریر شروع ہوتی ہے جو غالباً اُوپر والی تقریر کے بعد کسی وقت نازل ہوئی ہے اور مضمون کی مناسبت سے اُس کے ساتھ ملا کر ایک ہی سورہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ مضمون کی مناسبتیں متعدّد ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) وہ بھُولا ہُوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے، وہی سبق ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا، اور جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار ”ذِکر“ آتے رہے ہیں۔

(۲) انسان اُس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے، اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اُس کے اوّلین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے، اِسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاد دہانی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اُس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اِس

"ذِکر" کے ساتھ وہ کرے گا، آغازِ آفرینش ہی میں صاف صاف بتا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہو گے، ورنہ دُنیا و آخرت، دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

(۴) ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری، جس کی وجہ سے انسان اپنے اَزلی دشمن، شیطان کے بہکائے میں آ جائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویّے کی اصلاح کر لے اور انحراف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی، جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اِس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا، اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس رَوِش پر چلے گا۔

۹۳ – آدم علیہ السلام کا قصّہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف (دو مقامات پر)، سورۂ حِجر، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے۔ یہ ساتواں موقع ہے جب کہ اسے دُہرایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ سلسلۂ بیان سے اس کی مناسبت الگ ہے، اور ہر جگہ اسی مناسبت کے لحاظ سے قصّے کی تفصیلات مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ قصّے کے جو اجزا ایک جگہ کے موضوعِ بحث سے مناسبت رکھتے ہیں، وہ اسی جگہ بیان ہوئے ہیں، دوسری جگہ وہ نہ ملیں گے، یا طرزِ بیان ذرا مختلف ہو گا۔ پورے قصّے کو اور اس کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان تمام مَقامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ اس کے ربط و تعلق اور اس سے نکلنے والے نتائج کو اپنے حواشی میں بیان کر دیا ہے۔

۹۴ – یعنی اُس نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا، وہ اِستکبار اور قصدی و ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال اور نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پروا کرتا ہوں، اس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا، خدا کون ہوتا ہے کہ میرے معاملات میں دخل دے۔ اِس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا، اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا، اُس وقت وہ ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمایش کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرتا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔

بعض لوگوں نے "اُس میں عزم نہ پایا" کا مطلب یہ لیا ہے کہ "ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا"، یعنی اُس نے جو کچھ کیا بھولے سے کیا، نافرمانی کے عزم کی بنا پر نہیں کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا عَلَی الْعِصْیَانِ کہا جاتا، نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فُقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت کو دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قصّہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا، اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنستی رہی ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدمؑ[95] سے کہا کہ "دیکھو! یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے[96]، ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں

مزید برآں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا، اس کے ذہن میں پہلا مفہوم یہی آئے گا کہ "ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم، یا مضبوط ارادہ نہ پایا۔" دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ آدم علیہ السلام کی طرف مَعصِیَت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنیٰ کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی رائے علامہ آلوسیؒ نے بھی اس موقع پر اپنی تفسیر میں ظاہر فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں: لکن لا یخفٰی علیك ان ھٰذا التفسیر غیر متبادرٍ ولا کثیر المناسبة للمقام، "مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہو گی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع و محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔" (ملاحظہ ہو: روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۲۴۳)

**۹۵ –** یہاں وہ اصل حکم بیان نہیں کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ "اِس خاص درخت کا پھل نہ کھانا" وہ حکم دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر چونکہ بتانے کی اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہ اور فہمایش کے باوجود اپنے جانے بُوجھے دشمن کے اغوا سے متأثّر ہو جاتا ہے، اور کس طرح اس کی یہی کمزوری اس سے وہ کام کرا لیتی ہے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصل حکم کا ذکر کرنے کے بجائے یہاں اُس فہمایش کا ذکر کیا ہے جو اس حکم کے ساتھ حضرت آدمؑ کو کی گئی تھی۔

**۹۶ –** دشمنی کا مظاہرہ اُسی وقت ہو چکا تھا۔ آدم اور حوا علیہما السلام خود دیکھ چکے تھے کہ ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے، اور صاف صاف یہ کہہ کر کیا ہے کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ○ "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔" (اعراف، آیت ۱۲۔ ص، آیت ۷۶) اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ "ذرا دیکھ تو سہی، یہ ہے وہ ہستی جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔" ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ "اب کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" (بنی اسرائیل، آیات ۶۱–۶۲) پھر اتنے ہی پر اس نے اکتفا نہ کیا کہ کھلم کھلا اپنے حسد کا اظہار کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس نے مہلت بھی مانگی کہ مجھے اپنی فضیلت اور اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیجیے، میں اِسے بہکا کر آپ کو دکھا دوں گا کہ کیسا ہے یہ آپ کا خلیفہ۔ اعراف، حِجر اور بنی اسرائیل میں اس کا یہ چیلنج گزر چکا ہے اور آگے سورۂ ص میں بھی آ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ یہ تمھارا دشمن ہے، تو یہ محض ایک امرِ غیب کی اطلاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے عین برسرِ موقع دونوں میاں بیوی اپنی آنکھوں دیکھ چکے اور اپنے کانوں سن چکے تھے۔

الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ

---

جنت سے نکلوا دے[۹۷] اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں یہ آسایشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دُھوپ تمھیں ستاتی ہے[۹۸]۔" لیکن شیطان نے اس کو پُھسلایا[۹۹]۔ کہنے لگا: "آدمؑ! بتاؤں تمھیں وہ درخت جس سے اَبَدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے[۱۰۰]؟" آخرِکار دونوں (میاں بیوی) اُس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے سَتر

---

**۹۷** — اس طرح یہ بھی دونوں کو بتا دیا گیا کہ اگر اس کے بہکائے میں آکر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو جنّت میں نہ رہ سکو گے اور وہ تمام نعمتیں تم سے چھن جائیں گی جو تم کو یہاں حاصل ہیں۔

**۹۸** — یہ تشریح ہے اُس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسان کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ یہاں تمھارے لیے غذا، پانی، لباس اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے، تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم وحوا علیہما السلام پر واضح ہوگئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکائے میں آکر حکمِ سرکار کی خلاف ورزی کریں گے تو جنّت سے نکل کر انھیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسایشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات تک کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینا جب تک نہ بہائیں گے، ایک وقت کی روٹی تک نہ پا سکیں گے۔ مَعاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصّہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی نہ طاقت۔

**۹۹** — یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم وحوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے وسوسے میں ڈالا، آدم علیہ السلام تھے، نہ کہ حضرت حوا۔ اگرچہ سورۂ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطَب دونوں ہی تھے اور بہکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی وسوسہ اندازی کا رُخ دراصل حضرت آدمؑ ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس بائبل کا بیان یہ ہے کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی، اور پھر عورت نے اپنے شوہر کو بہکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا۔ (پیدایش، باب ۳)

**۱۰۰** — سورۂ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے: وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ○ "اور اس نے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ جیتے نہ رہو۔" (آیت ۲۰)

لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ

ایک دوسرے کے آگے کُھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتّوں سے ڈھانکنے۔[101] آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔[102] پھر اُس کے رب نے اُسے برگزیدہ کیا[103] اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی۔[104] اور فرمایا: ''تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور

**۱۰۱** – بالفاظِ دیگر، نافرمانی کا صُدور ہوتے ہی وہ آسایشیں ان سے چھین لی گئیں جو سرکاری انتظام سے ان کو مہیا کی جاتی تھیں، اور اس کا اوّلین ظہور لباس چھِن جانے کی شکل میں ہوا۔ غذا، پانی اور مسکن سے محرومی کی نوبت تو بعد کو ہی آنی تھی، اس کا پتا تو بھوک پیاس لگنے پر ہی چل سکتا تھا، اور مکان سے نکالے جانے کی باری بھی بعد ہی میں آسکتی تھی۔ مگر پہلی چیز جس پر نافرمانی کا اثر پڑا، وہ سرکاری پوشاک تھی جو اسی وقت اُتروالی گئی۔

**۱۰۲** – یہاں اُس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسایشیں حاصل تھیں، ان کا تجربہ انھیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمھارا دشمن تمھیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا تمھیں یہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ شیطان اُن کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کَنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصح، مشفق اور خیر خواہ دوست کے بھیس میں آکر ایک بہتر حالت (زندگیِ جاوداں اور سلطنتِ لازوال) کا لالچ دلایا، تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں نہ جم سکے اور پھسل گئے، حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا، اور اس کے فرمان کے بارے میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری جذبے نے، جو شیطانی تحریص کے زیرِ اثر اُبھر آیا تھا، ان پر ذہول طاری کر دیا، اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مَقامِ بلند سے مَعصِیَت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ ''بھول'' اور ''فُقدانِ عزم'' ہے جس کا ذکر قصّے کے آغاز میں کیا گیا تھا، اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی، اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

**۱۰۳** – یعنی شیطان کی طرح راندۂ درگاہ نہ کر دیا، اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں وہ گر گئے تھے، وہیں انھیں پڑا نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اُٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے اور اکڑ اور ہیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا، اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

---

شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دُوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے "ذِکر" (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا، اُس کے لیے دُنیا میں تنگ زندگی ہوگی[۱۰۵] اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اُٹھائیں گے[۱۰۶]۔"

---

اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بھول" اور "فقدانِ عزم" کی وجہ سے قصور کر گزرا ہو، اور پھر ہوش آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا، کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اُٹھے تھے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" (اعراف، آیت ۲۳)

۱۰۴ — یعنی صرف معاف ہی نہ کیا، بلکہ آیندہ کے لیے راہِ راست بھی بتائی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

۱۰۵ — دُنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اِقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی، جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کش مکش جاری رہے گی، جو اسے کبھی امن و اطمینان اور سچّی مَسَرّت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

۱۰۶ — اس جگہ آدم علیہ السلام کا قصّہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصّہ جس طریقے سے یہاں، اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت ممکن ہے کہ آسمانوں میں ہو، اور ممکن ہے کہ اِسی زمین پر بنائی گئی ہو۔ بہر حال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمے تھا اور خدمت گار (فرشتے) اُس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا، تاکہ اُمیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔

چنانچہ امتحان لیا گیا، اور جو بات کُھلی، وہ یہ تھی کہ یہ اُمیدوارتحریص واِطماع کے اثر میں آ کر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا، اور اس کے علم پر نسیان غالب آ جاتا ہے۔ اِس امتحان کے بعد آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمایشی خلافت دی گئی، اور آزمایش کے لیے ایک مدت (اَجَلِ مُسَمًّی، جس کا اختتام قیامت پر ہوگا) مقرر کر دی گئی۔ اِس آزمایش کے دَور میں اُمیدواروں کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انھیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمایش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر بھول لاحق ہوتی ہے، یا تحریص واِطماع کے اثر میں آ کر پھسلتے ہیں، تو تنبیہ، تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سنبھلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا معصیت کا؟ اس آزمایشی خلافت کے دَوران میں ہر ایک کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے، انھی کو پھر مستقل خلافت، اُس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اُس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے وہ صالح بندے ہوں گے جنھوں نے آزمایشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا بھول لاحق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف پلٹ کر اپنی اہلیّت ثابت کر دی ہوگی۔ جنت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اَینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہوگی، بغیر اس کے کہ اس کے لیے کسی تنزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافتِ الٰہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا، بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور اُن خدمات کا تصور کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچّے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو اِزدِواجی زندگی کی کیفیّات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن میں جنت کی زندگی کے صرف انھی لذائذ کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دُنیا کی لذتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آدمؑ وحوّاؑ کا قصہ جس طرح بائبل میں بیان ہوا ہے، اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ بائبل کا بیان ہے کہ ”اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا، تو انسان جیتی جان ہوا۔ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو، جسے اُس نے بنایا تھا، وہاں رکھا۔“ ”اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔“ ”اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے، لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا، تُو مرا۔“ ”اور خداوند خدا اس پسلی سے، جو اس نے آدمؑ میں سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر اسے آدمؑ کے پاس لایا۔“ ”اور آدمؑ اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔“ ”اور سانپ کُل دشتی جانوروں سے، جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا، اور اس نے عورت سے کہا: کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟“ ”سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔“ چنانچہ عورت نے اس کا پھل لے کر کھایا اور

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا‌ ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ اَسۡرَفَ

—— وہ کہے گا: ”پروردگار! دُنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”ہاں، اِسی طرح تُو ہماری آیات کو، جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تُو نے بھلا دیا تھا۔ اُسی طرح آج تُو بُھلایا جارہا ہے۔“[۱۰۷] —— اِس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے

اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔“ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں، اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدمؑ اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔“ پھر خدا نے آدمؑ کو پکارا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں تیری آواز سن کر ڈرا اور چھپ گیا، کیونکہ میں ننگا تھا۔ خدا نے کہا: ارے، تجھ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تو ننگا ہے؟ ضرور تو نے اس درخت کا پھل کھایا ہوگا جس سے میں نے منع کیا تھا۔ آدمؑ نے کہا کہ مجھے حوا نے اس کا پھل کھلایا، اور حوا نے کہا مجھے سانپ نے بہکایا تھا۔ اس پر خدا نے سانپ سے کہا: ”اس لیے کہ تو نے یہ کیا، تُو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھیرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا، اور میں تیرے اور عورت کے درمیان، اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گی، اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔“ اور عورت کو یہ سزا دی کہ ”میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی، اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی، اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔“ اور آدمؑ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور میرے حکم کے خلاف کیا ”اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، مَشقّت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا...... تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔“ پھر ”خداوند خدا نے آدمؑ اور اس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کُرتے بنا کر اُن کو پہنائے۔“ ”اور خداوند خدا نے کہا: دیکھو، انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اُس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔“ (پیدائش، باب ۲، آیات ۷-۲۵، باب ۳، آیات ۱-۲۳)

بائبل کے اِس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔

۱۰۷- قیامت کے روز نئی زندگی کے آغاز سے لے کر جہنّم میں داخل ہونے تک جو مختلف کیفیات مجرمین پر گزریں گی، ان کو قرآنِ مجید میں مختلف مواقع پر جُدا جُدا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کیفیت یہ ہے: لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا

وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ

رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دُنیا میں) بدلہ دیتے ہیں،[108] اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

پھر کیا اِن لوگوں کو[109] (تاریخ کے اِس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ اِن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت

عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿﴾ ''تو اِس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا ہے، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔'' یعنی تجھے خوب نظر آ رہا ہے۔ (ق، آیت ۲۲) دوسری کیفیت یہ ہے: اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿﴾ ''اللہ تو انھیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اُٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اُوپر جمی ہیں اور دل ہیں کہ اُڑے جاتے ہیں۔'' (ابراہیم، آیت ۴۳) تیسری کیفیت یہ ہے: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿﴾ ''اور قیامت کے روز ہم اس کے لیے ایک نوِشتہ نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب پائے گا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تُو خود ہی کافی ہے۔'' (بنی اسرائیل، آیت ۱۳-۱۴) اور انھی کیفیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو آیتِ زیرِ بحث میں بیان ہوئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ لوگ آخرت کے ہولناک مناظر اور اپنی شامتِ اعمال کے نتائج کو تو خوب دیکھیں گے، لیکن بس ان کی بینائی یہی کچھ دیکھنے کے لیے ہوگی۔ باقی دوسری حیثیتوں سے ان کا حال اندھے کا سا ہوگا جسے اپنا راستہ نظر نہ آتا ہو، جو نہ لاٹھی رکھتا ہو کہ ٹٹول کر چل سکے، نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کے چلانے والا ہو، قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا ہو، اور اس کو کچھ نہ سُوجھتا ہو کہ کدھر جائے اور اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرے۔ اسی کیفیت کو اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ ''جس طرح تو نے ہماری آیات کو بھلا دیا تھا، اُسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔'' یعنی آج کوئی پروا نہ کی جائے گی کہ تو کہاں کہاں ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے اور کیسی کیسی محرومیاں برداشت کر رہا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے گا، کوئی تیری حاجتیں پوری نہ کرے گا، اور تیری کچھ بھی خبرگیری نہ کی جائے گی۔

۱۰۸- اشارہ ہے اس ''تنگ زندگی'' کی طرف جو اللہ کے ''ذِکر''، یعنی اس کی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے درسِ نصیحت سے منہ موڑنے والوں کو دُنیا میں بسر کرائی جاتی ہے۔

۱۰۹- اشارہ ہے اہلِ مکہ کی طرف جو اُس وقت مخاطب تھے۔

فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا

اِس میں[110] بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں ؏

اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مُہلت کی ایک مدّت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور اِن کا بھی فیصلہ چُکا دیا جاتا۔ پس اے محمدؐ! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد وثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سُورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی[111]، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ[112]۔ اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان وشوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف

---

۱۱۰ – یعنی تاریخ کے اِس سبق میں، آثارِ قدیمہ کے اس مشاہدے میں، نسلِ انسانی کے اِس تجربے میں۔

۱۱۱ – یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ابھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مُہلت کی ایک مدّت مقرر کر چکا ہے، اس لیے اُس کی دی ہوئی اس مُہلت کے دَوران میں یہ جو کچھ بھی تمھارے ساتھ کریں، اُس کو تمھیں برداشت کرنا ہوگا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ وترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضۂ تبلیغ وتذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اِس تحمل وبرداشت اور اس صبر کی طاقت تمھیں نماز سے ملے گی، جس کو تمھیں اِن اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

''رب کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی تسبیح'' کرنے سے مراد نماز ہے، جیسا کہ آگے چل کر خود فرما دیا: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا ''اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔''

نماز کے اوقات کی طرف یہاں بھی صاف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ سُورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز، سُورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز، اور رات کے اوقات میں عشا اور تہجد کی نماز۔ رہے دن کے کنارے، تو وہ تین ہی ہو سکتے ہیں: ایک کنارہ صبح ہے، دوسرا کنارہ زوالِ آفتاب، اور تیسرا کنارہ شام۔ لہٰذا دن کے کناروں سے مراد فجر، ظہر اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۱۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۱ تا ۹۷۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۲۴۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۷۴۔

مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

قِسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انھیں آزمایش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال[113] ہی بہتر اور پایندہ تر ہے۔ اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو[114] اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمھیں دے رہے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔[115]

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟

---

۱۱۲ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمھیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں، اور اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی، وہ داعیِ حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندناتے بھی پھریں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا جس سے تمھارا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدّد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿﴾ ''توقع ہے کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود پر پہنچا دے گا'' (آیت ۷۹) اور سورہ ضحیٰ میں فرمایا: وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ ﴿﴾ ''تمھارے لیے بعد کا دَور یقیناً پہلے دَور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔'' (آیت ۴-۵)

۱۱۳ – رزق کا ترجمہ ہم نے ''رزقِ حلال'' کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو ''رزقِ رب'' سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا اور تمھارے ساتھی اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ یہ فُسّاق وفجار ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی زندگی میں جو ظاہری چمک دمک پیدا کر لیتے ہیں، اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ شان وشوکت تمھارے لیے ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے۔ جو پاک رزق تم اپنی محنت سے کماتے ہو، وہ خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو، راست باز اور ایمان دار آدمیوں کے لیے وہی بہتر ہے اور اسی میں وہ بھلائی ہے جو دُنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔

۱۱۴ – یعنی تمھارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی وخستہ حالی کے مقابلے میں اِن حرام خوروں کے عیش وعشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں۔ یہ چیز اُن کے زاویۂ نظر کو بدل دے گی۔ ان کے معیارِ قدر کو بدل دے گی۔ ان کی

اَوَلَمۡ تَاۡتِہِمۡ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳۳﴾ وَلَوۡ اَنَّاۤ اَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِعَذَابٍ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَقَالُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَنَخۡزٰی ﴿۱۳۴﴾ قُلۡ کُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اہۡتَدٰی ﴿۱۳۵﴾ ع

ع ۸ ۱۷

اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیانِ واضح نہیں آ گیا؟[116] اگر ہم اُس کے آنے سے پہلے اِن کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اَے ہمارے پروردگار! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اے محمدؐ! اِن سے کہو: ہر ایک انجامِ کار کے انتظار میں ہے[117]۔ پس اب منتظر رہو، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ ع

توجّہات کا مرکز بدل دے گی۔ وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اُس بھلائی کو، جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے، اُس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دُنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۱۵ – یعنی ہم نماز پڑھنے کے لیے تم سے اس لیے نہیں کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہے۔ فائدہ تمھارا اپنا ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو گا جو دُنیا اور آخرت دونوں ہی میں آخری اور مستقل کامیابی کا وسیلہ ہے۔

۱۱۶ – یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انھی میں سے ایک اُمّی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کُتُبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اُن کتابوں میں جو کچھ تھا، وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا، بلکہ اس کو ایسا کھول کر واضح بھی کر دیا گیا کہ صحرا نشین بدّو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

۱۱۷ – یعنی جب سے یہ دعوت تمھارے شہر میں اُٹھی ہے، نہ صرف اس شہر کا بلکہ گرد و پیش کے علاقے کا بھی ہر شخص انتظار کر رہا ہے کہ اس کا انجامِ آخرِ کار کیا ہوتا ہے۔

# تفہیم القرآن

## الانبیآء

(۲۱)

# الانبیآء

**نام** اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسلسل بہت سے انبیاؑ کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام "الانبیاء" رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورت کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

**زمانۂ نزُول** مضمون اور اندازِ بیان، دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکے کا دَورِ متوسط، یعنی ہماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کا تیسرا دَور ہے۔ اس کے پَس منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دَور کی سورتوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

**موضوع و مضمون** اس سورہ میں وہ کش مکش زیرِ بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرتؐ کے دعوائے رسالت اور آپؐ کی دعوتِ توحید و عقیدۂ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے، ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپؐ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جا رہی تھیں، ان پر زَجر و توبیخ کی گئی ہے اور اِن حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپؐ کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اُس پر مُتنَبِّہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو، وہ دراصل تمھارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

دَورانِ تقریر میں خاص طور پر جو اُمور زیرِ بحث آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) کفارِ مکہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہوسکتا، اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کرنا ــــــ اِس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

(۲) اُن کا آپؐ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر نہ جمنا ــــــ اِس پر مختصر مگر نہایت پُر زور اور معنیٰ خیز طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

(۳) ان کا یہ تصور کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روز کھیل کر یونہی ختم ہو جانا ہے، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا ہے، کسی حساب کتاب اور جزا و سزا سے سابقہ نہیں پیش آنا ہے ــــــ یہ چیز چونکہ اُس غفلت و بے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

(۴) شرک پر ان کا اصرار اور توحید کے خلاف ان کا جاہلانہ تعصُّب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نِزاع تھا ـــــ اِس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور توحید کے حق میں مختصر مگر بہت وزنی اور دل نشین دلائل دیے گئے ہیں۔

(۵) اُن کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار جھٹلانے کے باوجود جب ان پر کوئی عذاب نہیں آتا تو ضرور نبی جھوٹا ہے اور عذابِ الٰہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے ہمیں سناتا ہے، محض خالی خولی دھمکیاں ہیں ـــــ اِس کو اِستِدلال اور نصیحت، دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیا علیہم السلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظیریں پیش کی گئی ہیں، جن سے یہ سمجھانا مقصُود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دَوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دُنیا کے عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ اُلُوہیّت اور خدائی کا ان میں شائبہ تک نہ تھا، بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے ساتھ انھی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اور بھی واضح کی گئی ہیں: ایک، یہ کہ انبیاؑ پر طرح طرح کے مصائب آئے ہیں، اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو برباد کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے، یہ کہ تمام انبیاؑ کا دین ایک تھا، اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی ہے، اور باقی جتنے مذاہب دُنیا میں بنے ہیں، وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے تفرِقے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے، وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جو لوگ اسے ردّ کر دیں گے، وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبیؐ کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

---

۱۱۲ ایاتھا — سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ مَکِّیَّۃٌ — ۷ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ

الجزء ۱۷

قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت[۱]، اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں[۲]۔ اُن کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے[۳]، اُس کو بہ تکلّف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں[۴]، دِل ان کے (دُوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں۔ اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ "یہ شخص آخر تم جیسا

۱ — مراد ہے قربِ قیامت۔ یعنی اب وہ وقت دُور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ، "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت اِن دو اُنگلیوں کی طرح ہیں۔" یعنی میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حائل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور بشیر ونذیر آنے والا نہیں ہے۔

۲ — یعنی کسی تنبیہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ خود سوچتے ہیں کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے اور نہ اُس پیغمبر کی بات سنتے ہیں جو انھیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۳ — یعنی قرآن کی ہر نئی سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے اور انھیں سنائی جاتی ہے۔

۴ — وَھُمْ یَلْعَبُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو اُوپر ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس میں کھیل سے مراد یہی زندگی کا کھیل ہے جسے خدا اور آخرت سے غافل لوگ کھیل رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ

اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③

ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادُو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے[5]؟''

اسے سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے بلکہ کھیل اور مذاق کے طور پر سنتے ہیں۔

۵ - ''پھنسے جاتے ہو'' بھی ترجمہ ہوسکتا ہے، اور دونوں ہی مطلب صحیح ہیں۔ سرگوشیاں کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہرحال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اِس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو اور ہماری بہ نسبت اِس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو؟ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادُو ہے، کہ جو اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے، وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادُو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔

جس چیز کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ''سِحر'' کا الزام چسپاں کرتے تھے، اس کی چند مثالیں آپؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق (مُتوفّٰی ۱۵۲ھ) نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عُتبہ بن ربیعہ (ابوسفیانؓ کے خسر، ہندؓ جگر خوار کے باپ) نے سردارانِ قریش سے کہا: اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمدؐ سے ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تعداد روز بروز بڑھتی دیکھ کر اکابرِ قریش سخت پریشان ہو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا: ابوالولید! تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔ وہ حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا: ''بھتیجے! ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو، اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرِقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ اس کے دین اور اس کے معبُودوں کی بُرائی کی۔ باپ دادا جو مر چکے ہیں، ان سب کو تم نے گمراہ اور کافر بنایا۔ بھتیجے! اگر ان باتوں سے تمھارا مقصد دُنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے، تو آؤ ہم سب مل کر تم کو اتنا روپیا دے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ سرداری چاہتے ہو تو ہم تمھیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر تمھیں کوئی بیماری ہوگئی ہے جس کی وجہ سے تم کو واقعی سوتے یا جاگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے، تو ہم سب مل کر بہترین طبیبوں سے تمھارا علاج کرائے دیتے ہیں۔'' یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپؐ نے فرمایا: ''ابوالولید! جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟'' اس نے کہا: ''بس مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔'' آپؐ نے فرمایا: اچھا، اب میری سنو: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپؐ سورۂ حٰم السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عُتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اڑتیسویں آیت پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، اور پھر سر اُٹھا کر عُتبہ سے فرمایا:

''ابوالولید! جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عتبہ یہاں سے اُٹھ کر سردارانِ قریش کی طرف پلٹا تو لوگوں نے دُور سے ہی اس کو آتے دیکھ کر کہا: ''خدا کی قسم! ابوالولید کا چہرا بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا۔'' اس کے پہنچتے ہی لوگوں نے سوال کیا: ''کہو ابوالولید! کیا کر آئے ہو؟'' اس نے کہا: ''خدا کی قسم! آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ! یہ شعر نہیں ہے، نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ اے مَعْشَرِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں، رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کا خون تمھاری گردن پر نہ ہوگا، دوسروں پر ہوگا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمھاری حکومت ہوگی، اور اس کی عزت تمھاری عزت۔'' لوگوں نے کہا: ''واللہ، ابوالولید! تم پر بھی اس کا جادُو چل گیا۔'' اس نے کہا: ''یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمھارا کام۔'' (ابنِ ہِشَام، جلد اوّل، ص ۳۱۳-۳۱۴) بَیْہَقی نے اِس واقعے کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں، ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضورؐ سورہ حٰمٓ السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اِس آیت پر پہنچے کہ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (آیت ۱۳) تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔

دوسرا واقعہ ابنِ اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلۂ اَرَاش کا ایک شخص کچھ اُونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اس کے اُونٹ خرید لیے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اَرَاشی نے تنگ آ کر ایک روز حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمعِ عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے اس شخص سے کہا کہ ''ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو، وہ صاحب جو اس کونے میں بیٹھے ہیں، ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تمھارا روپیا دلوا دیں گے۔'' اَرَاشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا: ''آج لُطف آئے گا۔'' اَرَاشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی۔ آپؐ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے، اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا: ''کون؟'' آپؐ نے جواب دیا: ''محمدؐ۔'' وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپؐ نے اس سے کہا: ''اس شخص کا حق ادا کر دو۔'' اس نے جواب میں کوئی چُون و چَرا نہ کی، اندر گیا اور اس کے اُونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا، اور کہنے لگا کہ واللہ! آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو کبھی نہ دیکھا تھا، حَکَم بن ہِشام (ابوجہل) جب نکلا ہے تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اُس کا رنگ فق ہو گیا، اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حَکَم بن ہِشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابنِ ہِشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت و کردار کا اثر، اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادُو قرار دیتے تھے اور ناواقف لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا، ورنہ جادُو کر دے گا۔

---

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٤ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ

رسولؐ نے کہا: میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے[6]۔

وہ کہتے ہیں: ”بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اِس کی مَن گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے[7]۔

۶ - یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (whispering campaign) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ ”تم لوگ جو کچھ باتیں بناتے ہو، سب خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔“ وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اُتر آیا۔

۷ - اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکے کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کی جائے، اور ہر اس شخص کو، جو مکے میں زیارت کے لیے آئے، آپؐ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپؐ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے، جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے، اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی! وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تُک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تُلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انھوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپؐ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی، وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدّت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفیل بن عَمْرو دَوسی کا قصّہ ہے، جسے ابنِ اسحاق نے خود ان کی رِوایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبیؐ کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپؐ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ

فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٥﴾ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾

ورنہ یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پُرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔“ حالاں کہ اِن سے پہلے کوئی بستی بھی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں[8] گے؟

آپؐ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپؐ کعبے کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرسکوں۔ آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ جب نبیؐ نماز سے فارغ ہوکر واپس چلے تو میں آپؐ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور آپؐ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا، اور میں آپؐ سے اس قدر بدگمان ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپؐ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپؐ کی زبان سے سنے ہیں، وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپؐ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپؐ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متأثّر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعتِ اسلام کرتا رہا، یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے سترّ اسّی گھرانے مسلمان ہوگئے۔ (ابنِ ہِشام، جلد ۲، ص ۲۲ - ۲۴)

ایک اور روایت جو ابنِ اسحاق نے نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بناتے ہیں، وہ محض جھوٹ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مجلس میں نَضر بن حارث نے تقریر کی کہ ”تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو، اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمھارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمھارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچّا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آگئے، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا! وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا! وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تُک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا! وہ شاعر بھی نہیں ہے، شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں، اور اُس کا کلام ان میں سے کسی صِنف میں نہیں آتا۔ بخدا! وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تُکی بڑ وہ ہانکتا ہے، کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سردارانِ قریش! کچھ اَور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ تمھیں درپیش ہے، وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو۔“ اس کے بعد اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصّے لاکر پھیلائے جائیں، تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انھیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۷ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۹ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا

اور اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے[9]۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پُوچھ لو[10]۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پُورے کیے، اور انھیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچالیا، اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا[11]۔

لوگو! ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمھارا ہی ذکر ہے، کیا تم

عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (ابنِ ہشام، جلد اوّل، ص ۳۲۰-۳۲۱)

۸ – اس مختصر سے جملے میں نشانی کے مطالبے کا جو جواب دیا گیا ہے، وہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے: ایک، یہ کہ تم پچھلے رسولوں کی سی نشانیاں مانگتے ہو، مگر یہ بُھول جاتے ہو کہ ہٹ دھرم لوگ اُن نشانیوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ دوسرے، یہ کہ تم نشانی کا مطالبہ تو کرتے ہو، مگر یہ یاد نہیں رکھتے کہ جس قوم نے بھی صریح معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کیا ہے، وہ پھر ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہی ہے۔ تیسرے، یہ کہ تمھاری منہ مانگی نشانی نہ بھیجنا تو تم پر خدا کی ایک بڑی مہربانی ہے۔ اب تک تم انکار پر انکار کیے جاتے رہے اور مبتلائے عذاب نہ ہوئے۔ کیا اب نشانی اس لیے مانگتے ہو کہ ان قوموں کا سا انجام دیکھو جو نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں اور تباہ کر دی گئیں؟

۹ – یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ ''یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔'' وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بَشَرِیَّت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپؐ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پہلے زمانے کے جن لوگوں کو تم خود مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، وہ سب بھی بشر ہی تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۱۱)

۱۰ – یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمھارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤ پیچ سکھایا کرتے ہیں،

ع

تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ

---

سمجھتے نہیں[۱۲] ہو؟ ع

کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پِیس کر رکھ دیا اور اُن کے بعد دُوسری کسی قوم کو اُٹھایا۔ جب اُن کو ہمارا عذاب محسوس ہوا[۱۳] تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ (کہا گیا:) ”بھاگو نہیں، جاؤ اپنے انھی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے[۱۴]۔“ کہنے لگے: ”ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔“ اور وہ یہی پکارتے رہے،

---

انھی سے پوچھ لو کہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیلؑ کون تھے۔ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

۱۱ – یعنی پچھلی تاریخ کا سبق صرف اتنا ہی نہیں بتاتا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ انسان تھے، بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی نصرت و تائید کے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے جتنے وعدے اللہ نے ان سے کیے تھے، وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اب تم اپنا انجام خود سوچ لو۔

۱۲ – یہ اکٹھا جواب ہے کفارِ مکہ کے ان مضطرب اقوال کا جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے، کہ یہ شاعری ہے، یہ ساحری ہے، یہ پراگندہ خواب ہیں، یہ من گھڑت افسانے ہیں، وغیرہ۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں آخر وہ کون سی نرالی بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہ آتی ہو، جس کی وجہ سے اس کے متعلق تم اتنی متضاد رائیں قائم کر رہے ہو۔ اس میں تو تمھارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمھاری ہی نفسیات اور تمھارے ہی معاملاتِ زندگی زیرِ بحث ہیں۔ تمھاری ہی فطرت اور ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے۔ تمھارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چن چن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اور تمھارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمھارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گُنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اِس کو سمجھنے سے تمھاری عقل عاجز ہو؟

حَتّٰی جَعَلۡنٰہُمۡ حَصِیۡدًا خٰمِدِیۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا لٰعِبِیۡنَ ﴿۱۶﴾ لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَہۡوًا لَّاتَّخَذۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّاۤ ٭ۖ اِنۡ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۷﴾ بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُہٗ فَاِذَا ہُوَ زَاہِقٌ ؕ وَ لَکُمُ الۡوَیۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾

---

یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا۔

ہم نے اِس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے، کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔[15] اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔[16] مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے، اور تمھارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔[17]

---

۱۳ – یعنی جب عذابِ الٰہی سر پر آ گیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ آ گئی شامت۔

۱۴ – نہایت معنیٰ خیز فقرہ ہے اور اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، مثلاً ذرا اچھی طرح اِس عذاب کا معائنہ کرو، تاکہ کل کوئی اس کی کیفیت پوچھے تو ٹھیک بتا سکو۔ اپنے وہی ٹھاٹ جما کر پھر مجلسیں گرم کرو، شاید اب بھی تمھارے خَدَم وحَشَم ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ حضور! کیا حکم ہے۔ اپنی وہی کونسلیں اور کمیٹیاں جمائے بیٹھے رہو، شاید اب بھی تمھارے عاقلانہ مشوروں اور مدبرانہ آرا سے استفادہ کرنے کے لیے دُنیا حاضر ہو۔

۱۵ – یہ تبصرہ ہے اُن کے اُس پورے نظریۂ حیات پر جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان دُنیا میں بس یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جیے، کوئی باز پُرس اس سے نہیں ہونی ہے۔ کسی کو اسے حساب نہیں دینا ہے۔ چند روز کی بھلی بُری زندگی گزار کر سب کو بس یونہی فنا ہو جانا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا ہو۔ یہ خیال درحقیقت اِس بات کا ہم معنیٰ تھا کہ کائنات کا یہ سارا نظام محض کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے۔ اور یہی خیال دعوتِ پیغمبر سے ان کی بے اعتنائی کا اصل سبب تھا۔

۱۶ – یعنی ہمیں کھیلنا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اِس صورت میں یہ ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شُعور، ذمّہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا، اُس کے درمیان حق و باطل کی یہ کش مکش اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں، اور محض اپنے لُطف وتفریح کے لیے ہم دوسروں کو بلاوجہ تکلیفوں میں ڈالتے۔ تمھارے خدا نے یہ دُنیا کچھ

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۱۹ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۲۰

زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے، اللہ کی ہے۔[18] اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں،[19] وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اُس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔[20] شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔

رومی اکھاڑے (Colosseum) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو درندوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں نُچوا کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے۔

۱۷ – یعنی ہم بازی گر نہیں ہیں، نہ ہمارا کام کھیل تماشا کرنا ہے۔ ہماری یہ دُنیا ایک سنجیدہ نظام ہے جس میں کوئی باطل چیز نہیں جم سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اُٹھاتا ہے، حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے، اور آخر کار وہ مٹ کر ہی رہتا ہے۔ اس دُنیا کو اگر تم تماشا گاہ سمجھ کر جیو گے، یا حقیقت کے خلاف باطل نظریّات پر کام کرو گے تو نتیجہ تمھاری اپنی ہی تباہی ہوگا۔ نوعِ انسانی کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو کہ دُنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خوانِ یَغما، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاؑ کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریّات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ پھر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ جب سمجھانے والا سمجھائے تو اس کا مذاق اُڑاؤ، اور جب اپنے ہی کیے کرتوتوں کے نتائج عذابِ الٰہی کی صورت میں سر پر آ جائیں تو چیخنے لگو کہ ”ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔“

۱۸ – یہاں سے توحید کے اثبات اور شرک کے اِبطال پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکینِ مکہ کے درمیان اصل بنائے نزاع تھی۔ اب مشرکین کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات کا یہ نظام جس میں تم جی رہے ہو (جس کے متعلق ابھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ایک سنجیدہ اور بامقصد اور مبنی بر حقیقت نظام ہے، اور جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس میں باطل ہمیشہ حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے) اِس کی حقیقت یہ ہے کہ اس پورے نظام کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف ایک خدا ہے، اور اس حقیقت کے مقابلے میں باطل یہ ہے کہ اسے بہت سے خداؤں کی مشترک سلطنت سمجھا جائے، یا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بڑے خدا کی خدائی میں دوسرے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بھی کچھ دخل ہے۔

۱۹ – یعنی وہی فرشتے جن کو مشرکینِ عرب خدا کی اولاد سمجھ کر، یا خدائی میں دخیل مان کر معبُود بنائے ہوئے تھے۔

۲۰ – یعنی خدا کی بندگی کرنا ان کو ناگوار بھی نہیں ہے کہ بادلِ ناخواستہ بندگی کرتے کرتے وہ ملول ہو جاتے ہوں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾

کیا اِن لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اُٹھا کھڑا کرتے ہوں؟[21]

اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔[22] پس پاک ہے اللہ رب العرش[23] اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔

---

اصل میں لفظ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ استحسار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد وہ تکان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لاحق ہوتی ہے۔

**۲۱** — اصل میں لفظ ''یُنْشِرُوْنَ'' استعمال ہُوا ہے جو ''اِنشار'' سے مُشتق ہے۔ اِنشار کے معنٰی ہیں: بے جان پڑی ہوئی چیز کو اُٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآنِ مجید میں بالعُموم زندگی بعدِ موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصطلاحی مفہُوم سے قطعِ نظر، اصل لُغوی معنٰی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادّے میں زندگی پھونک دینے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہُوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں کو انھوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبُود بنایا ہے، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مادّۂ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے ——— اور مشرکینِ عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے ——— تو پھر وہ اُن کو خدا اور معبُود کس لیے مان رہے ہیں؟

**۲۲** — یہ اِستدلال سادہ بھی ہے اور بہت گہرا بھی۔ سادہ سی بات، جس کو ایک بدوی، ایک دیہاتی، ایک موٹی سی سمجھ کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے، یہ ہے کہ ایک معمولی گھر کا نظام بھی چار دن بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحبِ خانہ ہوں۔ اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام، زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیّاروں تک، ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا، اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں کے درمیان تناسُب اور توازُن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی اٹل اور غالب و قاہر ضابطہ ان بے شمار اشیا اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم تعاون کرتے رہنے پر مجبُور کر رہا ہو۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے مُطلَق العِنان فرماں رواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے؟ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مُستلزِم ہے۔ قانون اور ضابطے کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۷،

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ

وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دِہ نہیں ہے اور سب جواب دِہ ہیں۔

کیا اُسے چھوڑ کر اِنھوں نے دُوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دَور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔[۲۴]" مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔[۲۵] ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اُس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

یہ کہتے ہیں: "رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔[۲۶]" سبحان اللہ! وہ تو بندے ہیں جنھیں

جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۸۵)

۲۳ – رب العرش، یعنی کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک۔

۲۴ – پہلے دو اِستدلال عقلی تھے، اور یہ استدلال نقلی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنی کتابیں بھی خدا کی طرف سے دُنیا کے کسی ملک میں کسی قوم کے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں، اِن میں سے کسی میں یہ نکال کر دکھا دو کہ ایک اللہ، خالقِ زمین و آسمان کے سوا کوئی دوسرا بھی خدائی کا کوئی شائبہ رکھتا ہے، اور کسی اور کو بھی بندگی و عبادت کا حق پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسا مذہب تم لوگوں نے بنا رکھا ہے جس کی تائید میں نہ عقل سے کوئی دلیل ہے اور نہ آسمانی کتابیں ہی جس کے لیے کوئی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

۲۵ – یعنی نبی کی بات پر اِن کا توجہ نہ کرنا علم پر نہیں بلکہ جہل پر مبنی ہے۔ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لیے سمجھانے والے کی بات کو نا قابلِ التفات سمجھتے ہیں۔

۲۶ – یہاں پھر فرشتوں ہی کا ذکر ہے جن کو مشرکینِ عرب خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بعد کی تقریر سے

مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا

ع ۲ ۱۹

عزت دی گئی ہے۔ اُس کے حُضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے، اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سِفارش نہیں کرتے، بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں[۲۷]۔ اور جو اُن میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں، تو اُسے ہم جہنّم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے۔ ع

کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنھیں جدا[۲۸] کیا، اور پانی سے ہر

---

یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے۔

**۲۷** – مشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبُود بناتے تھے: ایک، یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے۔ دوسرے، یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انھیں خدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنانا چاہتے تھے۔ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ (یونُس، آیت ۱۸) اور مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (الزمر، آیت ۳) ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اِس جگہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنھیں تم شفیع قرار دیتے ہو، وہ علمِ غیب نہیں رکھتے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہیں، اور اُن باتوں کو بھی جو اُن سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سِفارش کرنے کا مُطلَق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے، جب کہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے

مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝٣٠ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝٣١ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا

زندہ چیز پیدا[۲۹] کی۔ کیا وہ (ہماری اِس خلّاقی کو) نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے[۳۰]، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں[۳۱]، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں[۳۲]۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا[۳۳] دیا، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف[۳۴]

خواہ فرشتے ہوں یا انبیا وصالحین، ہر ایک کا اختیارِ شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطورِ خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور دستِ سوال دراز کیا جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۵-۸۶)

**۲۸** – اصل میں ''رَتق'' اور ''فَتق'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَتق کے معنیٰ ہیں: یک جا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فَتق کے معنیٰ پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (mass) کی سی تھی، بعد میں اُس کو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اَجرامِ فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۱۳-۱۴-۱۵)

**۲۹** – اس سے جو مفہُوم سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ پانی کو خدا نے سببِ زندگی اور اصلِ حیات بنایا، اُسی میں اور اُسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جگہ اس مطلب کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (النور، آیت ۴۵) ''اور خدا نے ہر جان دار کو پانی سے پیدا کیا۔''

**۳۰** – اس کی تشریح سورۂ نحل، حاشیہ ۱۲ میں گزر چکی ہے۔

**۳۱** – یعنی پہاڑوں کے درمیان ایسے دَرّے رکھ دیے اور دریا نکال دیے جن کی وجہ سے پہاڑی علاقوں سے گزرنے اور زمین کے ایک خطّے سے دوسرے خطّے کی طرف عُبور کرنے کے راستے نکل آتے ہیں۔ اِسی طرح زمین کے دوسرے حصّوں کی ساخت بھی ایسی رکھی ہے کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے کے لیے راہ بن جاتی ہے یا بنائی جا سکتی ہے۔

**۳۲** – ذُو معنیٰ فقرہ ہے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ زمین میں چلنے کے لیے راہ پائیں، اور یہ بھی کہ وہ اِس حکمت

مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ

توجّہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے، اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔[۳۵]

اور[۳۶] اے محمدؐ! ہیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے۔

---

اور اِس کاریگری اور اِس انتظام کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ پالیں۔

۳۳- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۃ الحِجر، حواشی ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

۳۴- یعنی اُن نشانیوں کی طرف جو آسمانوں میں ہیں۔

۳۵- کُلٌّ اور یَّسۡبَحُوۡنَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مراد صرف سورج اور چاند ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے اَجرامِ فلکی، یعنی تارے بھی مراد ہیں، ورنہ جمع کے بجائے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ فَلَك، جو فارسی کے چَرخ اور گَردُوں کا ٹھیک ہم معنیٰ ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ ’’سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں‘‘ سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں: ایک، یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی ’’فلک‘‘ میں نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے، یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں اور وہ خود انھیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو، بلکہ وہ کوئی سیّال شے ہے، یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے، جس میں اِن تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۳۷)

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان وزمین کے رَتق وفَتق، اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے، اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہُوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبعیات (Physics)، حیاتیات (Biology) اور علمِ ہیئت (Astronomy) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہُوم کچھ اور کر دیا ہے، اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہونی ہیں، وہ اِن الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہرحال موجودہ زمانے کا انسان اِن تینوں آیات کو بالکل اپنی جدید ترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

اس مَقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وَلَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ سے لے کر وَكَذٰلِكَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ تک کی تقریر شرک کی تردید میں ہے، اور اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا سے لے کر فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے، اس میں توحید کے لیے ایجابی (positive) دلائل دیے گئے ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ یہ نظامِ کائنات جو تمھارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ ربّ العالمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کاریگری تمھیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کارفرمائی میں بن سکتا تھا اور اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے

اَفَاۡئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ

اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جان دار کو موت کا مزا چکھنا ہے[۳۷]، اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمایش کر رہے ہیں[۳۸]۔ آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔ یہ منکرینِ حق جب تمھیں دیکھتے ہیں تو تمھارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ''کیا یہ ہے وہ شخص

متعلّق کوئی صاحبِ عقل وخِرَد آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، اور اس نے محض تفریح کے لیے چند گُڑیاں بنائی ہیں، جن سے کچھ مدّت کھیل کر بس وہ یونہی اِن کو خاک میں ملا دے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات ماننے سے انکار کیے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز اس نظریۂ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے؟ ان نشانیوں کے ہوتے تم کہتے ہو کہ فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ، ''یہ نبی کوئی نشانی لے کر آئے''۔ کیا نبی کی دعوتِ توحید کے حق ہونے پر گواہی دینے کے لیے یہ نشانیاں کافی نہیں ہیں؟

۳۶- یہاں سے پھر سلسلۂ تقریر اُس کش مکش کی طرف مُڑتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مخالفین کے درمیان برپا تھی۔

۳۷- یہ مختصر جواب ہے اُن ساری دھمکیوں اور بد دعاؤں اور کوسنوں اور قتل کی سازشوں کا جن سے ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابرِ قریش تھے جو آئے دن آپؐ کو اِس تبلیغ کے خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے، اور ان میں سے بعض پُر جوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپؐ کا کام تمام کر دیں۔ دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کر لیتا تھا، آپؐ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اُس کی عورتیں آپؐ کو کلپ کلپ کر کوسنے اور بد دعائیں دیتی تھیں اور اُس کے مرد آپؐ کو ڈراوے دیتے پھرتے تھے۔ خُصوصاً ہجرتِ حبشہ کے بعد تو مکے بھر کے گھروں میں کُہرام مچ گیا تھا، کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا گھرانا بچا رہ گیا تھا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دُہائیاں دیتے تھے کہ اِس شخص نے ہمارے گھر برباد کیے ہیں۔ انھی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم ان کی پروا کیے بغیر، بے خوف اپنا کام کیے جاؤ۔

۳۸- یعنی راحت اور رنج، مفلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحّت اور بیماری، غرض تمام مختلف حالات میں تم لوگوں کی آزمایش کی جا رہی ہے، تاکہ دیکھیں تم اچھے حالات میں متکبر، ظالم، خدا فراموش، بندۂ نفس تو

يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿٣٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جو تمھارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟[39]" اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں[40]۔
انسان جلد باز مخلوق ہے[41]۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ[42]۔ ـــــ یہ لوگ کہتے ہیں: "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچّے ہو۔" کاش اِن کافروں کو اُس وقت کا کچھ علم ہوتا

نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں کم ہمّتی کے ساتھ پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لٰہذا کسی صاحبِ عقل آدمی کو اِن مختلف حالات کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جو حالت بھی اُسے پیش آئے، اُس کے امتحانی اور آزمایشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے، اور اس سے بخیریت گزرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے، اور جب بُرے حالات پیش آجائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔

۳۹ — یعنی برائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ فقرہ ان کے مذاق کا مضمون نہیں بتا رہا ہے، بلکہ مذاق اُڑانے کی وجہ اور بنیاد پر روشنی ڈال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ بجائے خود کوئی مذاق کا فقرہ نہیں ہے۔ مذاق تو وہ دوسرے ہی الفاظ میں اُڑاتے ہوں گے اور کچھ اور ہی طرح کے آوازے کَستے اور فقرے چُست کرتے ہوں گے۔ البتہ یہ سارا دل کا بخار جس وجہ سے نکالا جاتا تھا، وہ یہ تھی کہ آپؐ ان کے خود ساختہ معبُودوں کی خدائی کا ردّ کرتے تھے۔

۴۰ — یعنی بتوں اور بناوٹی خداؤں کی مخالَفت تو انھیں اس قدر ناگوار ہے کہ اس کا بدلہ لینے کے لیے تمھاری تضحیک و تذلیل کرتے ہیں، مگر انھیں خود اپنے حال پر شرم نہیں آتی کہ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کا ذکر سُن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

۴۱ — اصل میں خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ہے: "انسان جلد بازی سے بنایا گیا ہے، یا پیدا کیا گیا ہے"۔ لیکن یہ لفظی معنیٰ اصل مقصودِ کلام نہیں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں: فُلاں شخص عقل کا پُتلا ہے، اور فلاں شخص حرفوں کا بنا ہوا ہے، اُسی طرح عَرَبی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کی سرِشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا "انسان جلد باز واقع ہوا ہے" (بنی اسرائیل، آیت ۱۱) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُّجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝٣٩ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝٤٠ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝٤١ ع قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ط بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُونَ ۝٤٢ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُونِنَا ط لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ

ع ۱۲ ۳

جب کہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں، اور نہ ان کو کہیں سے مدد پہنچے گی۔ وہ بلا اچانک آئے گی اور اِنھیں اِس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ اِن کو لمحہ بھر مُہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اُڑایا جا چکا ہے، مگر اُن کا مذاق اُڑانے والے اُسی چیز کے پھیر میں آ کر رہے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ع

اے محمدؐ! اِن سے کہو: "کون ہے جو رات کو یا دن کو تمھیں رحمٰن سے بچا سکتا ہو؟[۴۳]" مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید

۴۲ – بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں "نشانیوں" سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اُڑاتے تھے، اُن میں سے ایک عذابِ الٰہی، اور قیامت اور جہنّم کا مضمون بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص آئے دن ہمیں ڈراوے دیتا ہے کہ میرا انکار کرو گے تو خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا، اور قیامت میں تم پر یہ بنے گی اور تم لوگ یوں جہنم کے ایندھن بنائے جاؤ گے۔ مگر ہم روز انکار کرتے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی عذاب آتا دکھائی دیتا ہے اور نہ کوئی قیامت ہی ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۴۳ – یعنی اگر اچانک دن کو یا رات کو کسی وقت خدا کا زبردست ہاتھ تم پر پڑ جائے تو آخر وہ کون سازور آور حامی و ناصر ہے جو اس کی پکڑ سے تم کو بچا لے گا؟

مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿٤٣﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۗ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٤٤﴾ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ

اُن کو حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اور اِن کے آبا و اجداد کو ہم زندگی کا سروسامان دیے چلے گئے، یہاں تک کہ اِن کو دن لگ گئے۔[44] مگر کیا اِنھیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سَمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟[45] پھر کیا یہ غالب آ جائیں گے؟[46] اِن سے کہہ دو کہ "میں تو وحی کی بنا پر تمھیں مُتنبّہ کر رہا ہوں"۔ ـــــ مگر بہرے پُکار کو نہیں سنا کرتے

۴۴ – یعنی ہماری اِس مہربانی اور پرورش سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ اِن کا کوئی ذاتی استحقاق ہے جس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ اپنی خوش حالیوں اور سرداریوں کو یہ لازوال سمجھنے لگے ہیں، اور ایسے سرمست ہوگئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

۴۵ – یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد، آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: حاشیہ ۶۰) یہاں اس سیاق وسباق میں یہ ایک اور معنٰی بھی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ زمین میں ہر طرف ایک غالب طاقت کی کارفرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی قحط کی شکل میں، کبھی وبا کی شکل میں، کبھی سیلاب کی شکل میں، کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں، اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آ جاتی ہے جو انسان کے سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں۔ بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں غارت ہو جاتی ہیں۔ پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائلِ زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی واقع ہو جاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے۔ اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۴، السجدہ، حاشیہ ۳۳)

۴۶ – یعنی جب کہ اِن کے تمام وسائلِ زندگی ہمارے ہاتھ میں ہیں، جس چیز کو چاہیں گھٹا دیں اور جسے چاہیں روک لیں، تو کیا یہ اتنا بل بُوتا رکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں غالب آ جائیں اور ہماری پکڑ سے بچ نکلیں؟ کیا یہ آثار ان کو یہی اطمینان دلا رہے ہیں کہ تمھاری طاقت لازوال اور تمھارا عیش غیر فانی ہے اور کوئی تمھیں پکڑنے والا نہیں ہے۔

اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ

---

جب کہ اُنھیں خبردار کیا جائے۔ اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انھیں چھُو جائے[۴۷] تو ابھی چیخ اُٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم خطاوار تھے۔

قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا، وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں[۴۸]۔

[۴۹] پہلے ہم موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور "ذکر"[۵۰] عطا کر چکے ہیں، اُن متقی لوگوں کی بھلائی کے لیے[۵۱]

---

۴۷ – وہی عذاب جس کے لیے یہ جلدی مچاتے ہیں اور مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ لاؤ نا وہ عذاب، کیوں نہیں وہ ٹوٹ پڑتا۔

۴۸ – تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸-۹۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ترازو کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہرحال وہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو مادّی چیزوں کو تولنے کے بجائے انسان کے اَخلاقی اوصاف واعمال اور اس کی نیکی و بدی کو تولے گی اور ٹھیک ٹھیک وزن کر کے بتا دے گی کہ اَخلاقی حیثیت سے کس شخص کا کیا پایہ ہے۔ نیک ہے تو کتنا نیک ہے، اور بد ہے تو کتنا بد۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری زبان کے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر "ترازو" کا لفظ یا تو اس وجہ سے انتخاب فرمایا ہے کہ اس کی نوعیت ترازو سے اشبہ ہوگی، یا اس انتخاب کا مقصد یہ تصور دلانا ہے کہ جس طرح ایک ترازو کے پلڑے دو چیزوں کے وزن کا فرق ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں، اسی طرح ہماری میزانِ عدل بھی ہر انسان کے کارنامۂ زندگی کو جانچ کر بے کم و کاست بتا دے گی کہ اس میں نیکی کا پہلو غالب ہے یا بدی کا۔

۴۹ – یہاں سے انبیا علیہم السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پے در پے بہت سے انبیاؑ کی زندگی کے

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ ج

ع ۵

جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اُس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ اور اب یہ بابرکت "ذکر" ہم نے (تمھارے لیے) نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو؟ ع

اُس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی ہوش مندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔

---

مفصّل یا مختصر واقعات کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ ذکر جس سِیاق وسَباق میں آیا ہے، اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حسبِ ذیل باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:

اوّل، یہ کہ تمام پچھلے انبیاؑ بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوم، یہ کہ پہلے انبیاؑ بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

سوم، یہ کہ انبیا علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں۔ سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں۔ شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخرِ کار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

چہارم: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبولِ بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود، تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ اُلوہیّت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور فیصلے میں ان سے غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ بیمار بھی وہ ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتّٰی کہ قصور بھی ان سے ہو جاتے تھے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ بھی ہوتا تھا۔

۵۰ – تینوں الفاظ تورات کی تعریف میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی وہ حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، وہ انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اور وہ اولادِ آدمؑ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔

۵۱ – یعنی اگرچہ بھیجی گئی تھی وہ تمام انسانوں کے لیے، مگر اس سے فائدہ عملاً وہی لوگ اُٹھا سکتے تھے جو اِن

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا

یاد کرو وہ موقع[۵۴] جب کہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”یہ مُورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ

صفات سے مُتَّصِف ہوں۔

۵۲ – جس کا ابھی اُوپر ذکر گزرا ہے، یعنی قیامت۔

۵۳ – ”ہوش مندی“ ہم نے ”رُشد“ کا ترجمہ کیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: ”صحیح وغلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا، اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا“۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ”رُشد“ کا ترجمہ ”راست روی“ بھی ہوسکتا ہے، لیکن چونکہ رُشد کا لفظ محض راست رَوی کو نہیں بلکہ اُس راست رَوی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہو فکرِ صحیح اور عقلِ سلیم کے استعمال کا، اس لیے ہم نے ”ہوش مندی“ کے لفظ کو اس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

”ابراہیم کو اُس کی ہوش مندی بخشی“، یعنی جو ہوش مندی اس کو حاصل تھی، وہ ہماری عطا کردہ تھی۔

”ہم اُس کو خوب جانتے تھے“، یعنی ہماری یہ بخشش کوئی اندھی بانٹ نہ تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے، اس لیے ہم نے اُس کو نوازا۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ”اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے۔“ (الانعام، آیت ۱۲۴) اس میں ایک لطیف اشارہ ہے سردارانِ قریش کے اُس اعتراض کی طرف جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آخر اِس شخص میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ ہم کو چھوڑ کر اُسے رسالت کے منصب پر مقرر کرے۔ اس کا جواب مختلف مَقامات پر قرآنِ مجید میں مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اِس لطیف اشارے پر اکتفا کیا گیا کہ یہی سوال ابراہیمؑ کے متعلق بھی ہوسکتا تھا، پوچھا جاسکتا تھا کہ سارے مُلکِ عراق میں ایک ابراہیمؑ ہی کیوں اس نعمت سے نوازا گیا، مگر ہم جانتے تھے کہ ابراہیمؑ میں کیا اہلیّت ہے، اس لیے ان کی پوری قوم میں سے اُن کو اِس نعمت کے لیے منتخب کیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اِس سے پہلے سورۂ بَقَرہ، آیات ۱۲۴ تا ۱۴۱ – ۲۵۸ – ۲۶۰۔ الاَنعام، آیات ۷۴ تا ۸۱۔ جلد دوم، التوبہ، آیت ۱۱۴۔ ہود، آیات ۶۹ تا ۷۶۔ ابراہیم، آیات ۳۵ تا ۴۱۔ الحِجْر، آیات ۵۱ تا ۶۰۔ النحل، آیات ۱۲۰ تا ۱۲۳ میں گزر چکے ہیں، جن پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

۵۴ – جس واقعے کا آگے ذکر کیا جا رہا ہے، اس کو پڑھنے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ قریش کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے، کعبہ انھی کا تعمیر کردہ تھا، سارے عرب میں کعبے کی مرکزیت انھی کی نسبت کے سبب سے تھی، اور قریش کا سارا بھرم اِسی لیے بندھا ہوا تھا کہ یہ اولادِ ابراہیمؑ ہیں اور کعبۂ ابراہیمی کے مجاور ہیں۔ آج اِس زمانے اور عرب سے دُور دراز کے ماحول میں تو حضرت ابراہیمؑ کا یہ قصّہ صرف ایک سبق آموز تاریخی واقعہ ہی نظر آتا ہے، مگر جس زمانے اور ماحول میں اوّل اوّل یہ بیان کیا گیا تھا، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ قریش کے مذہب اور ان کی برہمنیت پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی جو ٹھیک اس کی جڑ پر جا کر لگتی تھی۔

عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ
اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ
فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ
اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا

---

گرویدہ ہو رہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔" اس نے کہا: "تم بھی گمراہ ہو اور تمھارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" انھوں نے کہا "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟"[۵۵] اُس نے جواب دیا: "نہیں، بلکہ فی الواقع تمھارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اِس پر میں تمھارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم! میں تمھاری غیر موجودگی میں ضرور تمھارے بُتوں کی خبر لوں گا۔"[۵۶] چنانچہ اس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا[۵۷] اور صرف ان کے بڑے کو

---

۵۵ - اِس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "کیا تُو ہمارے سامنے حق پیش کر رہا ہے یا کھیلتا ہے؟" لیکن اصل مفہوم وہی ہے جس کی ترجمانی اُوپر کی گئی ہے۔ ان لوگوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ یہ باتیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ یہ تم محض مذاق اور کھیل کر رہے ہو، یا واقعی تمھارے یہی خیالات ہیں۔

۵۶ - یعنی اگر تم اِستدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں عملاً تمھیں مشاہدہ کرا دُوں گا کہ یہ بے بس ہیں، ان کے پاس کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں، اور ان کو خدا بنانا غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ عملی تجرِبے اور مُشاہدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے، تو اِس کی تفصیل حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر نہیں بتائی۔

۵۷ - یعنی موقع پا کر، جب کہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے، حضرت ابراہیمؑ ان کے مرکزی بُت خانے میں گُھس گئے، اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔

لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦۱﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

چھوڑ دیا، تاکہ شاید وہ اس کی طرف رُجوع کریں۔[۵۸] (اُنھوں نے آ کر بُتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے: ”ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔“ (بعض لوگ) بولے: ”ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سُنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔“ اُنھوں نے کہا: ”تو پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے، تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُس کی کیسی خبر لی جاتی ہے[۵۹])۔“ (ابراہیمؑ کے آنے پر) اُنھوں نے پوچھا: ”کیوں ابراہیم! تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟“ اُس نے جواب دیا: ”بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے، اِن ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں[٦۰]۔“ یہ سُن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے

۵۸ - ”اُس کی طرف“ کا اشارہ بڑے بت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنیٰ ہے۔ یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انھیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچومر بنا ڈالا ہو۔ یا پھر بڑے حضرت سے یہ پوچھیں کہ حضور! آپ کی موجودگی میں یہ کیا ہوا؟ کون یہ کام کر گیا؟ اور آپ نے اسے روکا کیوں نہیں؟ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید اِن کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہوگا، اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

۵۹ - یہ گویا حضرت ابراہیمؑ کی منہ مانگی مراد تھی، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ بات صرف پروہتوں اور پجاریوں ہی کے سامنے نہ ہو، بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بُت جو اُن کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں، کیسے بے بس ہیں اور خود یہ پروہت حضرات ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ اِس طرح ان پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بھی جادُوگروں سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرانے کے لیے ملک بھر کی خلقت جمع کی تھی، اور اِنھوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کا مُقدّمہ سننے کے لیے عوام کو اکٹھا کر لیا۔ وہاں حضرت موسیٰؑ کو سب کے سامنے

یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں، وہ جادُو نہیں معجزہ ہے۔ اور یہاں حضرت ابراہیمؑ کو ان کے دشمنوں نے آپ ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے اُن کے مکر وفریب کا طِلسم توڑ دیں۔

**۶۰** – یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیمؑ نے بت شکنی کے اِس فعل کو بڑے بت کی طرف جو منسُوب کیا ہے اِس سے اُن کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین پر حجّت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انھوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور اُن سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جاسکتی۔ ایسے مواقع پر ایک شخص اِستِدلال کی خاطر جو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے، اس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیّت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ ان کے مخاطَب ہی اِسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے حجّت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے، اور سننے والا بھی اُسے اسی معنٰی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک رِوایَت میں یہ بات آ گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک ''جھوٹ'' تو یہ ہے، اور دوسرا ''جھوٹ'' سورۂ صافّات میں حضرت ابراہیمؑ کا قول اِنِّیْ سَقِیْمٌ ہے، اور تیسرا ''جھوٹ'' اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے، جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائبل کی کتابِ پیدایش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غُلُو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری ومسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک رِوایَت کو لے کر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اُٹھا کر پھینک دو، کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابلِ اعتماد ہوں۔ اور نہ فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مُستَلزِم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابلِ اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابلِ اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے، اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث، جس میں حضرت ابراہیمؑ کے تین ''جھوٹ'' بیان کیے گئے ہیں، صرف اِسی وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے، بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تینوں ہی محلِّ نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک ''جھوٹ'' کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل وخرد کا آدمی بھی اِس سیاق وسباق میں حضرت ابراہیمؑ کے اس قول پر لفظ ''جھوٹ'' کا اِطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، معاذ اللہ، اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ والا واقعہ، تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح وتندرست تھے اور کوئی ادنٰی سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اِس زیرِ بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو

فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ؕ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ

دِلوں میں) کہنے لگے: ”واقعی تم خود ہی ظالم ہو۔“ مگر پھر اُن کی مت پلٹ گئی[۶۱] اور بولے: ”تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔“ ابراہیمؑ نے کہا: ”پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمھیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمھارے اِن معبُودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر

بہن قرار دینے کا واقعہ، تو وہ بجائے خود ایسا مُہمَل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہوسکتا۔ قصّہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے۔ بائبل کی رُو سے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیمؑ کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہِ مصر اس خوب صورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمھیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمھیں اپنی بہن بتاؤں گا، تاکہ میری جان تو بچ جائے۔ (پیدائش، باب ۱۲) حدیث کی زیرِ بحث روایت میں تیسرے ”جھوٹ“ کی بنیاد اِسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو، اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی اِفراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نوبت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرینِ حدیث کر رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب ”رسائل ومسائل“ جلد دوم، ص ۳۵ تا ۳۹)

۶۱- اصل میں نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ (اَوندھا دیے گئے اپنے سروں کے بَل) فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انھوں نے خجالت کے مارے سر جھکا لیے۔ لیکن موقع ومحل اور اُسلوبِ بیان اس معنیٰ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلۂ کلام اور اندازِ کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا جواب سنتے ہی پہلے تو انھوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو تم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبُودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا بیتی اور کون انھیں مار کر رکھ گیا، آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے، جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان پر ضد اور جہالت سوار ہوگئی اور، جیسا کہ ضد کا خاصّہ ہے، اس کے سوار ہوتے ہی ان کی عقل اَوندھ گئی۔ دماغ سیدھا سوچتے سوچتے یکایک اُلٹا سوچنے لگا۔

دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ۙ﴿۶۹﴾ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۚ﴿۷۰﴾ وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ

پُوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟" انھوں نے کہا: "جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی، اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔" ہم نے کہا: "اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔"[۶۲] وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں، مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا۔ اور ہم اُسے اور لوطؑ[۶۳] کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دُنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔[۶۴] اور ہم نے اسے اسحاقؑ عطا کیا اور یعقوبؑ اس پر

۶۲ – الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے کہ انھوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے اُنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی اُن معجزات میں سے ایک ہے، جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اِن معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظامِ عالَم کے معمول (routine) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اُٹھاتا ہے۔ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بندۂ خدا! تیرے اُوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انھیں منوا کر ہی چھوڑے؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جب کہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اِس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ عنکبوت، حاشیہ ۳۹)

۶۳ – بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے: نَحور اور حاران۔ حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے۔ (پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۶) سورۂ عنکبوت میں حضرت ابراہیمؑ کا جو تذکرہ آیا ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوطؑ ہی ان پر ایمان لائے تھے۔ (ملاحظہ ہو: آیت ۲۶)

۶۴ – یعنی شام و فلسطین کی سرزمین۔ اس کی برکتیں مادّی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مادّی حیثیت سے وہ دُنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ہے۔ اور رُوحانی حیثیت سے وہ ۲ ہزار برس تک انبیا علیہم السلام کا مہبط رہی ہے۔

نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝٧٢ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝٧٣ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝٧٤ وَاَدْخَلْنٰهُ فِىْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٧٥ ع

مزید[۶۵]، اور ہر ایک کو صالح بنایا۔ اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے سے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے[۶۶]۔

اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا[۶۷] اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی ـــــ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی ـــــ اور لوطؑ کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔ ع

---

دُنیا کے کسی دوسرے خطّے میں اتنی کثرت سے انبیاؑ مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۶۵ – یعنی بیٹے کے بعد پوتا بھی ایسا ہوا جسے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

۶۶ – حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دَور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ نمرود سے ان کی مُڈ بھیڑ، باپ اور قوم سے ان کی کش مکش، بت پرستی کے خلاف ان کی جِدّوجُہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصّہ، اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائبل کی کتاب ''پیدایش'' کے مصنف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ مَعاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو لے کر حاران میں جا بسا۔ (باب ۱۱، آیات ۲۷ تا ۳۲) اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا'' اور میں تجھے ایک

بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سوتو باعثِ برکت ہو! جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا، اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا، اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔'' (باب ۱۲، آیت ۱-۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیمؑ پر یہ نظرِ عنایت کیوں ہوگئی؟

تَلمُود میں البتہ سیرتِ ابراہیمی کے عراقی دَور کی وہ بیش تر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مَقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ مگر دونوں کا تقابُل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصّے کے اہم اجزا میں بَیِّن تفاوُت نظر آتا ہے، بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تَلمُود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلافِ قیاس باتوں سے بھرا ہوا ہے، اور اس کے برعکس قرآن بالکل مُنَقَّح صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے اہم واقعاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے، جن میں کوئی لَغوِیات آنے نہیں پائی ہے۔ توضیحِ مدّعا کے لیے ہم یہاں تَلمُود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، تاکہ ان لوگوں کی غَلَطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔

تَلمُود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدایش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود کو مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ اُن کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انھیں بچالیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا، جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارھویں سال حضرت ابراہیمؑ کو تارح نے حضرت نوحؑ کے پاس پہنچا دیا، اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوحؑ اور اُن کے بیٹے سام کی تربِیَت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۴۲ سال چھوٹی تھیں۔ (بائبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی صرف ۱۰ سال بتاتی ہے۔) (پیدایش، باب ۱۱، آیت ۲۹۔ اور باب ۱۷، آیت ۱۷)

پھر تَلمُود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پچاس سال کی عمر میں حضرت نوحؑ کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آ گئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ باپ بت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انھوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اُس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھریلو بُت خانے کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آ کر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا نمرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا، آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے، آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بلا کر حضرت ابراہیمؑ سے باز پرس کی۔ انھوں نے سخت جوابات دیے۔ نمرود نے ان کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا، تاکہ صلاح مشورے سے اس مُقدّمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کرایا گیا اور حضرت ابراہیمؑ اس میں پھینک دیے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے بھائی اور خسر، حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدایش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اِسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کرایا، تو اس نے کہا کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی۔ اس لیے خود اس فعل کے مرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ

اور یہی نعمت ہم نے نوحؑ کو دی۔ یاد کرو جب کہ اِن سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا[۶۸] تھا۔ ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم[۶۹] سے

جل بُھن کر کوئلا ہو گیا، مگر حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرود کو اس معاملے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے آ کر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا کہ ''آسمانی خدا کے بندے! آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا۔'' حضرت ابراہیمؑ باہر آ گئے۔ نمرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تَلمُود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا، اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیمؑ تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرا دے۔ اس نے ان کے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیمؑ کو خود نمرود ہی کے عطا کیے ہوئے ایک غلام، الیعَزر نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیمؑ نے بھاگ کر حضرت نوحؑ کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آ کر اُن سے خفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوحؑ اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُر سے حاران چلا گیا۔ (منتخباتِ تَلمُود از ایچ پولانو، لندن، صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

**۶۷** – ''حکم اور علم بخشنا'' بالعُموم قرآنِ مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ ''حکم'' سے مراد حکمت بھی ہے، صحیح قوتِ فیصلہ بھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سندِ حکمرانی (authority) حاصل ہونا بھی۔ رہا ''علم''، تو اس سے مراد وہ علمِ حق ہے جو وحی کے ذریعے سے عطا کیا گیا ہو۔ (حضرت لوطؑ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، آیات ۶۹ تا ۸۳۔ الحِجر، آیات ۵۷ تا ۷۶)

**۶۸** – اشارہ ہے حضرت نوحؑ کی اُس دُعا کی طرف جو ایک مدّتِ دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنے کے بعد آخرِ کار تھک کر انھوں نے مانگی تھی کہ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ ۝ ''پروردگار! میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب میری مدد کو پہنچ۔'' (القمر، آیت ۱۰) اور رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا ۝ ''پروردگار! زمین پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ۔'' (نوح، آیت ۲۶)

**۶۹** – کَربِ عظیم سے مراد یا تو ایک بدکردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے، یا پھر طوفان۔ (حضرت نوحؑ کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یُونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳)

الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ

---

نجات دی اور اُس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جُھٹلا دیا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ تھے، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جب کہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدّمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دُوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔[۷۰]

---

۷۰ – اس واقعے کا ذکر بائبل میں نہیں ہے، اور یہودی لٹریچر میں بھی ہمیں اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گُھس گئی تھیں۔ اُس نے حضرت داؤدؑ کے ہاں استغاثہ کیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اِسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اُس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اُس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمانؑ کو سمجھایا تھا۔ مگر چونکہ مُقدّمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کے مُقدّمے میں یہی ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حَنَفِیّہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہو گا یا نہیں، اور عائد ہو گا تو کس صورت میں ہو گا اور کس صورت میں نہیں، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہو گی۔

اس سیاق و سباق میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیا علیہم السلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور قابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی

وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ

داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخّر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے[71]، اِس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمھارے فائدے کے لیے زِرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے[72]، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟[73] اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخّر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے

---

تھے، الوہیّت کا کوئی شائبہ ان میں نہ ہوتا تھا۔ اس مُقدّمے میں حضرت داؤدؑ کی رہنمائی وحی کے ذریعے سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے، حضرت سلیمانؑ کی رہنمائی کی گئی اور انھوں نے صحیح فیصلہ کیا، حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ آگے ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ یہ وہبی کمالات تھے، اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔

ضمناً اِس آیت سے عدالت کا یہ اُصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دو جج ایک مقدمے کا فیصلہ کریں، اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہوگا، لیکن دونوں برحق ہوں گے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور ناتجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ بخاری میں عَمروؓ بن العاص کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا اجتھد الحاکم فاصاب فلہ اجران واذا اجتھد فاخطأ فلہ اجرٌ۔ ’’اگر حاکم اپنی حد تک فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اس کے لیے دُہرا اجر ہے، اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر۔‘‘ ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں بُریدہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ’’قاضی تین قسم کے ہیں۔ ایک ان میں سے جنّتی ہے اور دو جہنمی۔ جنّتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے۔ مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلافِ حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے۔ اور اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے بیٹھ جائے۔‘‘

۷۱ – مَعَ دَاوٗدَ کے الفاظ ہیں، لِدَاوٗدَ کے الفاظ نہیں ہیں، یعنی ’’داؤد علیہ السلام کے لیے‘‘ نہیں بلکہ ’’ان کے ساتھ‘‘ پہاڑ اور پرندے مسخّر کیے گئے تھے، اور اس تسخیر کا حاصل یہ تھا کہ وہ بھی حضرتِ ممدوح کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے

تھے۔ یہی بات سورۂ ص میں بیان کی گئی ہے: اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ ''ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے، اور پرندے بھی مسخر کر دیے تھے جو اکٹھے ہو جاتے تھے، سب اس کی تسبیح کو دُہراتے۔'' سورۂ سَبا میں اس کی مزید وضاحت یہ ملتی ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ ''پہاڑوں کو ہم نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ تسبیح دُہراؤ، اور یہی حکم پرندوں کو دیا۔'' اِن ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سریلی آواز سے پہاڑ گونج اُٹھتے تھے، پرندے ٹھیر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اس معنٰی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اَشْعَرِیؓ، جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپؐ نے فرمایا: لقد اوتی مزماراً من مزامیر اٰل داؤد، یعنی اس شخص کو داؤد کی خوش آوازی کا ایک حصّہ ملا ہے۔

۷۲ – سورۂ سبا میں مزید تفصیل یہ ہے: وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ، ''اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی، اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔ موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنٰی پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ دُنیا میں لوہے کے استعمال کا دَور (iron-age) ۱۲۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے۔ اوّل اوّل شام اور ایشیائے کُوچَک کی حِتّی قوم (Hittites) کو، جس کے عروج کا زمانہ ۲۰۰۰ ق م سے ۱۲۰۰ ق م تک رہا ہے، لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا، اور وہ شدت کے ساتھ اس کو دُنیا بھر سے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا، وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ عام استعمال میں نہ آ سکتا تھا۔ بعد میں فِلِستیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طالوت کی بادشاہی سے پہلے حِتّیوں اور فِلِستیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے تقریباً بے دخل کر دیا تھا، بائبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رَتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے۔ (یشوع، باب ۱۷، آیت ۱۶۔ قُضاۃ، باب ۱، آیت ۱۹۔ باب ۴، آیت ۲-۳) ۱۰۲۰ ق م میں جب طالوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا ہوا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا بڑا حصّہ واپس لے لیا، اور پھر حضرت داؤدؑ (۱۰۰۴-۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرقِ اُردُن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصّے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں آہن سازی کا وہ راز جو حِتّیوں اور فِلِستیوں کے قبضے میں تھا، بے نقاب ہو گیا، اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ فلسطین کے جنوب میں اَدُوم کا علاقہ خام لوہے (iron ore) کی دولت سے مالا مال ہے

بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝۸۱ وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ

برکتیں رکھی ہیں،[۷۴] ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو

اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کُھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔عَقَبہ اور اَیلہ سے مُتّصل حضرت سلیمانؑ کے زمانے کی بندرگاہ، عِضیُون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے، اس کے معائنے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اُصول استعمال کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (blast furnace) میں استعمال ہوتے ہیں۔اب یہ ایک قُدرَتی بات ہے کہ حضرت داؤدؑ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی ہی مدّت پہلے آس پاس کی دشمن قوموں نے اِسی لوہے کے ہتھیاروں سے اُن کی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔

۷۳ ۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۲۵۱۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۷،۶۳۔

۷۴ ۔ اس کی تفصیل سورۂ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ ’’اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اُس کا چلنا شام کو۔‘‘ پھر اس کی مزید تفصیل سورۂ ص میں یہ آتی ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ ’’پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا۔‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمانؑ کے لیے اِس طرح تابعِ امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک مہینے کی راہ تک کے مقامات کا سفر بسہولت کیا جا سکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ اُن کی مرضی کے مطابق بادِ مُوافق ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے دَورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عِضیُون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی مَمالک کی طرف جاتے تھے، اور دوسری طرف بحرِ روم کے بندرگاہوں سے ان کا بیڑا (جسے بائبل میں ’’ترسیسی بیڑا‘‘ کہا گیا ہے) مغربی مَمالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عِضیُون جابر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹّی ملی ہے، اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں اَدوم کے علاقۂ عَرَبہ کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں پگھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآنِ مجید کی اُس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق آئی ہے کہ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ ’’اور ہم نے اس کے لیے پگھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا۔‘‘ نیز اِس تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک مہینے کی راہ تک ہوا کی رفتار کو ’’مسخر‘‘ کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اُس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار

يَغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اس کا تابع بنا دیا تھا جو اُس کے لیے غوطے لگاتے اور اِس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگراں ہم ہی تھے۔[۷۵]

بادِ مُوافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمانؑ پر یہ کرمِ خاص تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے دونوں بحری بیڑوں کو ان کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ (اس کے حکم سے چلتی تھی) کے ظاہر الفاظ سے مُترشّح ہوتا ہے، تو یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے۔ جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دُکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۷۵ — سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ○ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ ...... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰي مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَاۗبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۭ ''اور جنّوں میں سے ایسے جنّ ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے ربّ کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے، اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اس کے لیے جیسے وہ چاہتا، قصر اور مجسّمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے.......... پھر جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو ان جنّوں کو اس کی موت پر مُطّلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، مگر زمین کا کیڑا (یعنی گُھن) جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنّوں کو پتا چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو اِس ذلّت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔'' اِس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جنّ تھے، اور جنّ بھی وہ جنّ جن کے بارے میں مشرکینِ عرب کا یہ عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علمِ غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآنِ مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے تعصّبات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریّات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلق ''شیطان'' اور ''جِنّ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے، وہاں اس کی مراد کون سی مخلوق ہوتی ہے، اور قرآن کی رُو سے وہ کون سے جِنّ ہیں جن کو مشرکینِ عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جنّ اور شیاطین جو

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ

اور یہی (ہوش مندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ[۷۶] کو دی تھی۔ یاد کرو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔"[۷۷] ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور جو تکلیف اُسے تھی اس کو دُور کر دیا،[۷۸] اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ

حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور آس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں اُن کی اِس تاویل کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصّہ آیا ہے، وہاں کا سیاق و سباق اور اندازِ بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انھی کی کون سی خصوصیّت تھی جس کو اس شان سے قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اہرامِ مصر سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسان نے نہیں بنایا ہے، اور کس بادشاہ یا رئیس یا مَلِکُ التُّجّار کے لیے وہ "جنّ" اور "شیاطین" فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمانؑ کے لیے فراہم کر رہے ہیں؟

۷۶ – حضرت ایوبؑ کی شخصیت، زمانہ، قومیّت، ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جدید زمانے کے محققین میں سے کوئی ان کو اسرائیلی قرار دیتا ہے، کوئی مصری اور کوئی عرب۔ کسی کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے کا ہے، کوئی انھیں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے زمانے کا آدمی قرار دیتا ہے، اور کوئی ان سے بھی متأخّر۔ لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد اُس سِفرِ ایوب یا صحیفۂ ایوب پر ہے جو بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں شامل ہے۔ اسی کی زبان، اندازِ بیان، اور کلام کو دیکھ کر یہ مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، نہ کہ کسی اور تاریخی شہادت پر۔ اور اس سِفرِ ایوب کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد ہے اور اس کا بیان قرآنِ مجید کے بیان سے بھی اتنا مختلف ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں مانا جا سکتا، لہٰذا ہم اس پر قطعاً اعتماد نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد شہادت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یسعیاہ نبی اور حزقی ایل نبی کے صحیفوں میں ان کا ذکر آیا ہے، اور یہ صحیفے تاریخی حیثیت سے زیادہ مستند ہیں۔ یسعیاہ نبی آٹھویں صدی اور حزقی ایل نبی چھٹی صدی قبلِ مسیح میں گزرے ہیں، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نویں صدی یا اس سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ رہی ان کی قومیت، تو سورۂ نساء، آیت ۱۶۳ اور سورۂ اَنعام، آیت ۸۴ میں جس طرح ان کا ذکر آیا ہے، اس سے گمان تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر وہب بن مُنَبِّہ کا یہ بیان بھی کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے عیسُو کی نسل سے تھے۔

۷۷ – دُعا کا انداز کس قدر لطیف ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس

مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ ﴿۸۴﴾

اتنے ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔[۷۹]

---

یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ''تُو ارحم الراحمین ہے''۔ آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرضِ مدّعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرزِ دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی پے در پے فاقوں سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ ''میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں''، آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

۷۸- سورۂ ص کے چوتھے رُکوع میں اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اُرۡكُضۡ بِرِجۡلِكَ ۚ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ''اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے نہانے کو اور پینے کو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پاؤں مارتے ہی اللہ نے ان کے لیے ایک قدرتی چشمہ جاری کر دیا، جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اس سے غسل کرنے اور اس کو پینے سے ان کی بیماری دُور ہوگئی۔ یہ علاج اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو کوئی سخت جِلدی بیماری ہوگئی تھی، اور بائبل کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان کا جسم سر سے پاؤں تک پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ (ایوب، باب ۲، آیت ۷)

۷۹- اس قصّے میں قرآنِ مجید حضرت ایوبؑ کو اِس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سِفرِ ایوبؑ پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسّم شکایت، اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اُس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں: ''نابود ہو وہ دن جس میں مَیں پیدا ہوا۔'' ''میں رِحم ہی میں کیوں نہ مر گیا۔'' ''میں نے پیٹ سے نکلتے ہی جان کیوں نہ دے دی۔'' اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ ''قادرِ مُطلَق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری رُوح انھی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں۔'' ''اے بنی آدم کے ناظر! اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے، یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دُور کر دیتا؟'' ''میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے مُلزَم نہ ٹھیرا۔ مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مَشوَرت کو روشن کرے؟'' اُس کے تین دوست اسے آ کر تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے، اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اِس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم

ہے جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکوکار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخرِ کار اس کے دوست اس کی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہوتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی، جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا، بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوبؑ کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ ''اس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھیرایا۔'' اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور ایوبؑ کے درمیان خوب دُوبدُو بحث ہوتی ہے۔ اِس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اُس صبرِ مجسّم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصّہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصّہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصّہ کہتا ہے کہ ایوبؑ ایک نہایت راست باز، خداترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ ''اہلِ مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔'' ایک روز خدا کے ہاں اُس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوبؑ پر فخر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا: آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے، اس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا؟ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے، وہ آپ کے منہ پر آپ کی ''تکفیر'' نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا: اچھا، اس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیو۔ شیطان نے جا کر ایوبؑ کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا، اور ایوبؑ ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا، مگر ایوبؑ کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا: ''ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔'' پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ اُن کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوبؑ کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا: جناب! ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھیے، وہ آپ کے منہ پر آپ کی ''تکفیر'' کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا: اچھا، جا، اُس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور آ کر اس نے ''ایوب کو تلوے سے چاند تک دردناک پھوڑوں سے دُکھ دیا۔'' اس کی بیوی نے اس سے کہا: ''کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا۔'' اس نے جواب دیا: ''تو نادان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دُکھ نہ پائیں؟''

یہ ہے سِفرِ ایوبؑ کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوبؑ کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات والزامات کی ایک مسلسل داستان ہے،

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ

اور یہی نعمت اسماعیلؑ اور ادریسؑ[80] اور ذُوالکِفلؑ[81] کو دی، کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو

اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوبؑ کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب دُو بدُو بحث کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توکّل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوبؑ ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دُور کر دیتے ہیں، اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا، اس سے دو چند دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصّے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوبؑ اور اللہ میاں دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبُور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے، تاکہ شیطان کے سامنے ان کی ہیٹی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوبؑ کا۔ بلکہ یہ حضرت ایوبؑ کے زمانے کا بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصّۂ ایوبؑ کو بنیاد بنا کر ''یوسف زلیخا'' کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوبؑ، الیفز تیمانی، سوخی بِلدد، نعماتی ضُوفر، برا کیل بُوزی کا بیٹا الیہُو، چند کریکٹر ہیں جن کی زبان سے نظامِ کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زورِ بیان کی جس قدر جی چاہے داد دے لیجیے، مگر کُتُبِ مقدّسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنٰی نہیں۔ ایوبؑ کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ''یوسف زلیخا'' کا تعلق سیرتِ یُوسُفی سے ہے، بلکہ شاید اُتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصّے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، اُن میں صحیح تاریخ کا ایک عُنصر پایا جاتا ہے، اور وہ شاعر نے یا تو زبانی رِوایات سے لیا ہوگا جو اس کے زمانے میں مشہور ہوں گی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہوگا جو اب ناپید ہے۔

۸۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، تفسیر سورۂ مریم، حاشیہ ۳۳۔

۸۱ – ذُوالکِفل کا لفظی ترجمہ ہے ''صاحبِ نصیب''، اور مُراد ہے اَخلاقی بزرگی اور ثوابِ آخرت کے لحاظ سے صاحبِ نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگ کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآنِ مجید میں دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے، نام نہیں لیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملے میں بہت مضطرب ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریّاؑ کا دوسرا نام ہے (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے)، کوئی کہتا ہے یہ حضرت الیاسؑ ہیں، کوئی یُوشعؑ بن نُون کا نام لیتا ہے، کوئی کہتا ہے یہ اَلْیَسَعؑ ہیں، (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورۂ ص میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذُوالکفل کا الگ)، کوئی انھیں حضرت اَلْیَسَعؑ کا خلیفہ

اَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا

ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔
اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا[۸۲]۔ یاد کرو جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا[۸۳]

بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بِشر تھا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ ''یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقیال (حِزْقی اِیل) نبی ہیں، جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ ق م) کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہرِ خابُور کے کنارے ایک بستی میں فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے۔''

ان مختلف اقوال کی موجودگی میں یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حِزْقی اِیل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے، لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکے۔ تاہم اگر اس کے لیے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفۂ حِزْقی اِیل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں جو اس آیت میں کی گئی ہے، یعنی صابر اور صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بُخْتِ نَصَّر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بُخْتِ نَصَّر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نو آبادی دریائے خابُور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تَلْ اَبِیب تھا۔ اِسی مقام پر ۵۹۴ ق م میں حضرت حِزْقی اِیل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے، جب کہ ان کی عمر ۳۰ سال تھی، اور مسلسل ۲۲ سال تک ایک طرف گرفتارِ بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کو چونکانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کارِ عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا، اُس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال اُن کی بیوی، جنھیں وہ خود ''منظورِ نظر'' کہتے ہیں، انتقال کر جاتی ہیں، لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور یہ اپنا دُکھڑا چھوڑ کر اپنی ملّت کو خدا کے اس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اس کے سر پر تُلا کھڑا تھا۔ (باب ۲۴، آیات ۱۵-۲۷) بائبل کا صحیفۂ حِزْقی اِیل ان صحیفوں میں سے ہے جنھیں پڑھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الہامی کلام ہے۔

**۸۲** – مراد ہیں حضرت یُونُسؑ۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں ''ذوالنُّون'' اور ''صاحب الحُوت''، یعنی ''مچھلی والے'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا اُنھیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں پکڑتے یا بیچتے تھے، بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا، جیسا کہ سورۂ صافات، آیت ۱۴۲ میں بیان ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، یونس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ الصّافّات حواشی ۷۷ تا ۸۵)

**۸۳** – یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے، قبل اِس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور اُن کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔

فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ‌ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ‌ۚ‏ ﴿۸۷﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ‌ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنۡجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ‏ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِيَّاۤ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِىۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَيۡرُ الۡوٰرِثِيۡنَ ‌ۚ‏ ﴿۸۹﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ وَوَهَبۡنَا لَهٗ يَحۡيٰى وَاَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا يُسٰرِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ وَيَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا‌ ؕ وَكَانُوۡا لَنَا خٰشِعِيۡنَ‏ ﴿۹۰﴾

---

اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔[۸۴] آخر کو اُس نے تاریکیوں میں سے پکارا:[۸۵] ”نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔“ تب ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اِسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

اور زکریاؑ کو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”اے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور بہترین وارث تو تُو ہی ہے۔“ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اسے یحییٰؑ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے دُرست کر دیا۔[۸۶] یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دَوڑ دھوپ کرتے تھے، اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جُھکے ہوئے تھے۔[۸۷]

---

۸۴ – انھوں نے خیال کیا کہ اس قوم پر تو عذاب آنے والا ہے، اب مجھے کہیں چل کر پناہ لینی چاہیے، تاکہ خود بھی عذاب میں نہ گِھر جاؤں۔ یہ بات بجائے خود تو قابلِ گرفت نہ تھی، مگر پیغمبر کا اذنِ الٰہی کے بغیر ڈیوٹی سے ہٹ جانا قابلِ گرفت تھا۔

۸۵ – یعنی مچھلی کے پیٹ میں سے، جو خود تاریک تھا، اور اُوپر سے سمندر کی تاریکیاں مزید۔

۸۶ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، آیات ۳۷ تا ۴۱ مع حواشی۔ جلد سوم، مریم، آیات ۲ تا ۱۵ مع حواشی۔ بیوی کو دُرست کر دینے سے مراد ان کا بانجھ پن دُور کر دینا اور سِنّ رسیدگی کے باوجود حمل کے قابل بنا دینا ہے۔ ”بہترین وارث تو تُو ہی ہے“، یعنی تو اولاد نہ بھی دے تو غم نہیں، تیری ذات پاک وارث ہونے کے لیے کافی ہے۔

۸۷ – اس سیاق و سباق میں انبیاؑ کا ذکر جس مقصد کے لیے کیا گیا ہے، اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے،

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ

اور وہ خاتون جس نے اپنی عِصمت کی حفاظت کی تھی۔[88] ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح سے پُھونکا[89] اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو دُنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔[90]

یہ تمھاری اُمّت حقیقت میں ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمھارا رب ہوں،

اُلوہیّت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونسؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اُولُوا العزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہوا تو انھیں پکڑ لیا گیا۔ اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوبؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلائے مصیبت ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاؑ توحید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمایشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو، مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوئی ہیں۔

**۸۸** - مراد ہیں حضرت مریم علیہا السلام۔

**۸۹** - حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (ص، آیات ۷۱-۷۲) ”میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس (اے فرشتو!) جب میں اسے پورا بنالوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“ اور یہی بات حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ (آیت ۱۷۱) ”اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح۔“ اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہوا: وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (آیت ۱۲) ”اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، پس پھونک دیا ہم نے اُس میں اپنی رُوح سے۔“ اس کے ساتھ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدایش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ

فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓي

ع ۶ ۱۸

پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انھوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا[91] ــــــ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے، ع پھر جو نیک عمل کرے گا، اِس حال میں کہ وہ مومن ہو، تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے[92]۔ یہاں تک کہ

كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (آیت ۵۹) ''عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے، جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا: ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتا ہے۔'' ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معمولی طریقۂ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہِ راست اپنے حکم سے وجود میں لا کر زندگی بخشتا ہے تو اس کو ''اپنی روح سے پھونکنے'' کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس رُوح کی نسبت اللہ کی طرف غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس کا پھونکا جانا معجزے کی غیر معمولی شان رکھتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۲-۲۱۳)

**۹۰** – یعنی یہ دونوں ماں بیٹے خدا یا خدائی میں شریک نہ تھے بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ ''نشانی'' وہ کس معنیٰ میں تھے، اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ مریم، حاشیہ ۲۱- اور سورۂ المومنون، حاشیہ ۴۳۔

**۹۱** – ''تم'' کا خطاب تمام انسانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو! تم سب حقیقت میں ایک ہی اُمّت اور ایک ہی ملّت تھے، دُنیا میں جتنے نبی بھی آئے، وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے، وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک ایک جُز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملّتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فُلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بِنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملّتوں اور مذہبوں کا تفرِقہ انبیاؑ کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ یہ مختلف ملّتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاؑ کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملّتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاؑ کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاؑ دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔

اِذَا فُتِحَتۡ يَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ وَهُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ وَاقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَارُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ يٰوَيۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمۡ

جب یاجُوج و ماجُوج کھول دیے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے پُورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا[۹۳]، تو یکایک اُن لوگوں کے دِیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے: "ہائے ہماری کم بختی! ہم اِس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، بلکہ ہم خطا کار[۹۴] تھے۔" بے شک تم

**۹۲** – اس آیت کے تین مطلب ہیں:

ایک، یہ کہ جس قوم پر ایک مرتبہ عذابِ الٰہی نازل ہو چکا ہو، وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔ اس کی نشأۃِ ثانیہ اور اس کی حیاتِ نَو ممکن نہیں ہے۔

دوسرے، یہ کہ ہلاک ہو جانے کے بعد پھر اِس دُنیا میں اُس کا پلٹنا اور اسے دوبارہ امتحان کا موقع ملنا غیر ممکن ہے۔ پھر تو اللہ کی عدالت ہی میں اُس کی پیشی ہو گی۔

تیسرے، یہ کہ جس قوم کی بدکاریاں اور زیادتیاں اور ہدایتِ حق سے پیہم رُوگردانیاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر رُجوع اور توبہ و انابت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اُس کے لیے پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ضلالت سے ہدایت کی طرف پلٹ سکے۔

**۹۳** – یاجُوج و ماجُوج کی تشریح سورۂ کہف حاشیہ ۶۲ و ۶۹ میں کی جا چکی ہے۔ اُن کے کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ "وعدۂ حق پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا" کا اشارہ صاف طور پر اِس طرف ہے کہ یاجوج و ماجوج کی یہ عالم گیر یورش آخری زمانے میں ہو گی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آ جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنیٰ کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کی رِوایَت سے نقل کیا ہے کہ "قیامت قائم نہ ہو گی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو: دُھواں، دجّال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طُلوع، عیسٰی ابنِ مریمؑ کا نزول، یاجُوج و ماجُوج کی یورش، اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسا، یا landslide) ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی۔ (یعنی بس اس کے بعد

وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾ لَوۡ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا ؕ وَكُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمۡ

اور تمھارے وہ معبُود جنھیں تم پُوجتے ہو، جہنّم کا ایندھن ہیں، وہیں تم کو جانا ہے۔[95] اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اِسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ

قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج و ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضورؐ نے فرمایا: اُس وقت قیامت اِس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پیٹوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جَن دے، رات کو یا دن کو۔ (کالحامل المتم لا یدری اھلھا متی تفجؤھم بولدھا لیلا او نھارًا) لیکن قرآنِ مجید اور احادیث میں یاجوج و ماجوج کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ مُترشّح نہیں ہوتا کہ یہ دونوں متحد ہوں گے اور مل کر دُنیا پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں یہ دونوں آپس ہی میں لڑ جائیں اور پھر ان کی لڑائی ایک عالم گیر فساد کی موجب بن جائے۔

۹۴- ''غفلت'' میں پھر ایک طرح کی معذرت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنی غفلت کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی صاف صاف اعتراف کریں گے کہ ہم کو انبیاءؑ نے آ کر اِس دن سے خبردار کیا تھا، لہٰذا درحقیقت ہم غافل و بے خبر نہ تھے بلکہ خطا کار تھے۔

۹۵- رِوایات میں آیا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن اَلزِّبَعرٰی نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو صرف ہمارے ہی معبُود نہیں، مسیحؑ اور عُزیرؑ اور ملائکہ بھی جہنّم میں جائیں گے، کیونکہ دُنیا میں ان کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم، کل من احبّ ان یعبد من دون اللّٰہ فھو مع من عبدہٗ، ''ہاں، ہر وہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُس کی بندگی کی جائے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جنھوں نے اس کی بندگی کی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے خلقِ خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انھی کو معبُود بنا بیٹھے، یا جو غریب اِس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دُنیا میں ان کی بندگی کی جا رہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کے جہنّم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اس شرک کے ذمّہ دار نہیں ہیں۔ البتہ جنھوں نے خود معبُود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلقِ خدا کے اِس شرک میں واقعی دخل ہے، وہ سب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنّم میں جائیں گے۔ اِسی طرح وہ لوگ بھی جہنّم میں جائیں گے جنھوں نے اپنی اغراض کے لیے غیر اللہ کو معبُود بنوایا، کیونکہ اس صورت میں مشرکین کے اصلی معبُود وہی قرار پائیں گے، نہ کہ وہ جن کو اِن اَشرار نے بظاہر معبُود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے، کیونکہ اُس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبُود بنایا جاتا ہے، اصل معبُود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے، جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامانِ پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنّم میں داخل کیا جائے گا، تاکہ وہ ان پر آتشِ جہنّم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انھیں مزید تکلیف ہو، کہ جن سے

فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ

پُھنکارے ماریں[۹۶] گے اور حال یہ ہوگا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہوگا، تو وہ یقیناً اُس سے دُور رکھے جائیں[۹۷] گے، اُس کی سرسراہٹ تک نہ سُنیں گے، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے۔ وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت اُن کو ذرا پریشان نہ کرے[۹۸] گا، اور ملائکہ بڑھ کر اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ "یہ تمھارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔"

وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طُومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم پھر اُس کا

---

وہ شفاعت کی اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے، وہ اُن پر اُلٹے عذاب کی شدّت کے موجب بنے ہوئے ہیں۔

۹۶ – اصل میں لفظ زَفِيْرٌ استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور تکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اس کو ایک پُھنکار کی شکل میں نکالتا ہے، تو اسے عربی میں زفیر کہتے ہیں۔

۹۷ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دُنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ وعدہ فرما چکا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور ان کو نجات دی جائے گی۔

۹۸ – یعنی روزِ محشر اور خدا کے حضور پیشی کا وقت، جو عام لوگوں کے لیے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہوگا، اس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لیے کہ سب کچھ اُن کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایمان وعملِ صالح کی جو پونجی لیے ہوئے وہ دُنیا سے رخصت ہوئے تھے، وہ اُس وقت خدا کے فضل سے اُن کی ڈھارس بندھائے گی اور خوف وحُزن کے بجائے ان کے دلوں میں یہ اُمید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے

نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۱۰۴ وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝۱۰۶ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷

اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمّے، اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔ اور زَبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ اِس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔[99]

اے محمدؐ! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دُنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔[100]

---

نتائجِ خیر سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

**۹۹** - اِس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کَنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دُنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرُّف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انھی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کُلِّیّہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے، جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے، اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر اُن قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دُنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر، سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں، جنھیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فِسق، فُجور، مَعصِیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرمانرواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کُھلّم کُھلّا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدّ مقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمین ہوئے ہیں۔ اِس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کُلِّیّہ تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ ''صالح'' کے اُس مفہوم میں ہے جو اَب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں ''صالح'' قرار پا سکیں، قطعِ نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ہوں، یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ ''صلاح'' کو ڈارونی تصورِ ''صلاحیت'' (fitness) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رُو سے آیتِ زیرِ بحث کے معنٰی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی ممالک کو فتح کرنے اور اُن پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی ''خدا کا صالح بندہ'' ہے اور اس کا یہ فعل تمام ''عابد'' انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ''عبادت'' اِس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجے میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو، تو نہ تمھارا شمار صالحین میں ہوسکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ معنٰی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر ''صلاح'' اور ''عبادت'' کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرُّسُل، ایمان بالکُتُب) کیا ہے جس کے بغیر، خود اِسی قرآن کی رُو سے، خدا کے ہاں کوئی عملِ صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اِس دعوت کے کیا معنٰی ہیں کہ اُس نظامِ اخلاق اور قانونِ زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسولؐ کے ذریعے سے بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنٰی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے، وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان داری کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غَلَطی ہوئی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنٰی بدل ڈالے، تاکہ وہ سب اُن کی اِس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں، اور اس ایک چیز کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انھوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو اُلٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مَرمّتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں، اُن کو یہ اُلٹا الزام دیتے ہیں کہ ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں''۔ یہ دراصل مادّی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہوگیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تأمّل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غَلَطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اُصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہوسکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص، جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے، وہ ''مادّی ترقی اور حکمرانی کی صلاحیت'' کی ہم معنٰی نہیں ہے، اور ''صالح'' کو اگر ''صاحبِ صلاحیت'' کے معنٰی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہُوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سِیاق وسَباق سے الگ کر کے بے تکلّف جو معنٰی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنٰی صرف وہی ہوسکتے ہیں جو سیاق وسباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا تھا کہ اُوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے، وہ عالَمِ آخرت میں مومنین، صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکایک اِس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کون سا موقع تھا کہ دُنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اُصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر

اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اُس اَبدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظامِ زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون، آیات ۴-۱۱ میں بھی ارشاد ہُوا ہے، اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زُمر کے خاتمے پر بیان کیا گیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صُورِ اوّل وثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفر کا انجام بیان کرکے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ ”اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا، وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے لیے جنّت کے دروازے کھول دیے جائیں گے، اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ اب اِس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوجاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اُس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔“ دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالَمِ آخرت سے ہے نہ کہ اس دُنیا سے۔

اب زَبور کو لیجیے جس کا حوالہ آیت زیرِ بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں زَبور کے نام سے جو کتاب اِس وقت پائی جاتی ہے، یہ اپنی اصلی غیر مُحرَّف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزامیرِ داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خَلَط مَلَط ہو گئے ہیں اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زَبور اس وقت موجود ہے، اس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکّل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

> ”کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے، لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، ملک کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہوجائے گا، تُو اُس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے.......... ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی.......... صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔“ (۳۷ داؤد کا مزمور، آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹)

دیکھیے، یہاں راست باز لوگوں کے لیے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں کی رُو سے خلود اور اَبدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے، نہ کہ اِس دُنیا کی زندگی سے۔

دُنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے، اسے سورۂ اَعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۟ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ (آیت ۱۲۸) ”زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔“ مشیّتِ الٰہی کے تحت یہ وراثت مومن اور کافر، صالح اور فاسق، فرماں بردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے، مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر، جیسا کہ اِسی آیت کے بعد دوسری آیت میں فرمایا: وَيَسْتَخْلِفَكُمْ

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اِن سے کہو: ”میرے پاس جو وحی آتی ہے، وہ یہ ہے کہ تمھارا خدا صرف ایک خدا ہے، پھر کیا تم سرِ اطاعت جُھکاتے ہو؟“ اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ ”میں نے عَلَی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[۱۰۱]، قریب ہے یا دُور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو بآوازِ بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چُھپا کر کرتے ہو[۱۰۲]۔

فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ع (آیت ۱۲۹) ”اور وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔“ اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک ضابطے کے مطابق دُنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس آخرت میں اِسی زمین کا دوامی بندوبست ہوگا، اور قرآن کے متعدّد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اِس قاعدے پر ہوگا کہ ”زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنینِ صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر نہیں، بلکہ اُس نیک رَوِیّے کی اَبَدی جزا کے طور پر جو انھوں نے دُنیا میں اختیار کیا۔“ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، النور، حاشیہ ۸۳)

**۱۰۰ –** دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے تم کو دُنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔“ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت دراصل نوعِ انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے، کیونکہ آپؐ نے آ کر غفلت میں پڑی ہوئی دُنیا کو چونکایا ہے، اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے، اور اس کو بالکل غیر مُشتبہ طریقے سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کون سی ہے اور سلامتی کی راہ کون سی۔ کفّارِ مکہ حضوؐر کی بِعثت کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت تمھارے لیے خدا کی رحمت ہے۔

**۱۰۱ –** یعنی خدا کی پکڑ جو دعوتِ رسالت کو ردّ کر دینے کی صورت میں آئے گی، خواہ کسی نوعیت کے عذاب کی شکل میں آئے۔

**۱۰۲ –** اشارہ ہے اُن مخالفانہ باتوں اور سازشوں اور سرگوشیوں کی طرف جن کا آغازِ سورہ میں ذکر کیا گیا تھا۔ وہاں بھی رسولؐ کی زبان سے اِن کا یہی جواب دلوایا گیا تھا کہ جو باتیں تم بنا رہے ہو، وہ سب خدا سُن رہا ہے اور جانتا ہے۔ یعنی

وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

ع ۷ ۱۹ النصف

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمھارے لیے ایک فتنہ[۱۰۳] ہے اور تمھیں ایک وقتِ خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔"

(آخرِ کار) رسولؐ نے کہا کہ "اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو، اُن کے مقابلے میں ہمارا ربِّ رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے۔" ع

اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ہوا میں اُڑ گئیں اور کبھی ان کی باز پُرس نہ ہو گی۔

**۱۰۳-** یعنی تم اس تاخیر کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تاخیر تو اس لیے کی جا رہی ہے کہ تمھیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دی جائے اور جلد بازی کر کے فوراً ہی نہ پکڑ لیا جائے۔ مگر تم اِس سے اِس غلط فہمی میں پڑ گئے ہو کہ نبی کی سب باتیں جھوٹی ہیں، ورنہ اگر یہ سچّا نبی ہوتا اور خدا ہی کی طرف سے آیا ہوتا، تو اس کو جھٹلا دینے کے بعد ہم کبھی کے دھر لیے گئے ہوتے۔

---

# تفہیم القرآن

# الحج

# (۲۲)

# الحج

**نام** چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ سے ماخوذ ہے۔

**زمانۂ نزول** اس سورہ میں مکّی اور مدنی سورتوں کی خصوصیّات ملی جُلی پائی جاتی ہیں۔ اِسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہوا ہے کہ یہ مکّی ہے یا مدنی۔ لیکن ہمارے نزدیک اِس کے مضامین اور اندازِ بیان کا یہ رنگ اِس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکّی دَور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دَور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

ابتدائی حصّے کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتاتا ہے کہ یہ مکے میں نازل ہوا ہے، اور اغلب یہ ہے کہ مکّی زندگی کے آخری دَور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا ہو۔ یہ حصّہ آیت ۲۴ (وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ○) پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر تک کا حصہ مدینۂ طیّبہ میں نازل ہوا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ذی الحجہ میں نازل ہُوا ہو، کیونکہ آیات ۲۵ تا ۴۱ کا مضمون اِسی بات کی نشان دِہی کرتا ہے، اور آیات ۳۹-۴۰ کی شانِ نُزول بھی اس کی مؤیّد ہے۔ اُس وقت مہاجرین ابھی تازہ تازہ ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے میں آئے تھے۔ حج کے زمانے میں اُن کو اپنا شہر اور حج کا اجتماع یاد آرہا ہوگا اور یہ بات بُری طرح کَھل رہی ہوگی کہ مشرکینِ قریش نے اُن پر مسجدِ حرام کا راستہ تک بند کر دیا ہے۔ اُس زمانے میں وہ اس بات کے بھی منتظر ہوں گے کہ جن ظالموں نے ان کو گھروں سے نکالا، مسجدِ حرام کی زیارت سے محروم کیا، اور خدا کا راستہ اختیار کرنے پر ان کی زندگی تک دشوار کر دی، اُن کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ ٹھیک نفسیاتی موقع تھا اِن آیات کے نُزول کا۔ اِن میں پہلے تو حج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مسجدِ حرام اس لیے بنائی گئی تھی اور یہ حج کا طریقہ اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ دُنیا میں خدائے واحد کی بندگی کی جائے، مگر آج وہاں شرک ہو رہا ہے اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والوں کے لیے اس کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں اور انھیں بے دخل کر کے ملک میں وہ نظامِ صالح قائم کریں جس میں بُرائیاں دَبیں اور نیکیاں فروغ پائیں۔ ابنِ عباسؓ، مجاہد، عُروَہ بن زُبیر، زید بن اسلم، مُقاتل بن حَیّان، قَتادہ اور دوسرے اکابر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ پہلی آیت ہے

جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور حدیث و سیرت کی روایات سے ثابت ہے کہ اِس اجازت کے بعد فوراً ہی قریش کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں، اور پہلی مہم صفر ۲ ھ میں ساحل بحِر احمر کی طرف روانہ ہوئی جو غزوۂ وَدّان یا غزوۂ اَبْوا کے نام سے مشہور ہے۔

**موضوع و مَبْحَث** اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں: مشرکینِ مکہ، مذبذب اور متردّد مسلمان، اور مومنینِ صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکے میں کی گئی اور مدینے میں اُس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اِس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ مُتَنبِّہ کیا گیا ہے کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے بے بنیاد جاہلانہ خیالات پر اصرار کیا، خدا کو چھوڑ کر اُن معبُودوں پر اعتماد کیا جن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اور خدا کے رسولؐ کو جھٹلا دیا۔ اب تمھارا انجام وہی کچھ ہو کر رہے گا جو تم سے پہلے اس رَوِش پر چلنے والوں کا ہو چکا ہے۔ نبی کو جھٹلا کر اور اپنی قوم کے صالح ترین عُنصر کو نشانۂ ستم بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خدا کا جو غضب تم پر نازل ہو گا، اس سے تمھارے بناوٹی معبود تمھیں نہ بچا سکیں گے۔ اس تنبیہ و اِنذار کے ساتھ افہام و تفہیم کا پہلو بالکل خالی نہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری سورت میں جگہ جگہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ آخر کیسا ایمان ہے کہ راحت، مَسَرَّت، عیش نصیب ہو تو خدا تمھارا خدا اور تم اس کے بندے۔ مگر جہاں خدا کی راہ میں مصیبت آئی اور سختیاں جھیلنی پڑیں، پھر نہ خدا تمھارا خدا رہا اور نہ تم اس کے بندے رہے۔ حالانکہ تم اپنی اس رَوِش سے کسی ایسی مصیبت اور نقصان اور تکلیف کو نہیں ٹال سکتے جو خدا نے تمھارے نصیب میں لکھ دی ہو۔

اہلِ ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے: ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطَب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی۔ اور دوسرے خطاب میں صرف اہل ایمان مخاطب ہیں۔

پہلے خطاب میں مشرکینِ مکہ کی اس رَوِش پر گرفت کی گئی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے، حالانکہ مسجدِ حرام ان کی ذاتی جائداد نہیں ہے اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے۔ یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بجائے خود حق بجانب تھا، بلکہ سیاسی حیثیت سے یہ قریش کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بھی تھا۔ اس سے عرب کے تمام دوسرے قبائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا گیا کہ قریش حرم کے مجاور ہیں یا مالک؟ اگر آج اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر وہ ایک

گروہ کو حج سے روک دیتے ہیں اور اس کو برداشت کرلیا جاتا ہے، تو کیا بعید ہے کہ کل جس سے بھی اُن کے تعلّقات خراب ہوں، اُس کو وہ حُدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیں اور اس کا عمرہ و حج بند کر دیں۔ اس سلسلے میں مسجدِ حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کے حکم سے اس کو تعمیر کیا تھا تو سب لوگوں کو حج کا اِذنِ عام دیا تھا اور وہاں اوّل روز سے مَقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حُقوق یکساں قرار دیے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھر شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا، اب یہ کیا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع، اور بتوں کی پرستش کے لیے ہو پوری آزادی۔

دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تمھیں اقتدار حاصل ہو تو تمھاری رَوِش کیا ہونی چاہیے اور اپنی حکومت میں تم کو کس مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہ مضمون سورہ کے وسط میں بھی ہے اور آخر میں بھی۔ آخر میں گروہِ اہلِ ایمان کے لیے ''مسلم'' کے نام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کے اصل جانشین تم لوگ ہو، تمھیں اِس خدمت کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے کہ دُنیا میں شہادت عَلَی النّاس کے مَقام پر کھڑے ہو، اب تمھیں اِقامتِ صلوٰۃ، اِیتائے زکوٰۃ اور فعل الخیرات سے اپنی زندگی کو بہترین نمونے کی زندگی بنانا چاہیے اور اللہ کے اعتماد پر اِعلائے کَلِمَۃُ اللہ کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

اس موقع پر سورۂ بَقَرہ اور سورۂ اَنفال کے دیباچوں پر بھی نگاہ ڈال لی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

---

۷۸ ایاتہا — ۱۰ رکوعاتہا

## سُوْرَۃُ الْحَجِّ مَدَنِیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ①

لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔[1]

۱ - یہ زلزلہ قیامت کی ابتدائی کیفیات میں سے ہے، اور اغلب یہ ہے کہ اس کا وقت وہ ہوگا جب کہ زمین یکا یک اُلٹی پھرنی شروع ہو جائے گی اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طُلوع ہوگا۔ یہی بات قدیم مفسرین میں سے عَلْقَمہ اور شَعْبی نے بیان کی ہے کہ یکون ذٰلک عند طلوع الشمس من مغربھا۔ اور یہی بات اُس طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو ابنِ جَرِیر اور طَبَرانی اور ابنِ ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی رِوایت سے نقل کی ہے۔ اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ نفخِ صُور کے تین مواقع ہیں: ایک نَفخِ فَزَع، دوسرا نفخِ صَعق اور تیسرا نفخِ قیام لِربّ العالمین۔ یعنی پہلا نفخ عام سراسیمگی پیدا کرے گا، دوسرے نفخ پر سب مر کر گر جائیں گے، اور تیسرے نفخ پر سب لوگ زندہ ہو کر خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ پھر پہلے نفخ کی تفصیلی کیفیت بیان کرتے ہوئے آپؐ بتاتے ہیں کہ اُس وقت زمین کی حالت اُس کشتی کی سی ہوگی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو، یا اُس معلّق قندیل کی سی جس کو ہوا کے جھونکے بُری طرح جھنجوڑ رہے ہوں۔ اُس وقت زمین کی آبادی پر جو کچھ گزرے گی، اُس کا نقشہ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ مثلاً:

| | |
|---|---|
| فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَیَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ (الحاقّہ) | پس جب صُور میں ایک پھونک ماردی جائے گی اور زمین اور پہاڑ اُٹھا کر ایک ہی چوٹ میں توڑ دیے جائیں گے، تو وہ واقعۂ عظیم پیش آجائے گا۔ |
| اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ (الزلزال) | جب کہ زمین پوری کی پوری ہلا ماری جائے گی، اور وہ اپنے پیٹ کے بوجھ نکال پھینکے گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے۔ |
| یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۙ قُلُوْبٌ یَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ (النازعات) | جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا ایک جھٹکا اور اس کے بعد دوسرا جھٹکا، اس دن دل کانپ رہے ہوں گے اور نگاہیں خوف زدہ ہوں گی۔ |
| اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ (الواقعہ) | جس روز زمین جھنجوڑ ڈالی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ |

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝٢ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ

جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہوگا کہ ہر دُودھ پلانے والی اپنے دُودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی[2]، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا[3]۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں[4] اور ہر شیطانِ سرکش

---

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (المزمل) — اگر تم نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو کیسے بچو گے اُس دن کی آفت سے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور جس کی شدت سے آسمان پھٹا پڑتا ہوگا۔

اگر چہ بعض مفسرین نے اس زلزلے کا وقت وہ بتایا ہے جب کہ مُردے زندہ ہو کر اپنے ربّ کے حضور پیش ہوں گے، اور اس کی تائید میں متعدِّد احادیث بھی نقل کی ہیں، لیکن قرآن کا صریح بیان ان رِوایات کو قبول کرنے میں مانع ہے۔ قرآن اِس کا وقت وہ بتا رہا ہے جب کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوں گی، اور پیٹ والیوں کے پیٹ گر جائیں گے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آخرت کی زندگی میں نہ کوئی عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہوگی اور نہ کسی حاملہ کے وضعِ حمل یا اسقاط کا کوئی موقع ہوگا، کیونکہ قرآن کی واضح تصریحات کی رُو سے وہاں سب رشتے منقطع ہو چکے ہوں گے اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے خدا کے سامنے حساب دینے کے لیے کھڑا ہوگا۔ لہٰذا قابلِ ترجیح وہی رِوایت ہے جو ہم نے پہلے نقل کی ہے۔ اگر چہ اس کی سند ضعیف ہے مگر قرآن سے مطابقت اس کے ضعف کو دُور کر دیتی ہے۔ اور یہ دوسری روایات گو سنداً قوی تر ہیں، لیکن قرآن کے ظاہر بیان سے عَدَمِ مطابقت ان کو ضعیف کر دیتی ہے۔

**۲** — آیت میں مُرْضِعٌ کے بجائے مُرْضِعَۃٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عَرَبیّت کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ مُرْضِع اُس عورت کو کہتے ہیں جو دودھ پلانے والی ہو، اور مُرضِعَہ اُس حالت میں بولتے ہیں جب کہ وہ بالفعل دودھ پلا رہی ہو اور بچہ اس کی چھاتی منہ میں لیے ہوئے ہو۔ پس یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ جب وہ قیامت کا زلزلہ آئے گا تو مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ نکلیں گی اور کسی ماں کو یہ ہوش نہ رہے گا کہ اس کے لاڈلے پر کیا گزری۔

كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ

---

کی پیروی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اُس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا، اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذابِ جہنّم کا راستہ دکھائے گا۔لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نُطفے سے[5]، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی[6]۔ (یہ ہم اِس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھیرائے

---

۳- واضح رہے کہ یہاں اصل مقصودِ کلام قیامت کا حال بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ خدا کے عذاب کا خوف دلا کر اُن باتوں سے بچنے کی تلقین کرنا ہے جو اس کے غضب کی موجب ہوتی ہیں۔ لہٰذا قیامت کی اِس مختصر کیفیت کے بعد آگے اصل مقصود پر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

۴- آگے کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے بارے میں ان کے جس جھگڑے پر گفتگو کی جا رہی ہے، وہ اللہ کی ہستی اور اس کے وجود کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حُقوق اور اختیارات اور اس کی بھیجی ہوئی تعلیمات کے بارے میں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے توحید اور آخرت منوانا چاہتے تھے، اور اسی پر وہ آپؐ سے جھگڑتے تھے۔ ان دونوں عقیدوں پر جھگڑا آخر کار جس چیز پر جا کر ٹھیرتا تھا، وہ یہی تھی کہ خدا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، اور یہ کہ کائنات میں آیا خدائی صرف ایک خدا ہی کی ہے، یا کچھ دوسری ہستیوں کی بھی۔

۵- اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادّوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اِس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا، جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا: وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ (آیات ۷-۸) ”انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔“

مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ

رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بُلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے، تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے[7]۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سُوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اُٹھی اور پھُول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[8]،

۶ – یہ اشارہ ہے اُن مختلف اطوار کی طرف جن سے ماں کے پیٹ میں بچہ گزرتا ہے۔ ان کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خُردبینوں ہی سے نظر آ سکتی ہیں، بلکہ ان بڑے بڑے نمایاں تغیُّرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بَدّو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداءً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے، جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انھی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے علم الجنین کی تفصیلی تحقیقات کی نہ اُس وقت ضرورت تھی نہ آج ہے۔

۷ – یعنی بڑھاپے کی وہ حالت جس میں آدمی کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ وہی شخص جو دوسروں کو عقل بتاتا تھا، بوڑھا ہو کر اُس حالت کو پہنچ جاتا ہے جو بچے کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے۔ جس علم و واقفیت اور تجربہ کاری و جہاں دیدگی پر اس کو ناز تھا، وہ ایسی بے خبری میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ بچے تک اس کی باتوں پر ہنسنے لگتے ہیں۔

۸ – اس سلسلۂ کلام میں یہ فقرہ تین معنٰی دے رہا ہے: ایک، یہ کہ اللہ ہی سچّا ہے اور تمھارا یہ گمان محض باطل ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے، یہ کہ اللہ کا وجود محض ایک خیالی اور فرضی وجود نہیں ہے جسے بعض عقلی مشکلات رفع کرنے کی خاطر مان لیا گیا ہو۔ وہ نِرا فلسفیوں کے خیال کا آفریدہ، واجب الوجود اور علّت العِلَل

وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۙ‏ ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ‏ ﴿۷﴾

اور وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور یہ (اِس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اُٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں[9]۔

(first cause) ہی نہیں ہے، بلکہ وہ حقیقی فاعلِ مختار ہے جو ہر آن اپنی قدرت، اپنے ارادے، اپنے علم اور اپنی حکمت سے پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی تدبیر کر رہا ہے۔ تیسرے، یہ کہ وہ کھلنڈرا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے کھلونے بنائے اور پھر یونہی توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دے۔ وہ حق ہے، اس کے سب کام سنجیدہ اور بامقصد اور پُرحکمت ہیں۔

**۹** — اِن آیات میں انسان کی پیدایش کے مختلف اطوار، زمین پر بارش کے اثرات، اور نباتات کی پیداوار کو پانچ حقیقتوں کی نشان دہی کرنے والے دلائل قرار دیا گیا ہے:

(۱) یہ کہ اللہ ہی حق ہے،

(۲) یہ کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے،

(۳) یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے،

(۴) یہ کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اور

(۵) یہ کہ اللہ ضرور اُن سب لوگوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا جو مر چکے ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ آثار ان پانچوں حقیقتوں کی کس طرح نشان دہی کرتے ہیں:

پورے نظامِ کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدایش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ ایک ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے، اور ہر ایک کے وجود اور نشوونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے، جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آئے کہ ایک ایک فردِ انسانی جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے، اس میں ایک حکیم و قادرِ مُطلق ہستی کا ارادی فیصلہ کس شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے، اس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اُس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جا کر کہیں بال، کہیں گوشت اور

کہیں ہڈی بنتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اُس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تخموں کی کثرت کا حال یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے، اُس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بیضۂ اُنثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر یہ کسی حکیم و قدیر اور حاکمِ مطلق کا فیصلہ ہے جو ان بے شمار امیدواروں میں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر چھانٹ کر بیضۂ اُنثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح اِستقرارِ حمل رُونما ہوتا ہے۔ پھر اِستقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے (egg cell) کے ملنے سے جو چیز ابتداءً بنتی ہے، وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خُردبین کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ حقیری سی چیز ۹ مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پا کر جن بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے، اُن میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمھارا دل گواہی دے گا کہ یہاں ہر آن ایک حکیمِ فعّال کا ارادی فیصلہ کام کرتا رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل کو پہنچانا ہے اور کسے خون کے لوتھڑے، یا گوشت کی بوٹی، یا نا تمام بچے کی شکل میں ساقط کر دینا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالنا ہے اور کس کو مردہ۔ کس کو معمولی انسان کی صورت و ہیئت میں نکالنا ہے اور کسے اَن گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دینی ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالنا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا، یا ٹُنڈا اور لُنجا بنا کر پھینک دینا ہے۔ کس کو خوب صورت بنانا ہے اور کسے بدصورت۔ کس کو مرد بنانا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر بھیجنا ہے اور کسے کَودن اور کُند ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل، جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحموں میں ہو رہا ہے، اِس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دُنیا کی کوئی طاقت ذرّہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے۔ حالانکہ انسانی آبادیوں کی قسمت کے کم از کم ۹۰ فی صد فیصلے انھی مراحل میں ہو جاتے ہیں، اور یہیں افراد ہی کے نہیں، قوموں کے، بلکہ پوری نوعِ انسانی کے مستقبل کی شکل بنائی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچے دُنیا میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے، اور کس کو قیامت کے بورے سمیٹنے ہیں؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے، اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی کارفرمائی کسی عالم گیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے، جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو اس امر میں شک ہے کہ اللہ ''حق'' ہے اور صرف اللہ ہی ''حق'' ہے، تو بے شک وہ عقل کا اندھا ہے۔

دوسری بات جو پیش کردہ آثار سے ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔'' لوگوں کو تو یہ سُن کر اچنبھا ہوتا ہے کہ اللہ کسی وقت مُردوں کو زندہ کرے گا، مگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آئے کہ وہ تو ہر وقت مُردے جِلا رہا ہے۔ جن مادّوں سے آپ کا جسم بنا ہے اور جن غذاؤں سے وہ پرورش پاتا ہے، اُن کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے۔ کوئلا، لوہا، چونا، کچھ نمکیات، کچھ ہوائیں، اور ایسی ہی چند چیزیں اور ہیں۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی حیات

اور نفسِ انسانی کے خواص موجود نہیں ہیں۔ مگر انھی مردہ، بے جان مادّوں کو جمع کر کے آپ کو جیتا جاگتا وجود بنا دیا گیا ہے۔ پھر انھی مادّوں کی غذا آپ کے جسم میں جاتی ہے اور وہاں اس سے مَردوں میں وہ تخم اور عورتوں میں وہ بیضی خَلیے بنتے ہیں جن کے ملنے سے آپ ہی جیسے جیتے جاگتے انسان روز بن بن کر نکل رہے ہیں۔ اس کے بعد ذرا اپنے گردوپیش کی زمین پر نظر ڈالیے۔ بے شمار مختلف چیزوں کے بیج تھے جن کو ہواؤں اور پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا، اور بے شمار مختلف چیزوں کی جڑیں تھیں جو جگہ جگہ پیوندِ خاک ہوئی پڑی تھیں۔ ان میں کہیں بھی نباتی زندگی کا کوئی ظہور موجود نہ تھا۔ آپ کے گردوپیش کی سوکھی زمین ان لاکھوں مُردوں کی قبر بنی ہوئی تھی۔ مگر جونہی کہ پانی کا ایک چھینٹا پڑا، ہر طرف زندگی لہلہانے لگی، ہر مُردہ جڑ اپنی قبر سے جی اُٹھی، اور ہر بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ اِحیائے اموات کا عمل ہر برسات میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

تیسری چیز جو ان مشاہدات سے ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ”اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔ ساری کائنات کو چھوڑ کر صرف اپنی اِسی زمین کو لے لیجیے، اور زمین کے بھی تمام حقائق و واقعات کو چھوڑ کر صرف انسان اور نباتات ہی کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ یہاں اُس کی قدرت کے جو کرشمے آپ کو نظر آتے ہیں، کیا انھیں دیکھ کر کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خدا بس وہی کچھ کر سکتا ہے جو آج ہم اسے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اور کل اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا؟ خدا تو خیر بہت بلند و برتر ہستی ہے، انسان کے متعلق پچھلی صدی تک لوگوں کے یہ اندازے تھے کہ یہ صرف زمین ہی پر چلنے والی گاڑیاں بنا سکتا ہے، ہوا پر اُڑنے والی گاڑیاں بنانا اس کی قدرت میں نہیں ہے۔ مگر آج کے ہوائی جہازوں نے بتا دیا کہ انسان کے ”امکانات“ کی حدیں تجویز کرنے میں ان کے اندازے کتنے غلط تھے۔ اب اگر کوئی شخص خدا کے لیے اُس کے صرف آج کے کام دیکھ کر امکانات کی کچھ حدیں تجویز کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا، تو وہ صرف اپنے ہی ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے، خدا کی قدرت بہرحال اس کی باندھی ہوئی حدوں میں بند نہیں ہو سکتی۔

چوتھی اور پانچویں بات، یعنی یہ کہ ”قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی“ اور یہ کہ ”اللہ ضرور ان سب لوگوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا جو مر چکے ہیں“، اُن تین مُقدّمات کا عقلی نتیجہ ہے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کے کاموں کو اس کی قدرت کے پہلو سے دیکھیے تو دل گواہی دے گا کہ وہ جب چاہے قیامت برپا کر سکتا ہے، اور جب چاہے اُن سب مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے جن کو پہلے وہ عَدَم سے وجود میں لایا تھا۔ اور اگر اُس کے کاموں کو اس کی حکمت کے پہلو سے دیکھیے تو عقل شہادت دے گی کہ یہ دونوں کام بھی وہ ضرور کر کے رہے گا، کیونکہ ان کے بغیر حکمت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اور ایک حکیم سے یہ بعید ہے کہ وہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ جو محدود سی حکمت و دانائی انسان کو حاصل ہے، اس کا یہ نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی اپنا مال، یا جائداد، یا کاروبار جس کے سُپرد بھی کرتا ہے، اس سے کسی نہ کسی وقت حساب ضرور لیتا ہے۔ گویا امانت اور محاسبے کے درمیان ایک لازمی عقلی رابطہ ہے جس کو انسان کی محدود حکمت بھی کسی حال میں نظرانداز نہیں کرتی۔ پھر اسی حکمت کی بنا پر آدمی اِرادی اور غیر اِرادی افعال کے درمیان فرق کرتا ہے، اِرادی

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطۡفِهٖ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنۡيَا خِزۡيٌ وَّنُذِيۡقُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ

بعض اَور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم[۱۰] اور ہدایت[۱۱] اور روشنی بخشنے والی کتاب[۱۲] کے بغیر، گردن اکڑائے ہوئے[۱۳]، خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں، تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں[۱۴]۔ ایسے شخص کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور قیامت کے روز اُس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے ــــــ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے

افعال کے ساتھ اَخلاقی ذمہ داری کا تصوّر وابستہ کرتا ہے، افعال میں نیک اور بد کی تمیز کرتا ہے، اچھے افعال کا نتیجہ تحسین اور انعام کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، اور بُرے افعال پر سزا کا تقاضا کرتا ہے، حتّٰی کہ خود ایک نظامِ عدالت اِس غرض کے لیے وجود میں لاتا ہے۔ یہ حکمت جس خالق نے انسان میں پیدا کی ہے، کیا باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود اس حکمت سے عاری ہوگا؟ کیا مانا جا سکتا ہے کہ اپنی اتنی بڑی دُنیا اتنے سروسامان اور اس قدر اختیارات کے ساتھ انسان کے سپرد کر کے وہ بُھول گیا ہے، اس کا حساب وہ کبھی نہ لے گا؟ کیا کسی صحیح الدماغ آدمی کی عقل یہ گواہی دے سکتی ہے کہ انسان کے جو بُرے اعمال سزا سے بچ نکلے ہیں، یا جن برائیوں کی متناسب سزا اسے نہیں مل سکی ہے، ان کی باز پُرس کے لیے کبھی عدالت قائم نہ ہوگی، اور جو بھلائیاں اپنے منصفانہ انعام سے محروم رہ گئی ہیں، وہ ہمیشہ محروم ہی رہیں گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قیامت اور زندگی بعدِ موت خدائے حکیم کی حکمت کا ایک لازمی تقاضا ہے، جس کا پورا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا سراسر بعید از عقل ہے۔

۱۰ – یعنی وہ ذاتی واقفیت جو براہِ راست مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوئی ہو۔

۱۱ – یعنی وہ واقفیت جو کسی دلیل سے حاصل ہوئی ہو، یا کسی علم رکھنے والے کی رہنمائی سے۔

۱۲ – یعنی وہ واقفیت جو خدا کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہوئی ہو۔

۱۳ – اس میں تین کیفیتیں شامل ہیں: جاہلانہ ضد اور ہٹ دھرمی۔ تکبر اور غرورِ نفس۔ اور کسی سمجھانے والے کی بات کی طرف التفات نہ کرنا۔

۱۴ – پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جو خود گمراہ ہیں، اور اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو خود ہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

ع ۱۰

یَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۰﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ

تیار کیا ہے، ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ ؏

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے،[۱۵] اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو اُلٹا پھر گیا۔[۱۶] اُس کی دُنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔[۱۷] پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارتا ہے جو نہ اُس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ،

۱۵ – یعنی دائرۂ دین کے وسط میں نہیں بلکہ کنارے پر، یا بالفاظِ دیگر، کفر و اسلام کی سرحد پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے۔ جیسے ایک مذبذب آدمی کسی فوج کے کنارے پر کھڑا ہو، اگر فتح ہوتی دیکھے تو ساتھ آ ملے اور شکست ہوتی دیکھے تو چپکے سے سٹک جائے۔

۱۶ – اس سے مراد ہیں وہ خام سیرت، مضطرب العقیدہ اور بندۂ نفس لوگ جو اسلام قبول تو کرتے ہیں مگر فائدے کی شرط کے ساتھ۔ ان کا ایمان اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں، ہر طرح چین ہی چین نصیب ہو، نہ خدا کا دین ان سے کسی قربانی کا مطالبہ کرے، اور نہ دُنیا میں ان کی کوئی خواہش اور آرزو پوری ہونے سے رہ جائے۔ یہ ہو تو خدا سے وہ راضی ہیں اور اس کا دین ان کے نزدیک بہت اچھا ہے۔ لیکن جہاں کوئی آفت آئی، یا خدا کی راہ میں کسی مصیبت اور مَشَقّت اور نقصان سے سابقہ پیش آ گیا، یا کوئی تمنا پوری ہونے سے رہ گئی، پھر ان کو خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت اور دین کی حقانیت، کسی چیز پر بھی اطمینان نہیں رہتا۔ پھر وہ ہر اُس آستانے پر جھکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جہاں سے ان کو فائدے کی اُمید اور نقصان سے بچ جانے کی توقع ہو۔

۱۷ – یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جو چند لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ مذبذب مسلمان کا حال درحقیقت سب سے بدتر ہوتا ہے۔ کافر اپنے رب سے بے نیاز، آخرت سے بے پروا، اور قوانینِ الٰہی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر جب یکسوئی کے ساتھ مادّی فائدوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے، تو چاہے وہ اپنی آخرت کھو دے، مگر دُنیا تو کچھ نہ کچھ بنا ہی لیتا ہے۔ اور مومن جب پورے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ خدا کے دین کی پیروی کرتا ہے، تو اگرچہ دُنیا کی کامیابی بھی آخرِ کار اس کے قدم چوم کر رہتی ہے، تاہم اگر دُنیا بالکل ہی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے، آخرت میں بہرحال اس کی فلاح

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا

یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ اُن کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے[18]، بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق[19]۔ (اِس کے برعکس) اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے[20]، یقیناً ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ

و کامرانی یقینی ہے۔ لیکن یہ مذبذب مسلمان نہ اپنی دُنیا ہی بنا سکتا ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے لیے فلاح کا کوئی امکان ہے۔ دُنیا کی طرف لپکتا ہے تو کچھ نہ کچھ خدا اور آخرت کے ہونے کا گمان، جو اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں رہ گیا ہے، اور کچھ نہ کچھ اَخلاقی حُدود کا لحاظ، جو اسلام سے تعلق نے پیدا کر دیا ہے، اس کا دامن کھینچتا رہتا ہے، اور خالص دُنیا طلبی کے لیے جس یکسوئی و استقامت کی ضرورت ہے، وہ کافر کی طرح اسے بہم نہیں پہنچتی۔ آخرت کا خیال کرتا ہے تو دُنیا کے فائدوں کا لالچ اور نقصانات کا خوف، اور خواہشات پر پابندیاں قبول کرنے سے طبیعت کا انکار اُس طرف جانے نہیں دیتا، بلکہ دُنیا پرستی اس کے عقیدے اور عمل کو اتنا کچھ بگاڑ دیتی ہے کہ آخرت میں اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح وہ دُنیا بھی کھوتا ہے اور آخرت بھی۔

۱۸ – پہلی آیت میں معبُودانِ غیر اللہ کے نافع وضارّ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کسی نفع وضرر کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اُن کے نقصان کو اُن کے نفع سے قریب تر بتایا گیا ہے، کیونکہ ان سے دُعائیں مانگ کر اور ان کے آگے حاجت روائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ اپنا ایمان تو فوراً اور یقیناً کھو دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ نفع اسے حاصل ہو جس کی اُمید پر اس نے انھیں پکارا تھا، تو حقیقت سے قطعِ نظر، ظاہر حال کے لحاظ سے بھی وہ خود مانے گا کہ اس کا حصول نہ تو یقینی ہے اور نہ قریب الوقوع۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کو مزید فتنے میں ڈالنے کے لیے کسی آستانے پر اس کی مراد برلائے، اور ہوسکتا ہے کہ اُس آستانے پر وہ اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھا آئے اور اپنی مراد بھی نہ پائے۔

۱۹ – یعنی جس نے بھی اس کو اس راستے پر ڈالا، خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان، وہ بدترین کارساز و سرپرست اور بدترین دوست اور ساتھی ہے۔

۲۰ – یعنی جن کا حال اس مطلب پرست، مذبذب اور بے یقین مسلمان کا سا نہیں ہے، بلکہ جو ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر خدا اور رسولؐ اور آخرت کو ماننے کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر چلتے رہتے ہیں،

يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

چاہتا ہے[۲۱]۔ جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دُنیا اور آخرت میں اُس کی کوئی مدد نہ کرے گا، اُسے چاہیے کہ ایک رسّی کے ذریعے سے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھ لے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو ردّ کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے[۲۲] ــــــ ایسی ہی کُھلی کُھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

خواہ اچھے حالات سے سابقہ پیش آئے یا بُرے حالات سے، خواہ مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں یا انعامات کی بارشیں ہونے لگیں۔

**۲۱** – یعنی اللہ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ دُنیا میں، یا آخرت میں، یا دونوں جگہ، وہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے، اور جس سے جو کچھ چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ وہ دینا چاہے تو کوئی روکنے والا نہیں۔ نہ دینا چاہے تو کوئی دِلوانے والا نہیں۔

**۲۲** – اس آیت کی تفسیر میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ مختلف مفسرین کے بیان کردہ مطالب کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اُس کی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہ کرے گا، وہ چھت سے رسّی باندھ کر خودکشی کر لے۔

(۲) " " " " وہ کسی رسّی کے ذریعے سے آسمان پر جائے اور مدد بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۳) " " " " وہ آسمان پر جا کر وحی کا سلسلہ منقطع کرنے کی کوشش کر دیکھے۔

(۴) " " " " وہ آسمان پر جا کر اس کا رزق بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۵) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اُس کی (یعنی خود اس طرح کا خیال کرنے والے کی) مدد نہ کرے گا، وہ اپنے گھر کی چھت سے رسّی لٹکائے اور خودکشی کر لے۔

(۶) " " " " وہ آسمان تک پہنچ کر مدد لانے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَ

جو لوگ ایمان لائے[۲۳]، اور جو یہودی ہوئے[۲۴]، اور صابی[۲۵]، اور نصاریٰ[۲۶]، اور مجوس[۲۷]، اور

کی کوشش کر دیکھے۔

ان میں سے پہلے چار مفہومات تو بالکل ہی سیاق وسباق سے غیر متعلق ہیں۔ اور آخری دو مفہوم اگرچہ سیاق و سباق سے قریب تر ہیں، لیکن کلام کے ٹھیک مدّعا تک نہیں پہنچتے۔ سلسلۂ تقریر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے، جب تک حالات اچھے رہتے ہیں مطمئن رہتا ہے، اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے، یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے، تو خدا سے پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے۔ اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سررشتے اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں، اور اللہ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے اُمیدیں وابستہ کرتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں، وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے، حتّٰی کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھِگلی لگا سکتا ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیرِ الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے۔ آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے مراد ہے وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو۔ ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے۔

۲۳- یعنی ''مسلمان''، جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں خدا کے تمام انبیاؑ اور اس کی کتابوں کو مانا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جنھوں نے پچھلے انبیاؑ کے ساتھ آپؐ پر بھی ایمان لانا قبول کیا۔ ان میں صادق الایمان بھی شامل تھے اور وہ بھی تھے جو ماننے والوں میں شامل تو ہو جاتے تھے مگر ''کنارے'' پر رہ کر بندگی کرتے تھے اور کفر و ایمان کے درمیان مذبذب تھے۔

۲۴- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۷۲۔

۲۵- صابی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے: ایک، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے، اور حضرت یحییٰؑ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے، ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیثؑ اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حرّان تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ وسائنس اور فنِ طِبّ کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔

۲۶- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، المائدہ، حاشیہ ۳۶۔

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

---

جن لوگوں نے شرک کیا[۲۸]، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا[۲۹]، ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سر بسجود ہیں[۳۰] وہ سب جو آسمانوں میں ہیں[۳۱] اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان[۳۲] اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں[۳۳]؟ اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے، اُسے پھر

---

۲۷– یعنی ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زَرتُشت کا پیرو کہتے تھے۔ ان کے مذہب و اَخلاق کو مزدُک کی گمراہیوں نے بُری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا، حتّٰی کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

۲۸– یعنی عرب اور دوسرے مُمالک کے مشرکین جو مذکورۂ بالا گروہوں کی طرح کسی خاص نام سے موسوم نہ تھے۔ قرآنِ مجید ان کو دوسرے گروہوں سے مُمیّز کرنے کے لیے مُشْرِكِيْنَ اور الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا کے اصطلاحی ناموں سے یاد کرتا ہے، اگرچہ اہلِ ایمان کے سوا باقی سب کے ہی عقائد و اعمال میں شرک داخل ہو چکا تھا۔

۲۹– یعنی خدا کے بارے میں مختلف انسانی گروہوں کے درمیان جو جھگڑا ہے، اُس کا فیصلہ اِس دُنیا میں نہیں ہوگا بلکہ قیامت کے روز ہوگا۔ وہیں اس بات کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ان میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اگرچہ ایک معنٰی کے لحاظ سے یہ فیصلہ اس دُنیا میں بھی خدا کی کتابیں کرتی رہی ہیں، لیکن یہاں فیصلے کا لفظ "جھگڑا چُکانے" اور فریقین کے درمیان عدالت کرنے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، جب کہ ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف باقاعدہ ڈگری دے دی جائے۔

۳۰– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۴-۲۵-النحل، حاشیہ ۴۱-۴۲۔

۳۱– یعنی فرشتے، اَجرامِ فلکی، اور وہ سب مخلوقات جو زمین کے ماورا دوسرے جہانوں میں ہیں، خواہ وہ انسان کی طرح ذی عقل و ذی اختیار ہوں، یا حیوانات، نباتات، جمادات اور ہوا اور روشنی کی طرح بے عقل و بے اختیار۔

۳۲– یعنی وہ جو محض مجبوراً ہی نہیں بلکہ بالارادہ اور بطوع و رغبت بھی اُس کو سجدہ کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں

السجدۃ ۲

مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ ۱۸ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ

کوئی عزت دینے والا نہیں ہے،[۳۴] اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔[۳۵]

یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔[۳۶] اِن میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اُن کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں،[۳۷] اُن کے سروں پر

---

دوسرا اِنسانی گروہ، جس کا بعد کے فقرے میں ذکر آ رہا ہے، وہ ہے جو اپنے ارادے سے خدا کے آگے جھکنے سے انکار کرتا ہے، مگر دوسری بے اختیار مخلوقات کی طرح وہ بھی قانونِ فطرت کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور سب کے ساتھ مجبُوراً سجدہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس کے مستحقِ عذاب ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں بغاوت کی رَوِش اختیار کرتا ہے۔

**۳۳-** مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان مختلف گروہوں کے جھگڑے کا فیصلہ تو قیامت ہی کے روز چکایا جائے گا، لیکن کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو وہ آج بھی دیکھ سکتا ہے کہ حق پر کون ہے اور آخری فیصلہ کس کے حق میں ہونا چاہیے۔ پوری کائنات کا نظام اس بات پر شاہد ہے کہ زمین سے آسمانوں تک ایک ہی خدا کی خدائی پورے زور اور پوری ہمہ گیری کے ساتھ چل رہی ہے۔ زمین کے ایک ذرّے سے لے کر آسمان کے بڑے بڑے سیّاروں تک سب ایک قانون میں جکڑے ہوئے ہیں، جس سے بال برابر بھی جنبش کرنے کا کسی کو یارا نہیں ہے۔ مومن تو خیر دل سے اس کے آگے سر جھکاتا ہے، مگر وہ دہریہ جو اس کے وجود تک کا انکار کر رہا ہے، اور وہ مشرک جو ایک ایک بے اختیار ہستی کے آگے جھک رہا ہے، وہ بھی اُس کی اطاعت پر اُسی طرح مجبُور ہے جس طرح ہوا اور پانی۔ کسی فرشتے، کسی جن، کسی نبی اور ولی، اور کسی دیوی یا دیوتا کے پاس خدائی کی صفات اور اختیارات کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے کہ اس کو اُلوہیت اور معبُودیت کا مَقام دیا جا سکے، یا خداوندِ عالَم کا ہم جنس یا مثیل ٹھیرایا جا سکے۔ کسی قانونِ بے حاکم، اور فطرتِ بے صانع، اور نظامِ بے ناظم کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لا سکے اور باقاعدگی کے ساتھ خود ہی چلاتا رہے، اور قدرت و حکمت کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھا سکے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ کائنات کی یہ کھلی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی جو شخص انبیاءؑ کی بات نہیں مانتا اور مختلف خود ساختہ عقیدے اختیار کر کے خدا کے بارے میں جھگڑتا ہے، اس کا برسرِ باطل ہونا آج بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح قیامت کے روز ثابت ہوگا۔

**۳۴-** یہاں ذلّت اور عزت سے مراد حق کا انکار اور اس کی پیروی ہے، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ذلّت اور عزت ہی کی شکل میں ظاہر ہونا ہے۔ جو شخص کھلے کھلے اور روشن حقائق کو آنکھیں کھول کر نہ دیکھے، اور سمجھانے والے کی بات بھی

فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۗ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوْٓا

ع ۲ ۱۲ ۹

کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا، جس سے اُن کی کھالیں ہی نہیں، پیٹ کے اندر کے حصّے تک گل جائیں گے، اور اُن کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گُرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنّم سے نکلنے کی کوشش کریں گے، پھر اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے، کہ چکھّو اب جلنے کی سزا کا مزا۔ع (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اُن کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہاں وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیے جائیں گے[۳۸] اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔ ان کو پاکیزہ

سن کر نہ دے، وہ خود ہی ذلّت و خواری کو اپنے اُوپر دعوت دیتا ہے، اور اللہ وہی چیز اس کے نصیب میں لکھ دیتا ہے جو اس نے خود مانگی ہے۔ پھر جب اللہ ہی نے اس کو پیروی حق کی عزت نہ دی، تو اب کون ہے جو اس کو اِس عزت سے سرفراز کر دے؟

۳۵- یہاں سجدۂ تلاوت واجب ہے، اور سورۂ حج کا یہ سجدہ مُتَّفَق عَلَیْہ ہے۔ سجدۂ تلاوت کی حکمت اور اس کے احکام کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۵۷۔

۳۶- یہاں خدا کے بارے میں جھگڑا کرنے والے تمام گروہوں کو ان کی کثرت کے باوجود دو فریقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک فریق وہ جو انبیاؑ کی بات مان کر خدا کی صحیح بندگی اختیار کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو ان کی بات نہیں مانتا اور کفر کی راہ اختیار کرتا ہے، خواہ اس کے اندر آپس میں کتنے ہی اختلافات ہوں اور اس کے کفر نے کتنی ہی مختلف صورتیں اختیار کر لی ہوں۔

۳۷- مستقبل میں جس چیز کا پیش آنا بالکل قطعی اور یقینی ہو، اس کو زور دینے کے لیے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ پیش آ چکی ہے۔ آگ کے کپڑوں سے مراد غالباً وہی چیز ہے جسے سورۂ ابراہیم، آیت ۵۰ میں سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ فرمایا گیا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، ابراہیم، حاشیہ ۵۸۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٢﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿١٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا

یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ اُن کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے[18]، بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے اُس کا رفیق[19]۔ (اِس کے برعکس) اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے[20]، یقیناً ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ

وکامرانی یقینی ہے۔ لیکن یہ مذبذب مسلمان نہ اپنی دُنیا ہی بنا سکتا ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے لیے فلاح کا کوئی امکان ہے۔ دُنیا کی طرف لپکتا ہے تو کچھ نہ کچھ خدا اور آخرت کے ہونے کا گمان، جو اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں رہ گیا ہے، اور کچھ نہ کچھ اَخلاقی حُدود کا لحاظ، جو اسلام سے تعلق نے پیدا کر دیا ہے، اس کا دامن کھینچتا رہتا ہے، اور خالص دُنیا طلبی کے لیے جس یکسوئی و استقامت کی ضرورت ہے، وہ کافر کی طرح اسے بہم نہیں پہنچتی۔ آخرت کا خیال کرتا ہے تو دُنیا کے فائدوں کا لالچ اور نقصانات کا خوف، اور خواہشات پر پابندیاں قبول کرنے سے طبیعت کا انکار اُس طرف جانے نہیں دیتا، بلکہ دُنیا پرستی اس کے عقیدے اور عمل کو اتنا کچھ بگاڑ دیتی ہے کہ آخرت میں اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح وہ دُنیا بھی کھوتا ہے اور آخرت بھی۔

۱۸ – پہلی آیت میں معبُودانِ غیر اللہ کے نافع و ضارّ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کسی نفع و ضرر کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اُن کے نقصان کو اُن کے نفع سے قریب تر بتایا گیا ہے، کیونکہ ان سے دُعائیں مانگ کر اور ان کے آگے حاجت روائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ اپنا ایمان تو فوراً اور یقیناً کھو دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ نفع اسے حاصل ہو جس کی اُمید پر اس نے انھیں پکارا تھا، تو حقیقت سے قطعِ نظر، ظاہر حال کے لحاظ سے بھی وہ خود مانے گا کہ اس کا حصول نہ تو یقینی ہے اور نہ قریب الوقوع۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو مزید فتنے میں ڈالنے کے لیے کسی آستانے پر اس کی مراد بر لائے، اور ہو سکتا ہے کہ اُس آستانے پر وہ اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھا آئے اور اپنی مراد بھی نہ پائے۔

۱۹ – یعنی جس نے بھی اس کو اس راستے پر ڈالا، خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان، وہ بدترین کارساز و سرپرست اور بدترین دوست اور ساتھی ہے۔

۲۰ – یعنی جن کا حال اس مطلب پرست، مذبذب اور بے یقین مسلمان کا سا نہیں ہے، بلکہ جو ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر خدا اور رسولؐ اور آخرت کو ماننے کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر چلتے رہتے ہیں،

مراد کفارِ مکہ ہیں۔

۴۲ – یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو حج اور عمرہ نہیں کرنے دیتے۔

۴۳ – یعنی جو کسی شخص، یا خاندان، یا قبیلے کی جائداد نہیں ہے، بلکہ وقفِ عام ہے، اور جس کی زیارت سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

یہاں فقہی نقطۂ نظر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں فقہائے اسلام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ ''مسجدِ حرام'' سے مراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرم مکہ؟

دوم: یہ کہ اس میں عاکف (رہنے والے) اور باد (باہر سے آنے والے) کے حقوق برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم، جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے مُترشّح ہوتا ہے۔ اور اس میں حُقوق کے مُساوی ہونے سے مراد عبادت کے حق میں مُساوات ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یا بنی عبد مناف من ولی منکم من امور الناس شیئا فلا یمنعن احدًا طاف بھٰذا البیت او صلّٰی اٰیَّۃَ ساعۃ شاء من لیل او نھار۔ ''اے اولادِ عبدِ مناف! تم میں سے جو کوئی لوگوں کے معاملات پر کسی اقتدار کا مالک ہو، اسے چاہیے کہ کسی شخص کو رات اور دن کے کسی وقت میں بھی خانۂ کعبہ کا طواف کرنے یا نماز پڑھنے سے منع نہ کرے۔'' اس رائے کے حامی کہتے ہیں کہ مسجدِ حرام سے پورا حرم مراد لینا اور پھر وہاں جملہ حیثیات سے مَقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر قرار دینا غلط ہے۔ کیونکہ مکے کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حُقوقِ مِلکیّت و وراثت اور حقوقِ بَیع و اجارہ اسلام سے پہلے قائم تھے اور اسلام کے بعد بھی قائم رہے، حتّٰی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صَفوانؓ بن اُمَیّہؓ کا مکان مکہ میں جیل کی تعمیر کے لیے چار ہزار درہم میں خریدا گیا۔ لہٰذا یہ مُساوات صرف عبادت ہی کے معاملے میں ہے، نہ کہ کسی اور چیز میں۔ یہ امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال اصحاب کا قول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ خود اس آیت میں جس چیز پر مشرکینِ مکہ کو ملامت کی گئی ہے، وہ مسلمانوں کے حج میں مانع ہونا ہے، اور ان کے اس فعل کو یہ کہہ کر ردّ کیا گیا ہے کہ وہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حج صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتا، بلکہ صفا اور مَروہ سے لے کر مِنٰی، مُزدَلفہ، عَرَفات، سب مناسکِ حج کے مَقامات ہیں۔ پھر قرآن میں ایک جگہ نہیں، متعدّد مقامات پر مسجدِ حرام بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَاِخْرَاجُ اَھْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ ''مسجدِ حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے۔'' (البقرہ، آیت ۲۱۷) ظاہر ہے کہ یہاں مسجد سے نماز پڑھنے والوں کو نکالنا نہیں، بلکہ مکے سے مسلمان باشندوں کو نکالنا مراد ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ذٰلِکَ لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَھْلُہٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ ''یہ رعایت اُس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجدِ حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔'' (البقرہ، آیت ۱۹۶) یہاں بھی مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے نہ کہ محض مسجد۔ لہٰذا ''مسجدِ حرام'' میں مُساوات کو صرف

مسجد میں مُساوات تک محدود نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ حرمِ مکہ میں مساوات ہے۔

پھر یہ گروہ کہتا ہے کہ یہ مساوات صرف عبادت اور تعظیم و حرمت ہی میں نہیں ہے، بلکہ حرمِ مکہ میں تمام حُقوق کے اعتبار سے ہے۔ یہ سرزمین خدا کی طرف سے وقفِ عام ہے، لہٰذا اس پر اور اس کی عمارات پر کسی کے حُقوقِ مِلکیّت نہیں ہیں۔ ہر شخص ہر جگہ ٹھیر سکتا ہے، کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ کسی بیٹھے ہوئے کو اُٹھا سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ لوگ بکثرت احادیث اور آثار پیش کرتے ہیں، مثلاً:

عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایَت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مکة مناخٌ لا تُبَاع رباعها ولا تؤاجر بیوتها، ''مکہ مسافروں کے اُترنے کی جگہ ہے، نہ اس کی زمینیں بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرایے پر چڑھائے جائیں۔''

ابراہیم نَخَعی کی مُرسَل روایت کہ حضورؐ نے فرمایا: مکة حرمها اللّٰه لا یحل بیع رباعها ولا اجارة بیوتها، ''مکے کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے، اس کی زمین کو بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔'' (واضح رہے کہ ابراہیم نَخَعی کی مُرسَلات حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہیں، کیونکہ اُن کا یہ قاعدہ مشہور و معروف ہے کہ جب وہ مُرسَل رِوایَت کرتے ہیں تو دراصل عبداللہؓ بن مسعود کے واسطے سے روایت کرتے ہیں)۔ مجاہد نے بھی تقریباً انھی الفاظ میں ایک روایت نقل کی ہے۔

عَلْقَمہ بن نَضْلہ کی رِوایَت کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مکے کی زمینیں سوائب (اُفتادہ زمینیں یا شاملات) سمجھی جاتی تھیں، جس کو ضرورت ہوتی وہ رہتا تھا، اور جب ضرورت نہ رہتی، دوسرے کو ٹھیرا دیتا تھا۔

عبداللہ بن عمرؓ کی رِوایَت کہ حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا تھا کہ حج کے زمانے میں مکے کا کوئی شخص اپنا دروازہ بند نہ کرے۔ بلکہ مجاہد کی روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ مکہ کو اپنے مکانات کے صحن کھلے چھوڑ دینے کا حکم دے رکھا تھا، اور وہ ان پر دروازے لگانے سے منع کرتے تھے، تاکہ آنے والا جہاں چاہے ٹھیرے۔ یہی روایت عطاؒ کی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ صرف سُہَیلؓ بن عَمْرو کو فاروقِ اعظمؓ نے صحن پر دروازے لگانے کی اجازت دی تھی، کیونکہ ان کو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں اپنے اونٹ وہاں بند کرنے ہوتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کا قول کہ جو شخص مکے کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے، وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ کا قول کہ اللہ نے پورے حرمِ مکہ کو مسجد بنا دیا ہے، جہاں سب کے حُقوق برابر ہیں۔ مکہ والوں کو باہر والوں سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان امیرِ مکہ کے نام کہ مکے کے مکانات پر کرایہ نہ لیا جائے، کیونکہ یہ حرام ہے۔

ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں، اور فقہا میں سے امام مالک، امام ابوحنیفہ، سُفیان ثَوری، امام احمد بن حَنْبل اور اسحاق بن راہَوَیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضیِ مکہ کی بیع، اور کم از کم موسمِ حج میں مکّے کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں۔ البتہ بیشتر فقہا نے مکے کے مکانات پر لوگوں کی مِلکیّت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیتِ عمارت، نہ کہ بحیثیتِ زمین

بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۲۵ وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ

ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا[۴۴]، اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ ع

یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی، (اِس

---

بیع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

یہی مسلک کتاب اللہ وسنتِ رسولؐ اللہ اور سنتِ خلفائے راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دُنیا کے مسلمانوں پر حج اس لیے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہلِ مکہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنے، اور جو مسلمان احساسِ فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں، انھیں وہاں کے مالکانِ زمین اور مالکانِ مکانات خوب کرایے وصول کر کر کے لُوٹیں۔ وہ ایک وقفِ عام ہے تمام اہلِ ایمان کے لیے۔ اس کی زمین کسی کی مِلک نہیں ہے۔ ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھیر جائے۔

۴۴- اس سے ہر وہ فعل مراد ہے جو راستی سے ہٹا ہوا ہو اور ظلم کی تعریف میں آتا ہو، نہ کہ کوئی خاص فعل۔ اس طرح کے افعال اگرچہ ہر حال میں گناہ ہیں، مگر حرم میں ان کا ارتکاب زیادہ شدید گناہ ہے۔ مفسرین نے بلاضرورت قسم کھانے تک کو اِلحاد فی الحرم میں شمار کیا ہے اور اس آیت کا مِصداق ٹھیرایا ہے۔ ان عام گناہوں کے علاوہ حرم کی حرمت کے متعلق جو خاص احکام ہیں، ان کی خلاف ورزی بدرجۂ اَولیٰ اس تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً:

حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو، یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو جس پر حد لازم آتی ہو، اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے، تو جب تک وہ وہاں رہے، اس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی ہے، اور فتحِ مکہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اُٹھائی گئی، پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئی۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ”جو اس میں داخل ہوگیا، وہ امن میں آ گیا۔“ حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر رِوایات میں آئے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جُمہور تابعین اور حَنَفِیّہ اور حنابلہ اور اہلِ حدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جرم کا قِصاص حرم میں نہیں لیا جا سکتا۔

وہاں جنگ اور خوں ریزی حرام ہے۔ فتحِ مکہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا، اس میں آپؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ”لوگو! اللہ نے مکہ کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے۔“ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ”اگر میری اِس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خون ریزی کو جائز ٹھیرائے، تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمھارے لیے۔ اور میرے لیے بھی یہ صرف ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا تھا، پھر آج اُس کی حرمت اُسی طرح قائم ہوگئی جیسی کل تھی۔“

وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا، نہ خود رو گھاس اُکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ

---

ہدایت کے ساتھ) کہ "میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رُکوع وسُجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو[۴۵] اور لوگوں کو حج کے لیے اِذنِ عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اُونٹوں[۴۶] پر سوار آئیں[۴۷]" تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے رکھے گئے ہیں،[۴۸]

---

جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے، اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جا سکتا ہے، تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اِس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ اور خودرو گھاس سے اِذْخِر اور خشک گھاس مستثنیٰ کی گئی ہے۔ اِن اُمُور کے متعلق صحیح احادیث میں صاف صاف احکام وارد ہوئے ہیں۔

وہاں کی گری پڑی چیز اُٹھانا ممنوع ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں آیا ہے: ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نھٰی عن لقطۃ الحاج، یعنی "آپؐ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اُٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔"

وہاں جو شخص بھی حج یا عُمرے کی نیّت سے آئے، وہ اِحرام کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دوسری کسی غرض سے داخل ہونے والے کے لیے بھی اِحرام باندھ کر جانا ضروری ہے یا نہیں۔ ابنِ عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ کسی حال میں بلا اِحرام داخل نہیں ہو سکتے۔ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی ایک ایک قول اسی کا موٴیِّد ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ صرف وہ لوگ اِحرام کی قید سے مستثنیٰ ہیں جن کو بار بار اپنے کام کے لیے وہاں جانا آنا پڑتا ہو۔ باقی سب کو اِحرام بند جانا چاہیے۔ یہ امام احمدؒ اور شافعیؒ کا دوسرا قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ جو شخص میقاتوں کے حُدود میں رہتا ہو، وہ مکے میں بلا اِحرام داخل ہو سکتا ہے، مگر جو حدودِ میقات سے باہر کا رہنے والا ہو، وہ بلا اِحرام نہیں جا سکتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

۴۵ – بعض مفسرین نے "پاک رکھو" پر اُس فرمان کو ختم کر دیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، اور "حج کے لیے اِذنِ عام دے دو" کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مانا ہے۔ لیکن اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ خطاب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرف ہے اور اُسی حکم کا ایک حصّہ ہے جو اُن کو خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دیا گیا تھا۔ علاوہ بریں مقصودِ کلام بھی یہاں یہی بتانا ہے کہ اوّل روز ہی سے یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور تمام خدا پرستوں کو یہاں حج کے لیے آنے کا اذنِ عام تھا۔

۴۶ – اصل میں لفظ ضَامِرٍ استعمال ہوا ہے، جو خاص طور پر دُبلے اُونٹوں کے لیے بولتے ہیں۔ اس سے اُن مسافروں کی تصویر کھینچنا مقصود ہے جو دُور دراز مقامات سے چلے آ رہے ہوں اور راستے میں اُن کے اُونٹ چارا پانی نہ

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ

اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انھیں بخشے ہیں،[۴۹]

ملنے کی وجہ سے دُبلے ہو گئے ہوں۔

۴۷ - یہاں وہ حکم ختم ہوتا ہے جو ابتداءً حضرت ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا، اور آگے کا ارشاد اس پر اضافہ ہے جو بطورِ تشریح مزید کیا گیا ہے۔ ہماری اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کا خاتمہ ''اِس قدیم گھر کا طواف کریں'' پر ہوا ہے، جو ظاہر ہے کہ تعمیرِ خانۂ کعبہ کے وقت نہ فرمایا گیا ہوگا۔ (حضرت ابراہیمؑ کی تعمیرِ خانۂ کعبہ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، آیات ۱۲۵-۱۲۹۔ آلِ عمران، آیات ۹۶-۹۷۔ ابراہیم، آیات ۳۵-۴۱)

۴۸ - اس سے مراد صرف دینی فائدے ہی نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے بھی ہیں۔ یہ اسی خانۂ کعبہ اور اس کے حج کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ڈھائی ہزار برس کی مدّت میں عربوں کو ایک مرکزِ وحدت حاصل رہا، جس نے اُن کی عَرَبیّت کو قبائلیت میں بالکل گم ہو جانے سے بچائے رکھا۔ اس کے مرکز سے وابستہ ہونے اور حج کے لیے ہر سال ملک کے تمام حصوں سے آتے رہنے کی بدولت ان کی زبان ایک رہی، ان کی تہذیب ایک رہی ان کے اندر عرب ہونے کا احساس باقی رہا، اور ان کو خیالات، معلومات اور تمدّنی طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ بھی اسی حج کی برکت تھی کہ عرب کی اس عام بدامنی میں کم از کم چار مہینے ایسے امن کے میسر آ جاتے تھے جن میں ملک کے ہر حصّے کا آدمی سفر کر سکتا تھا اور تجارتی قافلے بھی بخیریت گزر سکتے تھے۔ اس لیے عرب کی مَعاشی زندگی کے لیے بھی حج ایک رحمت تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، آلِ عمران، حواشی ۸۰-۸۱۔ المائدہ، حاشیہ ۱۱۳)

اسلام کے بعد حج کے دینی فائدوں کے ساتھ اس کے دنیوی فائدے بھی کئی گُنے زیادہ ہو گئے۔ پہلے وہ صرف عرب کے لیے رحمت تھا۔ اب وہ ساری دُنیا کے اہلِ توحید کے لیے رحمت ہو گیا۔

۴۹ - جانوروں سے مراد مویشی جانور ہیں، یعنی اُونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، جیسا کہ سورۂ اَنعام، آیات ۱۴۲-۱۴۴ میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

اُن پر اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کے نام پر اور اُس کا نام لے کر انھیں ذبح کرنا ہے، جیسا کہ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں قربانی کے لیے بالعُموم ''جانور پر اللہ کا نام لینے'' کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کرنا ہی ہے۔ اس طرح گویا اس حقیقت پر مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر، یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور کو ذبح کرنا کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ مسلمان جب کبھی جانور کو ذبح کرے گا، اللہ کا نام لے کر کرے گا، اور جب کبھی قربانی کرے گا، اللہ کے لیے کرے گا۔

ایّامِ معلومات (چند مقرر دنوں) سے مراد کون سے دن ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد ذی الحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ ابنِ عباسؓ، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، قَتَادَہ اور متعدِّد دوسرے صحابہؓ و تابعینؒ سے

فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ

خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں[50]، پھر اپنا مَیل کچیل دُور کریں[51] اور

یہ قول منقول ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم النحر (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) اور اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ اس کی تائید میں ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، ابراہیم نَخَعی، حسن اور عطاء کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں، اور امام شافعیؒ و احمدؒ سے بھی ایک ایک قول اس کے حق میں منقول ہوا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین دن ہیں، یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔ اس کی تائید میں حضرات عمر، علی، ابنِ عمر، ابنِ عباس، اَنَس بن مالک، ابو ہریرہ، سعید بن مُسَیَّب اور سعید بن جُبَیر رضی اللہ عنہم کے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ فقہا میں سے سُفیان ثَورِیؒ، امام مالکؒ، امام ابو یُوسُفؒ اور امام محمدؒ نے یہی قول اختیار کیا ہے اور مذہبِ حَنَفی و مالکی میں اسی پر فتویٰ ہے۔ باقی کچھ شاذ اقوال بھی ہیں۔ مثلاً کسی نے یکم محرم تک قربانی کے ایّام کو دراز کیا ہے، کسی نے صرف یوم النحر تک اسے محدود کر دیا ہے، اور کسی نے یوم النحر کے بعد صرف ایک دن مزید قربانی کا مانا ہے۔ لیکن یہ کمزور اقوال ہیں جن کی دلیل مضبوط نہیں ہے۔

**۵۰ –** بعض لوگوں نے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں واجب ہیں، کیونکہ حکم بصیغۂ امر دیا گیا ہے۔ دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ کھانا مستحب ہے اور کھلانا واجب۔ یہ رائے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں مستحب ہیں۔ کھانا اس لیے مستحب ہے کہ جاہلیّت کے زمانے میں لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانا ممنوع سمجھتے تھے، اور کھلانا اس لیے پسندیدہ کہ اس میں غریبوں کی امداد و اعانت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ ابنِ جَریر نے حسن بصری، عطاء، مجاہد اور ابراہیم نَخَعی کے یہ اقوال نقل کیے ہیں کہ فَكُلُوْا مِنْهَا میں صیغۂ امر کے استعمال سے کھانے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امر ویسا ہی ہے جیسے فرمایا: وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا، ''جب تم حالتِ احرام سے نکل آؤ تو پھر شکار کرو'' (المائدہ، آیت ۲) اور فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ، ''پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ'' (الجمعہ، آیت ۱۰) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احرام سے نکل کر شکار کرنا اور نمازِ جمعہ کے بعد زمین میں پھیل جانا واجب ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پھر ایسا کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی چونکہ لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانے کو ممنوع سمجھتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ نہیں، اسے کھاؤ، یعنی اس کی کوئی مُمانعت نہیں ہے۔

تنگ دست فقیر کو کھلانے کے متعلق جو فرمایا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنی کو نہیں کھلایا جا سکتا۔ دوست، ہمسایے، رشتہ دار، خواہ محتاج نہ ہوں، پھر بھی انھیں قربانی کے گوشت میں سے دینا جائز ہے۔ یہ بات صحابۂ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ عَلْقَمَہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے میرے ہاتھ قربانی کے جانور بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ یوم النحر کو انھیں ذبح کرنا، خود بھی کھانا، مساکین کو بھی دینا، اور میرے بھائی کے گھر بھی بھیجنا۔ ابنِ عمرؓ کا بھی یہی قول

لْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا

اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

یہ تھا (تعمیرِ کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے۔

اور تمھارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے، ماسوا اُن چیزوں کے جو

ہے کہ ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ ہمسایوں کو دو، اور ایک حصہ مساکین میں تقسیم کرو۔

۵۱ – یعنی یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانی سے فارغ ہو کر اِحرام کھول دیں، حجامت کرائیں، نہائیں، دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو اِحرام کی حالت میں عائد ہو گئی تھیں۔ لغت میں تَفَث کے اصل معنیٰ اُس غبار اور مَیل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر حج کے سلسلے میں جب مَیل کچیل دُور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا جو اُوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسکِ حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے، وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے، اور نہ جسم کی دوسری صفائی کر سکتا ہے۔ (اِس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ قربانی سے فراغت کے بعد دوسری تمام پابندیاں تو ختم ہو جاتی ہیں، مگر بیوی کے پاس جانا اُس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک آدمی طوافِ افاضہ نہ کر لے۔)

۵۲ – یعنی جو نذر بھی کسی نے اِس موقع کے لیے مانی ہو۔

۵۳ – کعبے کے لیے ”بیتِ عتیق“ کا لفظ بہت معنیٰ خیز ہے۔ ”عتیق“ عَرَبی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، قدیم۔ دوسرے، آزاد، جس پر کسی کی مِلکیّت نہ ہو۔ تیسرے، مکرّم اور معزز۔ یہ تینوں ہی معنیٰ اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔

طواف سے مراد طوافِ افاضہ، یعنی طوافِ زیارت ہے، جو یوم النحر کو قربانی کرنے اور اِحرام کھول دینے کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ ارکانِ حج میں سے ہے۔ اور چونکہ قضائے تَفَث کے حکم سے متصل اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طواف قربانی کرنے اور اِحرام کھول کر نہا دھو لینے کے بعد کیا جانا چاہیے۔

۵۴ – بظاہر یہ ایک عام نصیحت ہے جو اللہ کی قائم کی ہوئی تمام حرمتوں کا احترام کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں وہ حرمتیں بدرجۂ اَولیٰ مراد ہیں جو مسجدِ حرام اور حج اور عمرے اور حرمِ مکہ کے باب میں قائم کی گئی ہیں۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ قریش نے حرم سے مسلمانوں کو نکال کر، اور ان پر حج کا راستہ بند کر کے اور مناسکِ حج میں مشرکانہ و جاہلانہ رسمیں شامل کر کے، اور بیت اللہ کو شرک کی گندگی سے ملوث کر کے اُن بہت سی حرمتوں کی ہتک کر ڈالی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قائم کر دی گئی تھیں۔

يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰

تمھیں بتائی جا چکی ہیں[۵۶]۔ پس بُتوں کی گندگی سے بچو[۵۷]، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو[۵۸]،

۵۵ - اس موقع پر مویشی جانوروں کی حلّت کا ذکر کرنے سے مقصود دو غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے: اوّل، یہ کہ قریش اور مشرکینِ عرب بَحِیرہ اور سائبہ اور وَصِیلہ اور حام کو بھی اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں شمار کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ اس کی قائم کردہ حرمتیں نہیں ہیں، بلکہ اس نے تمام مویشی جانور حلال کیے ہیں۔ دوم، یہ کہ حالتِ اِحرام میں جس طرح شکار حرام ہے، اُسی طرح کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مویشی جانوروں کا ذبح کرنا اور ان کو کھانا بھی حرام ہے۔ اس لیے بتایا گیا کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں سے نہیں ہے۔

۵۶ - اشارہ ہے اس حکم کی طرف جو سورۂ اَنعام اور سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے کہ ''اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ ہیں مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر ذبح کیا جائے۔'' (الاَنعام، آیت ۱۴۵۔ النحل، آیت ۱۱۵)

۵۷ - یعنی بتوں کی پرستش سے اس طرح بچو جیسے غلاظت سے آدمی گِھن کھاتا ہے اور دُور ہٹتا ہے۔ گویا کہ وہ نجاست سے بھرے ہوئے ہیں اور قریب جاتے ہی آدمی اُن سے نجس اور پلید ہو جائے گا۔

۵۸ - اگرچہ الفاظ عام ہیں، اور ان سے ہر جھوٹ، بہتان اور جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں خاص طور پر اشارہ اُن باطل عقائد اور احکام اور رُسوم اور اَوہام کی طرف ہے جن پر کفر و شرک کی بنیاد ہے۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں اس کے بندوں کو حصّہ دار بنانا وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ اور پھر وہ جھوٹ بھی اس فرمان کی براہِ راست زد میں آتا ہے جس کی بنا پر مشرکینِ عرب بَحِیرہ اور سائبہ اور حام وغیرہ کو حرام قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۂ نحل میں فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ''اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔'' (آیت ۱۱۶)

اس کے ساتھ جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی اسی حکم کے تحت آتی ہے، جیسا کہ صحیح احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: عُدِلت شھادۃ الزور بالاشراك باللّٰہِ، ''جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے''، اور پھر آپؐ نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔ اسلامی قانون میں یہ جرم مُستَلزِم تعزیر ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شخص عدالت میں جھوٹا گواہ ثابت ہو جائے، اُس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔ یہی حضرت عمرؓ کا قول اور فعل بھی ہے۔ مَکحُول کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یُضرب ظھرہ ویحلق رأسہ ویسخم وجھہ ویطال حبسہ، ''اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں، اس کا سر مونڈا جائے اور منہ کالا کیا جائے، اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔'' عبداللہ بن عامرؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں ایک شخص

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے، یا ہَوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔[۵۹] یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ[۶۰] شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔[۶۱]

---

کی گواہی جھوٹی ثابت ہوگئی تو انھوں نے اس کو ایک دن برسرِ عام کھڑا رکھ کر اعلان کرایا کہ یہ فلاں بن فُلاں جھوٹا گواہ ہے، اِسے پہچان لو، پھر اس کو قید کر دیا۔ موجودہ زمانے میں ایسے شخص کا نام اخبارات میں نکال دینا تشہیر کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔

۵۹ – اس تمثیل میں آسمان سے مراد ہے انسان کی فطری حالت جس میں وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہوتا اور توحید کے سوا اُس کی فطرت کسی اور مذہب کو نہیں جانتی۔ اگر انسان انبیاؑ کی دی ہوئی رہنمائی قبول کر لے تو وہ اسی فطری حالت پر علم اور بصیرت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے، اور آگے اس کی پرواز مزید بلندیوں ہی کی طرف ہوتی ہے، نہ کہ پستیوں کی طرف۔ لیکن شرک (اور صرف شرک ہی نہیں بلکہ دہریت اور الحاد بھی) اختیار کرتے ہی وہ اپنی فطرت کے آسمان سے یکایک گر پڑتا ہے اور پھر اس کو دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آتی ہے: ایک، یہ کہ شیاطین اور گمراہ کرنے والے انسان، جن کو اس تمثیل میں شکاری پرندوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اس کی طرف جھپٹتے ہیں، اور ہر ایک اسے اُچک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کی اپنی خواہشاتِ نفس اور اس کے اپنے جذبات اور تخیّلات، جن کو ہَوا سے تشبیہ دی گئی ہے، اسے اُڑائے اُڑائے لیے پھرتے ہیں اور آخرِ کار اُس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیتے ہیں۔

سَحِیْق کا لفظ سحق سے نکلا ہے، جس کے اصل معنیٰ پیسنے کے ہیں۔ کسی جگہ کو سَحیق اُس صورت میں کہیں گے جب کہ وہ اتنی گہری ہو کہ جو چیز اس میں گرے، وہ پاش پاش ہو جائے۔ یہاں فکر و اَخلاق کی پستی کو اس گہرے کھڈ سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں گر کر آدمی کے پُرزے اُڑ جائیں۔

ع ۸/۱۱ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ع

تمھیں ایک وقتِ مقرر تک اُن (ہَدی کے جانوروں) سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہے[۶۲]، پھر اُن (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے[۶۳]۔ ع

۶۰ – یعنی خدا پرستی کی علامات، خواہ وہ اعمال ہوں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ، یا اشیا ہوں، جیسے مسجد اور ہَدی کے اونٹ وغیرہ۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۵)

۶۱ – یعنی یہ احترام دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ نہ کچھ خدا کا خوف ہے، جبھی تو وہ اس کے شعائر کا احترام کر رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص جان بُوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو چکا ہے، یا تو وہ خدا کا قائل ہی نہیں ہے، یا ہے تو اس کے مقابلے میں باغیانہ رَوِش اختیار کرنے پر اُتر آیا ہے۔

۶۲ – پہلی آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے اور اسے دل کے تقویٰ کی علامت ٹھیرانے کے بعد یہ فقرہ ایک غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ شعائر اللہ میں ہَدی کے جانور بھی داخل ہیں، جیسا کہ اہلِ عرب مانتے تھے، اور قرآن خود بھی آگے چل کر کہتا ہے کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ”اور ان ہَدی کے اُونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔“ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حکم اُوپر دیا گیا ہے، کیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہَدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی طرف جب لے جانے لگیں تو ان کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے؟ ان پر سواری کرنا، یا سامان لادنا، یا ان کے دودھ پینا تعظیمِ شعائرِ اللہ کے خلاف تو نہیں ہے؟ عرب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ وہ ان جانوروں کو بالکل کوتَل لے جاتے تھے۔ راستے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ اِسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قربانی کی جگہ پہنچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، ایسا کرنا تعظیمِ شعائرِ اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہی بات اُن احادیث سے معلوم ہوتی ہے جو اس مسئلے میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت اَنسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اُونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جا رہا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اس پر سوار ہو جا۔“ اُس نے عرض کیا: ”یہ ہَدی کا اونٹ ہے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”ارے سوار ہو جا۔“

مفسرین میں سے ابنِ عباسؓ، قَتَادہ، مجاہد، ضحّاک اور عطاء خُراسانی اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں ”ایک وقتِ مقرر تک“ سے مراد ”جب تک کہ جانور کو قربانی کے لیے نامزد اور ہَدی سے موسوم نہ کر دیا جائے“ ہے۔ اس تفسیر کی رُو سے آدمی ان جانوروں سے صرف اس وقت تک فائدہ اُٹھا سکتا ہے جب تک کہ وہ اسے ہَدی کے نام سے موسوم نہ کر دے۔ اور جونہی کہ وہ اسے ہَدی بنا کر بیت اللہ لے جانے کی نیت کر لے، پھر اسے کوئی فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں رہتا۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ

ہر اُمّت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے، تاکہ (اُس اُمّت کے) لوگ اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے ان کو بخشے ہیں۔[۶۴] (اِن مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اُسی کے تم مطیعِ فرمان بنو۔ اور اَے نبیؐ! بشارت دے دے

لیکن یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوّل تو اس صورت میں استعمال اور استفادے کی اجازت دینا ہی بے معنیٰ ہے۔ کیونکہ ''ہَدی'' کے سوا دوسرے جانوروں سے اِستفادہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی شک پیدا ہی کب ہوا تھا کہ اسے اجازت کی تصریح سے رفع کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ پھر آیت صریح طور پر کہہ رہی ہے کہ اجازت ان جانوروں کے استعمال کی دی جا رہی ہے جن پر ''شعائر اللہ'' کا اطلاق ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ انھیں ہَدی قرار دے دیا جائے۔

دُوسرے مفسرین، مثلاً عُروَہ بن زبیر اور عطاء بن ابی رَباح کہتے ہیں کہ ''وقتِ مقرر'' سے مراد ''قربانی کا وقت'' ہے۔ قربانی سے پہلے ہَدی کے جانوروں کو سواری کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں، ان کے دودھ بھی پی سکتے ہیں، ان کے بچے بھی لے سکتے ہیں اور اُن کا اُون، صوف، بال وغیرہ بھی اتار سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ حَنَفِیّہ اگرچہ پہلی تفسیر کے قائل ہیں، لیکن وہ اس میں اتنی گنجایش نکال دیتے ہیں کہ بشرطِ ضرورت استفادہ جائز ہے۔

۶۳ – جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ، آیت ۹۵) اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کعبہ پر، یا مسجدِ حرام میں قربانی کی جائے، بلکہ حرم کے حُدُود میں قربانی کرنا مراد ہے۔ یہ ایک اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآن کعبہ، یا بیت اللہ، یا مسجدِ حرام بول کر بالعُموم حرمِ مکہ مراد لیتا ہے، نہ کہ صرف وہ عمارت۔

۶۴ – اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ قربانی تمام شرائعِ الٰہیہ کے نظامِ عبادت کا ایک لازمی جز رہی ہے۔ توحید فی العبادت کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان نے جن جن صورتوں سے غیر اللہ کی بندگی کی ہے، ان سب کو غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مختص کر دیا جائے۔ مثلاً انسان نے غیر اللہ کے آگے رکوع و سجود کیا ہے۔ شرائعِ الٰہیہ نے اسے اللہ کے لیے خاص کر دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے آگے مالی نذرانے پیش کیے ہیں۔ شرائعِ الٰہیہ نے انھیں ممنوع کر کے زکوٰۃ و صدقہ اللہ کے لیے واجب کر دیا۔ انسان نے معبُودانِ باطل کی تیرتھ یاترا کی ہے۔ شرائعِ الٰہیہ نے کسی نہ کسی مَقام کو مقدّس یا بیت اللہ قرار دے کر اس کی زیارت اور طواف کا حکم دے دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے نام کے روزے رکھے ہیں۔ شرائعِ الٰہیہ نے انھیں بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح انسان اپنے خودساختہ معبُودوں کے لیے

الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا

عاجزانہ رَوِش اختیار کرنے والوں[65] کو، جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اُٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی اُن پر آتی ہے اُس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[66]۔

اور (قربانی کے) اُونٹوں[67] کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمھارے لیے اُن میں

جانوروں کی قربانیاں بھی کرتا رہا ہے، اور شرائع الٰہیہ نے ان کو بھی غیر کے لیے قطعاً حرام اور اللہ کے لیے واجب کر دیا۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ اصل چیز اللہ کے نام پر قربانی ہے، نہ کہ اس قاعدے کی یہ تفصیلات کہ قربانی کب کی جائے اور کہاں کی جائے اور کس طرح کی جائے۔ ان تفصیلات میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں اور ملکوں کے انبیاؑ کی شریعتوں میں حالات کے لحاظ سے اختلافات رہے ہیں، مگر سب کی رُوح اور سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے۔

۶۵ — اصل میں لفظ مُخْبِتِین استعمال کیا گیا ہے، جس کا مفہُوم کسی ایک لفظ سے پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ اس میں تین مفہُومات شامل ہیں: اِستکبار اور غرورِ نفس چھوڑ کر اللہ کے مقابلے میں عجز اختیار کرنا، اُس کی بندگی و غلامی پر مطمئن ہو جانا، اس کے فیصلوں پر راضی ہو جانا۔

۶۶ — اس سے پہلے ہم اس امر کی تصریح کر چکے ہیں کہ اللہ نے کبھی حرام و ناپاک مال کو اپنا رزق نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو پاک رزق ہم نے انھیں بخشا ہے اور جو حلال کمائیاں ان کو عطا کی ہیں، ان میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ سے مراد بھی ہر طرح کا خرچ نہیں ہے، بلکہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، رشتہ داروں اور ہمسایوں اور حاجت مند لوگوں کی مدد کرنا، رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لینا، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مالی ایثار کرنا مراد ہے۔ بے جا خرچ، اور عیش و عشرت کے خرچ، اور ریا کارانہ خرچ وہ چیز نہیں ہے جسے قرآن ''انفاق'' قرار دیتا ہو، بلکہ یہ اس کی اصطلاح میں اسراف اور تبذیر ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور تنگ دلی کے ساتھ جو خرچ کیا جائے، کہ آدمی اپنے اہل و عیال کو بھی تنگ رکھے، اور خود بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ضرورتیں پوری نہ کرے، اور خلقِ خدا کی مدد بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرنے سے جی چُرائے، تو اس صورت میں اگرچہ آدمی خرچ تو کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے، مگر قرآن کی زبان میں اس خرچ کا نام ''اِنفاق'' نہیں ہے۔ وہ اس کو ''بُخل'' اور ''شُحِّ نفس'' کہتا ہے۔

۶۷ — اصل میں لفظ ''بُدْن'' استعمال ہوا ہے، جو عربی زبان میں اُونٹوں کیلیے مخصوص ہے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم

خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا

بھلائی ہے[68]، پس انھیں کھڑا کر کے[69] اُن پر اللہ کا نام لو[70]، اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹِک

نے قربانی کے حکم میں گائے کو بھی اُونٹوں کے ساتھ شامل فرمادیا ہے۔ جس طرح ایک اُونٹ کی قربانی سات آدمیوں کے لیے کافی ہوتی ہے، اسی طرح ایک گائے کی قربانی بھی سات آدمی مل کر کر سکتے ہیں۔ مسلم میں جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ امرنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ان نشترك فی الاضاحی البدنة عن سبعة والبقرة عن سبعة، ”رسولؐ اللہ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم قربانیوں میں شریک ہو جایا کریں، اُونٹ سات آدمیوں کے لیے اور گائے سات آدمیوں کے لیے۔“

۶۸ – یعنی تم ان سے بکثرت فائدے اُٹھاتے ہو۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمھیں ان کی قربانی کیوں کرنی چاہیے۔ آدمی خدا کی بخشی ہوئی جن جن چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی قربانی اس کو اللہ کے نام پر کرنی چاہیے، نہ صرف شکرِ نعمت کے لیے، بلکہ اللہ کی برتری اور مالکیت تسلیم کرنے کے لیے بھی، تاکہ آدمی دل میں بھی اور عمل سے بھی اس امر کا اعتراف کرے کہ یہ سب کچھ خدا کا ہے جو اُس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ایمان اور اسلام نفس کی قربانی ہے۔ نماز اور روزہ جسم اور اس کی طاقتوں کی قربانی ہے۔ زکوٰۃ اُن اموال کی قربانی ہے جو مختلف شکلوں میں ہم کو اللہ نے دیے ہیں۔ جہاد وقت اور ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی قربانی ہے۔ قِتال فی سبیل اللہ جان کی قربانی ہے۔ یہ سب ایک ایک طرح کی نعمت اور ایک ایک عطیّے کے شکریّے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی قربانی بھی ہم پر عائد کی گئی ہے، تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی اِس عظیم الشان نعمت پر اُس کا شکر ادا کریں اور اس کی بڑائی مانیں کہ اس نے اپنے پیدا کیے ہوئے بکثرت جانوروں کو ہمارے لیے مسخر فرمایا، جن پر ہم سوار ہوتے ہیں، جن سے کھیتی باڑی اور بار برداری کی خدمت لیتے ہیں، جن کے گوشت کھاتے ہیں، جن کے دودھ پیتے ہیں، جن کی کھالوں اور بالوں اور خون اور ہڈی، غرض ایک ایک چیز سے بے حساب فائدے اُٹھاتے ہیں۔

۶۹ – واضح رہے کہ اُونٹ کی قربانی اس کو کھڑا کر کے کی جاتی ہے۔ اُس کا ایک پاؤں باندھ دیا جاتا ہے، پھر اس کے حلقوم میں زور سے نیزہ مارا جاتا ہے جس سے خون کا ایک فوّارہ نکل پڑتا ہے، پھر جب کافی خون نکل آتا ہے تب اُونٹ زمین پر گر پڑتا ہے۔ یہی مفہوم ہے صَوَآفّ کا۔ ابنِ عباسؓ، مجاہد، ضحّاک وغیرہ نے اس کی یہی تشریح کی ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ مسلم اور بخاری میں رِوایت ہے کہ ابنِ عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے اُونٹ کو بٹھا کر قربانی کر رہا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: ابعثها قیاما مقیدة سنة ابی القاسم صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ”اس کو پاؤں باندھ کر کھڑا کر، یہ ہے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔“ ابوداؤد میں جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اُونٹ کا بایاں پاؤں باندھ کر باقی تین پاؤں پر اُسے کھڑا کرتے تھے، پھر اس کو نحر کرتے تھے۔ اسی مفہوم کی طرف خود قرآن بھی اشارہ کر رہا ہے: فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا ”جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹِک جائیں۔“ یہ اُسی صورت میں بولیں گے جب کہ جانور کھڑا ہو اور پھر زمین پر گرے۔ ورنہ لٹا کر قربانی کرنے کی صورت میں تو پیٹھ ویسے ہی ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔

۷۰ – یہ الفاظ پھر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنے سے کوئی جانور حلال نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو ”ذبح کرو“ کہنے کے بجائے ”اُن پر اللہ کا نام لو“ فرمارہا ہے، اور مطلب اس کا جانوروں کو ذبح کرنا ہے۔ اس سے

فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ

جائیں[71] تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں، اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ اِن جانوروں کو ہم نے اس طرح تمھارے لیے مسخّر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو[72]۔ نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اُسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے[73]۔ اُس نے ان کو تمھارے لیے اِس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اُس کی تکبیر کرو[74]۔ اور اے نبیؐ!

خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی شریعت میں جانور کے ذبح کرنے کا کوئی تصور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے سوا نہیں ہے۔

ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنے کا طریقہ بھی اسی مقام سے ماخوذ ہے۔ آیت ۳۶ میں فرمایا: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا، ''ان پر اللہ کا نام لو'' اور آیت ۳۷ میں فرمایا: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ، ''تاکہ اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔''

قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینے کی مختلف صورتیں احادیث میں منقول ہیں، مثلاً (۱) بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ ''اللہ کے نام کے ساتھ، اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔'' (۲) اللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ، ''اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔'' (۳) اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ ''میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور قربانی اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اِسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔''

۷۱ – ٹکنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ زمین پر گر جائیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ گر کر ٹھیر جائیں، یعنی تڑپنا بند کر دیں اور جان پوری طرح نکل جائے۔ ابوداؤد، ترمذی اور مُسنَدِ احمد میں نبی کریمؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ما قطع (اَوما بان) من البھیمة وھی حیة فھومیتة، یعنی ''جانور سے جو گوشت اس حالت میں کاٹا جائے کہ ابھی وہ زندہ ہو، وہ مُردار ہے۔''

۷۲ – یہاں پھر اشارہ ہے اِس مضمون کی طرف کہ قربانی کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ فرمایا: اس لیے کہ یہ شکریہ ہے اُس عظیم الشان نعمت کا جو اللہ نے مویشی جانوروں کو تمھارے لیے مسخر کر کے تمھیں بخشی ہے۔

۷۳ – جاہلیّت کے زمانے میں اہلِ عرب جس طرح بتوں کی قربانی کا گوشت بتوں پر لے جا کر چڑھاتے تھے، اُسی

طرح اللہ کے نام کی قربانی کا گوشت کعبے کے سامنے لا کر رکھتے اور خون اس کی دیواروں پر لتھیڑتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ قربانی گویا اس لیے کی جاتی تھی کہ اللہ کے حضور اس کا خون اور گوشت پیش کیا جائے۔ اس جَہالت کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ اصل چیز جو اللہ کے حضور پیش ہوتی ہے، وہ جانور کا خون اور گوشت نہیں، بلکہ تمھارا تقویٰ ہے۔ اگر تم شکرِ نعمت کے جذبے کی بنا پر خالص نیت کے ساتھ صرف اللہ کے لیے قربانی کرو گے، تو اس جذبے اور نیت اور خلوص کا نذرانہ اس کے حضور پہنچ جائے گا، ورنہ خون اور گوشت یہیں دھرا رہ جائے گا۔ یہی بات ہے جو حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ لا ینظر الٰی صورکم ولا الٰی الوانکم ولکن ینظر الٰی قلوبکم واعمالکم، ’’اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے رنگ نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دل اور اعمال دیکھتا ہے۔‘‘

۷۴ – یعنی دل سے اس کی بڑائی اور برتری مانو اور عمل سے اس کا اعلان و اظہار کرو۔ یہ پھر حکم قربانی کی غرض اور علّت کی طرف اشارہ ہے۔ قربانی صرف اسی لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ یہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر اللہ کا شکریہ ہے، بلکہ اس لیے بھی واجب کی گئی ہے کہ جس کے یہ جانور ہیں، اور جس نے انھیں ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اس کے حُقوقِ مالکانہ کا ہم دل سے بھی اور عملاً بھی اعتراف کریں، تاکہ ہمیں کبھی یہ بھول لاحق نہ ہو جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا مال ہے۔ اسی مضمون کو وہ فقرہ ادا کرتا ہے جو قربانی کرتے وقت کہا جاتا ہے کہ اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ، ’’خدایا! تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔‘‘

اس مَقام پر یہ جان لینا چاہیے کہ اس پیراگراف میں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ صرف حاجیوں کے لیے ہی نہیں ہے، اور صرف مکے میں حج ہی کے موقع پر ادا کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے عام ہے، جہاں بھی وہ ہوں، تاکہ وہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر شکریہ اور تکبیر کا فرض بھی ادا کریں اور ساتھ ساتھ اپنے اپنے مَقامات پر حاجیوں کے شریکِ حال بھی ہو جائیں۔ حج کی سعادت میسر نہ آئی، نہ سہی، کم از کم حج کے دنوں میں ساری دُنیا کے مسلمان وہ کام تو کر رہے ہوں جو حاجی جوارِ بیت اللہ میں کریں۔ اس مضمون کی تصریح متعدّد صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور بکثرت معتبر روایات سے بھی ثابت ہوا ہے کہ نبیؐ خود مدینۂ طَیّبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ہر سال بقرعید کے موقع پر قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں میں آپؐ ہی کی سنت سے یہ طریقہ جاری ہوا۔ مُسْنَدِ احمد اور ابنِ ماجہ میں ابوہریرہؓ کی رِوایَت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| من وجد سعة فلم یُضَحِّ فلا یقربن مصَلّانا۔ | جو شخص استطاعت رکھتا ہو پھر قربانی نہ کرے، وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ |

اس روایت کے تمام راوی ثِقہ ہیں۔ محدثین میں صرف اس امر پر اختلاف ہے کہ یہ مرفوع روایت ہے یا موقوف۔ تِرْمِذی میں ابنِ عمرؓ کی روایت ہے:

| | |
|---|---|
| اقام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم بالمدینة عشر سنین یُضَحّی۔ | نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں دس سال رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔ |

بخاری میں حضرت اَنَسؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے روز فرمایا:

| | |
|---|---|
| من کان ذبح قبل الصلٰوة فلیعُد ومن | جس نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کرلیا، اسے دوبارہ |

بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بشارت دے دے نیکوکار لوگوں کو۔

یقیناً[۷۵] اللہ مُدافعت کرتا ہے اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔[۷۶] یقیناً اللہ

ذبح بعد الصلٰوۃ فقد تم نسکه واصاب سنة المسلمین۔ قربانی کرنی چاہیے، اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی، اس کی قربانی پوری ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کا طریقہ پالیا۔

اور یہ معلوم ہے کہ یوم النحر کو مکے میں کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کرنا سنتِ مسلمین کے خلاف ہو اور بعد کرنا اس کے مطابق۔ لہٰذا لامحالہ یہ ارشاد مدینے ہی میں ہوا ہے، نہ کہ حج کے موقع پر مکے میں۔

مسلم میں جابرؓ بن عبداللہ کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں بقرعید کی نماز پڑھائی اور بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ آپؐ قربانی کر چکے ہیں، اپنی اپنی قربانیاں کرلیں۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے قربانی کرلی ہے، وہ پھر اعادہ کریں۔

پس یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ بقرعید کے روز جو قربانی عام مسلمان دُنیا بھر میں کرتے ہیں، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جاری کی ہوئی سنّت ہے۔ البتہ اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ آیا یہ واجب ہے یا صرف سنّت۔ ابراہیم نَخَعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام محمدؒ، اور ایک روایت کے مطابق امام ابویوسفؒ بھی، اس کو واجب مانتے ہیں۔ مگر امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ صرف سنتِ مسلمین ہے، اور سفیان ثَوریؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ تاہم علمائے اُمّت میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اگر تمام مسلمان متفق ہوکر اسے چھوڑ دیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ نئی اُپج صرف ہمارے زمانے کے بعض لوگوں کو سوجھی ہے، جن کے لیے ان کا نفس ہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

۷۵ – یہاں سے تقریر کا رُخ ایک دوسرے مضمون کی طرف پھرتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں تازہ کرلیجیے کہ یہ تقریر اس وقت کی ہے جب ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ حج کا موسم آیا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو مہاجرین اور انصارِ مدینہ، دونوں کو یہ بات سخت شاق گزر رہی تھی کہ وہ حج کی نعمت سے محروم کردیے گئے ہیں اور ان پر زیارتِ حرم کا راستہ زبردستی بند کردیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں پر نہ صرف اُس ظلم کے داغ تازہ تھے جو مکے میں ان پر کیے گئے تھے، بلکہ اس بات پر بھی وہ سخت رنجیدہ تھے کہ گھر بار چھوڑ کر جب وہ مکے سے نکل گئے تو اب مدینے میں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا جارہا ہے۔ اس موقع پر جو تقریر فرمائی گئی، اس کے پہلے حصے میں کعبہ کی تعمیر، اور حج کے ادارے اور قربانی کے طریقے پر مفصّل گفتگو کرکے بتایا گیا کہ ان سب چیزوں کا اصل مقصد کیا تھا اور جاہلیت نے ان کو بگاڑ کر کیا سے کیا کردیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کردیا گیا کہ انتقام کی نیت سے نہیں بلکہ اصلاح کی نیت سے اِس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اُٹھیں۔ نیز اس کے ساتھ مدینے میں قربانی کا طریقہ جاری کرکے مسلمانوں کو یہ موقع بھی فراہم کردیا گیا کہ حج کے زمانے میں اپنے اپنے گھروں پر ہی قربانی

لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٨﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿٣٩﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

الثلثۃ ع ۵ ۱۲

کسی خائن کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا[۷۷]۔ اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں[۷۸]، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے[۷۹]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال

کر کے اس سعادت میں حصہ لے سکیں جس سے دشمنوں نے ان کو محروم کرنے کی کوشش کی ہے، اور حج سے الگ ایک مستقل سنّت کی حیثیت سے قربانی جاری کر دی، تاکہ جو حج کا موقع نہ پائے، وہ بھی اللہ کی نعمت کے شکر اور اس کی تکبیر کا حق ادا کر سکے۔ اس کے بعد اب دوسرے حصّے میں مسلمانوں کو اس ظلم کے خلاف تلوار اُٹھانے کی اجازت دی جا رہی ہے جو اُن پر کیا گیا تھا اور کیا جا رہا تھا۔

۷۶ – ''مدافعت'' دفع سے ہے، جس کے اصل معنیٰ کسی چیز کو ہٹانے اور دُور کرنے کے ہیں۔ مگر جب دفع کرنے کے بجائے مدافعت کرنا بولیں گے تو اس میں دو مفہوم اور شامل ہو جائیں گے: ایک، یہ کہ کوئی دشمن طاقت ہے جو حملہ آور ہو رہی ہے اور مُدافعت کرنے والا اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دوسرے، یہ کہ یہ مقابلہ بس ایک دفعہ ہی ہو کر نہیں رہ گیا، بلکہ جب بھی وہ حملہ کرتا ہے، یہ اس کو دفع کرتا ہے۔ ان دو مفہومات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اہلِ ایمان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے مُدافعت کرنے کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کفر اور ایمان کی کشمکش میں اہلِ ایمان یکّہ وتنہا نہیں ہوتے بلکہ اللہ خود ان کے ساتھ ایک فریق ہوتا ہے۔ وہ ان کی تائید اور حمایت فرماتا ہے، ان کے خلاف دشمنوں کی چالوں کا توڑ کرتا ہے اور موذیوں کے ضرر کو اُن سے دفع کرتا رہتا ہے۔ پس یہ آیت حقیقت میں اہلِ حق کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے، جس سے بڑھ کر ان کا دل مضبوط کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

۷۷ – یہ وجہ ہے اس بات کی کہ اِس کش مکش میں اللہ کیوں اہلِ حق کے ساتھ ایک فریق بنتا ہے۔ اس لیے کہ حق کے خلاف کش مکش کرنے والا دوسرا فریق خائن ہے، اور کافرِ نعمت ہے۔ وہ ہر اس امانت میں خیانت کر رہا ہے جو اللہ نے اس کے سُپرد کی ہے، اور ہر اس نعمت کا جواب ناشکری اور کفران اور نمک حرامی سے دے رہا ہے جو اللہ نے اس کو بخشی ہے۔ لہٰذا اللہ اس کو ناپسند فرماتا ہے اور اس کے خلاف جِدّ وجُہد کرنے والے حق پرستوں کی تائید کرتا ہے۔

۷۸ – جیسا کہ دیباچے میں بیان کیا جا چکا ہے، یہ قِتال فی سبیل اللہ کے بارے میں اوّلین آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس آیت میں صرف اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں سورۂ بَقَرہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں جنگ کا حکم دے دیا گیا، یعنی وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (آیت ۱۹۰)، اور وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (آیت ۱۹۱)، اور وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (آیت ۱۹۳)، اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (آیت ۲۱۶)، اور وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (آیت ۲۴۴)

بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّآ أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

دیے گئے،[80] صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: "ہمارا رب اللہ ہے۔"[81] اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے

اجازت اور حکم میں صرف چند مہینوں کا فصل ہے۔ اجازت ہماری تحقیق کے مطابق ذی الحجہ ۱ ھ میں نازل ہوئی، اور حکم جنگِ بَدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان ۲ ھ میں نازل ہُوا۔

**۷۹ –** یعنی اس کے باوجود کہ یہ چند مٹھی بھر آدمی ہیں، اللہ ان کو تمام مشرکینِ عرب پر غالب کر سکتا ہے۔ یہ بات نگاہ میں رہے کہ جس وقت تلوار اُٹھانے کی یہ اجازت دی جا رہی تھی، مسلمانوں کی ساری طاقت صرف مدینے کے ایک معمولی قصبے تک محدود تھی اور مہاجرین و انصار مل کر بھی ایک ہزار کی تعداد تک نہ پہنچتے تھے۔ اور اس حالت میں چیلنج دیا جا رہا تھا قریش کو، جو تنہا نہ تھے، بلکہ عرب کے دوسرے مشرک قبائل بھی ان کی پشت پر تھے اور بعد میں یہودی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ "اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے" نہایت برمحل تھا۔ اس سے ان مسلمانوں کی بھی ڈھارس بندھائی گئی جنھیں پورے عرب کی طاقت کے مقابلے میں تلوار لے کر اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے اُبھارا جا رہا تھا، اور کفار کو بھی مُتنبّہ کر دیا گیا کہ تمھارا مقابلہ دراصل ان مٹھی بھر مسلمانوں سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اس کے مقابلے کی ہمت ہو تو سامنے آ جاؤ۔

**۸۰ –** یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ سورۂ حج کا یہ حصہ لازماً ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے۔

**۸۱ –** جس ظلم کے ساتھ یہ لوگ نکالے گئے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل کے چند واقعات مُلاحظہ ہوں:

حضرت صُہَیبؓ رومی جب ہجرت کرنے لگے تو کفارِ قریش نے ان سے کہا کہ تم یہاں خالی ہاتھ آئے تھے اور اب خوب مال دار ہو گئے ہو۔ تم جانا چاہو تو خالی ہاتھ ہی جا سکتے ہو، اپنا مال نہیں لے جا سکتے۔ حالانکہ انھوں نے جو کچھ کمایا تھا، اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا تھا، کسی کا دیا نہیں کھاتے تھے۔ آخر وہ غریب دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور سب کچھ ظالموں کے حوالے کر کے اس حال میں مدینے پہنچے کہ تن کے کپڑوں کے سوا اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔

حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اور ان کے شوہر ابوسَلَمہؓ اپنے دودھ پیتے بچے کو لے کر ہجرت کے لیے نکلے۔ بنی مُغیرہ (اُمِّ سَلَمہؓ کے خاندان) نے راستہ روک لیا اور ابوسَلَمہؓ سے کہا کہ تمھارا جہاں جی چاہے پھرتے رہو، مگر ہماری لڑکی کو لے کر نہیں جا سکتے۔ مجبُوراً بے چارے بیوی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر بنی عبد الاسد (ابوسَلَمہؓ کے خاندان والے) آگے بڑھے اور انھوں نے کہا کہ بچہ ہمارے قبیلے کا ہے، اسے ہمارے حوالے کرو۔ اس طرح بچہ بھی ماں اور باپ، دونوں سے چھین لیا گیا۔ تقریباً ایک سال تک حضرت اُمِّ سَلَمہؓ بچے اور شوہر کے غم میں تڑپتی رہیں، اور آخر بڑی مصیبت سے اپنے بچے کو حاصل کر کے مکے سے اس حال میں نکلیں کہ اکیلی عورت گود میں بچہ لیے اُونٹ پر سوار تھی اور ان راستوں پر جا رہی تھی جن سے مسلح قافلے بھی گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

عَیّاش بن ابی رَبیعہ، ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ پیچھے پیچھے

بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ؕ وَلَيَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ

سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد[82] اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں[83]۔ اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے[84]۔ اللہ بڑا طاقتور اور

ابوجہل اپنے ایک بھائی کو ساتھ لے کر جا پہنچا اور بات بنائی کہ امّاں جان نے قسم کھالی ہے کہ جب تک عیّاش کی صورت نہ دیکھ لوں گی، نہ دھوپ سے سایے میں جاؤں گی اور نہ سر میں کنگھی کروں گی۔ اس لیے تم بس چل کر انھیں صورت دکھا دو، پھر واپس آ جانا۔ وہ بیچارے ماں کی محبّت میں ساتھ ہو لیے۔ راستے میں دونوں بھائیوں نے ان کو قید کر لیا اور مکے میں انھیں لے کر اس طرح داخل ہوئے کہ وہ رسّیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں بھائی پکارتے جارہے تھے کہ ’’اے اہلِ مکہ! اپنے اپنے نالائق لونڈوں کو یوں سیدھا کرو جس طرح ہم نے کیا ہے۔‘‘ کافی مدّت تک یہ بیچارے قید رہے اور آخر کار ایک جانباز مسلمان ان کو نکال لانے میں کامیاب ہوا۔

اس طرح کے مظالم سے قریب قریب ہر اس شخص کو سابقہ پیش آیا جس نے مکّے سے مدینے کی طرف ہجرت کی۔ ظالموں نے گھر بار چھوڑتے وقت بھی ان غریبوں کو خیریت سے نہ نکلنے دیا۔

۸۲ – اصل میں صَوَامِعُ اور بِيَعٌ اور صَلَوٰتٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صومعہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں راہب اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقیر رہتے ہوں۔ بیعہ کا لفظ عربی زبان میں عیسائیوں کی عبادت گاہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صَلَوات سے مراد یہودیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہودیوں کے ہاں اس کا نام صلوتا تھا جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ بعید نہیں کہ انگریزی لفظ (salute) اور (salutation) اسی سے نکل کر لاطینی میں اور پھر انگریزی میں پہنچا ہو۔

۸۳ – یعنی یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے کسی ایک گروہ یا قوم کو دائمی اقتدار کا پٹّا لکھ کر نہیں دے دیا، بلکہ وہ وقتاً فوقتاً دُنیا میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرتا رہتا ہے۔ ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو کہیں پٹّا مل گیا ہوتا، تو قلعے اور قصر اور ایوانِ سیاست اور صنعت وتجارت کے مرکز ہی تباہ نہ کر دیے جاتے بلکہ عبادت گاہیں تک دست درازیوں سے نہ بچتیں۔ سورۂ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے: وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ’’اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد مچ جاتا۔ مگر اللہ دُنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔‘‘ (آیت ۲۵۱)

۸۴ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوا ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو توحید کی طرف بلانے اور دینِ حق کو قائم کرنے اور شر کی جگہ خیر کو فروغ دینے کی سعی وجُہد کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے مددگار ہیں، کیونکہ یہ اللہ کا کام ہے جسے انجام دینے میں وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۵۰)

عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿٤١﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿٤٣﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ

---

زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں [85] گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[86]

اے نبیؐ! اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں[87] تو اُن سے پہلے قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ اور اہلِ مَدیَن بھی جُھٹلا چکے ہیں اور موسیٰؑ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ ان سب منکرینِ حق کو میں نے پہلے مُہلت دی،

---

۸۵ - یعنی اللہ کے مددگار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دُنیا میں انھیں حکومت و فرماں روائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فِسق و فُجور اور کِبر و غرور کے بجائے اِقامتِ صلوٰۃ ہو، اُن کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صَرف ہو، ان کی حکومت نیکی کو دبانے کے بجائے اُسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے، اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ اس ایک فقرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خُصوصیّات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔

۸۶ - یعنی یہ فیصلہ کہ زمین کا انتظام کس وقت کسے سونپا جائے، دراصل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مغرور بندے اس غلط فہمی میں ہیں کہ زمین اور اس کے بسنے والوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنے والے وہ خود ہیں۔ مگر جو طاقت ایک ذرا سے بیج کو تناور درخت بنا دیتی ہے، اور ایک تناور درخت کو ہیزم سوختنی میں تبدیل کر دیتی ہے، اسی کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جن کے دبدبے کو دیکھ کر لوگ خیال کرتے ہوں کہ بھلا ان کو کون ہلا سکے گا، اُنھیں ایسا گرائے کہ دُنیا کے لیے نمونۂ عبرت بن جائیں، اور جنھیں دیکھ کر کوئی گمان بھی نہ کر سکتا ہو کہ یہ بھی کبھی اُٹھ سکیں گے، اُنھیں ایسا سر بلند کرے کہ دُنیا میں اُن کی عظمت و بزرگی کے ڈنکے بج جائیں۔

۸۷ - یعنی کفارِ مکہ۔

ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٤﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿٤٥﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿٤٦﴾

---

پھر پکڑ لیا[۸۸]۔ اب دیکھ لو کہ میری عُقُوبت کیسی تھی[۸۹]۔ کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں[۹۰] بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے اور اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں[۹۱]۔

---

۸۸ – یعنی ان میں سے کسی قوم کو بھی نبی کی تکذیب کرتے ہی فوراً نہیں پکڑ لیا گیا تھا، بلکہ ہر ایک کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی وقت دیا گیا، اور گرفت اُس وقت کی گئی جب کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو چکے تھے۔ اسی طرح کفارِ مکہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ ان کی شامت آنے میں جو دیر لگ رہی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ نبی کی تنبیہات محض خالی خولی دھمکیاں ہیں۔ درحقیقت یہ مُہلتِ غور و فکر ہے جو اللہ اپنے قاعدے کے مطابق ان کو دے رہا ہے، اور اس مُہلت سے اگر انھوں نے فائدہ نہ اُٹھایا تو ان کا انجام بھی وہی ہو کر رہنا ہے جو اُن کے پیش رَوؤں کا ہو چکا ہے۔

۸۹ – اصل میں لفظ نکیر استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم عقوبت یا کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ یہ لفظ دو معنٰی دیتا ہے: ایک، یہ کہ کسی شخص کی بُری رَوِش پر ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ اُس کو ایسی سزا دی جائے جو اس کی حالت دِگرگوں کر دے۔ اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا جائے۔ کوئی دیکھے تو پہچان نہ سکے کہ یہ وہی شخص ہے۔ ان دونوں مفہومات کے لحاظ سے اس فقرے کا پورا مطلب یہ ہے کہ ”اب دیکھ لو کہ ان کی اس رَوِش پر جب میرا غضب بھڑکا تو پھر میں نے ان کی حالت کیسی دِگرگوں کر دی۔“

۹۰ – عرب میں کنواں اور بستی قریب قریب ایک دوسرے کے ہم معنٰی ہیں۔ کسی قبیلے کی بستی کا نام لینا ہو تو کہتے ہیں: ماء بنی فلان، یعنی فُلاں قبیلے کا کنواں۔ ایک عرب کے سامنے جب یہ کہا جائے گا کہ کنویں بیکار پڑے ہیں، تو اس کے ذہن میں اس کا یہ مطلب آئے گا کہ بستیاں اُجڑی پڑی ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾ ع قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

ع ۱۳

---

یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں[92]۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے[93]۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں، میں نے ان کو پہلے مُہلت دی، پھر پکڑ لیا۔ اور سب کو واپس تو میرے ہی پاس آنا ہے۔ع

اے محمدؐ! کہہ دو کہ "لوگو! میں تو تمھارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (بُرا وقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کر دینے والا ہو[94]۔ پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، اُن کے لیے مغفرت ہے

---

۹۱- خیال رہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ یہاں خواہ مخواہ ذہن اس سوال میں نہ اُلجھ جائے کہ سینے والا دل کب سوچا کرتا ہے۔ اَدَبی زبان میں احساسات، جذبات، خیالات، بلکہ قریب قریب تمام ہی افعالِ دماغ سینے اور دل ہی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ کسی چیز کے "یاد ہونے" کو بھی یوں کہتے ہیں کہ "وہ تو میرے سینے میں محفوظ ہے"۔

۹۲- یعنی بار بار چیلنج کر رہے ہیں کہ میاں! اگر تم سچے نبی ہو تو کیوں نہیں آ جاتا ہم پر وہ عذاب جو خدا کے بھیجے ہوئے نبی برحق کے جھٹلانے پر آنا چاہیے، اور جس کی دھمکیاں بھی تم بار ہا ہم کو دے چکے ہو۔

۹۳- یعنی انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے تمھاری گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے کہ آج ایک صحیح یا غلط رَوِش اختیار کی اور کل اس کے اچھے یا بُرے نتائج ظاہر ہو گئے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ فُلاں طرزِ عمل اختیار کرنے کا انجام تمھاری تباہی کی صورت میں نکلے گا، تو وہ بڑی ہی احمق ہو گی اگر جواب میں یہ اِستِدلال کرے کہ جناب! اس طرزِ عمل کو اختیار کیے ہمیں دس، بیس یا پچاس برس ہو چکے ہیں، ابھی تک تو ہمارا کچھ بگڑا نہیں۔ تاریخی نتائج کے لیے دن اور مہینے اور سال تو درکنار، صدیاں بھی کوئی بڑی چیز نہیں ہیں۔

۹۴- یعنی میں تمھاری قسمتوں کے فیصلے کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ صرف خبردار کرنے والا ہوں۔ میرا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ شامت آنے سے پہلے تم کو مُتنبِّہ کر دوں۔ آگے فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی طے کرے گا کہ کس کو کب تک

وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝٥٠ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝٥١ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٥٢ۙ

اور عزّت کی روزی۔[95] اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے، وہ دوزخ کے یار ہیں۔

اور اَے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی[96] (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اُس نے تمنّا[97] کی، شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہوگیا۔[98] اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے،[99] اللہ علیم ہے اور حکیم[100]۔ (وہ اس لیے ایسا

مُہلت دینی ہے اور کب کس صورت میں اس پر عذاب لانا ہے۔

۹۵ – ''مغفرت'' سے مراد ہے خطاؤں اور کمزوریوں اور لغزشوں سے چشم پوشی و درگزر۔ اور ''رزقِ کریم'' کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ عمدہ رزق دیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ عزت کے ساتھ بٹھا کر دیا جائے۔

۹۶ – رسول اور نبی کے فرق کی تشریح سورۂ مریم، حاشیہ ۳۰ میں کی جا چکی ہے۔

۹۷ – تَمَنّٰی کا لفظ عَرَبی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنٰی تو وہی ہیں جو اُردو میں لفظ تمنّا کے ہیں، یعنی کسی چیز کی خواہش اور آرزو۔ دوسرے معنٰی تلاوت کے ہیں، یعنی کسی چیز کو پڑھنا۔

۹۸ – ''تمنّا'' کا لفظ اگر پہلے معنٰی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ شیطان نے اس کی آرزو پوری ہونے میں رخنے ڈالے اور رکاوٹیں پیدا کیں۔ دوسرے معنٰی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ جب بھی اُس نے کلامِ الٰہی لوگوں کو سنایا، شیطان نے اس کے بارے میں طرح طرح کے شبہے اور اعتراضات پیدا کیے، عجیب عجیب معنٰی اس کو پہنائے، اور ایک صحیح مطلب کے سوا ہر طرح کے اُلٹے سیدھے مطلب لوگوں کو سمجھائے۔

۹۹ – پہلے معنٰی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی خلل اندازیوں کے باوجود آخر کار نبی کی تمنّا کو (اور آخر نبی کی تمنا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی مساعی بار آور ہوں اور اس کا مشن فروغ پائے) پورا کرتا ہے اور اپنی آیات کو (یعنی ان وعدوں کو جو اس نے نبی سے کیے تھے) پختہ اور اٹل وعدے ثابت کر دیتا ہے۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات و اعتراضات کو اللہ رفع کر دیتا ہے، اور ایک آیت کے بارے میں جو اُلجھنیں وہ لوگوں کے ذہنوں میں ڈالتا ہے، انھیں بعد کی کسی واضح تر آیت سے صاف کر دیا جاتا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے اُن لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نِفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عِناد میں بہت دُور نکل گئے ہیں ـــــ اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جُھک جائیں، یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔[101]

۱۰۰ـــ یعنی وہ جانتا ہے کہ شیطان نے کہاں کیا خلل اندازی کی اور اس کے کیا اثرات ہوئے۔ اور اس کی حکمت ہر شیطانی فتنے کا توڑ کر دیتی ہے۔

۱۰۱ـــ یعنی شیطان کی ان فتنہ پردازیوں کو اللہ نے لوگوں کی آزمایش، اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ بگڑی ہوئی ذہنیت کے لوگ اِنھی چیزوں سے غلط نتیجے اخذ کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے گمراہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ صاف ذہن کے لوگوں کو یہی باتیں نبی اور کتاب اللہ کے برحق ہونے کا یقین دلاتی ہیں اور وہ محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ سب شیطان کی شرارتیں ہیں، اور یہ چیز انھیں مطمئن کر دیتی ہے کہ یہ دعوت یقیناً خیر اور راستی کی دعوت ہے، ورنہ شیطان اس پر اس قدر نہ تلملاتا۔

سلسلۂ کلام کو نظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اِن آیات کا مطلب صاف سمجھ میں آ جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس وقت جس مرحلے میں تھی، اس کو دیکھ کر تمام ظاہر بیں نگاہیں یہ دھوکا کھا رہی تھیں کہ آپؐ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے ہیں۔ دیکھنے والے جو کچھ دیکھ رہے تھے، وہ تو یہی تھا کہ ایک شخص، جس کی تمنا اور آرزو یہ تھی کہ اس کی قوم اس پر ایمان لائے، وہ تیرہ برس، معاذ اللہ، سر مارنے کے بعد آخرِ کار اپنے مٹھی بھر پیرووں کو لے کر وطن سے نکل جانے پر مجبُور ہو گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں جب لوگ آپؐ کے اس بیان کو دیکھتے تھے کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اس کی تائید میرے ساتھ ہے، اور قرآن کے ان اعلانات کو دیکھتے تھے کہ نبی کو جھٹلا دینے والی قوم پر عذاب آ جاتا ہے، تو انھیں آپؐ کی اور قرآن کی

صداقت مُشتبہ نظر آنے لگتی تھی، اور آپؐ کے مخالفین اس پر بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے کہ کہاں گئی وہ خدا کی تائید، اور کیا ہوئیں وہ عذاب کی وعیدیں، اب کیوں نہیں آجاتا وہ عذاب جس کے ہم کو ڈراوے دیے جاتے تھے۔ انھی باتوں کا جواب اس سے پہلے کی آیتوں میں دیا گیا تھا، اور انھی کے جواب میں یہ آیات بھی ارشاد ہوئی ہیں۔ پہلے کی آیتوں میں جواب کا رُخ کفار کی طرف تھا، اور ان آیتوں میں اُس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو کفار کے پروپیگنڈے سے متأثّر ہو رہے تھے۔ پورے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''کسی قوم کا اپنے پیغمبر کی تکذیب کرنا انسانی تاریخ میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ پھر اس تکذیب کا جو انجام ہوا، وہ تمھاری آنکھوں کے سامنے تباہ شدہ قوموں کے آثارِ قدیمہ کی صورت میں موجود ہے۔ سبق لینا چاہو تو اس سے لے سکتے ہو۔ رہی یہ بات کہ تکذیب کرتے ہی وہ عذاب کیوں نہ آ گیا جس کی وعیدیں قرآن کی بکثرت آیتوں میں کی گئی تھیں، تو آخر یہ کب کہا گیا تھا کہ ہر تکذیب فوراً ہی عذاب لے آتی ہے۔ اور نبی نے یہ کب کہا تھا کہ عذاب لانا اس کا اپنا کام ہے۔ اس کا فیصلہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جلد باز نہیں ہے۔ پہلے بھی وہ عذاب لانے سے پہلے قوموں کو مُہلت دیتا رہا ہے اور اب بھی دے رہا ہے۔ مُہلت کا یہ زمانہ اگر صدیوں تک بھی دراز ہو تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ سب وعیدیں خالی خُولی دھمکیاں ہی تھیں جو پیغمبر کے جھٹلانے والوں پر عذاب آنے کے متعلق کی گئی تھیں۔

پھر یہ بات بھی کوئی نئی نہیں ہے کہ پیغمبر کی آرزوؤں اور تمناؤں کے بر آنے میں رکاوٹیں واقع ہوں، یا اس کی دعوت کے خلاف جھوٹے الزامات اور طرح طرح کے شبہات و اعتراضات کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہو۔ یہ سب کچھ بھی تمام پچھلے پیغمبروں کی دعوتوں کے مقابلے میں ہو چکا ہے۔ مگر آخرکار اللہ تعالیٰ اِن شیطانی فتنوں کا اِستیصال کر دیتا ہے۔ رکاوٹوں کے باوجود دعوتِ حق فروغ پاتی ہے، اور محکم آیات کے ذریعے سے شبہات کے رخنے بھر دیے جاتے ہیں۔ شیطان اور اس کے چیلے ان تدبیروں سے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں، مگر اللہ انھی کو انسانوں کے درمیان کھوٹے اور کھرے کی تمیز کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اس ذریعے سے کھرے آدمی دعوتِ حق کی طرف کھنچ آتے ہیں، اور کھوٹے لوگ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں۔''

یہ ہے وہ صاف اور سیدھا مفہُوم جو سیاق وسباق کی روشنی میں اِن آیات سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایک روایت نے ان کی تفسیر میں اتنا بڑا گھپلا ڈال دیا کہ نہ صرف ان کے معنٰی کچھ سے کچھ ہو گئے، بلکہ سارے دین کی بنیاد ہی خطرے میں پڑ گئی۔ ہم اس کا ذکر یہاں اس لیے کرتے ہیں کہ قرآن کے طالبِ علم فہمِ قرآن میں روایات سے مدد لینے کے صحیح اور غلط طریقوں کا فرق اچھی طرح سمجھ سکیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ روایت پرستی میں ناروا غُلوّ کیا نتائج پیدا کرتا ہے، اور قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر تنقید کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قصّہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش! قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہو جائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دور ہو اور وہ کچھ قریب آ جائیں۔ یا کم از کم اُن کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انھیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپؐ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپؐ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپؐ نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ جب آپؐ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۔ پر پہنچے تو یکایک آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: **تلك الغرانقة العلی۝ وان شفاعتهن لترجی**۔ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس کے بعد آگے پھر آپؐ سورۂ نجم کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتام سورہ پر آپؐ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمدؐ سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انھوں نے کہا: یہ آپؐ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپؐ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۸ میں ہے کہ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ...... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۔ یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی، یہاں تک کہ سورۂ حج کی یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں آنحضرتؐ کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاؑ کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سُن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرینِ حَبَشہ تک اس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ صُلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کفر کی دشمنی جُوں کی تُوں قائم ہے۔

یہ قصّہ ابنِ جَرِیر اور بہت سے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں، ابنِ سعد نے طَبَقات میں، الواحدی نے اسبابُ النُّزول میں، موسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں، ابنِ اسحاق نے سیرت میں، اور ابنِ ابی حاتم، ابن المُنذِر، بزّار، ابنِ مَردُوْیہ اور طَبَرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہوا ہے، وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قُرَظی، عُروہ بن زبیر، ابوصالح، ابوالعالیہ، سعید بن جُبَیر، ضحّاک، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قَتَادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شِہاب زُہری، اور ابنِ عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابنِ عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصّے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں: ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے ان کا اِستقصا کرنے کی کوشش کی تو ۱۵ عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رُو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپؐ پر اِلقا کر دیے اور آپؐ سمجھے کہ یہ بھی جبریلؑ لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اُس خواہش کے زیرِ اثر سہواً آپؐ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپؐ کو اُونگھ آ گئی تھی اور اس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپؐ نے یہ قصداً کہے مگر استفہامِ انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپؐ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی تھا۔

ابن کثیر، بَیہقی، قاضی عیاض، ابنِ خُزَیمہ، قاضی ابوبکر ابنُ العَرَبی، امام رازی، قُرطُبی، بدرالدین عَینی، شوکانی، آلوسی وغیرہ

حضرات اس قصّے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ ”جتنی سندوں سے یہ روایت ہوا ہے، سب مُرسَل اور منقطع ہیں، مجھے کسی صحیح متصل سند سے یہ نہیں ملا“۔ بَیہقی کہتے ہیں کہ ”ازرُوئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں ہے۔“ ابنِ خُزَیمہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ ”یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے۔“ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ”اس کی کمزوری اسی سے ظاہر ہے کہ صِحاحِ سِتّہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح، متصل، بے عیب سند کے ساتھ ثِقہ راویوں سے منقول ہوا ہے۔“ امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کر کے اسے بڑے پر زور طریقے سے ردّ کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف حافظ اِبنِ حَجَر جیسے بلند پایہ محدث، اور ابوبکر جَصّاص جیسے نامور فقیہ اور زَمَخشَری جیسے عقلیّت پسند مفسّر، اور ابنِ جَریر جیسے امامِ تفسیر و تاریخ و فقہ اس کو صحیح مانتے ہیں، اور اسی کو آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابنِ حَجَر کا محدّثانہ استدلال یہ ہے کہ:

> ”سعید بن جُبَیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے، وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریقے سے متصلاً بسندِ صحیح بھی نقل ہوا ہے، جسے بَزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یوسف بن حماد عن اُمَیَّہ بن خالد عن شُعْبَہ عن ابی بِشْر عن سعید بن جُبَیر عَن ابنِ عباسؓ)۔ اور دو طریقوں سے یہ اگرچہ مُرسَل ہے مگر اس کے راوی صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طَبَری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریقِ یونُس بن یزید عن ابنِ شِہاب، دوسری بطریقِ مُعتَمِر بن سلیمان و حماد بن سَلَمہ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العَالیہ۔“

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعُموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے ردّ کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصّے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے ردّ کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مُشتَبَہ ہوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا اِستِدلال ان لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں، یا جو اَب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مُشتَبَہ قرار پاتا ہو، انھیں ردّ کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نام ور صحابی اور بکثرت تابعین و تبع تابعین، اور متعددِ معتبر راویانِ حدیث کی روایت سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے، تو اسے صرف اس بنا پر کیوں ردّ کر دیا جائے کہ اس سے آپ کا دین مُشتَبَہ ہوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے، جب کہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر ہی رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصّے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو، یا قوی ہوتی۔

پہلی چیز خود اُس کی اندرونی شہادت ہے جو اُسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ

اُس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ واقع ہو چکی تھی، اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرینِ حبشہ میں سے ایک گروہ مکہ واپس آ گیا۔اب ذرا تاریخوں کا فرق مُلاحظہ کیجیے:

—— ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ نبوی میں واقع ہوئی، اور مہاجرینِ حبشہ کا ایک گروہ مُصَالَحَت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکے واپس آ گیا۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ نبوی کا ہے۔

—— سورۂ بنی اسرائیل، جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی، معراج کے بعد اُتری ہے، اور معراج کا زمانہ معتبر ترین رِوایات کی رُو سے ۱۱ یا ۱۲ نبوی کا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

—— اور زیرِ بحث آیت، جیسا کہ اس کا سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے، ۱ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو اِلقائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان ۹ سال بعد؟

پھر اس قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۂ نجم میں ہوئی تھی اور اس طرح ہوئی کہ ابتدا سے آپؐ اصل سورت کے الفاظ پڑھتے چلے آ رہے تھے، یکایک وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی پر پہنچ کر آپؐ نے بطورِ خود یا شیطانی اغوا سے یہ فقرہ ملایا، اور آگے پھر سورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفارِ مکہ اسے سُن کر خوش ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا۔مگر سورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں اس الحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:

> ’’پھر تم نے کچھ غور بھی کیا اِن لات اور عُزّیٰ پر اور تیسری ایک اور (دیوی) مناۃ پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔کیا تمھارے لیے تو ہوں بیٹے اور اس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آ گئی ہے۔‘‘

دیکھیے، اس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ واقعی تمھاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شَفاعت ضرور متوقع ہے۔دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر اُن پر چوٹ کی جاتی ہے کہ بے وقوفو! یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمھیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصے میں آئیں بیٹیاں! یہ سب تمھاری من گھڑت ہے، جسے خدا کی طرف سے کوئی سندِ اعتبار حاصل نہیں ہے۔تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مردِ عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پا کر یہ الفاظ زبان سے

نکلوا دیے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اُسے سُن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا کہ بعد کے فقروں میں ان تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سُن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سننے کے بعد یہ پکار اُٹھے ہوں گے کہ چلو آج ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا؟

یہ تو ہے اس قصّے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لَغو اور مُہمَل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نُزول بیان کی جا رہی ہے، آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصّے میں بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو ۵ نبوی میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعے کی توجیہ سورۂ حج کی زیرِ بحث آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہو گی: یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جب کہ آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یوں ہی ڈالے رکھا گیا، اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اس میں لا کر چپکا دیا گیا۔ پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی برس تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نُزول تک اسے کہیں نہ چسپاں کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعے کے ۶ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی، تو علاوہ اُس بے تُکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے۔

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جا رہی ہو، اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق و سباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رُکوع پڑھ کر دیکھیے، اور اس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعے پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے (قطع نظر اس سے کہ آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں، اور آیت کے الفاظ کفار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق)۔ اسی طرح سورۂ حج آپ کے سامنے موجود ہے۔ آیتِ زیرِ بحث سے پہلے کا مضمون بھی پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سیاق و سباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آ گیا کہ ''اے نبی! ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہو گئی تھی، اُس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیاءؑ سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیاءؑ اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کر کے اپنی آیات کو پھر پختہ کر دیتا ہے۔''

ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا

ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق وسباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک مُشکّک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصّہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا، جب کہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں، بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپؐ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش! اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرما بیٹھیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپؐ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مُشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریلؑ کے ساتھ شیطان بھی آپؐ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے اور آپؐ اسی غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریلؑ ہی لائے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ! اُس روایت پرستی سے جو محض سند کا اِتّصال یا راویوں کی وِثاقت یا طُرُقِ روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصّے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اس قصّے کی کوئی اصلیت نہیں ہے تو نبیؐ اور قرآن پر اتنا بڑا بہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعے سے، جن میں بعض بڑے نامور ثِقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث ہی کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور مُسنَدِ احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُرتاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک ملہمانہ شان کے ساتھ ادا ہونا، اس کو سُن کر اگر پورے مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو اور آپؐ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تأثّر پر کچھ پشیمان سے ہوئے ہوں گے، اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کی ہو گی کہ صاحب، ہمارے کانوں نے تو محمدؐ کی زبان سے اپنے معبُودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے، اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔ دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حبشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہو گئی ہے، کیونکہ دیکھنے والے نے آپؐ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرین میں سے تقریباً ۳۳ آدمی مکے میں واپس آ گئے۔ ایک صدی کے اندر یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اس سجدے کی یہ توجیہ، اور مہاجرینِ حبشہ کی واپسی، مل جُل کر ایک قصّے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثِقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہو گئے۔ انسان آخر انسان ہے۔ بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ

ع ۷ ۱۴

اِنکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ یا تو اُن پر قیامت کی گھڑی اچانک آجائے، یا ایک منحوس[102] دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ اُس روز بادشاہی اللہ کی ہوگی، اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ جو ایمان رکھنے والے اور عملِ صالح کرنے والے ہوں گے، وہ نعمت بھری جنّتوں میں جائیں گے، اور جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیات کو جُھٹلایا ہوگا، اُن کے لیے رُسوا کن عذاب ہوگا۔ع اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر قتل کر دیے گئے یا مر گئے، اللہ ان کو اچھا رزق

لغزش ہو جاتی ہے، اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ عقیدت میں بے جا غُلوّ رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں۔ اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انھیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو ان کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذرِ آتش کر دینے کے لائق ہے۔

**۱۰۲** - اصل میں لفظ عَقِیْم استعمال ہُوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ''بانجھ'' ہے۔ دن کو بانجھ کہنے کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ ایسا منحوس دن ہو جس میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، ہر کوشش اُلٹی پڑے، اور ہر اُمید مایوسی میں تبدیل ہو جائے۔ دوسرے، یہ کہ وہ ایسا دن ہو جس کے بعد رات دیکھنی نصیب نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں مراد ہے وہ دن جس میں کسی قوم کی بربادی کا فیصلہ ہو جائے۔ مثلاً جس روز قومِ نوح پر طوفان آیا، وہ اس کے لیے ''بانجھ'' دن تھا۔ اسی طرح عاد، ثمود، قومِ لوط، اہلِ مَدیَن، اور دوسری سب تباہ شدہ قوموں کے حق میں عذابِ الٰہی کے نزول کا دن بانجھ ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اُس ''اِمروز'' کا کوئی ''فردا'' پھر وہ نہ دیکھ سکے، اور کوئی چارہ گری اُن کے لیے ممکن نہ ہوئی جس سے وہ اپنی قسمت کی بگڑی بنا سکتے۔

رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۶۱ ذٰلِكَ بِاَنَّ

دے گا۔ اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انھیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔ بے شک اللہ علیم اور حلیم ہے[103]۔ یہ تو ہے اُن کا حال، اور جو کوئی بدلہ لے، ویسا ہی جیسا اُس کے ساتھ کیا گیا، اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو، تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا[104]۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے[105]۔

یہ اس[106] لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے[107] اور وہ سمیع و بصیر ہے[108]۔ یہ اس لیے

**۱۰۳** — "علیم" ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ کس نے فی الحقیقت اُسی کی راہ میں گھر بار چھوڑا ہے اور وہ کس انعام کا مستحق ہے۔ "حلیم" ہے، یعنی ایسے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ان کی بڑی بڑی خدمات اور قربانیوں پر پانی پھیر دینے والا نہیں ہے۔ وہ ان سے درگزر فرمائے گا اور ان کے قصور معاف کر دے گا۔

**۱۰۴** — پہلے ان مظلوموں کا ذکر تھا جو ظلم کے مقابلے میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکے ہوں، اور یہاں اُن کا ذکر ہے جو ظالموں کے مقابلے میں قوت استعمال کریں۔

امام شافعیؒ نے اس آیت سے یہ اِستدلال کیا ہے کہ قِصاص اُسی شکل میں لیا جائے گا جس شکل میں ظلم کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی شخص نے اگر آدمی کو ڈبو کر مارا ہے تو اسے بھی ڈبو کر مارا جائے گا، اور کسی نے جلا کر مارا ہے تو اسے بھی جلا کر مارا جائے گا۔ لیکن حَنفیہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ قاتل نے قتل خواہ کسی طریقے سے کیا ہو، اس سے قِصاص ایک ہی معروف طریقے سے لیا جائے گا۔

**۱۰۵** — اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں: ایک، یہ کہ ظلم کے مقابلے میں جو کُشت و خون کیا جائے وہ اللہ کے ہاں معاف ہے، اگرچہ کُشت و خون بجائے خود اچھی چیز نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ جس کے تم بندے ہو، عَفو و درگزر کرنے والا ہے، اس لیے تم کو بھی، جہاں تک بھی تمھارے بس میں ہو، عَفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ اہلِ ایمان کے

اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۶۳﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ

کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں[109]، اور اللہ ہی بالا دست اور بزرگ ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے[110]؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے[111]۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

اَخلاق کا زیور یہی ہے کہ وہ حلیم، عالی ظرف اور متحمل ہوں۔ بدلہ لینے کا حق انھیں ضرور حاصل ہے، مگر بالکل منتقمانہ ذہنیت اپنے اُوپر طاری کر لینا ان کے لیے موزوں نہیں ہے۔

۱۰۶ – اس پیراگراف کا تعلق اُوپر کے پورے پیراگراف سے ہے، نہ کہ صرف قریب کے آخری فقرے سے۔ یعنی کفر و ظلم کی رَوِش اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کرنا، مومن و صالح بندوں کو انعام دینا، مظلوم اہلِ حق کی داد رسی کرنا، اور طاقت سے ظلم کا مقابلہ کرنے والے اہلِ حق کی نصرت فرمانا، یہ سب کس وجہ سے ہے؟ اس لیے کہ اللہ کی صفات یہ اور یہ ہیں۔

۱۰۷ – یعنی تمام نظامِ کائنات پر وہی حاکم ہے اور گردشِ لیل و نہار اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس ظاہری معنیٰ کے ساتھ اِس فقرے میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو خدا رات کی تاریکی میں سے دن کی روشنی نکال لاتا ہے اور چمکتے ہوئے دن پر رات کی ظلمت طاری کر دیتا ہے، وہی خدا اس پر بھی قادر ہے کہ آج جن کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر ہے، اُن کے زوال و غروب کا منظر بھی دنیا کو جلدی ہی دکھا دے، اور کفر و جہالت کی جو تاریکی اِس وقت حق و صداقت کی فجر کا راستہ روک رہی ہے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے حکم سے چھٹ جائے اور وہ دن نکل آئے جس میں راستی اور علم و معرفت کے نور سے دُنیا روشن ہو جائے۔

۱۰۸ – یعنی وہ دیکھنے اور سننے والا خدا ہے، اندھا بہرا نہیں ہے۔

۱۰۹ – یعنی حقیقی اختیارات کا مالک اور واقعی رب وہی ہے، اس لیے اس کی بندگی کرنے والے خائب و خاسر نہیں رہ سکتے۔ اور دوسرے تمام معبود سراسر بے حقیقت ہیں، ان کو جن صفات اور اختیارات کا مالک سمجھ لیا گیا ہے، اُن کی سرے سے کوئی اصلیت نہیں ہے، اس لیے خدا سے منہ موڑ کر اُن کے اعتماد پر جینے والے کبھی فلاح و کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔

۱۱۰ – یہاں پھر ظاہر مفہُوم کے پیچھے ایک لطیف اشارہ چھپا ہُوا ہے۔ ظاہر مفہوم تو محض اللہ کی قدرت کا بیان ہے۔ مگر لطیف اشارہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کی برسائی ہوئی بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی تم دیکھتے ہو کہ سوکھی پڑی

مَا فِي الْأَرْضِ ۭ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦٤﴾ ع أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۭ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٥﴾ وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۭ إِنَّ الْإِنسَانَ

ع ٨ ١٥

---

جو کچھ زمین میں ہے۔ بے شک وہی غنی وحمید ہے[112] ع کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے، اور اُسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے، اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اِذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا؟[113] واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے۔ وہی ہے جس نے تمھیں زندگی بخشی ہے، وہی تم کو موت دیتا ہے اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی

---

ہوئی زمین یکایک لہلہا اُٹھتی ہے، اسی طرح یہ وحی کا بارانِ رحمت جو آج ہو رہا ہے، عنقریب تم کو یہ منظر دکھانے والا ہے کہ یہی عرب کا بنجر ریگستان علم اور اَخلاق اور تہذیبِ صالح کا وہ گلزار بن جائے گا جو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

۱۱۱ – ''لطیف'' ہے، یعنی غیر محسوس طریقوں سے اپنے ارادے پورے کرنے والا ہے۔ اس کی تدبیریں ایسی ہوتی ہیں کہ لوگ اُن کے آغاز میں کبھی اُن کے انجام کا تصوّر تک نہیں کر سکتے۔ لاکھوں بچے دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں، کون جان سکتا ہے کہ ان میں سے کون ابراہیمؑ ہے جو تین چوتھائی دُنیا کا روحانی پیشوا ہو گا، اور کون چنگیز ہے جو ایشیا اور یورپ کو تہ و بالا کر ڈالے گا۔ خُردبین جب ایجاد ہوئی تھی، اس وقت کون تصوّر کر سکتا تھا کہ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک نوبت پہنچائے گی۔ کولمبس جب سفر کو نکل رہا تھا تو کسے معلوم تھا کہ یہ ریاست ہائے مُتّحِدہ امریکا کی بِنا ڈالی جا رہی ہے۔ غرض خدا کے منصوبے ایسے ایسے دقیق اور ناقابلِ اِدراک طریقوں سے پورے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ جائیں، کسی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ کس چیز کے لیے کام ہو رہا ہے۔

''خبیر'' ہے، یعنی وہ اپنی دُنیا کے حالات، مصالح اور ضروریات سے باخبر ہے، اور جانتا ہے کہ اپنی خدائی کا کام کس طرح کرے۔

۱۱۲ – وہی ''غنی'' ہے، یعنی صرف اسی کی ذات ایسی ہے جو کسی کی محتاج نہیں۔ اور وہی ''حمید'' ہے، یعنی تعریف اور حمد اسی کے لیے ہے اور وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، خواہ کوئی حمد کرے یا نہ کرے۔

لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي

منکرِ حق[114] ہے۔

ہر اُمّت[115] کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت[116] مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے، پس اے محمدؐ! وہ اِس معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں[117]۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو[118]۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ "جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے، اللہ قیامت کے روز تمھارے درمیان اُن سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔" کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان وزمین

۱۱۳– آسمان سے مراد یہاں پورا عالَم بالا ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ تھمی ہوئی ہے۔

۱۱۴– یعنی یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اُس حقیقت کا انکار کیے جاتا ہے جسے انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔

۱۱۵– یعنی ہر نبی کی اُمّت۔

۱۱۶– یہاں "مَنسَک" کا لفظ قربانی کے معنیٰ میں نہیں بلکہ پورے نظامِ عبادت کے معنیٰ میں ہے۔ اِس سے پہلے اسی لفظ کا ترجمہ "قربانی کا قاعدہ" کیا گیا تھا، کیونکہ وہاں بعد کا فقرہ "تا کہ لوگ اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں" اس کے وسیع معانی میں سے صرف قربانی مراد ہونے کی تصریح کر رہا تھا۔ لیکن یہاں اسے محض "قربانی" کے معنیٰ میں لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ عبادت کو بھی اگر "پرستش" کے بجائے "بندگی" کے وسیع تر مفہوم میں لیا جائے تو مدعا سے قریب تر ہوگا۔ اس طرح مَنسَک (طریق بندگی) کے وہی معنیٰ ہو جائیں گے جو شریعت اور منہاج کے معنیٰ ہیں، اور یہ اسی مضمون کا اعادہ ہوگا جو سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔" (آیت ۴۸)

۱۱۷– یعنی جس طرح پہلے انبیا اپنے اپنے دَور کی اُمتوں کے لیے ایک "مَنسَک" لائے تھے، اسی طرح اس دَور کی اُمّت کے لیے تم ایک "مَنسَک" لائے ہو۔ اب کسی کو تم سے نزاع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس دَور کے لیے یہی مَنسَکِ حق ہے۔ سورۂ جاثیہ میں اِس مضمون کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ

السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴿۷۰﴾ وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَیْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۷۱﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ یَكَادُوْنَ

---

کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے[119]۔
یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کر رہے ہیں جن کے لیے نہ تو اس نے کوئی سند نازل کی ہے اور نہ یہ خود اُن کے بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں[120]۔ اِن ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے[121]۔ اور جب ان کو ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ منکرینِ حق کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے

---

اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (آیت ۱۸) ''پھر (انبیائے بنی اسرائیل کے بعد) اَے محمدؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک شریعت (طریقے) پر قائم کیا، پس تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔'' (مفصّل تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۲۰)

**۱۱۸** – یہ فقرہ اس مطلب کو پوری طرح واضح کر رہا ہے جو پچھلے فقرے کی تفسیر میں ابھی ہم بیان کر آئے ہیں۔

**۱۱۹** – سلسلۂ کلام سے اس پیراگراف کا تعلق سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۵۵ تا ۵۷ نگاہ میں رہنی چاہییں۔

**۱۲۰** – یعنی نہ تو خدا کی کسی کتاب میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے فلاں فلاں کو اپنے ساتھ خدائی میں شریک کیا ہے، لہٰذا ہمارے ساتھ تم ان کی بھی عبادت کیا کرو، اور نہ ان کو کسی علمی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ واقعی اُلوہیّت میں حصّہ دار ہیں اور اس بنا پر ان کو عبادت کا حق پہنچتا ہے۔ اب یہ جو طرح طرح کے معبُود گھڑے گئے ہیں، اور ان کی صفات اور اختیارات کے متعلق قسم قسم کے عقائد تصنیف کر لیے گئے ہیں، اور ان کے آستانوں پر جَبْہَہ سائیاں ہو رہی ہیں، دُعائیں مانگی جا رہی ہیں، چڑھاوے چڑھ رہے ہیں، نیازیں دی جا رہی ہیں، طواف کیے جا رہے ہیں اور اعتکاف ہو رہے ہیں، یہ سب جاہلانہ گمان کی پیروی کے سوا آخر اور کیا ہے۔

**۱۲۱** – یعنی یہ احمق لوگ سمجھ رہے ہیں کہ یہ معبُود دُنیا اور آخرت میں ان کے مددگار ہیں، حالانکہ حقیقت میں ان کا کوئی بھی مددگار نہیں ہے۔ نہ یہ معبُود، کیونکہ ان کے پاس مدد کی کوئی طاقت نہیں، اور نہ اللہ، کیونکہ اس سے یہ بغاوت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اپنی اس حماقت سے یہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کر رہے ہیں۔

يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

کہ ابھی وہ اُن لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے جو انھیں ہماری آیات سُناتے ہیں۔ ان سے کہو: ”میں بتاؤں تمھیں کہ اس سے بدتر چیز کیا ہے؟[۱۲۲] آگ، اللہ نے اُسی کا وعدہ اُن لوگوں کے حق میں کر رکھا ہے جو قبولِ حق سے انکار کریں، اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔“ ع

لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبُودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اُسے چُھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔[۱۲۳] اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی، جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔

۱۲۲- یعنی کلامِ الٰہی کی آیات سن کر جو غصّے کی جلن تم کو لاحق ہوتی ہے، اس سے شدید تر چیز، یا یہ کہ ان آیات کو سنانے والوں کے ساتھ جو زیادہ سے زیادہ برائی تم کر سکتے ہو، اس سے زیادہ بدتر چیز، جس سے تمھیں سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۱۲۳- یعنی مدد چاہنے والا تو اس لیے کسی بالاتر طاقت کی طرف استمداد کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ مگر اس غرض کے لیے یہ جن کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، ان کی کمزوری کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مکھی سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اب غور کرو کہ اُن لوگوں کی کمزوری کا کیا حال ہوگا جو خود بھی کمزور ہوں اور ان کی امیدوں کے سہارے بھی کمزور۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۚ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۷۷﴾ السجدة وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ

السجدة عند الشافعی

حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔[۱۲۴] وہ سمیع اور بصیر ہے، جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے،[۱۲۵] اور سارے معاملات اسی کی طرف رُجوع ہوتے ہیں۔[۱۲۶] اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، رُکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب[۱۲۷] ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔[۱۲۸] اس نے

۱۲۴- مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبود بنایا ہے، ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیا۔ اور ان کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں، جن کو اس نے اس خدمت کے لیے چُن لیا ہے۔ محض یہ فضیلت ان کو خدا، یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔

۱۲۵- یہ فقرہ قرآنِ مجید میں بالعُموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیا و صلحا کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھ کر نہ سہی، اللہ کے ہاں سِفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کے کھلے اور چُھپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے، ملائکہ اور انبیا سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔

۱۲۶- یعنی تدبیرِ امر بالکل اس کے اختیار میں ہے۔ کائنات کے کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مَرجَع کوئی دوسرا نہیں ہے کہ اس کے پاس تم اپنی درخواستیں لے جاؤ۔ ہر معاملہ اسی کے آگے فیصلے کے لیے پیش ہوتا ہے۔ لہٰذا دستِ طلب بڑھانا ہے تو اس کی طرف بڑھاؤ۔ ان بے اختیار ہستیوں سے کیا مانگتے ہو جو خود اپنی بھی کوئی حاجت آپ پوری کر لینے پر قادر نہیں ہیں۔

**۱۲۷**- یعنی فلاح کی توقع اگر کی جا سکتی ہے تو یہی رَوِش اختیار کرنے سے کی جا سکتی ہے۔لیکن جو شخص بھی یہ رَوِش اختیار کرے، اُسے اپنے عمل پر گھمنڈ نہ ہونا چاہیے کہ میں جب ایسا عبادت گزار اور نیکوکار ہوں تو ضرور فلاح پاؤں گا، بلکہ اسے اللہ کے فضل کا امیدوار رہنا چاہیے اور اسی کی رحمت سے توقعات وابستہ کرنی چاہییں۔ وہ فلاح دے تب ہی کوئی شخص فلاح پا سکتا ہے۔خود فلاح حاصل کر لینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

''شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو'' یہ فقرہ ارشاد فرمانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح فلاح نصیب ہونا مشکوک ہے۔ بلکہ دراصل یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ بادشاہ اگر اپنے کسی ملازم سے یہ کہے کہ فلاں کام کرو، شاید کہ تمھیں فُلاں منصب مل جائے، تو ملازم کے گھر شادیانے بج جاتے ہیں، کیونکہ یہ اشارتاً ایک وعدہ ہے، اور ایک مہربان آقا سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ کسی خدمت پر ایک صلے کی اُمید وہ خود دلائے اور پھر اپنے وفادار خادم کو مایوس کرے۔

امام شافعی، امام احمد، عبداللہ بن مبارک اور اسحاق بن رَاہَوَیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سورۂ حج کی یہ آیت بھی آیتِ سجدہ ہے۔مگر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، حسن بصریؒ، سعید بن المُسَیَّب، سعید بن جُبیرؒ، ابراہیم نَخَعیؒ اور سفیان ثَوریؒ اس جگہ سجدۂ تلاوت کے قائل نہیں ہیں۔ دونوں طرف کے دلائل ہم مختصراً یہاں نقل کر دیتے ہیں:

پہلے گروہ کا اوّلین اِستِدلال ظاہرِ آیت سے ہے کہ اس میں سجدے کا حکم ہے۔ دوسری دلیل عُقبہؓ بن عامر کی وہ رِوایَت ہے جسے احمد، ابوداؤد، ترمِذی، ابنِ مَردُوْیَہ اور بَیْہقی نے نقل کیا ہے کہ قلت یا رسول اللّٰہ افضلت سورۃ الحج علٰی سائر القراٰن بسجدتین؟ قال نعم فمن لم یسجدھما فلا یقرأھما، ''میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا سورۂ حج کو سارے قرآن پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، پس جو اُن پر سجدہ نہ کرے وہ انھیں نہ پڑھے۔'' تیسری دلیل ابوداؤد اور ابنِ ماجہ کی وہ روایت ہے جس میں عَمرؓو بن عاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورۂ حج میں دو سجدے سکھائے تھے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرات عمرؓ، علیؓ، عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، ابنِ عباسؓ، ابوالدَّرداءؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ اور عمّار بن یاسرؓ سے یہ بات منقول ہے کہ سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔

دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ آیت میں محض سجدے کا حکم نہیں ہے بلکہ رکوع اور سجدے کا ایک ساتھ ہے، اور قرآن میں رُکوع و سجود ملا کر جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے۔ نیز رکوع و سجود کا اجتماع نماز ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ عُقبہؓ بن عامر کی روایت کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اس کو ابنِ لہیعہ، ابوالمُصعَب بصری سے روایت کرتا ہے اور یہ دونوں ضعیف راوی ہیں۔ خاص کر ابوالمُصعَب تو وہ شخص ہے جو حجاج بن یوسف کے ساتھ کعبے پر منجنیق سے پتھر برسانے والوں میں شامل تھا۔ عَمرؓو بن عاص والی روایت کو بھی وہ پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کو سعید العتقی، عبداللہ بن مُنَین الکِلَابی سے روایت کرتا ہے، اور دونوں مجہول ہیں، کچھ پتا نہیں کہ کون تھے اور کس پایے کے آدمی تھے۔ اقوالِ صحابہؓ کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ابنِ عباسؓ نے سورۂ حج میں دو سجدے ہونے کا یہ مطلب صاف بتایا ہے کہ الاولٰی عزمۃ والاخرۃ تعلیم، یعنی پہلا سجدہ لازمی ہے، اور دوسرا سجدہ تعلیمی۔

**۱۲۸**- جہاد سے مراد محض ''قِتال'' (جنگ) نہیں ہے، بلکہ یہ لفظ جِدّ و جُہد اور کش مکش اور انتہائی سعی و کوشش

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۚ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ۩﴿۷۷﴾ وَ جَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ

السجدة عند الشافعیؒ

حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔[۱۲۴] وہ سمیع اور بصیر ہے، جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے،[۱۲۵] اور سارے معاملات اسی کی طرف رُجوع ہوتے ہیں۔[۱۲۶]

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، رُکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔[۱۲۷] اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔[۱۲۸] اس نے

---

**۱۲۴** — مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبُود بنایا ہے، ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیا۔ اوران کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں، جن کو اس نے اس خدمت کے لیے چُن لیا ہے۔ محض یہ فضیلت ان کو خدا، یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔

**۱۲۵** — یہ فقرہ قرآنِ مجید میں بالعُموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مَقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیا و صلحا کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھ کر نہ سہی، اللہ کے ہاں سِفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر اور مخفی حالات وہی جانتا ہے، دنیا کے کھلے اور چھُپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے، ملائکہ اور انبیا سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔

**۱۲۶** — یعنی تدبیرِ امر بالکل اس کے اختیار میں ہے۔ کائنات کے کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مَرجَع کوئی دوسرا نہیں ہے کہ اس کے پاس تم اپنی درخواستیں لے جاؤ۔ ہر معاملہ اسی کے آگے فیصلے کے لیے پیش ہوتا ہے۔ لہٰذا دستِ طلب بڑھانا ہے تو اس کی طرف بڑھاؤ۔ ان بے اختیار ہستیوں سے کیا مانگتے ہو جو خود اپنی بھی کوئی حاجت آپ پوری کر لینے پر قادر نہیں ہیں۔

اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوۡلٰٮكُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ ﴿۷۸﴾ ع ۱۰

کی مِلّت پر[۱۳۱]۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام ”مسلم“ رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے[۱۳۲])۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر[۱۳۳]۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ[۱۳۴]۔ وہ ہے تمھارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ، اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔ ع

ان کو جانی پہچانی نیکیوں کا حکم دیتا ہے، اور ان بُرائیوں سے روکتا ہے جن سے فطرتِ انسانی انکار کرتی ہے، اور وہ چیزیں حلال کرتا ہے جو پاکیزہ ہیں، اور وہ چیزیں حرام کرتا ہے جو گندی ہیں، اور ان پر سے وہ بھاری بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے، اور وہ زنجیریں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔“ (اعراف، آیت ۱۵۷)

**۱۳۱** – اگرچہ اسلام کو مِلّتِ نوحؑ، مِلّتِ موسیٰؑ، مِلّتِ عیسیٰؑ بھی اسی طرح کہا جا سکتا ہے جس طرح مِلّتِ ابراہیمؑ، لیکن قرآنِ مجید میں اس کو بار بار مِلّتِ ابراہیمؑ کہہ کر اس کے اتباع کی دعوت تین وجوہ سے دی گئی ہے: ایک یہ کہ قرآن کے اوّلین مخاطَب اہلِ عرب تھے اور وہ حضرت ابراہیمؑ سے جس طرح مانوس تھے، کسی اور سے نہ تھے۔ ان کی تاریخ، روایات اور معتقدات میں جس شخصیت کا رُسوخ واثر رچا ہوا تھا، وہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی شخصیت تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہی وہ شخص تھے جن کی بزرگی پر یہودی، عیسائی، مسلمان، مشرکینِ عرب، اور شرقِ اَوسَط کے صابی، سب مُتَّفِق تھے۔ انبیاؑ میں کوئی دوسرا ایسا نہ تھا اور نہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب مِلّتوں کی پیدایش سے پہلے گزرے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور صابئیّت کے متعلق تو معلوم ہی ہے کہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ رہے مشرکینِ عرب، تو وہ بھی یہ مانتے تھے کہ ان کے ہاں بت پرستی کا رواج عَمْرو بن لُحَیّ سے شروع ہوا جو بنی خُزاعہ کا سردار تھا اور مآب (مُوآب) کے علاقے سے ہُبَل نامی بت لے آیا تھا۔ اُس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو سال قبلِ مسیح کا ہے۔ لہٰذا یہ مِلّت بھی حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد پیدا ہوئی۔ اس صورتِ حال میں قرآن جب کہتا ہے کہ ان مِلّتوں کے بجائے مِلّتِ ابراہیمؑ کو اختیار کرو، تو وہ دراصل اس حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ برحق اور برسرِ ہدایت تھے، اور ان مِلتوں میں سے کسی کے پیرو نہ تھے، تو لامحالہ پھر وہی مِلّت اصل مِلّتِ حق ہے، نہ کہ یہ بعد کی مِلّتیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اُسی مِلّت کی طرف ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۳۴-۱۳۵۔ آلِ عمران، حواشی ۵۸-۷۹۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۲۰)

**۱۳۲** – ”تمھارا“ کا خطاب مخصوص طور پر صرف اُنھی اہلِ ایمان کی طرف نہیں ہے جو اِس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، یا اس کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں داخل ہوئے، بلکہ اس کے مخاطَب تمام وہ لوگ ہیں جو آغاز

تاریخِ انسانی سے توحید، آخرت، رسالت اور کُتُبِ الٰہی کے ماننے والے رہے ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ اس ملّتِ حق کے ماننے والے پہلے بھی "نوحی"، "ابراہیمی"، "موسوی"، "مسیحی" وغیرہ نہیں کہلاتے تھے، بلکہ ان کا نام "مسلم" (اللہ کے تابعِ فرمان) تھا، اور آج بھی وہ "محمدی" نہیں بلکہ "مسلم" ہیں۔ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ سوال مُعمّا بن گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا نام قرآن سے پہلے کس کتاب میں مسلم رکھا گیا تھا۔

**۱۳۳** — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴۔ اس سے زیادہ شرح وبَسْط کے ساتھ اس مضمون پر ہم نے اپنے رسالہ "شہادتِ حق" میں روشنی ڈالی ہے۔

**۱۳۴** — یا دوسرے الفاظ میں اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ ہدایت اور قانونِ زندگی بھی اسی سے لو، اطاعت بھی اسی کی کرو، خوف بھی اسی کا رکھو، اُمیدیں بھی اسی سے وابستہ کرو، مدد کے لیے بھی اسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ، اور اپنے توکّل واعتماد کا سہارا بھی اسی کی ذات کو بناؤ۔

---

# تفہیم القرآن

# المومنون

(۲۳)

# المومنون

**نام** پہلی ہی آیت قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ سے ماخوذ ہے۔

**زمانۂ نُزُول** اندازِ بیان اور مضامین، دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نُزول مکے کا دَورِ متوسّط ہے۔ پسِ منظر میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان سخت کش مکش برپا ہے، لیکن ابھی کفار کے ظلم وستم نے پورا زور نہیں پکڑا ہے۔ آیت ۷۵-۷۶ سے صاف طور پر یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ مکے کے اُس قحط کی شدّت کے زمانے میں نازل ہوئی ہے جو معتبر رِوایات کی رو سے اسی دورِ متوسّط میں برپا ہوا تھا۔ عُروہؒ بن زبیرؓ کی ایک رِوایَت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عمرؓ ایمان لا چکے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ سورت ان کے سامنے نازل ہوئی ہے۔ وہ خود نزولِ وحی کی کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے، اور جب حضورؐ اس سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ اگر کوئی اُن کے معیار پر پورا اُتر جائے تو یقیناً جنت میں جائے گا، پھر آپؐ نے اس سورہ کی ابتدائی آیات سنائیں۔ (احمد، ترمِذی، نَسائی، حاکم)

**موضوع اور مباحث** اتباعِ رسولؐ کی دعوت اِس سورت کا مرکزی مضمون ہے اور پوری تقریر اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔

آغازِ کلام اس طرح ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اِس پیغمبر کی بات مان لی ہے، اُن کے اندر یہ اور یہ اوصاف پیدا ہو رہے ہیں، اور یقیناً ایسے ہی لوگ دُنیا و آخرت کی فلاح کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد انسان کی پیدایش، آسمان و زمین کی پیدایش، نباتات وحیوانات کی پیدایش، اور دوسرے آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جس سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ توحید اور مَعاد کی جن حقیقتوں کو ماننے کے لیے یہ پیغمبر تم سے کہتا ہے، ان کے برحق ہونے پر تمھارا اپنا وجود اور یہ پورا نظامِ عالم گواہ ہے۔

پھر انبیا علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے قصّے شروع کیے گئے ہیں، جو بظاہر تو قصّے ہی نظر آتے ہیں، لیکن دراصل اس پیرایے میں چند باتیں سامعین کو سمجھائی گئی ہیں:

اوّل، یہ کہ آج تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو شبہات واعتراضات وارد کر رہے ہو، وہ کچھ نئے نہیں ہیں۔ پہلے بھی جو انبیاؑ دُنیا میں آئے تھے، جن کو تم خود فرستادۂ الٰہی مانتے ہو، ان سب پر ان کے زمانے کے جاہلوں نے یہی اعتراضات کیے تھے۔ اب دیکھ لو کہ تاریخ کا سبق کیا بتا رہا ہے۔ اعتراضات کرنے والے برحق تھے یا انبیاؑ۔

دوم، یہ کہ توحید و آخرت کے متعلق جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، یہی تعلیم ہر زمانے کے انبیاؑ نے

دی ہے۔ اُس سے مختلف کوئی نرالی چیز آج نہیں پیش کی جا رہی ہے جو کبھی دُنیا نے نہ سنی ہو۔

سوم، یہ کہ جن قوموں نے انبیاؑ کی بات سُن کر نہ دی اور ان کی مخالفت پر اصرار کیا وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہیں۔

چہارم، یہ کہ خدا کی طرف سے ہر زمانے میں ایک ہی دین آتا رہا ہے اور تمام انبیاؑ ایک ہی اُمّت کے لوگ تھے۔ اُس دینِ واحد کے سوا، جو مختلف مذاہب تم لوگ دنیا میں دیکھ رہے ہو، یہ سب لوگوں کے طبع زاد ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مِن جانبِ اللہ نہیں ہے۔

ان قصوں کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیوی خوش حالی، مال و دولت، آل و اولاد، حَشَم و خَدَم، قوت و اقتدار وہ چیزیں نہیں ہیں جو کسی شخص یا گروہ کے راہِ راست پر ہونے کی یقینی علامت ہوں اور اس بات کی دلیل قرار دی جائیں کہ خدا اس پر مہربان ہے اور اس کا رَوِیّہ خدا کو محبُوب ہے۔ اسی طرح کسی کا غریب اور خستہ حال ہونا بھی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا اس سے اور اس کے رَوِیّے سے ناراض ہے۔ اصل چیز جس پر خدا کے ہاں محبُوب یا مغضوب ہونے کا مدار ہے، وہ آدمی کا ایمان اور اس کی خدا ترسی و راست بازی ہے۔ یہ باتیں اس لیے ارشاد ہوئی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں اُس وقت جو مزاحمت ہو رہی تھی، اس کے عَلَم بردار سب کے سب مکے کے شُیوخ اور بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ اپنی جگہ خود بھی یہ گھمنڈ رکھتے تھے، اور ان کے زیرِ اثر لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نعمتوں کی بارش جن لوگوں پر ہو رہی ہے اور جو بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں، اُن پر ضرور خدا اور دیوتاؤں کا کرم ہے۔ رہے یہ ٹوٹے مارے لوگ جو محمدؐ کے ساتھ ہیں، اِن کی تو حالت خود ہی یہ بتا رہی ہے کہ خدا اِن کے ساتھ نہیں ہے، اور دیوتاؤں کی تو مار ہی ان پر پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اہلِ مکہ کو مختلف پہلوؤں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ قحط جو تم پر نازل ہوا ہے، یہ ایک تنبیہ ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو دیکھ کر سنبھلو اور راہِ راست پر آ جاؤ۔ ورنہ اس کے بعد سخت تر سزا آئے گی جس پر بلبلا اُٹھو گے۔

پھر ان کو از سرِ نَو اُن آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو کائنات میں اور خود ان کے اپنے وجود میں موجود ہیں۔ مدّعا یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھو، جس توحید اور جس حیات بعد الموت کی حقیقت سے یہ پیغمبر تم کو آگاہ کر رہا ہے، کیا ہر طرف اس کی شہادت دینے والے آثار پھیلے ہوئے نہیں ہیں؟ کیا تمھاری عقل اور فطرت اس کی صحّت و صداقت پر گواہی نہیں دیتی؟

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ یہ لوگ تمھارے مقابلے میں کیسا ہی بُرا رَوِیّہ اختیار کریں، تم بھلے طریقوں ہی سے مُدافعت کرنا۔ شیطان کبھی تم کو جوش میں لا کر بُرائی کا جواب بُرائی سے دینے پر آمادہ نہ کرنے پائے۔

خاتمۂ کلام پر مخالفینِ حق کو آخرت کی باز پُرس سے ڈرایا گیا ہے اور انھیں مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ جو کچھ تم دعوتِ حق اور اس کے پیروؤں کے ساتھ کر رہے ہو، اس کا سخت حساب تم سے لیا جائے گا۔

---

آیاتہا ۱۱۸ سُوۡرَۃُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الجزء ۱۸ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾

یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے[1] جو:

اپنی[2] نماز میں خشوع[3] اختیار کرتے ہیں۔

---

۱ – ایمان لانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی، آپؐ کو اپنا ہادی و رہبر مان لیا، اور اُس طریقِ زندگی کی پیروی پر راضی ہو گئے جسے آپؐ نے پیش کیا ہے۔

فلاح کے معنیٰ ہیں: کامیابی و خوش حالی۔ یہ لفظ خُسران کی ضد ہے، جو ٹوٹے اور گھاٹے اور نامرادی کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ اَفۡلَحَ الرَّجُلُ کے معنیٰ ہیں: فلاں شخص کامیاب ہوا، اپنی مراد کو پہنچا، آسودہ و خوش حال ہو گیا، اس کی کوشش بار آور ہوئی، اس کی حالت اچھی ہو گئی۔

قَدۡ اَفۡلَحَ ''یقیناً فلاح پائی۔'' آغازِ کلام اِن الفاظ سے کرنے کی معنویت اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک وہ ماحول نگاہ میں نہ رکھا جائے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ اُس وقت ایک طرف دعوتِ اسلامی کے مخالف سردارانِ مکہ تھے جن کی تجارتیں چمک رہی تھیں، جن کے پاس دولت کی ریل پیل تھی، جن کو دنیوی خوش حالی کے سارے لوازم میسّر تھے۔ اور دوسری طرف دعوتِ اسلامی کے پیرو تھے، جن میں سے اکثر تو پہلے ہی غریب اور خستہ حال تھے، اور بعض جو اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یا اپنے کاروبار میں پہلے کامیاب تھے، ان کو بھی اب قوم کی مخالفت نے بدحال کر دیا تھا۔ اس صورتِ حال میں جب تقریر کا آغاز اس فقرے سے کیا گیا کہ ''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے'' تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلا کہ تمھارا معیارِ فلاح و خُسران غلط ہے، تمھارے اندازے غلط ہیں، تمھاری نگاہ دور رس نہیں ہے، تم اپنی جس عارضی و محدود خوش حالی کو فلاح سمجھ رہے ہو، وہ فلاح نہیں خُسران ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو جو تم ناکام و نامراد سمجھ رہے ہو، وہ دراصل کامیاب و بامراد ہیں۔ اس دعوتِ حق کو مان کر انھوں نے خسارے کا سودا نہیں کیا ہے، بلکہ وہ چیز پائی ہے جو دُنیا اور آخرت، دونوں میں ان کو پائدار خوش حالی سے ہم کنار کرے گی۔ اور اسے ردّ کر کے دراصل خسارے کا سودا تم نے کیا ہے، جس کے بُرے نتائج تم یہاں بھی دیکھو گے اور دُنیا سے گزر کر دوسری زندگی میں بھی دیکھتے رہو گے۔

یہی اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے اور ساری تقریر اوّل سے آخر تک اسی مدّعا کو ذہن نشین کرنے کے لیے کی گئی ہے۔

۲ – یہاں سے آیت ۹ تک ایمان لانے والوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ گویا دلیلیں ہیں اس

دعوے کی کہ انھوں نے ایمان لاکر درحقیقت فلاح پائی ہے۔ بالفاظِ دیگر، گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ ایسے لوگ آخر کیوں کر فلاح یاب نہ ہوں جن کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ اِن اوصاف کے لوگ ناکام و نامراد کیسے ہو سکتے ہیں۔ کامیابی انھیں نصیب نہ ہوگی تو اور کسے ہوگی۔

**۳۔** خُشُوع کے اصل معنیٰ ہیں کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا، اظہارِ عجز وانکسار کرنا۔ اس کیفیت کا تعلق دل سے بھی ہے اور جسم کی ظاہری حالت سے بھی۔ دل کا خشوع یہ ہے کہ آدمی کسی کی ہیبت اور عظمت وجلال سے مرعوب ہو۔ اور جسم کا خشوع یہ ہے کہ جب وہ اُس کے سامنے جائے تو سر جھک جائے، اعضا ڈھیلے پڑ جائیں، نگاہ پست ہو جائے، آواز دب جائے، اور ہیبت زدگی کے وہ سارے آثار اس پر طاری ہو جائیں جو اُس حالت میں فطرتاً طاری ہو جایا کرتے ہیں جب کہ آدمی کسی زبردست باجَبَرُوت ہستی کے حضور پیش ہو۔ نماز میں خشوع سے مراد دل اور جسم کی یہی کیفیت ہے اور یہی نماز کی اصل روح ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: لو خشع قلبه خشعت جوارحه۔ ”اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جسم پر بھی خشوع طاری ہوتا۔“

اگرچہ خشوع کا تعلق حقیقت میں دل سے ہے، اور دل کا خشوع آپ سے آپ جسم پر طاری ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورۂ بالا حدیث سے ابھی معلوم ہوا۔ لیکن شریعت میں نماز کے کچھ ایسے آداب بھی مقرر کر دیے گئے ہیں جو ایک طرف قلبی خشوع میں مددگار ہوتے ہیں، اور دوسری طرف خشوع کی گھٹتی بڑھتی کیفیات میں فعلِ نماز کو کم از کم ظاہری حیثیت سے ایک معیارِ خاص پر قائم رکھتے ہیں۔ ان آداب میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی دائیں بائیں نہ مڑے اور نہ سر اُٹھا کر اُوپر کی طرف دیکھے۔ (زیادہ سے زیادہ صرف گوشۂ چشم سے اِدھر اُدھر دیکھا جا سکتا ہے۔ حَنَفِیَّہ اور شافعیہ کے نزدیک نگاہ سجدہ گاہ سے متجاوز نہ ہونی چاہیے، مگر مالکیہ اس بات کے قائل ہیں کہ نگاہ سامنے کی طرف رہنی چاہیے)۔ نماز میں ہلنا اور مختلف سَمتوں میں جھکنا بھی ممنوع ہے۔ کپڑوں کو بار بار سمیٹنا، یا اُن کو جھاڑنا، یا ان سے شغل کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی اپنے بیٹھنے کی جگہ یا سجدے کی جگہ صاف کرنے کی کوشش کرے۔ تن کر کھڑے ہونا، بہت بلند آواز سے کڑک کر قراءت کرنا، یا قراءت میں گانا بھی آدابِ نماز کے خلاف ہے۔ زور زور سے جمائیاں لینا اور ڈکاریں مارنا بھی نماز میں بے ادبی ہے۔ جلدی جلدی مارا مار نماز پڑھنا بھی سخت ناپسندیدہ ہے۔ حکم یہ ہے کہ نماز کا ہر فعل پوری طرح سُکون اور اطمینان سے ادا کیا جائے، اور ایک فعل، مثلاً رکوع یا سجود یا قیام یا قعود جب تک مکمل نہ ہو لے، دوسرا فعل شروع نہ کیا جائے۔ نماز میں اگر کوئی چیز اذیت دے رہی ہو تو اسے ایک ہاتھ سے دفع کیا جا سکتا ہے، مگر بار بار ہاتھوں کو حرکت دینا، یا دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔

ان ظاہری آداب کے ساتھ یہ چیز بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آدمی نماز میں جان بوجھ کر غیر متعلق باتیں سوچنے سے پرہیز کرے۔ بلا ارادہ خیالات ذہن میں آئیں اور آتے رہیں تو یہ نفسِ انسانی کی ایک فطری کمزوری ہے۔ لیکن آدمی کی پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نماز کے وقت اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو، اور جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہو وہی دل سے بھی عرض کرے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾

لغویات سے دُور رہتے ہیں[۴]۔
زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں[۵]۔

اس دوران میں اگر بے اختیار دوسرے خیالات آجائیں تو جس وقت بھی آدمی کو اُن کا احساس ہو، اسی وقت اسے اپنی توجہ ان سے ہٹا کر نماز کی طرف پھیر لینی چاہیے۔

۴ – ”لَغْو“ ہر اس بات اور کام کو کہتے ہیں جو فضول، لایعنی اور لاحاصل ہو۔ جن باتوں یا کاموں کا کوئی فائدہ نہ ہو، جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو، جن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو، جن سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہ ہو، وہ سب ”لغویات“ ہیں۔

”مُعْرِضُوْنَ“ کا ترجمہ ہم نے ”دُور رہتے ہیں“ کیا ہے۔ مگر اس سے بات پوری طرح ادا نہیں ہوتی۔ آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ وہ لغویات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جہاں ایسی باتیں ہو رہی ہوں یا ایسے کام ہو رہے ہوں، وہاں جانے سے پرہیز کرتے ہیں، ان میں حصّہ لینے سے اجتناب کرتے ہیں، اور اگر کہیں ان سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو ٹل جاتے ہیں، کترا کر نکل جاتے ہیں، یا بدرجۂ آخر بے تعلق ہو رہتے ہیں۔ اسی بات کو دُوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿﴾ (الفرقان، آیت ۷۲) یعنی جب کسی ایسی جگہ سے ان کا گزر ہوتا ہے جہاں لغو باتیں ہو رہی ہوں، یا لغو کام ہو رہے ہوں، وہاں سے مہذب طریقے پر گزر جاتے ہیں۔

یہ چیز، جسے اس مختصر سے فقرے میں بیان کیا گیا ہے، دراصل مومن کی اہم ترین صفات میں سے ہے۔ مومن وہ شخص ہوتا ہے جسے ہر وقت اپنی ذمّہ داری کا احساس رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے، اور جس چیز کو زندگی اور عمر اور وقت کے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک نپی تُلی مدّت ہے جو اسے امتحان کے لیے دی گئی ہے۔ یہ احساس اس کو بالکل اُس طالبِ علم کی طرح سنجیدہ اور مشغول اور منہمک بنا دیتا ہے جو امتحان کے کمرے میں بیٹھا اپنا پرچہ حل کر رہا ہو۔ جس طرح اس طالب علم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ امتحان کے یہ چند گھنٹے اس کی آیندہ زندگی کے لیے فیصلہ کُن ہیں، اور اس احساس کی وجہ سے وہ اُن گھنٹوں کا ایک ایک لمحہ اپنے پرچے کو صحیح طریقے سے حل کرنے کی کوشش میں صَرف کر ڈالنا چاہتا ہے اور ان کا کوئی سیکنڈ فضول ضائع کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح مومن بھی دُنیا کی اس زندگی کو اُنھی کاموں میں صرف کرتا ہے جو انجامِ کار کے لحاظ سے مفید ہوں۔ حتّٰی کہ وہ تفریحات اور کھیلوں میں سے بھی ان چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو محض تضیعِ وقت نہ ہوں بلکہ کسی بہتر مقصد کے لیے اسے تیار کرنے والی ہوں۔ اس کے نزدیک وقت ”کاٹنے“ کی چیز نہیں ہوتی بلکہ استعمال کرنے کی چیز ہوتی ہے۔

علاوہ بریں مومن ایک سلیم الطبع، پاکیزہ مزاج، خوش ذوق انسان ہوتا ہے۔ بیہودگیوں سے اس کی طبیعت کو کسی قسم کا لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ مفید باتیں کر سکتا ہے، مگر فضول گپیں نہیں ہانک سکتا۔ وہ ظرافت اور مزاح اور لطیف مذاق

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ

اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں،[۶] سوائے اپنی بیویوں کے اور اُن عورتوں کے جو ان کی مِلکِ

کی حد تک جاسکتا ہے، مگر ٹھٹھے بازیاں نہیں کرسکتا، گندا مذاق اور مسخرہ پن برداشت نہیں کرسکتا، تفریحی گفتگوؤں کو اپنا مشغلہ نہیں بنا سکتا۔ اُس کے لیے تو وہ سوسائٹی ایک مستقل عذاب ہوتی ہے جس میں کان کسی وقت بھی گالیوں سے، غیبتوں اور تہمتوں اور جھوٹی باتوں سے، گندے گانوں اور فحش گفتگوؤں سے محفوظ نہ ہوں۔ اس کو اللہ تعالیٰ جس جنّت کی اُمید دلاتا ہے، اُس کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی بیان کرتا ہے کہ لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ''وہاں تُو کوئی لغو بات نہ سنے گا۔''

۵ – ''زکوٰۃ دینے'' اور ''زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہونے'' میں معنیٰ کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، جسے نظر انداز کر کے دونوں کو ہم معنیٰ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے یہاں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کا معروف انداز چھوڑ کر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ کا غیر معمولی طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ عَرَبی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے: ایک ''پاکیزگی''، دوسرے ''نشوونَما''۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں اُن کو دُور کرنا، اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا، یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ایک، وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے، بجائے خود تزکیہ کا فعل۔ اگر وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ تزکیے کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصّہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیے کا فعل کرتے ہیں، اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی، بلکہ تزکیۂ نفس، تزکیۂ اَخلاق، تزکیۂ زندگی، تزکیۂ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی۔ اور مزید برآں، اس کا مطلب صرف اپنی ہی زندگی کے تزکیے تک محدود نہ رہے گا، بلکہ اپنے گردوپیش کی زندگی کے تزکیے تک بھی پھیل جائے گا۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ''وہ تزکیے کا کام کرنے والے لوگ ہیں''، یعنی اپنے آپ کو بھی پاک کرتے ہیں اور دوسروں کو پاک کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، اپنے اندر بھی جوہرِ انسانیت کو نَشوونَما دیتے ہیں اور باہر کی زندگی میں بھی اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں دوسرے مَقامات پر بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ میں فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ ''فلاح پائی اس شخص نے جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھی۔'' اور سورۂ شمس میں فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ''بامراد ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔'' مگر یہ آیت ان دونوں کی بہ نسبت وسیع تر مفہوم کی حامل ہے، کیونکہ وہ صرف اپنے نفس کے تزکیے پر زور دیتی ہیں، اور یہ بجائے خود فعلِ تزکیہ کی اہمیت بیان کرتی ہے، جو اپنی ذات اور معاشرے کی زندگی، دونوں ہی کے تزکیے پر حاوی ہے۔

۶ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اپنے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو چھپا کر رکھتے ہیں، یعنی عُریانی سے پرہیز

اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷

یمین میں ہوں، کہ ان پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اُس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی زیادتی کرنے والے ہیں،[7]

کرتے ہیں اور اپنا ستر دوسروں کے سامنے نہیں کھولتے۔ دوسرے، یہ کہ وہ اپنی عصمت وعفت کو محفوظ رکھتے ہیں، یعنی صنفی معاملات میں آزادی نہیں برتتے اور قوتِ شہوانی کے استعمال میں بے لگام نہیں ہوتے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النور، حواشی ۳۰-۳۲)

۷ ــ یہ جملۂ معترضہ ہے جو اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے جو ”شرم گاہوں کی حفاظت“ کے لفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں پہلے بھی یہ سمجھا جاتا رہا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قوتِ شہوانی بجائے خود ایک بُری چیز ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنا، خواہ جائز طریقے ہی سے کیوں نہ ہو، بہرحال نیک اور اللہ والے لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کو تقویت پہنچ جاتی اگر صرف اتنا ہی کہہ کر بات ختم کر دی جاتی کہ فلاح پانے والے اہلِ ایمان اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا تھا کہ وہ لنگوٹ بند رہتے ہیں، راہب اور سنیاسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، شادی بیاہ کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ اس لیے ایک جملۂ معترضہ بڑھا کر حقیقت واضح کر دی گئی کہ جائز مقام پر اپنی خواہشِ نفس پوری کرنا کوئی قابلِ ملامت چیز نہیں ہے، البتہ گناہ یہ ہے کہ آدمی شہوت رانی کے لیے اس معروف اور جائز صورت سے تجاوز کر جائے۔

اس جملۂ معترضہ سے چند احکام نکلتے ہیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں:

(۱) شرم گاہوں کی حفاظت کے حکمِ عام سے دو قسم کی عورتوں کو مُستثنیٰ کیا گیا ہے: ایک ازواج، دوسرے مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ ”ازواج“ کا اطلاق عربی زبان کے معروف استعمال کی رُو سے بھی اور خود قرآن کی تصریحات کے مطابق بھی صرف اُن عورتوں پر ہوتا ہے جن سے باقاعدہ نکاح کیا گیا ہو، اور یہی اس کے ہم معنیٰ اُردو لفظ ”بیوی“ کا مفہوم ہے۔ رہا لفظ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تو عربی زبان کے محاورے اور قرآن کے استعمالات، دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اس کا اطلاق لونڈی پر ہوتا ہے، یعنی وہ عورت جو آدمی کی مِلک میں ہو۔ اس طرح یہ آیت صاف تصریح کر دیتی ہے کہ منکوحہ بیوی کی طرح مملوکہ لونڈی سے بھی صنفی تعلق جائز ہے، اور اس کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ مِلک ہے۔ اگر اس کے لیے بھی نکاح شرط ہوتا تو اسے ازواج سے الگ بیان کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی، کیونکہ منکوحہ ہونے کی صورت میں وہ بھی ازواج میں داخل ہوتی۔ آج کل کے بعض مفسرین، جنھیں لونڈی سے تمتُّع کا جواز تسلیم کرنے سے انکار ہے، سورۂ نساء کی آیت وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (آیت ۲۵) سے اِستِدلال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لونڈی سے تمتُّع بھی صرف نکاح ہی کر کے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمھاری مالی حالت کسی آزاد خاندانی عورت سے شادی کرنے کی متحمل نہ ہو تو کسی لونڈی سے ہی نکاح کر لو۔ لیکن ان لوگوں کی یہ عجیب خصوصیّت ہے کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے کو مفید مطلب پا کر لے لیتے ہیں، اور اسی آیت کا جو ٹکڑا ان کے مدّعا کے خلاف پڑتا ہو اُسے جان بُوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آیت میں لونڈیوں

سے نکاح کرنے کی ہدایت جن الفاظ میں دی گئی ہے وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''پس ان (لونڈیوں) سے نکاح کرلو اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اور اُن کو معروف طریقے سے اُن کے مہر ادا کرو۔'' یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خود لونڈی کے مالک کا معاملہ زیرِ بحث نہیں ہے، بلکہ کسی ایسے شخص کا معاملہ زیرِ بحث ہے جو آزاد عورت سے شادی کا خرچ نہ برداشت کرسکتا ہو اور اس بنا پر کسی دوسرے شخص کی مملوکہ لونڈی سے نکاح کرنا چاہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ اپنی ہی لونڈی سے نکاح کرنے کا ہو تو اس کے وہ ''اہل'' (سرپرست) کون ہو سکتے ہیں جن سے اس کو اجازت لینے کی ضرورت ہو؟ مگر قرآن سے کھیلنے والے صرف فَانْكِحُوْهُنَّ کو لے لیتے ہیں اور اس کے بعد ہی بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ کے جو الفاظ موجود ہیں، انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مزید برآں، وہ ایک آیت کا ایسا مفہوم نکالتے ہیں جو اسی موضوع سے متعلق قرآنِ مجید کی دوسری آیات سے ٹکراتا ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے خیالات کی نہیں بلکہ قرآنِ پاک کی پیروی کرنا چاہتا ہو تو وہ سورۂ نساء، آیت ۳-۲۵، سورۂ احزاب، آیت ۵۰-۵۲، اور سورۂ معارج، آیت ۳۰ کو سورۂ مومنون کی اس آیت کے ساتھ ملا کر پڑھے۔ اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا قانون اس مسئلے میں کیا ہے۔ (اِس مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۴۴۔ تفہیمات، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰ تا ۳۲۴۔ رسائل و مسائل، جلد اوّل، صفحہ ۳۲۴ تا ۳۳۳)

(۲) اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ میں لفظ عَلٰٓى اس بات کی صراحت کر دیتا ہے کہ اس جملۂ معترضہ میں جو قانون بیان کیا جا رہا ہے، اس کا تعلق صرف مَردوں سے ہے۔ باقی تمام آیات قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے لے کر خٰلِدُوْنَ تک، مذکر کی ضمیروں کے باوجود مرد و عورت دونوں کو شامل ہیں، کیونکہ عربی زبان میں عورتوں اور مردوں کے مجموعے کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو ضمیر مذکر ہی استعمال کی جاتی ہے، لیکن یہاں لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ کے حکم سے مستثنیٰ کرتے ہوئے عَلٰٓى کا لفظ استعمال کر کے یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ اِستثنا مردوں کے لیے ہے نہ کہ عورتوں کے لیے۔ اگر ''ان پر'' کہنے کے بجائے ''اُن سے'' محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں کہا جاتا تو البتہ یہ حکم بھی مرد و عورت، دونوں پر حاوی ہوسکتا تھا۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک عورت حضرت عمرؓ کے زمانے میں اپنے غلام سے تمتّع کر بیٹھی تھی۔ صحابہ کرامؓ کی مجلسِ شُوریٰ میں جب اس کا معاملہ پیش کیا گیا تو سب نے بالاتفاق کہا کہ تاولت کتاب اللّٰہ تعالٰی غیر تاویلہ، ''اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا غلط مفہوم لے لیا۔'' یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اگر یہ استثنا مردوں کے لیے خاص ہے تو پھر بیویوں کے لیے ان کے شوہر کیسے حلال ہوئے؟ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ جب بیویوں کے معاملے میں شوہروں کو حفظِ فروج کے حکم سے مستثنیٰ کیا گیا تو اپنے شوہروں کے معاملے میں بیویاں آپ سے آپ اِس حکم سے مستثنیٰ ہوگئیں۔ ان کے لیے پھر الگ کسی تصریح کی حاجت نہ رہی۔ اس طرح اس حکمِ استثنا کا اثر عملاً صرف مرد اور اس کی مملوکہ عورت تک محدود ہو جاتا ہے، اور عورت پر اس کا غلام حرام قرار پاتا ہے۔ عورت کے لیے اِس چیز کو حرام کرنے کی حکمت یہ ہے کہ غلام اس کی خواہشِ نفس تو پوری کرسکتا ہے مگر اس کا اور گھر کا قوّام نہیں بن سکتا، جس کی وجہ سے خاندانی زندگی کی چول ڈھیلی رہ جاتی ہے۔

(۳) ''البتہ جو اُس کے علاوہ کچھ اور چاہیں، وہی زیادتی کرنے والے ہیں''، اِس فقرے نے مذکورۂ بالا دو جائز صورتوں کے سوا خواہشِ نفس پوری کرنے کی تمام دوسری صورتوں کو حرام کر دیا، خواہ وہ زنا ہو، یا عملِ قومِ لوط، یا وطیِ بہائم، یا کچھ اور۔ صرف ایک اِستمنا بالید (masturbation) کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس کو قطعی حرام ٹھیراتے ہیں۔ اور حَنَفِیَّہ کے نزدیک اگرچہ یہ حرام ہے، لیکن وہ کہتے ہیں

کہ اگر شدید غلبۂ جذبات کی حالت میں آدمی سے احیاناً اس فعل کا صُدور ہو جائے تو اُمید ہے کہ معاف کر دیا جائے گا۔

(۴) بعض مفسرین نے متعہ کی حرمت بھی اس آیت سے ثابت کی ہے۔ ان کا اِستدلال یہ ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے۔ اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے، نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اس کے لیے عدّت ہے، نہ طلاق، نہ نفقہ، نہ ایلا اور ظہار اور لعان وغیرہ۔ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔ پس جب وہ ''بیوی'' اور ''لونڈی''، دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ''ان کے علاوہ کچھ اور'' میں شمار ہوگی، جس کے طالب کو قرآن ''حد سے گزرنے والا'' قرار دیتا ہے۔ یہ اِستدلال بہت قوی ہے، مگر اس میں کمزوری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ متعہ کی حُرمت کے بارے میں یہ آیت ناطق ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتحِ مکہ کے سال دیا ہے، اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمتِ متعہ کا حکم قرآن کی اس آیت ہی میں آ چکا تھا جو بالاتفاق مکّی ہے اور ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی، تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتحِ مکہ تک جائز رکھتے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ متعہ کی حرمت قرآنِ مجید کے کسی صریح حکم پر نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر مبنی ہے۔ سنت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔ متعہ کا جب ذکر آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی اور توضیح کر دی جائے: اول، یہ کہ اس کی حرمت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسے حضرت عمرؓ نے حرام کیا، دُرست نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اس حکم کے مُوجِد نہیں تھے بلکہ صرف اسے شائع اور نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ یہ حکم حضورؐ نے آخر زمانے میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہ پہنچا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی عام اشاعت کی اور بذریعۂ قانون اسے نافذ کیا۔ دوم، یہ کہ شیعہ حضرات نے متعہ کو مطلقاً مباح ٹھیرانے کا جو مسلک اختیار کیا ہے، اس کے لیے تو بہرحال نُصوصِ کتاب وسنّت میں سرے سے کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ صدرِ اوّل میں صحابہؓ اور تابعین اور فقہا میں سے چند بزرگ جو اس کے جواز کے قائل تھے، وہ اسے صرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اسے نکاح کی طرح مباحِ مطلق اور عام حالات میں معمول بہ بنا لینے کا قائل نہ تھا۔ ابنِ عباسؓ، جن کا نام قائلینِ جواز میں سب سے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے، اپنے مسلک کی توضیح خود ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ماھی الا کالمیتة لاتحل الا للمضطر (یہ تو مردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں)۔ اور اس فتوے سے بھی وہ اُس وقت باز آ گئے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجایش سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اسے موقوف نہیں رکھتے۔ اس سوال کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ ابنِ عباسؓ اور ان کے ہم خیال چند گنے چُنے اصحاب نے اس مسلک سے رُجوع کر لیا تھا یا نہیں، تو اُن کے مسلک کو اختیار کرنے والا زیادہ سے زیادہ جواز بحالتِ اضطرار کی حد تک جا سکتا ہے۔ مطلق اباحت، اور بلا ضرورت تمتّع، حتّٰی کہ منکوحہ بیویوں تک کی موجودگی میں بھی ممتوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوقِ سلیم بھی گوارا نہیں کرتا، کجا کہ اسے شریعتِ محمدؐیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمۂ اہلِ بیت کو اس سے مُتَّہَم کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ خود شیعہ حضرات میں سے بھی کوئی شریف آدمی

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝٨ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝٩

وقف لازم

اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، [8]
اور اپنی نمازوں کی مُحافَظَت کرتے ہیں۔ [9]

یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی یا بہن کے لیے نکاح کے بجائے متعہ کا پیغام دے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جوازِ متعہ کے لیے معاشرے میں زنانِ بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ایسا ادنیٰ طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے تمتّع کرنے کا دروازہ کُھلا رہے۔ یا پھر یہ کہ متعہ صرف غریب لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ہو اور اس سے فائدہ اُٹھانا خوش حال طبقے کے مردوں کا حق ہو۔ کیا خدا اور رسولؐ کی شریعت سے اس طرح کے غیر منصفانہ قوانین کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور کیا خدا اور اس کے رسولؐ سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ایسے فعل کو مباح کردیں گے جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی؟

۸- ’’امانات‘‘ کا لفظ جامع ہے ان تمام امانتوں کے لیے جو خداوندِ عالَم نے، یا معاشرے نے، یا افراد نے کسی شخص کے سُپرد کی ہوں۔ اور عہد و پیمان میں وہ سارے معاہَدے داخل ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان، یا انسان اور انسان کے درمیان، یا قوم اور قوم کے درمیان اُستوار کیے گئے ہوں۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی امانت میں خیانت نہ کرے گا، اور کبھی اپنے قول و قرار سے نہ پھرے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے: لا ایمان لمن لا امانة لهٗ ولا دین لمن لا عهد له، ’’جو امانت کی صفت نہیں رکھتا وہ ایمان نہیں رکھتا، اور جو عہد کا پاس نہیں رکھتا وہ دین نہیں رکھتا۔‘‘ (بَیْہَقِی فی شُعَبِ الایمان) بخاری و مسلم کی مُتَّفَق عَلَیہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ’’چار خصلتیں ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے، جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے: جب کوئی امانت اس کے سُپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ اور جب کسی سے جھگڑے تو (اَخلاق و دیانت کی) ساری حدیں پھاند جائے۔‘‘

۹- اُوپر خشوع کے ذکر میں ’’نماز‘‘ فرمایا تھا اور یہاں ’’نمازوں‘‘ بصیغۂ جمع ارشاد فرمایا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں جنسِ نَماز مراد تھی، اور یہاں ایک ایک وقت کی نماز فرداً فرداً مراد ہے۔ ’’نمازوں کی محافظت‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، ارکان و اجزائے نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری نگہداشت کرتے ہیں۔ جسم اور کپڑے پاک رکھتے ہیں۔ وضو ٹھیک طرح سے کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کبھی بے وضو نہ پڑھ بیٹھیں۔ صحیح وقت پر نماز ادا کرنے کی فکر کرتے ہیں، وقت ٹال کر نہیں پڑھتے۔ نماز کے تمام ارکان پوری طرح سکون و اطمینان کے ساتھ ادا کرتے ہیں، ایک بوجھ کی طرح جلدی سے اُتار کر بھاگ نہیں جاتے۔ اور جو کچھ نماز میں پڑھتے ہیں، وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ جیسے بندہ اپنے خدا سے کچھ عرض کر رہا ہے، نہ اِس طرح کہ گویا ایک رَٹی ہوئی عبارت کو کسی نہ کسی طور پر ہوا میں پھونک دینا ہے۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡوَٰرِثُونَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلۡفِرۡدَوۡسَ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿١١﴾

یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس[۱۰] پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔[۱۱]

۱۰ – فردوس، جنت کے لیے معروف ترین لفظ ہے جو قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں پَرِدیشَا، قدیم کلدانی زبان میں پَردیسا، قدیم ایرانی (ژَند) میں پیری وائزا، عبرانی میں پَردیس، اَرمنی میں پَردیز، سُریانی میں فَردیسو، یونانی میں پارادائسوس، لاطینی میں پاراڈائس، اور عربی میں فردوس۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کے لیے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو، وسیع ہو، آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو، اور اس میں ہر قسم کے پھل، خُصوصاً انگور پائے جاتے ہوں۔ بلکہ بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلامِ جاہلیّت میں بھی لفظِ فردوس مستعمل تھا۔ اور قرآن میں اس کا اطلاق متعدّد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ کہف میں ارشاد ہوا: كَانَتۡ لَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ''ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہیں۔'' اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت باغ اور چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔

اہلِ ایمان کے وارثِ فردوس ہونے پر، سورۂ طٰہٰ (حاشیہ ۸۳)، اور سورۂ انبیاء (حاشیہ ۹۹) میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

۱۱ – اِن آیات میں چار اہم مضمون ادا ہوئے ہیں:

اوّل، یہ کہ جو لوگ بھی قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان کر یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرلیں گے اور اس رَوِیّے کے پابند ہو جائیں گے، وہ دُنیا اور آخرت میں فلاح پائیں گے، قطعِ نظر اس سے کہ کسی قوم، نسل یا ملک کے ہوں۔

دوم، یہ کہ فلاح محض اقرارِ ایمان، یا محض اَخلاق اور عمل کی خوبیوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ جب آدمی خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مانے، پھر اس کے مطابق اخلاق اور عمل کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرلے، تب وہ فلاح سے ہم کنار ہوگا۔

سوم، یہ کہ فلاح محض دنیوی اور مادّی خوش حالی اور محدود وقتی کامیابیوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک وسیع تر حالتِ خیر کا نام ہے، جس کا اطلاق دنیا اور آخرت میں پائدار و مستقل کامیابی و آسودگی پر ہوتا ہے۔ یہ چیز ایمان و عملِ صالح کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ اور اس کُلّیے کو نہ تو گمراہوں کی وقتی خوش حالیاں اور کامیابیاں توڑتی ہیں، نہ مومنینِ صالحین کے عارضی مصائب کو اس کی نقیض ٹھیرایا جا سکتا ہے۔

چہارم، یہ کہ مومنین کے ان اوصاف کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی صداقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور یہی مضمون آگے کی تقریر سے ان آیات کا ربط قائم کرتا ہے۔ تیسرے رکوع کے خاتمے تک کی پوری تقریر کا سلسلۂ استدلال اس طرح پر ہے کہ آغاز میں تجرِبی دلیل ہے، یعنی یہ کہ اس نبی کی تعلیم نے خود تمھاری ہی سوسائٹی کے افراد میں یہ سیرت و

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا،[12] پھر اسے ایک دُوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔[13]

کردار اور یہ اَخلاق واوصاف پیدا کر کے دکھائے ہیں، اب تم خود سوچ لو کہ یہ تعلیم حق نہ ہوتی تو ایسے صالح نتائج کس طرح پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے بعد مُشاہَداتی دلیل ہے، یعنی یہ کہ انسان کے اپنے وجود میں اور گرد و پیش کی کائنات میں جو آیات نظر آتی ہیں، وہ سب توحید اور آخرت کی اس تعلیم کے برحق ہونے کی شہادت دے رہی ہیں جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ پھر تاریخی دلائل آتے ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ نبی اور اس کے منکرین کی کش مکش آج نئی نہیں ہے بلکہ انھی بنیادوں پر قدیم ترین زمانے سے چلی آ رہی ہے، اور اس کش مکش کا ہر زمانے میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا رہا ہے، جس سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ فریقین میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔

**۱۲** – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہوں: سورۂ حج کے حواشی ۵، ۶، ۹۔

**۱۳** – یعنی کوئی خالی الذہن آدمی بچے کو ماں کے رحم میں پرورش پاتے دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہاں وہ انسان تیار ہو رہا ہے جو باہر جا کر عقل اور دانائی اور صنعت کے یہ کچھ کمالات دکھائے گا اور ایسی ایسی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں اس سے ظاہر ہوں گی۔ وہاں وہ ہڈیوں اور گوشت پوست کا ایک پلندا سا ہوتا ہے جس میں وضعِ حمل کے آغاز تک زندگی کی ابتدائی خُصوصیّات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی، نہ عقل و خرد، نہ اور کوئی خوبی۔ مگر باہر آ کر وہ چیز ہی کچھ اور بن جاتا ہے جس کو پیٹ والے جنین سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ اب وہ ایک سمیع و بصیر اور ناطق وجود ہوتا ہے۔ اب وہ تجرِبے اور مُشاہَدے سے علم حاصل کرتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک ایسی خودی اُبھرنی شروع ہوتی ہے جو بیداری کے پہلے ہی لمحے سے اپنی دسترس کی ہر چیز پر تحکُّم جتاتی اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے، اُس کی ذات میں یہ "چیزے دیگر" ہونے کی کیفیت نمایاں تر اور افزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جوان ہوتا ہے تو بچپن کی بہ نسبت کچھ اَور ہوتا ہے۔ ادھیڑ ہوتا ہے تو جوانی کے مقابلے میں کوئی اَور چیز ثابت ہوتا ہے۔ بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو نئی نسلوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا بچپن کیا تھا اور جوانی کیسی تھی۔ اتنا بڑا تغیر کم از کم اِس دُنیا کی کسی دوسری مخلوق میں واقع نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ایک طرف کسی پختہ عمر کے انسان کی طاقتیں اور قابلیتیں اور کام دیکھے، اور دوسری طرف یہ تصور کرے کہ

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ

پس بڑا ہی بابرکت ہے[14] اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اُٹھائے جاؤ گے۔

اور تمھارے اُوپر ہم نے سات راستے بنائے[15]، تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے[16]۔ اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو

---

پچاس ساٹھ برس پہلے ایک روز جو بوند ٹپک کر رحمِ مادر میں گری تھی اس کے اندر یہ کچھ بھرا ہوا تھا، تو بے اختیار اس کی زبان سے وہی بات نکلے گی جو آگے کے فقرے میں آرہی ہے۔

۱۴– اصل میں فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، جن کی پوری معنویت ترجمے میں ادا کرنا محال ہے۔ لغت اور استعمالاتِ زبان کے لحاظ سے اس میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک، یہ کہ وہ نہایت مقدس اور مُنزّہ ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ اس قدر خیر اور بھلائی اور خوبی کا مالک ہے کہ جتنا تم اُس کا اندازہ کرو، اس سے زیادہ ہی اُس کو پاؤ، حتیٰ کہ اس کی خیرات کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حواشی ۱ و ۱۹) ان دونوں معنوں پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ تخلیقِ انسانی کے مراتب بیان کرنے کے بعد فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کا فقرہ محض ایک تعریفی فقرہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ دلیل کے بعد نتیجۂ دلیل بھی ہے۔ اس میں گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جو خدا مٹی کے ست کو ترقی دے کر ایک پورے انسان کے مرتبے تک پہنچا دیتا ہے، وہ اس سے بدرجہا زیادہ منزّہ ہے کہ خدائی میں کوئی اس کا شریک ہو سکے، اور اس سے بدرجہا مقدس ہے کہ اُسی انسان کو پھر پیدا نہ کر سکے، اور اس کی خیرات کا یہ بڑا ہی گھٹیا اندازہ ہے کہ بس ایک دفعہ انسان بنا دینے ہی پر اس کے کمالات ختم ہو جائیں، اس سے آگے وہ کچھ نہ بنا سکے۔

۱۵– اصل میں لفظ طَرَآئِقَ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ راستوں کے بھی ہیں اور طبقوں کے بھی۔ اگر پہلے معنیٰ لیے جائیں تو غالباً اس سے مراد سات سیّاروں کی گردش کے راستے ہیں، اور چونکہ اس زمانے کا انسان سبع سیارہ ہی سے واقف تھا، اس لیے سات ہی راستوں کا ذکر کیا گیا۔ اِس کے معنیٰ بہرحال یہ نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ اور دوسرے راستے نہیں ہیں۔ اور اگر دوسرے معنیٰ لیے جائیں تو سَبْعَ طَرَآئِقَ کا وہی مفہوم ہوگا جو سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (سات آسمان طبق برطبق) کا مفہوم ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”تمھارے اوپر“ ہم نے سات راستے بنائے، تو اس کا ایک تو سیدھا سادھا مطلب وہی ہے جو ظاہر الفاظ سے ذہن میں آتا ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم سے بھی زیادہ بڑی چیز ہم نے یہ آسمان

فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ﴿١٨﴾ فَأَنشَأْنَا لَكُم بِهِ

زمین میں ٹھیرا دیا،[۱۷] ہم اُسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔[۱۸] پھر اس پانی کے ذریعے سے ہم نے تمھارے لیے

بنائے ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ’’آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے۔‘‘ (المومن، آیت ۵۷)

۱۶ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ’’اور مخلوقات کی طرف سے ہم غافل نہ تھے، یا نہیں ہیں۔‘‘ متن میں جو مفہوم لیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ جو ہم نے بنایا ہے، یہ بس یونہی کسی اناڑی کے ہاتھوں اَلل ٹَپ نہیں بن گیا ہے، بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر پورے علم کے ساتھ بنایا گیا ہے، اہم قوانین اس میں کارفرما ہیں، ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سارے نظامِ کائنات میں ایک مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور اس کارگاہِ عظیم میں ہر طرف ایک مقصدیّت نظر آتی ہے، جو بنانے والے کی حکمت پر دلالت کر رہی ہے۔ دوسرا مفہُوم لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے، اس کی کسی حاجت سے ہم کبھی غافل، اور کسی حالت سے کبھی بے خبر نہیں رہے ہیں۔ کسی چیز کو ہم نے اپنے منصوبے کے خلاف بننے اور چلنے نہیں دیا ہے۔ کسی چیز کی فطری ضروریات فراہم کرنے میں ہم نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ اور ایک ایک ذرّے اور پتّے کی حالت سے ہم باخبر رہے ہیں۔

۱۷ – اس سے مراد اگرچہ موسمی بارش بھی ہوسکتی ہے، لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے ایک دوسرا مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آغازِ آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اتنی مقدار میں زمین پر پانی نازل فرمادیا تھا جو قیامت تک اِس کُرے کی ضروریات کے لیے اُس کے علم میں کافی تھا۔ وہ پانی زمین ہی کے نشیبی حصوں میں ٹھیر گیا، جس سے سمندر اور بُحَیرے وجود میں آئے اور آبِ زیرِ زمین (sub-soil water) پیدا ہوا۔ اب یہ اسی پانی کا اُلٹ پھیر ہے جو گرمی، سردی اور ہواؤں کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، اسی کو بارشیں، برف پوش پہاڑ، دریا، چشمے اور کنویں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلاتے رہتے ہیں، اور وہی بے شمار چیزوں کی پیدایش اور ترکیب میں شامل ہوتا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے۔ شروع سے آج تک پانی کے اس ذخیرے میں نہ ایک قطرے کی کمی ہوئی اور نہ ایک قطرے کا اضافہ ہی کرنے کی کوئی ضرورت پیش آئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پانی، جس کی حقیقت آج ہر مَدرَسے کے طالب علم کو معلوم ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن، دو گیسوں کے امتزاج سے بنا ہے، ایک دفعہ تو اتنا بن گیا کہ اس سے سمندر بھر گئے، اور اب اس کے ذخیرے میں ایک قطرے کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ کون تھا جس نے ایک وقت میں اتنی ہائیڈروجن اور آکسیجن ملا کر اس قدر پانی بنا دیا؟ اور کون ہے جو اَب انھی دونوں گیسوں کو اُس خاص تناسُب کے ساتھ نہیں ملنے دیتا جس سے پانی بنتا ہے، حالانکہ دونوں گیسیں اب بھی دُنیا میں موجود ہیں؟ اور جب پانی بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ جاتا ہے تو اس وقت کون ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ ہو جانے سے روکے رکھتا ہے؟ کیا دہریوں کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ اور کیا پانی اور ہوا اور گرمی اور سردی کے الگ الگ خدا ماننے والے اس کا کوئی

وقف لازم

جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ

کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیے، تمھارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں[19] اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو۔[20] اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طُورِ سینا سے نکلتا ہے،[21] تیل بھی لیے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز ہم تمھیں پلاتے ہیں،[22] اور تمھارے لیے ان میں بہت سے دوسرے

---

جواب رکھتے ہیں؟

**۱۸ –** یعنی اسے غائب کر دینے کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے، بے شمار صورتیں ممکن ہیں، اور ان میں سے جس کو ہم جب چاہیں، اختیار کر کے تمھیں زندگی کے اس اہم ترین وسیلے سے محروم کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ آیت سورۂ ملک کی اُس آیت سے وسیع تر مفہوم رکھتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ؏ ”ان سے کہو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر تمھارا یہ پانی زمین میں بیٹھ جائے تو کون ہے جو تمھیں بہتے چشمے لا دے گا؟“

**۱۹ –** یعنی کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ بھی طرح طرح کے میوے اور پھل۔

**۲۰ –** یعنی ان باغوں کی پیداوار سے، جو پھل، غلّے، لکڑی اور دوسری مختلف صورتوں میں حاصل ہوتی ہے، تم اپنی مَعاش پیدا کرتے ہو۔ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ میں مِنْهَا کی ضمیر جَنّٰتٍ کی طرف پھرتی ہے نہ کہ پھلوں کی طرف۔ اور تَاْكُلُوْنَ کے معنیٰ صرف یہی نہیں ہیں کہ ان باغوں کے پھل تم کھاتے ہو، بلکہ یہ بحیثیتِ مجموعی روزی حاصل کرنے کے مفہوم پر حاوی ہے۔ جس طرح ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے فلاں کام کی روٹی کھاتا ہے، اُسی طرح عربی زبان میں بھی کہتے ہیں: فلان یاکل من حرفتہ۔

**۲۱ –** مراد ہے زیتون، جو بحرِ روم کے گرد و پیش کے علاقے کی پیداوار میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ اس کا درخت ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار برس تک چلتا ہے، حتّٰی کہ فلسطین کے بعض درختوں کا قد و قامت اور پھیلاؤ دیکھ کر اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک چلے آ رہے ہیں۔ طورِ سینا کی طرف اس کو منسوب کرنے کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ وہی علاقہ جس کا مشہور ترین اور نمایاں ترین مقام طورِ سینا ہے، اس درخت کا وطنِ اصلی ہے۔

كَثِيرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً

ع ۲۲ / ۱۷

فائدے بھی ہیں۔ اُن کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔[۲۳]

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔[۲۴] اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی اور معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟"[۲۵] اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا، وہ کہنے لگے کہ "یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔[۲۶] اِس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔[۲۷] اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔[۲۷الف] یہ بات

۲۲ – یعنی دُودھ، جس کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ خون اور گوبر کے درمیان یہ ایک تیسری چیز ہے جو جانور کی غذا سے پیدا کر دی جاتی ہے۔ (النحل، آیت ۶۶)

۲۳ – مویشیوں اور کشتیوں کا ایک ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب سواری اور بار برداری کے لیے زیادہ تر اُونٹ استعمال کرتے تھے، اور اُونٹوں کے لیے "خشکی کے جہاز" کا استعارہ بہت پرانا ہے۔ جاہلیّت کا شاعر ذُو الرُّمّہ کہتا ہے:

ع سفينة برٍّ تحت خدى زمامها

۲۴ – تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونُس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہُود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳۔ الانبیاء، آیات ۷۶–۷۷

۲۵ – یعنی کیا تمھیں اپنے اصلی اور حقیقی خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ جو تمھارا اور سارے جہان کا مالک و فرمانروا ہے، اُس کی سلطنت میں رہ کر اس کے بجائے دوسروں کی بندگی و اطاعت کرنے اور دوسروں کی رُبوبیت و خداوندی تسلیم کرنے کے کیا نتائج ہوں گے؟

۲۶ – یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا اور نبی بشر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصور کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاءؑ انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہوں: الاعراف، آیات ۶۳–۶۹، یونُس: ۲، ہود: ۲۷–۳۱، یوسف: ۱۰۹، الرعد: ۳۸، ابراہیم: ۱۰–۱۱، النحل: ۴۳، بنی اسرائیل: ۹۴–۹۵، الکہف: ۱۱۰، الانبیاء: ۳–۳۴،

المومنون: ۳۳-۳۴-۴۷-۴۷، الفرقان: ۷-۲۰، الشعراء: ۱۵۴-۱۸۶، یٰسین: ۱۵، حٰم السجدہ: ۶ مع حواشی )

**۲۷** - یہ بھی مخالفینِ حق کا قدیم ترین حربہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے اُٹھے، اُس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ پر لگایا تھا کہ تم اس لیے اُٹھے ہو کہ تمھیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے، وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْأَرْضِ (یونس، آیت ۷۸) یہی حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سردارانِ قریش کو تھا، چنانچہ کئی مرتبہ انھوں نے آپؐ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو ''اپوزیشن'' چھوڑ کر ''حزبِ اقتدار'' میں شامل ہو جاؤ، تمھیں ہم بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دُنیا اور اس کے مادّی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں، اُن کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اسی دُنیا میں کوئی انسان نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاحِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دل فریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے دعوے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کبھی لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ ان کا اپنا ہم جنس ہی ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف ''اقتدار کی بھوک'' کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انھیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے، وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں، البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ جس کے لیے یہ ''غذا'' پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی ''بھوک'' محسوس کر رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: حاشیہ ۳۶)

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اُٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریّہ و نظام پیش کرے گا، اس کے لیے بہر حال یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِّراہ ہوں، انھیں ہٹانے کی کوشش کرے اور اُن طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریّہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہوگی، اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا، اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی، یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیا اور مصلحینِ عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا، اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امرِ واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا، اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟ ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصدِ خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجے میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ صرف اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریقِ کار اور دونوں

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ

تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سُنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔ کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے۔ کچھ مدّت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔" نوحؑ نے کہا: "پروردگار! ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے اس پر اب تُو ہی میری نصرت فرما۔"[28] ہم نے اس پر وحی کی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر۔ پھر جب ہمارا حکم آجائے اور تنور اُبل پڑے[29] تو

کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

۲۷، الف۔ یہ اس امر کا کُھلا ہُوا ثبوت ہے کہ قومِ نوحؑ اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر نہ تھی اور نہ اس بات کی منکر تھی کہ ربّ العالمین وہی ہے اور سارے فرشتے اس کے تابعِ فرمان ہیں۔ اس قوم کی اصل گمراہی شرک تھی نہ کہ انکارِ خدا۔ وہ خدائی کی صفات اور اختیارات میں اور اُس کے حُقوق میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتی تھی۔

۲۸ - یعنی میری طرف سے اس تکذیب کا بدلہ لے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ "پس نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا کہ میں دبا لیا گیا ہوں، اب تو اُن سے بدلہ لے۔" (القمر، آیت ۱۰) اور سورۂ نوح میں فرمایا: وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ "اور نوحؑ نے کہا: "اے میرے پروردگار! اس زمین پر کافروں میں سے ایک بسنے والا بھی نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو رہنے دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان کی نسل سے بدکار منکرینِ حق ہی پیدا ہوں گے۔" (آیت ۲۶-۲۷)

۲۹ - بعض لوگوں نے تنور سے مراد زمین لی ہے، بعض نے زمین کا بلند ترین حصّہ مراد لیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ فَارَ التَّنُّوْرُ کا مطلب طُلوعِ فجر ہے، اور بعض کی رائے میں یہ حمی الوطیس کی طرح ایک استعارہ ہے "ہنگامہ گرم ہو جانے" کے معنٰی میں۔ لیکن کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ قرآن کے الفاظ کو بغیر کسی قرینے کے مجازی معنوں میں لیا جائے، جب کہ ظاہری مفہوم لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ الفاظ پڑھ کر ابتداءً جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، وہ یہی ہے کہ کوئی خاص تنور پہلے سے نامزد کر دیا گیا تھا کہ طوفان کا آغاز اس کے نیچے سے پانی اُبلنے پر ہو گا۔ دوسرے کوئی معنٰی سوچنے کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب کہ آدمی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو کہ اتنا بڑا طوفان ایک تنور کے نیچے سے پانی اُبل پڑنے پر شروع ہوا ہو گا۔ مگر خدا کے معاملات عجیب ہیں۔ وہ جب کسی قوم کی شامت لاتا ہے تو ایسے رُخ سے لاتا ہے جدھر اس کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔

فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جا، اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے، سوائے اُن کے جن کے خلاف پہلے فیصلہ ہو چکا ہے، اور ظالموں کے معاملے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا، یہ اب غرق ہونے والے ہیں۔ پھر جب تو اپنے ساتھیوں سمیت کشتی پر سوار ہو جائے تو کہہ: شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی[۳۰]۔ اور کہہ: پروردگار! مجھ کو برکت والی جگہ اُتار اور تُو بہترین جگہ دینے والا ہے[۳۱]۔"

اِس قصّے میں بڑی نشانیاں ہیں[۳۲]، اور آزمائش تو ہم کر کے ہی رہتے ہیں[۳۳]۔

۳۰- یہ کسی قوم کی انتہائی بداطواری اور خباثت و شرارت کا ثبوت ہے کہ اس کی تباہی پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔

۳۱- "اُتارنے" سے مراد محض اتارنا ہی نہیں ہے، بلکہ عربی محاورے کے مطابق اس میں "میزبانی" کا مفہوم بھی شامل ہے۔ گویا اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! اب ہم تیرے مہمان ہیں اور تو ہی ہمارا میزبان ہے۔

۳۲- یعنی عبرت آموز سبق ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ توحید کی دعوت دینے والے انبیاؑ حق پر تھے اور شرک پر اصرار کرنے والے کفار باطل پر، اور یہ کہ آج وہی صورتِ حال مکے میں درپیش ہے جو کسی وقت حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان تھی، اور اُس کا انجام بھی کچھ اُس سے مختلف ہونے والا نہیں ہے، اور یہ کہ خدا کے فیصلے میں چاہے دیر کتنی ہی لگے مگر فیصلہ آخر کار ہو کر رہتا ہے اور وہ لازماً اہلِ حق کے حق میں اور اہلِ باطل کے خلاف ہوتا ہے۔

۳۳- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آزمائش تو ہمیں کرنی ہی تھی"، یا "آزمائش تو ہمیں کرنی ہی ہے"۔ تینوں صورتوں میں مدّعا اس حقیقت پر خبردار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بھی اپنی زمین اور اس کی بے شمار چیزوں پر اقتدار عطا کر کے بس یونہی اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اس کی آزمائش کرتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح استعمال کر رہی ہے۔ قومِ نوحؑ کے ساتھ جو کچھ ہوا اسی قانون کے مطابق ہوا، اور دوسری کوئی قوم بھی اللہ

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا

---

ان کے بعد ہم نے ایک دوسرے دَور کی قوم اُٹھائی۔[۳۴] پھر ان میں خود انھی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انھیں دعوت دی) کہ اللہ کی بندگی کرو، تمھارے لیے اُس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ع اُس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا، جن کو ہم نے دُنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا،[۳۵] وہ کہنے لگے: "یہ شخص کچھ

---

کی ایسی چہیتی نہیں ہے کہ وہ بس اسے خوانِ یغما پر ہاتھ مارنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ اس معاملے سے ہر ایک کو لازماً سابقہ پیش آنا ہے۔

۳۴۔ بعض لوگوں نے اس سے مراد قوم ثمود لی ہے، کیونکہ آگے چل کر ذکر آ رہا ہے کہ یہ قوم صَیْحَہ کے عذاب سے تباہ کی گئی، اور دوسرے مقامات پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ثمود وہ قوم ہے جس پر یہ عذاب آیا۔ (ہود: ۶۷۔ الحِجر: ۸۳۔ القمر: ۳۱) بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ ذکر دراصل قومِ عاد کا ہے، کیونکہ قرآن کی رُو سے قوم نوحؑ کے بعد یہی قوم اُٹھائی گئی تھی، وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اَعراف، آیت ۶۹) صحیح بات یہی دوسری معلوم ہوتی ہے، کیونکہ "قومِ نوحؑ کے بعد" کا اشارہ اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ رہا صَیْحَہ (چیخ، آوازہ، شور، ہنگامۂ عظیم) تو محض اس کی مناسبت اس قوم کو ثمود قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ لفظ جس طرح اُس آوازۂ تُند کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہلاکتِ عام کی موجب ہو، اسی طرح اس شور و ہنگامہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو ہلاکتِ عام کے وقت برپا ہوا کرتا ہے، خواہ سببِ ہلاکت کچھ ہی ہو۔

۳۵۔ یہ خصوصیات لائقِ غور ہیں۔ پیغمبر کی مخالفت کے لیے اُٹھنے والے اصل لوگ وہ تھے جنھیں قوم کی سرداری حاصل تھی۔ ان سب کی مشترک گمراہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے منکر تھے، اس لیے خدا کے سامنے کسی ذمّہ داری و جواب دِہی کا انھیں اندیشہ نہ تھا، اور اسی لیے وہ دُنیا کی اِس زندگی پر فریفتہ تھے اور "مادّی فلاح و بہبود" سے بلند تر کسی قدر کے قائل نہ تھے۔ پھر اس گمراہی میں جس چیز نے ان کو بالکل ہی غرق کر دیا تھا، وہ خوش حالی و آسودگی تھی جسے وہ اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ عقیدہ، وہ نظامِ اخلاق، اور وہ طرزِ زندگی غلط بھی ہو سکتا ہے جس پر چل کر انھیں دُنیا میں یہ کچھ کامیابیاں نصیب ہو رہی ہیں۔ انسانی تاریخ بار بار اس حقیقت کو دُہراتی رہی ہے کہ دعوتِ حق کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ انھی تین خصوصیات کے حامل لوگ ہوئے ہیں۔ اور یہی اُس وقت کا منظر بھی تھا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکے

هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ ۳۳ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ ۳۴ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ ۳۵ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ ۳۶ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ ۳۷ اِنْ هُوَ اِلَّا

نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے[۳۶]۔ یہ تمھیں اِطّلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے، اُس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید، بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دُنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے

میں اصلاح کی سعی فرما رہے تھے۔

۳۶- بعض لوگوں نے یہ غلط سمجھا ہے کہ یہ باتیں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نہیں، یہ خطاب دراصل عوام الناس سے تھا۔ سردارانِ قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثّر ہو جائیں گے، اور ان کے متاثّر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انھوں نے یہ تقریریں کر کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ یہ اُسی معاملے کا ایک دوسرا پہلو ہے جو اُوپر سردارانِ قومِ نوحؑ کے ذکر میں بیان ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے، محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کرا رہی ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ بھائیو! ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے۔ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اِس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر کیوں یہ بڑا بنے اور تم اِس کے فرمان کی اطاعت کرو؟ ان تقریروں میں یہ بات گویا بلانزاع تسلیم شدہ تھی کہ ہم جو تمھارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے، ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیرِ بحث ہماری سرداری نہیں ہے، کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے، البتہ زیرِ بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات سردارانِ قومِ نوحؑ کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، جن کے نزدیک قابلِ الزام اگر کوئی چیز تھی تو وہ ''اقتدار کی بھوک'' تھی جو کسی نئے آنے والے کے اندر محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہ کیا جا سکے۔ رہا ان کا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے، جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابلِ اعتراض نہیں۔

رَجُلُ ۨافۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا وَّ مَا نَحۡنُ لَہٗ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیۡلٍ لَّیُصۡبِحُنَّ نٰدِمِیۡنَ ﴿ۚ۴۰﴾ فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ بِالۡحَقِّ فَجَعَلۡنٰہُمۡ غُثَآءً ۚ فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾ ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قُرُوۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿ؕ۴۲﴾ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَ مَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿ؕ۴۳﴾ ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوۡلُہَا کَذَّبُوۡہُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَہُمۡ بَعۡضًا وَّ جَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۙ۴۵﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ

---

نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے،[۳۶ الف] اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں۔" رسول نے کہا: "پروردگار! اِن لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے، اس پر اب تُو ہی میری نصرت فرما۔" جواب میں ارشاد ہوا: "قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔" آخرِ کار ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامۂ عظیم نے ان کو آلیا اور ہم نے ان کو کچرا[۳۷] بنا کر پھینک دیا ــــــ دُور ہو ظالم قوم!

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اُٹھائیں۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھیر سکی۔ پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا، اُس نے اُسے جھُٹلایا، اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا ــــــ پھِٹکار اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے![۳۸]

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور کھُلی سند[۳۹] کے ساتھ فرعون اور اس کے

---

۳۶، الف۔ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے یہ لوگ بھی منکر نہ تھے، ان کی بھی اصل گمراہی شرک ہی تھی۔ دوسرے مقامات پر بھی قرآنِ مجید میں اس قوم کا یہی جرم بیان کیا گیا ہے۔ مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۷۰۔ ہود: ۵۳-۵۴۔ حٰم السجدہ: ۱۴۔ الاحقاف: ۲۱-۲۲

۳۷۔ اصل میں لفظ غُثَآءً استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: وہ کُوڑا کرکٹ جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہوا آتا ہے اور پھر کناروں پر لگ کر پڑا سڑتا رہتا ہے۔

وَمَلَاۡئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ۚ﴿۴۶﴾ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ۚ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوۡهُمَا فَكَانُوۡا مِنَ الۡمُهۡلَكِيۡنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبۡوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيۡنٍ ﴿۵۰﴾ ع

اَعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے تکبّر کیا اور بڑی دُون کی لی۔[۴۰] کہنے لگے: ”کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟[۴۰ الف] اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔[۴۱]“ پس اُنھوں نے دونوں کو جُھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والوں میں جا ملے۔[۴۲] اور موسیٰؑ کو ہم نے کتاب عطا فرمائی، تاکہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں۔

اور ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشان بنایا[۴۳] اور ان کو ایک سطحِ مُرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔[۴۴] ع

---

۳۸ — یا بالفاظِ دیگر، پیغمبروں کی بات نہیں مانتے۔

۳۹ — ”نشانیوں“ کے بعد ”کُھلی سند“ سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان نشانیوں کا ان کے ساتھ ہونا ہی اس بات کی کھلی سند تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ یا پھر نشانیوں سے مراد عصا کے سوا دوسرے وہ تمام معجزات ہیں جو مصر میں دکھائے گئے تھے، اور کھلی سند سے مراد عصا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے جو معجزے رُونما ہوئے، اُن کے بعد تو یہ بات بالکل ہی واضح ہو گئی تھی کہ یہ دونوں بھائی مامور من اللہ ہیں۔ (تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرُف، حواشی ۴۳-۴۴)

۴۰ — اصل میں وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ کے الفاظ ہیں، جن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ بڑے گھمنڈی، ظالم اور دراز دست تھے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بڑے اُونچے بنے اور انھوں نے بڑی دوں کی لی۔

۴۰، الف — تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: حاشیہ ۲۶۔

۴۱ — اصل الفاظ ہیں: ”جن کی قوم ہماری عابد ہے“۔ عربی زبان میں کسی کا ”مطیع فرمان“ ہونا اور ”اس کا عبادت گزار“ ہونا، دونوں تقریباً ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ جو کسی کی بندگی و اطاعت کرتا ہے، وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے۔ اس سے بڑی اہم روشنی پڑتی ہے لفظ ”عبادت“ کے معنیٰ پر اور انبیا علیہم السلام کی اس دعوت پر کہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے سوا ہر ایک کی عبادت چھوڑ دینے کی تلقین جو وہ کرتے تھے، اس کا پورا مفہوم کیا تھا۔ ”عبادت“ ان کے نزدیک صرف ”پوجا“ نہ تھی۔ ان کی دعوت یہ نہیں تھی کہ صرف پوجا اللہ کی کرو، باقی بندگی و اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ وہ انسان کو اللہ کا پرستار بھی بنانا چاہتے تھے اور مطیع فرمان بھی، اور ان دونوں معنوں کے لحاظ سے دوسروں کی عبادت کو غلط ٹھیراتے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰)

يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۱ۭ

اے پیغمبرو[۴۵]! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح[۴۶]، تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں اس کو خوب جانتا ہوں۔

۴۲ – قصۂ موسیٰؑ و فرعون کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۴۹–۵۰، الاعراف: ۱۰۳ تا ۱۳۶، یونُس: ۷۵ تا ۹۲، ہود: ۹۶ تا ۹۹، بنی اسرائیل: ۱۰۱ تا ۱۰۴، طٰہٰ: ۹ تا ۸۰۔

۴۳ – یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابنِ مریمؑ تھے اور ایک نشانی خود مریمؑ۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریمؑ اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریمؑ کا پیدا ہونا، اور مرد کی صحبت کے بغیر مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی پیدایشِ بے پدر کے منکر ہیں، وہ ماں اور بیٹے کے ایک آیت ہونے کی کیا توجیہ کریں گے؟ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۴–۵۳۔ النساء، حواشی ۱۹۰–۲۱۲–۲۱۳۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲۔ الانبیاء، حواشی ۸۹–۹۰) یہاں دو باتیں اور بھی قابلِ توجہ ہیں: اوّل، یہ کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدۂ ماجدہ کا معاملہ جاہل انسانوں کی ایک دوسری کمزوری کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُوپر جن انبیاؑ کا ذکر تھا، اُن پر تو ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ تم بشر ہو، بھلا بشر بھی کہیں نبی ہو سکتا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کے جب لوگ معتقد ہوئے تو پھر ایسے ہوئے کہ انھیں بَشَرِیّت کے مَقام سے اُٹھا کر خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوم، یہ کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدایش، اور ان کی گہوارے والی تقریر سے اس کے معجزہ ہونے کا کھلا کھلا ثبوت دیکھ لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کیا اور حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی، اُن کو پھر سزا بھی ایسی دی گئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُنیا کے سامنے ایک نمونۂ عبرت بن گئی۔

۴۴ – مختلف لوگوں نے اس سے مختلف مقامات مراد لیے ہیں۔ کوئی دِمَشق کہتا ہے، کوئی الرَّملَہ، کوئی بیت المَقدِس، اور کوئی مصر۔ مسیحی رِوایات کے مطابق حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبُور ہوئیں۔ پہلے ہیرودِیس بادشاہ کے عہد میں وہ انھیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں۔ پھر اَرخِلاوُس کے عہدِ حکومت میں اِن کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی۔ (مَتّی ۲–۱۳ تا ۲۳) اب یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ قرآن کا اشارہ کس مَقام کی طرف ہے۔ لغت میں رَبْوَہ اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گرد و پیش کے علاقے سے اُونچی ہو۔ ذاتِ قرار سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت کی سب چیزیں پائی جاتی ہوں اور رہنے والا وہاں بفراغت زندگی بسر کر سکتا ہو۔ اور مَعِین سے مراد ہے: بہتا ہوا پانی یا چشمۂ جاری۔

۴۵ – پچھلے دوُرکوعوں میں متعدِّد انبیاؑ کا ذکر کرنے کے بعد اب یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کہہ کر تمام پیغمبروں کو خطاب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں یہ سارے پیغمبر یک جا موجود تھے اور ان سب کو خطاب کر کے یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا۔ بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر زمانے میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں میں آنے والے انبیاؑ کو یہی ہدایت کی گئی تھی، اور سب کے سب اختلافِ زمانہ و مَقام کے باوجود ایک ہی حکم کے مخاطب تھے۔ بعد کی آیت میں چونکہ تمام انبیاؑ کو ایک اُمّت، ایک جماعت، ایک گروہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے طرزِ بیان یہاں ایسا اختیار کیا گیا کہ نگاہوں کے سامنے ان سب کے ایک گروہ ہونے کا نقشہ

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳ فَذَرْهُمْ فِيْ

اور یہ تمھاری اُمّت ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، پس مجھی سے تم ڈرو۔[۴۷]
مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، اُسی میں وہ مگن ہے[۴۸] ______ اچھا، تو چھوڑو انھیں، ڈوبے

کھنچ جائے۔ گویا وہ سارے کے سارے ایک جگہ جمع ہیں اور سب کو ایک ہی ہدایت دی جا رہی ہے۔ مگر اس طرزِ کلام کی لطافت اس دَور کے بعض کُند ذہن لوگوں کی سمجھ میں نہ آ سکی اور وہ اس سے یہ نتیجہ نکال بیٹھے کہ یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے انبیاؑ کی طرف ہے، اور اس سے حضورؐ کے بعد بھی سلسلۂ نبوت کے جاری ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ تعجب ہے، جو لوگ زبان و ادب کے ذوقِ لطیف سے اس قدر کورے ہیں، وہ قرآن کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

۴۶ – پاک چیزوں سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو بجائے خود بھی پاکیزہ ہوں، اور پھر حلال طریقے سے بھی حاصل ہوں۔ طیّبات کھانے کی ہدایت کر کے رہبانیت اور دُنیا پرستی کے درمیان اسلام کی راہِ اعتدال کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ مسلمان نہ تو راہب کی طرح اپنے آپ کو پاکیزہ رزق سے محروم کرتا ہے، اور نہ دُنیا پرست کی طرح حرام و حلال کی تمیز کے بغیر ہر چیز پر منہ مار دیتا ہے۔

عملِ صالح سے پہلے طیّبات کھانے کی ہدایت سے صاف اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ حرام خوری کے ساتھ عملِ صالح کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ صلاح کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ آدمی رزقِ حلال کھائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ ”لوگو! اللہ خود پاک ہے، اس لیے پاک ہی چیز کو پسند کرتا ہے۔“ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا: الرجل یطیل السفر اشعث اغبر ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام یمد یدیه الی السماء یا رب یا رب فانی یستجاب لذالك ”ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار آلود و پراگندہ مُو آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دُعائیں مانگتا ہے، یا رب یا رب! مگر حال یہ ہوتا ہے کہ روٹی اس کی حرام، کپڑے اس کے حرام، اور جسم اس کا حرام کی روٹیوں سے پلا ہوا۔ اب کس طرح ایسے شخص کی دُعا قبول ہو۔“ (مسلم، ترمذی، احمد من حدیثِ ابی ہریرہؓ)

۴۷ – ”تمھاری امت ایک ہی اُمّت ہے“، یعنی تم ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ ”اُمّت“ کا لفظ اُس مجموعۂ افراد پر بولا جاتا ہے جو کسی اصلِ مشترک پر جمع ہو۔ انبیاؑ چونکہ اختلافِ زمانہ و مقام کے باوجود ایک عقیدے، ایک دین اور ایک دعوت پر جمع تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ ان سب کی ایک ہی اُمّت ہے۔ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے کہ وہ اصلِ مشترک کیا تھی جس پر سب انبیاؑ جمع تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: البقرہ، آیات ۱۳۰ تا ۱۳۳–۲۱۳۔ آلِ عمران: ۱۹–۲۰–۳۳–۳۴–۶۴–۷۹ تا ۸۵۔ النساء: ۱۵۰ تا ۱۵۲۔ الاعراف: ۵۹–۶۵–۷۳–۸۵۔ یوسف: ۳۷ تا ۴۰۔ مریم: ۴۹ تا ۵۹۔ الانبیاء: ۷۱ تا ۹۳۔

غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٥٤﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ

رہیں اپنی غفلت میں ایک وقتِ خاص تک۔[۴۹]

کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو اِنھیں مال اولاد سے مدد دیے جا رہے ہیں تو گویا اِنھیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا اِنھیں شعور نہیں ہے۔[۵۰] بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور

۴۸ – یہ محض بیانِ واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس اِستدلال کی ایک کڑی بھی ہے جو آغازِ سورہ سے چلا آ رہا ہے۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک تمام انبیاؑ یہی توحید اور عقیدۂ آخرت کی تعلیم دیتے رہے ہیں، تو لامحالہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی اسلام ہے، اور دوسرے تمام مذاہب جو آج پائے جاتے ہیں، وہ اسی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، جو اس کی بعض صداقتوں کو مسخ کر کے اور اس کے اندر بعض من گھڑت باتوں کا اضافہ کر کے بنالی گئی ہیں۔ اب اگر غَلَطی پر ہیں تو وہ لوگ ہیں جو اُن مذاہب کے گرویدہ ہو رہے ہیں، نہ کہ وہ جو ان کو چھوڑ کر اصل دین کی طرف بلا رہا ہے۔

۴۹ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک خلا ہے جسے بھرنے کے بجائے سامع کے تخیُّل پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ اس کو تقریر کا پَس منظر خود بھر رہا ہے۔ پَس منظر یہ ہے کہ خدا کا ایک بندہ پانچ چھ سال سے لوگوں کو اصل دین کی طرف بلا رہا ہے، دلائل سے بات سمجھا رہا ہے، تاریخ سے نظیریں پیش کر رہا ہے، اس کی دعوت کے اثرات و نتائج عملاً نگاہوں کے سامنے آ رہے ہیں، اور پھر اس کا ذاتی کردار بھی اس امر کی ضمانت دے رہا ہے کہ وہ ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگ صرف یہی نہیں کہ اُس باطل میں مگن ہیں جو اُن کو باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا، اور صرف اِس حد تک بھی نہیں کہ وہ اُس حق کو مان کر نہیں دیتے جو روشن دلائل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ وہ ہاتھ دھو کر اس داعیِ حق کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور ہٹ دھرمی، طعن، ملامت، ظلم، جھوٹ، غرض کوئی بُری سے بُری تدبیر بھی اس کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اس صورتِ حال میں اصل دینِ حق کی وحدت، اور بعد کے ایجاد کردہ مذاہب کی حقیقت بیان کرنے کے بعد یہ کہنا کہ ”چھوڑو انھیں، ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں“، خود بخود اس معنٰی پر دلالت کرتا ہے کہ ”اچھا، اگر یہ لوگ نہیں مانتے اور اپنی گمراہیوں ہی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو چھوڑو انھیں۔“ اس ”چھوڑو“ کو بالکل لفظی معنوں میں لے کر یہ سمجھ بیٹھنا کہ ”اب تبلیغ ہی نہ کرو“، کلام کے تیوروں سے نا آشنائی کا ثبوت ہوگا۔ ایسے مواقع پر یہ بات تبلیغ و تلقین سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ غافلوں کو جھنجوڑنے کے لیے کہی جایا کرتی ہے۔ پھر ”ایک وقتِ خاص تک“ کے الفاظ میں ایک بڑی گہری تنبیہ ہے جو یہ بتا رہی ہے کہ غفلت کا یہ استغراق زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گا، ایک وقت آنے والا ہے جب یہ چونک پڑیں گے اور انھیں پتا چل جائے گا کہ بلانے والا جس چیز کی طرف بلا رہا تھا وہ کیا تھی، اور یہ جس چیز میں مگن تھے وہ کیسی تھی۔

۵۰- اس مقام پر آغازِ سورہ کی آیتوں پر پھر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اُسی مضمون کو اب پھر ایک دوسرے انداز سے دُہرایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ ''فلاح'' اور ''خیر'' اور ''خوش حالی'' کا ایک محدود مادّی تصور رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک جس نے اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا گھر پا لیا، جو مال و اولاد سے نواز دیا گیا، اور جسے معاشرے میں نام و نمود اور رُسُوخ و اثر حاصل ہو گیا، اس نے بس فلاح پا لی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا، وہ ناکام و نامراد رہا۔ اس بنیادی غلط فہمی سے وہ پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اور وہ یہ تھی کہ جسے اس معنیٰ میں فلاح نصیب ہے، وہ ضرور راہِ راست پر ہے، بلکہ خدا کا محبُوب ہے، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ اسے یہ کامیابیاں حاصل ہوتیں۔ اور اس کے برعکس جو اس فلاح سے ہم کو عَلانِیَہ محروم نظر آ رہا ہے، وہ یقیناً عقیدے اور عمل میں گمراہ اور خدا (یا خداؤں) کے غضب میں گرفتار ہے۔ اس غلط فہمی کو، جو درحقیقت مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کی ضلالت کے اہم ترین اسباب میں سے ہے، قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے، مختلف طریقوں سے اس کی تردید کی گئی ہے، اور طرح طرح سے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیت ۱۲۶-۲۱۲۔ الاعراف: ۳۲۔ التوبہ: ۵۵-۶۹-۸۵۔ یونس: ۱۷۔ ہود: ۳-۲۷ تا ۳۱-۳۸-۳۹۔ الرعد: ۲۶۔ الکہف: ۲۸-۳۲ تا ۴۳-۱۰۳ تا ۱۰۵۔ مریم: ۷۷ تا ۸۰۔ طٰہٰ: ۱۳۱-۱۳۲۔ الانبیاء: ۴۴- مع حواشی)

اس سلسلے میں چند اہم حقیقتیں ایسی ہیں کہ جب تک آدمی ان کو اچھی طرح نہ سمجھ لے، اس کا ذہن کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔

اوّل یہ کہ ''انسان کی فلاح'' اِس سے وسیع تر اور بلند تر چیز ہے کہ اسے کسی فرد یا گروہ یا قوم کی محض مادّی خوش حالی اور وقتی کامیابی کے معنیٰ میں لے لیا جائے۔

دوم یہ کہ فلاح کو اس محدود معنیٰ میں لینے کے بعد اگر اسی کو حق و باطل اور خیر و شر کا معیار قرار دے لیا جائے تو یہ ایک ایسی بنیادی گمراہی بن جاتی ہے جس سے نکلے بغیر ایک انسان کبھی عقیدہ و فکر اور اَخلاق و سیرت میں راہِ راست پا ہی نہیں سکتا۔

سوم یہ کہ دنیا فی الاصل دار الجزا نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ یہاں اخلاقی جزا و سزا اگر ہے بھی تو بہت محدود پیمانے پر اور ناقص صورت میں ہے، اور امتحان کا پہلو خود اس میں بھی موجود ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لینا کہ یہاں جس کو جو نعمت بھی مل رہی ہے وہ ''انعام'' ہے اور اس کا ملنا انعام پانے والے کے برحق اور صالح اور محبُوبِ رب ہونے کا ثبوت ہے، اور جس پر جو آفت بھی آ رہی ہے وہ ''سزا'' ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سزا پانے والا باطل پر ہے، غیر صالح ہے، اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے، یہ سب کچھ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی بلکہ حماقت ہے، جس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسری چیز ہمارے تصورِ حق اور معیارِ اَخلاق کو بگاڑ دینے والی ہو۔ ایک طالبِ حقیقت کو اوّل قدم پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دُنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں بے شمار مختلف صورتوں سے افراد کا، قوموں کا اور تمام انسانوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان کے دوران میں جو مختلف حالات لوگوں کو پیش آتے ہیں، وہ جزا و سزا کے آخری فیصلے نہیں ہیں کہ انھی کو نظریّات، اخلاق اور اعمال کی صحّت اور غلطی کا معیار بنا لیا جائے، اور انھی کو خدا کے ہاں محبُوب یا مغضوب ہونے کی علامت قرار دے لیا جائے۔

مِّنۡ خَشۡيَةِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۵۸﴾ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ بِرَبِّهِمۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ ۙ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِيۡنَ

سبقت کر کے انھیں پالینے والے[۵۰ الف] تو درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں[۵۱]، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں[۵۲]، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے[۵۳]، اور جن کا حال یہ ہے

چہارم، یہ کہ فلاح کا دامن یقیناً حق اور نیکی کے ساتھ بندھا ہوا ہے، اور بلا شک و ریب یہ ایک حقیقت ہے کہ باطل اور بدی کا انجام خُسران ہے۔ لیکن اس دُنیا میں چونکہ باطل اور بدی کے ساتھ عارضی و نمایشی فلاح، اور اسی طرح حق اور نیکی کے ساتھ ظاہری اور وقتی خُسران ممکن ہے، اور اکثر و بیشتر یہ چیز دھوکا دینے والی ثابت ہوتی ہے، اس لیے حق و باطل اور خیر و شر کی جانچ کے لیے ایک مستقل کَسَوٹی کی ضرورت ہے جس میں دھوکے کا خطرہ نہ ہو۔ انبیا علیہم السلام کی تعلیمات اور آسمانی کتابیں ہم کو وہ کسوٹی بہم پہنچاتی ہیں، انسانی عقلِ عام (common sense) اس کی صحت کی تصدیق کرتی ہے اور معروف و مُنکَر کے متعلق نوعِ انسانی کے مشترک وجدانی تصورات اُس پر گواہی دیتے ہیں۔

پنجم، یہ کہ جب کوئی شخص یا قوم ایک طرف تو حق سے منحرف اور فِسق و فُجور اور ظلم و طُغیان میں مبتلا ہو، اور دوسری طرف اس پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہو، تو عقل اور قرآن دونوں کی رُو سے یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ خدا نے اس کو شدید تر آزمایش میں ڈال دیا ہے اور اس پر خدا کی رحمت نہیں بلکہ اس کا غضب مسلط ہو گیا ہے۔ اسے غَلَطی پر چوٹ لگتی تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے کہ خدا ابھی اس پر مہربان ہے، اسے تنبیہ کر رہا ہے اور سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔ لیکن غلطی پر "انعام" یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اسے سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، اور اس کی کشتی اس لیے تیر رہی ہے کہ خوب بھر کر ڈوبے۔ اس کے برعکس جہاں ایک طرف سچّی خدا پرستی ہو، اَخلاق کی پاکیزگی ہو، معاملات میں راست بازی ہو، خلقِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک اور رحمت و شفقت ہو، اور دوسری طرف مصائب اور شدائد اس پر موسلا دھار برس رہے ہوں اور چوٹوں پر چوٹیں اسے لگ رہی ہوں، تو یہ خدا کے غضب کی نہیں، اس کی رحمت ہی کی علامت ہے۔ سُنار اس سونے کو تپا رہا ہے تاکہ خوب نکھر جائے اور دنیا پر اس کا کامل العِیار ہونا ثابت ہو جائے۔ دنیا کے بازار میں اس کی قیمت نہ بھی اُٹھے تو پروا نہیں۔ سُنار خود اس کی قیمت دے گا، بلکہ اپنے فضل سے مزید عطا کرے گا۔ اس کے مصائب اگر غضب کا پہلو رکھتے ہیں تو خود اس کے لیے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں ہی کے لیے رکھتے ہیں، یا پھر اس سوسائٹی کے لیے جس میں صالحین ستائے جائیں اور فُسّاق نوازے جائیں۔

۵۰، الف۔ اُردو زبان کی رعایت سے ہم نے آیت ۶۱ کا ترجمہ پہلے کر دیا ہے اور آیات ۵۷ تا ۶۰ کا ترجمہ بعد میں کیا ہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ آیت ۶۱ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

۵۱ – یعنی وہ دُنیا میں خدا سے بے خوف اور بے فکر ہو کر نہیں رہتے کہ جو دل چاہے کرتے رہیں اور کبھی نہ سوچیں

يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ

کر دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل اُن کے اِس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے[۵۴]۔ وہی بھلائیوں

کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ظلم اور زیادتی پر پکڑنے والا ہے، بلکہ ان کے دل میں ہر وقت اس کا خوف رہتا ہے اور وہی انھیں برائیوں سے روکتا رہتا ہے۔

**۵۲** – آیات سے مراد دونوں طرح کی آیات ہیں، وہ بھی جو خدا کی طرف سے اس کے انبیاؑ پیش کرتے ہیں، اور وہ بھی جو انسان کے اپنے نفس میں اور ہر طرف آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آیاتِ کتاب پر ایمان لانا اُن کی تصدیق کرنا ہے، اور آیاتِ آفاق و اَنفُس پر ایمان لانا اُن حقیقتوں پر ایمان لانا ہے جن پر وہ دلالت کر رہی ہیں۔

**۵۳** – اگرچہ آیات پر ایمان سے خود ہی یہ لازم آتا ہے کہ انسان توحید کا قائل و معتقد ہو، لیکن اس کے باوجود شرک نہ کرنے کا ذکر الگ اس لیے کیا گیا ہے کہ بسا اوقات انسان آیات کو مان کر بھی کسی نہ کسی طور کے شرک میں مبتلا رہتا ہے۔ مثلاً ریا، کہ وہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ یا انبیا اور اولیا کی تعظیم میں ایسا مبالغہ جو شرک تک پہنچا دے۔ یا غیر اللہ سے دُعا اور استعانت۔ یا برضا و رغبت اربابٌ من دُون اللہ کی بندگی و اطاعت اور غیر الٰہی قوانین کا اتباع۔ پس ایمان بآیاتِ اللہ کے بعد شرک کی نفی کا الگ ذکر کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اللہ کے لیے اپنی بندگی، اطاعت اور عُبودیّت کو بالکل خالص کر لیتے ہیں، اس کے ساتھ کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک لگا نہیں رکھتے۔

**۵۴** – عربی زبان میں "دینے" (ایتاء) کا لفظ صرف مال یا کوئی مادّی چیز دینے ہی کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے کہتے ہیں: اٰتیتہٗ من نفسی القبول۔ کسی شخص کی اطاعت سے انکار کر دینے کے لیے کہتے ہیں: اٰتیتہ من نفسی الابائۃ۔ پس اس دینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ راہِ خدا میں مال دیتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب اللہ کے حضور طاعت و بندگی پیش کرنے پر بھی حاوی ہے۔

اسی معنیٰ کے لحاظ سے آیت کا پورا مفہوم یہ ہوا کہ وہ اللہ کی فرماں برداری میں جو کچھ بھی نیکیاں کرتے ہیں، جو کچھ بھی خدمات انجام دیتے ہیں، جو کچھ بھی قربانیاں کرتے ہیں، ان پر وہ پُھولتے نہیں ہیں، غرورِ تقویٰ اور پِندارِ خدا رسیدگی میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ اپنے مقدور بھر سب کچھ کر کے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ خدا جانے یہ قبول ہو یا نہ ہو، ہمارے گناہوں کے مقابلے میں وزنی ثابت ہو یا نہ ہو، ہمارے رب کے ہاں ہماری مغفرت کے لیے کافی ہو یا نہ ہو۔ یہی مطلب ہے جس پر وہ حدیث روشنی ڈالتی ہے جو احمد، تِرمِذی، ابنِ ماجہ، حاکم اور ابنِ جَرِیر نے نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص چوری اور زِنا اور شراب نوشی کرتے ہوئے اللہ سے ڈرے؟" اس سوال سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اسے يَاْتُوْنَ مَآ اَتَوْا کے معنیٰ میں لے رہی تھیں، یعنی "کرتے ہیں جو کچھ بھی کرتے ہیں"۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یا بنت الصدیق ولٰکنہ الذی یصلی ویصوم ویتصدق وھو یخاف اللّٰہ عزوجلّ، "نہیں، اے صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور پھر اللہ عَزّ و جَلّ سے ڈرتا رہتا ہے۔"

فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ

کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انھیں پالینے والے ہیں۔ ہم کسی شخص کو[۵۴ الف] اس کی مَقدِرَت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے[۵۵]، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے، جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے[۵۶]، اور لوگوں پر ظلم بہر حال نہیں کیا جائے گا[۵۷]۔ مگر یہ لوگ اس معاملے سے

---

اس جواب سے پتا چلا کہ آیت کی صحیح قراءت یَاْتُوْنَ نہیں بلکہ یُؤْتُوْنَ ہے، اور یہ یُؤْتُوْنَ صرف مال دینے کے محدود معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ طاعت بجا لانے کے وسیع معنیٰ میں ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک مومن کس قلبی کیفیت کے ساتھ اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اس کی مکمل تصویر حضرت عمرؓ کی وہ حالت ہے کہ عمر بھر کی بے نظیر خدمات کے بعد جب دنیا سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو خدا کے محاسبے سے ڈرتے ہوئے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر آخرت میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے خوب کہا ہے کہ مومن طاعت کرتا ہے پھر بھی ڈرتا رہتا ہے، اور منافق مَعصِیَت کرتا ہے پھر بھی بے خوف رہتا ہے۔

۵۴، الف — واضح رہے کہ آیت ۶۱ کا ترجمہ آیات ۵۷ تا ۶۰ کے ترجمے سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں سے آیت ۶۲ کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

۵۵ — اس سیاق وسباق میں یہ فقرہ اپنے اندر بڑی گہری معنویّت رکھتا ہے، جسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پچھلی آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ بھلائیاں لُوٹنے والے اور سبقت کر کے انھیں پالینے والے دراصل کون لوگ ہیں اور ان کی صفات کیا ہیں۔ اس مضمون کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ہم کسی کو اس کی مَقدِرَت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ سیرت، یہ اخلاق اور یہ کردار کوئی فوق البشری چیز نہیں ہے۔ تم ہی جیسے گوشت پوست کے انسان اس رَوِش پر چل کر دکھا رہے ہیں۔ لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو انسانی مَقدِرَت سے باہر ہے۔ انسان کو تو مَقدِرَت اُس رَوِیّے کی بھی حاصل ہے جس پر تم چل رہے ہو، اور اُس کی بھی حاصل ہے جس پر تمھاری اپنی قوم کے چند اہلِ ایمان چل رہے ہیں۔ اب فیصلہ جس چیز پر ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ان دونوں امکانی رَوِیّوں میں سے کون کس کا انتخاب کرتا ہے۔ اس انتخاب میں غَلَطی کر کے اگر آج تم اپنی ساری محنتیں اور کوششیں بُرائیاں سمیٹنے میں صَرف کر دیتے ہو اور بھلائیوں سے محروم رہ جاتے ہو، تو کل اپنی اس حماقت کا خمیازہ بھگتنے سے تم کو یہ جھوٹی معذرت نہیں بچا سکے گی کہ بھلائیوں تک پہنچنے کا راستہ ہماری مَقدِرَت سے باہر تھا۔ اُس وقت یہ عذر پیش کرو گے تو تم سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ راستہ انسانی مَقدِرَت سے باہر تھا تو تم ہی جیسے بہت سے انسان اس پر چلنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔

۵۶ — کتاب سے مراد ہے نامۂ اعمال، جو ہر ایک شخص کا الگ الگ مرتّب ہو رہا ہے، جس میں اس کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت، حتّٰی کہ خیالات اور ارادوں تک کی ایک ایک حالت ثبت کی جا رہی ہے۔ اسی کے متعلق سورۂ کہف

مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

بے خبر ہیں[58]۔ اور ان کے اعمال بھی اُس طریقے سے (جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) مختلف ہیں۔ وہ اپنے یہ کرتوت کیے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ جب ہم اُن کے عیّاشوں کو عذاب میں پکڑ لیں گے[59] تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں گے[60] ـــــ اب[61] بند کرو اپنی فریاد و فغاں، ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمھیں نہیں ملنی۔ میری آیات سُنائی جاتی تھیں تو تم (رسول کی آواز سنتے ہی) اُلٹے پاؤں

میں فرمایا گیا ہے کہ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝ ”اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا، پھر تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اُس کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے، اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ایسی نہیں رہ گئی جو اس میں درج نہ ہو۔ جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“ (آیت ۴۹) بعض لوگوں نے یہاں کتاب سے مراد قرآن لے کر آیت کا مطلب خبط کر دیا ہے۔

۵۷ - یعنی نہ تو کسی کے ذمّے کوئی ایسا الزام تھوپا جائے گا جس کا وہ درحقیقت قصوروار نہ ہو، نہ کسی کی کوئی ایسی نیکی ماری جائے گی جس کے صلے کا وہ فی الواقع مستحق ہو، نہ کسی کو بے جا سزا دی جائے گی اور نہ کسی کو حق کے مطابق بجا انعام سے محروم رکھا جائے گا۔

۵۸ - یعنی اس امر سے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، کہہ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں، یہ سب کچھ کہیں درج ہو رہا ہے اور کبھی اس کا حساب ہونے والا ہے۔

۵۹ - ”عیّاش“ یہاں مُتْرَفِيْنَ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ مُتْرَفِيْنَ اصل میں اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو دنیوی مال و دولت کو پا کر مزے کر رہے ہوں اور خدا و خلق کے حُقوق سے غافل ہوں۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم لفظ عیّاش سے ادا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اسے صرف شہوت رانی کے معنیٰ میں نہ لیا جائے بلکہ عیش کوشی کے وسیع تر معنوں میں لیا جائے۔

عذاب سے مراد یہاں غالباً آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ دنیا کا عذاب ہے جو اِسی زندگی میں ظالموں کو دیکھنا پڑے۔

۶۰ - اصل میں لفظ جؤار استعمال کیا گیا ہے جو بیل کی اُس آواز کو کہتے ہیں جو سخت تکلیف کے وقت وہ نکالتا ہے۔ یہ لفظ یہاں محض فریاد و فُغان کے معنیٰ میں نہیں بلکہ اُس شخص کی فریاد و فُغان کے معنیٰ میں بولا گیا ہے جو کسی رحم کا مستحق نہ ہو۔ اس میں تحقیر اور طنز کا انداز چھپا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ ”اچھا، اب جو اپنے کرتوتوں کا مزا چکھنے کی نوبت آئی تو بلبلانے لگے۔“

تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ

بھاگ نکلتے تھے[٦٢]، اپنے گھمنڈ میں اُس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے، اپنی چوپالوں میں اُس پر باتیں چھانٹتے[٦٣] اور بکواس کیا کرتے تھے۔

تو کیا اِن لوگوں نے کبھی اِس کلام پر غور نہیں کیا؟[٦٤] یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی؟[٦٥] یا یہ اپنے رسول سے کبھی کے واقف نہ تھے کہ (اَن جانا آدمی ہونے کے باعث)

---

٦١ – یعنی اُس وقت ان سے یہ کہا جائے گا۔

٦٢ – یعنی اس کی بات سننا تک تمھیں گوارا نہ تھا۔ یہ تک برداشت نہ کرتے تھے کہ اس کی آواز کان میں پڑے۔

٦٣ – اصل میں لفظ ''سٰمِرًا'' استعمال کیا گیا ہے۔ سمر کے معنٰی ہیں: رات کے وقت بات چیت کرنا، گپیں ہانکنا، قصّے کہانیاں کہنا۔ دیہاتی اور قصباتی زندگی میں یہ راتوں کی گپیں عُموماً چوپالوں میں ہُوا کرتی ہیں، اور یہی اہلِ مکّہ کا بھی دستور تھا۔

٦٤ – یعنی کیا ان کے اس رَوِیّے کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کو انھوں نے سمجھا ہی نہیں اس لیے وہ اسے نہیں مانتے؟ ظاہر ہے کہ یہ وجہ نہیں ہے۔ قرآن کوئی چیستان نہیں ہے، کسی نا قابلِ فہم زبان میں نہیں ہے۔ کسی ایسے مضمون اور موضوع کلام پر مشتمل نہیں ہے جو آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ وہ اس کی ایک ایک بات اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ پیش کر رہا ہے اسے نہیں ماننا چاہتے، نہ اس لیے کہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اور سمجھ میں نہ آیا۔

٦٥ – یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نرالی بات پیش کر رہا ہے جس سے انسانی کان کبھی آشنا ہی نہ ہوئے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ وجہ بھی نہیں ہے۔ خدا کی طرف سے انبیاؑ کا آنا، کتابیں لے کر آنا، توحید کی دعوت دینا، آخرت کی باز پرس سے ڈرانا، اور اَخلاق کی معروف بھلائیاں پیش کرنا، اِن میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تاریخ میں آج پہلی مرتبہ رُونما ہوئی ہو، اور اس سے پہلے کبھی اس کا ذکر نہ سُنا گیا ہو۔ ان کے گرد و پیش عراق، شام اور مصر میں انبیا پر انبیا آئے ہیں جنھوں نے یہی باتیں پیش کی ہیں اور یہ لوگ اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ خود ان کی اپنی سرزمین میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام آئے، ہُود اور صالح اور شعیب علیہم السلام آئے، ان کے نام آج تک ان کی زبانوں پر ہیں، ان کو یہ خود فرستادۂ الٰہی مانتے ہیں، اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مشرک نہ تھے بلکہ خدائے واحد کی بندگی سکھاتے تھے۔ اس لیے درحقیقت اِن کے انکار کی یہ وجہ بھی نہیں ہے کہ ایک بالکل ہی انوکھی بات سن رہے ہیں جو کبھی نہ سنی گئی تھی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الفرقان، حاشیہ ۸۴۔ السجدہ، حاشیہ ۵۔ سبا، حاشیہ ۳۵)

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ

اُس سے بِدَکتے ہیں؟[٦٦] یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنُون ہے؟[٦٧] نہیں، بلکہ وہ حق لایا ہے اور

٦٦ – یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل اجنبی آدمی، جس سے یہ کبھی کے واقف نہ تھے، اچانک ان کے درمیان آ کھڑا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے مان لو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی نہیں ہے۔ جو شخص یہ دعوت پیش کر رہا ہے، وہ ان کی اپنی برادری کا آدمی ہے۔ اس کی نسبی شرافت ان سے مخفی نہیں۔ اس کی ذاتی زندگی ان سے چھپی ہوئی نہیں۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی سرحد تک وہ ان کے سامنے پہنچا ہے۔ اس کی صداقت سے، اس کی راست بازی سے، اس کی امانت سے، اس کی بے داغ سیرت سے یہ خوب واقف ہیں۔ اس کو خود امین کہتے رہے ہیں۔ اس کی دیانت پر ان کی ساری برادری بھروسا کرتی رہی ہے۔ اس کے بدترین دشمن تک یہ مانتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اس کی پوری جوانی عفت اور پاک دامنی کے ساتھ گزری ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ نہایت شریف اور نہایت نیک آدمی ہے۔ حلیم ہے۔ حق پسند ہے۔ امن پسند ہے۔ جھگڑوں سے کنارہ کش ہے۔ معاملے میں کھرا ہے۔ قول و قرار کا پکا ہے۔ ظلم نہ خود کرتا ہے نہ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔ کسی حق دار کا حق ادا کرنے میں اُس نے کوتاہی نہیں کی ہے۔ ہر مصیبت زدہ، بے کس، حاجت مند کے لیے اس کا دروازہ ایک رحیم و شفیق ہمدرد کا دروازہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبوت کے دعوے سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ کسی دعوے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اور جس روز اس نے دعویٰ کیا، اس کے بعد سے آج تک وہ ایک ہی بات کہتا رہا ہے۔ کوئی پلٹی اُس نے نہیں کھائی ہے۔ کوئی ردّ و بدل اپنے دعوے اور دعوت میں اس نے نہیں کیا ہے۔ کوئی تدریجی ارتقا اس کے دعووں میں نظر نہیں آتا، کہ کوئی یہ گمان کر سکے کہ آہستہ آہستہ قدم جما جما کر دعووں کی وادی میں پیش قدمی کی جا رہی ہے۔ پھر اس کی زندگی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جو کچھ اس نے دوسروں سے کہا ہے، وہ پہلے خود کر کے دکھایا ہے۔ اس کے قول اور عمل میں تضاد نہیں ہے۔ اس کے پاس ہاتھی کے دانت نہیں ہیں کہ دکھانے کے اور ہوں، اور چبانے کے اور۔ وہ دینے کے باٹ الگ اور لینے کے الگ نہیں رکھتا۔ ایسے جانے بُوجھے اور جانچے پرکھے آدمی کے متعلق وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ "صاحب! دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے، بڑے بڑے فریبی آتے ہیں اور دل موہ لینے والی باتیں کر کے اوّل اوّل اعتبار جما لیتے ہیں، بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سب محض چکما ہی چکما تھا، یہ صاحب بھی کیا خبر، اصل میں کیا ہوں اور بناوٹ کا مُلمّع اُترنے کے بعد کیا کچھ ان کے اندر سے نکل آئے، اس لیے ان کو مانتے ہوئے ہمارا تو ماتھا ٹھنکتا ہے۔" (اس سلسلے میں مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الانعام، حاشیہ ۲۱۔ یونُس، حاشیہ ۲۱۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۵)

٦٧ – یعنی کیا اِن کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ واقعی وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بھی اصلی وجہ نہیں ہے، کیونکہ زبان سے چاہے وہ کچھ ہی کہتے رہیں، دلوں میں تو اُن کی دانائی و زیرکی کے قائل ہیں۔ علاوہ بریں ایک پاگل اور ایک ہوش مند آدمی کا فرق کوئی ایسا چھپا ہوا تو نہیں ہوتا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو۔ آخر ایک ہٹ دھرم اور

اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ ﴿۷۱﴾

حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے ـــــ اور حق اگر کہیں اِن کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا[۶۸] ـــــ نہیں، بلکہ ہم ان کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں[۶۹]۔

بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سُن کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی دیوانے کا کلام ہے، اور اس شخص کی زندگی کو دیکھ کر یہ رائے ظاہر کر سکتا ہے کہ یہ کسی مخبوط الحواس آدمی کی زندگی ہے؟ بڑا ہی عجیب ہے وہ جُنون (یا مُستشرقینِ مغرب کی بکواس کے مطابق مِرگی کا وہ دَورہ) جس میں آدمی کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلے اور جس میں آدمی ایک تحریک کی ایسی کامیاب راہ نمائی کرے کہ اپنے ہی ملک کی نہیں، دنیا بھر کی قسمت بدل ڈالے۔

۶۸ – اس مختصر سے جملے میں ایک بڑی بات کہی گئی ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دُنیا میں نادان لوگوں کی بالعُموم یہ رَوِش ہوتی ہے کہ جو شخص ان سے حق بات کہتا ہے، وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات وہ کہی جائے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، نہ کہ وہ جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ حالانکہ حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہتی ہے، خواہ وہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند۔ تمام دنیا کی مُتَّفِقہ خواہش بھی کسی واقعہ کو غیرِ واقعہ اور کسی امرِ حق کو غیرِ حق نہیں بنا سکتی، کجا کہ حقائق اور واقعات ایک ایک شخص کی خواہشات کے مطابق ڈھلا کریں اور ہر آن بے شمار متضاد خواہشوں سے ہم آہنگ ہوتے رہیں۔ حماقت مآب ذہن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حقیقت اور ان کی خواہش کے درمیان اگر اختلاف ہے تو یہ قصور حقیقت کا نہیں بلکہ ان کے اپنے نفس کا ہے۔ وہ اس کی مخالفت کر کے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اپنا ہی کچھ بگاڑ لیں گے۔ کائنات کا یہ عظیم الشان نظام جن اٹل حقائق اور قوانین پر مبنی ہے، ان کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ اپنے خیالات، خواہشات اور طرزِ عمل کو حقیقت کے مطابق بنائے، اور اس غرض کے لیے ہر وقت دلیل، تجْرِبے اور مشاہدَے سے یہ جاننے کی کوشش کرتا رہے کہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی یہاں یہ طرزِ فکر و عمل اختیار کر سکتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ بیٹھا ہے، یا جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے کہ ہو، یا جو کچھ اپنے تعصُّبات کی بنا پر وہ فرض کر چکا ہے کہ ہے یا ہونا چاہیے، اُس پر جم کر رہ جائے اور اس کے خلاف کسی کی مضبوط سے مضبوط اور معقول سے معقول دلیل کو بھی سننا گوارا نہ کرے۔

۶۹ – یہاں لفظِ ذکر کے تین معنی ممکن ہیں اور تینوں ہی صحیح بیٹھتے ہیں:

(۱) ذکر بمعنٰی بیانِ فطرت۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی دوسرے عالَم کی باتیں نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کی اپنی ہی حقیقت اور فطرت اور اس کے مقتضیات ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، تاکہ وہ اپنے اِس بُھولے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ

کیا تُو ان سے کچھ مانگ رہا ہے؟ تیرے لیے تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔ تُو تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بُلا رہا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، وہ راہِ راست سے

ہوئے سبق کو یاد کریں، مگر وہ اسے قبول کرنے سے کترا رہے ہیں۔ ان کا یہ فرار کسی غیر متعلق چیز سے نہیں بلکہ اپنے ہی ذکر سے ہے۔

(۲) ذکر بمعنیٰ نصیحت۔ اس کی رُو سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، یہ انھی کے بھلے کے لیے ایک نصیحت ہے، اور ان کا یہ فرار کسی اور چیز سے نہیں، اپنی ہی بھلائی کی بات سے ہے۔

(۳) ذکر بمعنیٰ شرف و اعزاز۔ اِس معنیٰ کو اختیار کیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم وہ چیز ان کے پاس لائے ہیں جسے یہ قبول کریں تو انھی کو عزت اور سرفرازی نصیب ہوگی۔ اس سے ان کی یہ رُوگردانی کسی اَور چیز سے نہیں، اپنی ہی ترقی اور اپنے ہی اُٹھان کے ایک زرّین موقع سے رُوگردانی ہے۔

۷۰ – یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے حق میں ایک اور دلیل ہے۔ یعنی یہ کہ آپؐ اپنے اس کام میں بالکل بے لوث ہیں۔ کوئی شخص ایمان داری کے ساتھ یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپؐ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہے ہیں کہ کوئی نفسانی غرض آپؐ کے پیشِ نظر ہے۔ اچھی خاصی تجارت چمک رہی تھی، اب افلاس میں مبتلا ہوگئے۔ قوم میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ہر شخص ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ اب گالیاں اور پتھر کھا رہے ہیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑے ہیں۔ چَین سے اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔ اب ایک ایسی سخت کش مکش میں پڑ گئے ہیں جو کسی دَم قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ بات وہ لے کر اُٹھے ہیں جس کی بدولت سارا ملک دشمن ہوگیا ہے، حتّٰی کہ خود اپنے ہی بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خودغرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خودغرض آدمی اپنی قوم اور قبیلے کے تعصُّبات کا عَلَم بردار بن کر اپنی قابلیت اور جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اُٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصُّبات کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اُس چیز کی جڑ ہی کاٹ دیتی ہے جس پر مشرکینِ عرب میں اس کے قبیلے کی چودھراہٹ قائم ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس کو قرآن میں نہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، بلکہ بالعُموم تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: الاَنعام، آیت ۹۰۔ یونس: ۷۲۔ ہود: ۲۹-۵۱۔ یوسف: ۱۰۴۔ الفرقان: ۵۷۔ الشعراء: ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰۔ سبا: ۴۷۔ یٰسین: ۲۱۔ ص: ۸۶۔ الشوریٰ: ۲۳۔ النجم: ۴۰۔ مع حواشی)

لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾ ع

ع ۴ ۲۷ ۴

ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔[۷۱]

اگر ہم اِن پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں، دُور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔[۷۲] اِن کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے اِنھیں تکلیف میں مبتلا کیا، پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں تو یکایک تم دیکھو گے کہ اس حالت میں یہ ہر خیر سے مایوس ہیں۔[۷۳] ع

۷۱ – یعنی آخرت کے انکار نے ان کو غیر ذمّہ دار، اور احساسِ ذمّہ داری کے فُقدان نے ان کو بے فکر بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب وہ سرے سے یہی نہیں سمجھتے کہ ان کی اس زندگی کا کوئی مآل اور نتیجہ بھی ہے اور کسی کے سامنے اپنے اس پورے کارنامۂ حیات کا حساب بھی دینا ہے، تو پھر انھیں اس کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ جانوروں کی طرح ان کی بھی غایتِ مقصود بس یہ ہے کہ ضروریاتِ نفس و جسم خوب اچھی طرح پوری ہوتی رہیں۔ یہ مقصود حاصل ہو تو پھر حق و باطل کی بحث ان کے لیے محض لایعنی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں کوئی خرابی رونما ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ سوچیں گے، وہ صرف یہ کہ اُس خرابی کا سبب کیا ہے اور اسے کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے۔ راہِ راست اس ذہنیت کے لوگ نہ چاہ سکتے ہیں نہ پا سکتے ہیں۔

۷۲ – اشارہ ہے اُس تکلیف و مصیبت کی طرف جس میں وہ قحط کی بدولت پڑے ہوئے تھے۔ اس قحط کے متعلق روایات نقل کرتے ہوئے بعض لوگوں نے دو قحطوں کے قصّوں کو خَلَط مَلَط کر دیا ہے، جس کی وجہ سے آدمی کو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے یا بعد کا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں اہلِ مکہ کو دو مرتبہ قحط سے سابقہ پیش آیا ہے۔ ایک نبوت کے آغاز سے کچھ مدّت بعد، دوسرا ہجرت کے کئی سال بعد، جب کہ ثُمامہ بن اُثال نے یَمامہ سے مکے کی طرف غلّے کی برآمد روک دی تھی۔ یہاں ذکر دوسرے قحط کا نہیں بلکہ پہلے قحط کا ہے۔ اس کے متعلق صحیحین میں ابنِ مسعودؓ کی یہ رِوایَت ہے کہ جب قریش نے نبیؐ کی دعوت قبول کرنے سے پیہم انکار کیا اور سخت مزاحمت شروع کر دی تو حضورؐ نے دعا کی کہ اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف، ’’خدایا! ان کے مقابلے میں میری مدد یوسفؑ کے ہفت سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر۔‘‘ چنانچہ ایسا سخت قحط شروع ہوا کہ مُردار تک کھانے کی نوبت آگئی۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ

---

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیے۔ مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو[۷۴]۔ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اُسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے[۷۵]۔ کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی؟[۷۶] مگر یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پیش رو

---

اس قحط کی طرف مکی سورتوں میں بکثرت اشارات ملتے ہیں۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: الانعام: ۴۲ تا ۴۴۔ الاعراف: ۹۴ تا ۹۹۔ یونس: ۱۱-۱۲-۲۱۔ النحل: ۱۱۲-۱۱۳۔ الدخان: ۱۰ تا ۱۶۔ مع حواشی)

۷۳ – اصل میں لفظ مُبْلِسُوْنَ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم مایوسی سے ادا نہیں ہوتا۔ بَلَس اور اِبلاس کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حیرت کی وجہ سے دنگ ہو کر رہ جانا۔ خوف اور دہشت کے مارے دم بخود ہو جانا۔ رنج و غم کے مارے دل شکستہ ہو جانا۔ ہر طرف سے نااُمید ہو کر ہمت توڑ بیٹھنا۔ اور اسی کا ایک پہلو مایوسی و نامرادی کی وجہ سے برافروختہ (desperate) ہو جانا بھی ہے، جس کی بنا پر شیطان کا نام ابلیس رکھا گیا ہے۔ اس نام میں یہ معنیٰ پوشیدہ ہیں کہ یاس اور نامرادی (frustration) کی بنا پر اُس کا زخمی تکبّر اس قدر برانگیختہ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان سے ہاتھ دھو کر ہر بازی کھیل جانے اور ہر جرم کا ارتکاب کر گزرنے پر تُلا ہوا ہے۔

۷۴ – مطلب یہ ہے کہ بدنصیبو! یہ آنکھ، کان اور دل و دماغ تم کو کیا اس لیے دیے گئے تھے کہ تم ان سے بس وہ کام لو جو حیوانات لیتے ہیں؟ کیا ان کا صرف یہی مَصرَف ہے کہ تم جانوروں کی طرح جسم اور نفس کے مطالبات پورے کرنے کے ذرائع ہی تلاش کرتے رہو، اور ہر وقت اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تدبیریں ہی سوچتے رہا کرو؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ناشُکری ہو سکتی ہے کہ تم بنائے تو گئے تھے انسان، اور بن کر رہ گئے نرے حیوان؟ جن آنکھوں سے سب کچھ دیکھا جائے مگر حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے نشانات ہی نہ دیکھے جائیں، جن کانوں سے سب کچھ سُنا جائے مگر ایک سبق آموز بات ہی نہ سنی جائے، اور جس دل و دماغ سے سب کچھ سوچا جائے مگر بس یہی نہ سوچا جائے کہ مجھے یہ وجود کیسے ملا ہے، کس لیے ملا ہے اور کیا میری زندگی کی غایت ہے، حیف ہے اگر وہ پھر ایک بیل کے بجائے ایک انسان کے ڈھانچے میں ہوں۔

۷۵ – علم کے ذرائع (حواس اور قوتِ فکر) اور اِن کے مصرفِ صحیح سے انسان کی غفلت پر مُتنبّہ کرنے کے بعد

الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ

---

کہہ چکے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: ”کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں[۷۷]۔“

ان سے کہو: بتاؤ، اگر تم جانتے ہو، کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ کی۔ کہو: پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے[۷۸]؟ ان سے پُوچھو: ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ۔ کہو: پھر تم ڈرتے کیوں نہیں[۸۰]؟ اِن سے کہو: بتاؤ، اگر تم جانتے ہو، کہ ہر چیز پر اقتدار[۸۱]

---

اب اُن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کا مشاہدہ اگر کھلی آنکھوں سے کیا جائے اور جن کی نشان دِہی سے اگر صحیح طور پر اِستِدلال کیا جائے، یا کھلے کانوں سے کسی معقول استدلال کو سنا جائے، تو آدمی حق تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی بے خدا، یا بہت سے خداؤں کا ساختہ و پرداختہ نہیں ہے، بلکہ توحید کی اساس پر قائم ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ یہ بے مقصد نہیں ہے، نرا کھیل اور محض ایک بے معنیٰ طِلسم نہیں ہے، بلکہ ایک مبنی بر حکمت نظام ہے، جس میں انسان جیسی ذی اختیار مخلوق کا غیر جواب دہ ہونا اور بس یونہی مر کر مٹی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

۷۶ — واضح رہے کہ یہاں توحید اور حیات بعد الموت، دونوں پر ایک ساتھ اِستِدلال کیا جا رہا ہے، اور آگے تک جن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اُن سے شرک کے اِبطال اور انکارِ آخرت کے ابطال، دونوں پر دلیل لائی جا رہی ہے۔

۷۷ — خیال رہے کہ اُن کا آخرت کو مُستَبعَد سمجھنا صرف آخرت ہی کا انکار نہ تھا، خدا کی قدرت اور حکمت کا بھی انکار تھا۔

۷۸ — یعنی کیوں یہ بات نہیں سمجھتے کہ پھر اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق بھی نہیں ہے، اور اس کے لیے زمین کی اس آبادی کو دوبارہ پیدا کر دینا بھی مشکل نہیں ہے۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ

کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو: پھر کہاں سے تم کو دھوکا لگتا ہے؟[۸۲] جو امرِ حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں[۸۳]۔ اللہ نے کسی کو اپنی

۷۹ – اصل میں لفظ لِلّٰہِ استعمال ہوا ہے، یعنی ''یہ سب چیزیں بھی اللہ کی ہیں''۔ ہم نے ترجمے میں محض اُردو زبان کے حُسنِ کلام کی خاطر وہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔

۸۰ – یعنی، پھر کیوں تمھیں اُس سے بغاوت کرتے اور اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ اور کیوں تم کو یہ خوف لاحق نہیں ہوتا کہ آسمان و زمین کے فرمانروا نے اگر کبھی ہم سے حساب لیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟

۸۱ – اصل میں لفظ مَلَکُوْتُ استعمال ہوا ہے جس میں مُلک (بادشاہی) اور مِلک (مالکیت)، دونوں مفہوم شامل ہیں، اور اس کے ساتھ یہ انتہائی مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس تفصیل کے لحاظ سے آیت کے پیش کردہ سوال کا پورا مطلب یہ ہے کہ ''ہر چیز پر کامل اقتدار کس کا ہے اور ہر چیز پر پورے پورے مالکانہ اختیارات کس کو حاصل ہیں؟''

۸۲ – اصل الفاظ ہیں: اَنّٰى تُسْحَرُوْنَ، جن کا لفظی ترجمہ ہے: ''کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو؟'' سِحر اور جادو کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو اس کی اصل ماہیت اور صحیح صورت کے خلاف بنا کر دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے ذہن میں یہ غلط تأثُّر پیدا کرتا ہے کہ اُس شے کی اصلیّت وہ ہے جو بناوٹی طور پر ساحر پیش کر رہا ہے۔ پس آیت میں جو سوال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کس نے تم پر یہ سِحر کر دیا ہے کہ یہ سب باتیں جاننے کے باوجود حقیقت تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟ کس کا جادو تم پر چل گیا ہے کہ جو مالک نہیں ہیں، وہ تمھیں مالک یا اس کے شریک نظر آتے ہیں، اور جنھیں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے، وہ اصل صاحبِ اقتدار کی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تم کو بندگی کے مستحق محسوس ہوتے ہیں؟ کس نے تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے کہ جس خدا کے متعلق خود مانتے ہو کہ اس کے مقابلے میں کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے، اس سے غداری و بے وفائی کرتے ہو اور پھر بھروسا اُن کی پناہ پر کر رہے ہو جو اُس سے تم کو نہیں بچا سکتے؟ کس نے تم کو اس دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ جو ہر چیز کا مالک ہے، وہ تم سے کبھی نہ پوچھے گا کہ تم نے میری چیزوں کو کس طرح استعمال کیا، اور جو ساری کائنات کا بادشاہ ہے، وہ کبھی تم سے اس کی باز پُرس نہ کرے گا کہ میری بادشاہی میں تم اپنی بادشاہیاں چلانے یا دوسروں کی بادشاہیاں ماننے کے کیسے مجاز ہو گئے؟ سوال کی یہ نوعیت اور زیادہ معنیٰ خیز ہو جاتی ہے جب یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قریش کے لوگ نبیؐ پر سِحر کا الزام رکھتے تھے۔ اس طرح گویا سوال کے انھی الفاظ میں یہ مضمون بھی ادا ہو گیا کہ بے وقوفو! جو شخص تمھیں اصل حقیقت (وہ حقیقت جسے تمھارے اپنے اعترافات کے مطابق حقیقت ہونا چاہیے) بتاتا ہے، وہ تو تم کو نظر آتا ہے جادُوگر، اور جو لوگ تمھیں

مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ

اولاد نہیں بنایا ہے[۸۴]، اور کوئی دوسرا خدا اُس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا، اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے[۸۵]۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ کُھلے اور

رات دن حقیقت کے خلاف باتیں باور کراتے رہتے ہیں، حتّٰی کہ جنھوں نے تم کو صریح عقل اور مَنْطِق کے خلاف، تجرِبے اور مشاہدے کے خلاف، تمھاری اپنی اعتراف کردہ صداقتوں کے خلاف، سراسر جھوٹی اور بے اصل باتوں کا معتقد بنا دیا ہے، اُن کے بارے میں کبھی تمھیں یہ شبہ نہیں ہوتا کہ اصل جادوگر تو وہ ہیں۔

۸۳ – یعنی اپنے اس قول میں جھوٹے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی اُلُوہیّت (خدائی کی صفات، اختیارات اور حُقوق، یا ان میں سے کوئی حصّہ) حاصل ہے۔ اور اپنے اِس قول میں جھوٹے کہ زندگی بعدِ موت ممکن نہیں ہے۔ ان کا جھوٹ اُن کے اپنے اعترافات سے ثابت ہے۔ ایک طرف یہ ماننا کہ زمین و آسمان کا مالک اور کائنات کی ہر چیز کا مختار اللہ ہے، اور دوسری طرف یہ کہنا کہ خدائی تنہا اسی کی نہیں ہے بلکہ دوسروں کا بھی (جو لامحالہ اُس کے مملوک ہی ہوں گے) اُس میں کوئی حصّہ ہے، یہ دونوں باتیں صریح طور پر ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ اسی طرح ایک طرف یہ کہنا کہ ہم کو اور اِس عظیم الشان کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے، اور دوسری طرف یہ کہنا کہ خدا اپنی ہی پیدا کردہ مخلوق کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا، صریحاً خلافِ عقل ہے۔ لہٰذا ان کی اپنی مانی ہوئی صداقتوں سے یہ ثابت ہے کہ شرک اور انکارِ آخرت، دونوں ہی جھوٹے عقیدے ہیں جو انھوں نے اختیار کر رکھے ہیں۔

۸۴ – یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ارشاد محض عیسائیت کی تردید میں ہے۔ نہیں، مشرکینِ عرب بھی اپنے معبُودوں کو خدا کی اولاد قرار دیتے تھے، اور دُنیا کے اکثر مشرکین اس گمراہی میں ان کے شریکِ حال رہے ہیں۔ چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ''ابن اللہ'' زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اس لیے بعض اکابر مفسرین تک کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ یہ آیت اسی کی تردید میں وارد ہوئی ہے۔ حالانکہ ابتدا سے رُوئے سُخَن کفارِ مکہ کی طرف ہے اور آخر تک ساری تقریر کے مخاطَب وہی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں یکایک عیسائیوں کی طرف کلام کا رُخ پھر جانا بے معنٰی ہے۔ البتہ ضمناً اس میں ان تمام لوگوں کے عقائد کی تردید ہو گئی ہے جو خدا سے اپنے معبُودوں یا پیشواؤں کا نسب ملاتے ہیں، خواہ وہ عیسائی ہوں، یا مشرکینِ عرب، یا کوئی اور۔

۸۵ – یعنی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کائنات کی مختلف قوتوں اور مختلف حصّوں کے خالق اور مالک الگ الگ خدا ہوتے اور پھر ان کے درمیان ایسا مکمّل تعاون ہوتا جیسا کہ تم اس پورے نظامِ عالَم کی بے شمار قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں میں، اور اَن گنت تاروں اور سیّاروں میں پا رہے ہو۔ نظام کی باقاعدگی اور اجزائے نظام کی ہم آہنگی اقتدار

وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝٩٢ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝٩٣ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٩٤ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ

چھپے کا جاننے والا[86]، وہ بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کر رہے ہیں ؏

اے محمدؐ! دعا کرو کہ "پروردگار! جس عذاب کی اِن کو دھمکی دی جا رہی ہے، وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے، تو اَے میرے رب! مجھے اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔"[87] اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تمھاری

کی مرکزیت و وحدت پر خود دلالت کر رہی ہے۔ اگر اقتدار بٹا ہوا ہوتا تو اصحابِ اقتدار میں اختلاف رونما ہونا یقیناً ناگزیر تھا۔ اور یہ اختلاف ان کے درمیان جنگ اور تصادم تک پہنچے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہی مضمون سورۂ انبیاء میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (آیت ۲۲) "اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔" اور یہی اِستدلال سورۂ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے کہ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ (آیت ۴۲) "اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو ضرور وہ مالکِ عرش کے مقام پر پہنچنے کی کوشش کرتے۔" (تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۲۲)

۸۶ – اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اُس خاص قسم کے شرک کی طرف جس نے پہلے شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی، اور پھر غیر اللہ کے لیے علمِ غیب (علمِ ما کان و ما یکون) کے اثبات کی شکل اختیار کر لی۔ یہ آیت اِس شرک کے دونوں پہلوؤں کی تردید کر دیتی ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۲۷)

۸۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ، اُس عذاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبتلا ہو جانے کا فی الواقع کوئی خطرہ تھا، یا یہ کہ اگر آپؐ یہ دُعا نہ مانگتے تو اس میں مبتلا ہو جاتے۔ بلکہ اس طرح کا اندازِ بیان یہ تصور دلانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ خدا کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق چیز۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا مطالبہ کیا جائے، اور اگر اللہ اپنی رحمت اور اپنے حلم کی وجہ سے اس کے لانے میں دیر کرے تو اطمینان کے ساتھ شرارتوں اور نافرمانیوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ درحقیقت وہ ایسی خوف ناک چیز ہے کہ گناہ گاروں ہی کو نہیں، نیکوکاروں کو بھی اپنی ساری نیکیوں کے باوجود اس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ علاوہ بریں اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اجتماعی گناہوں کی پاداش میں جب عذاب کی چکّی چلتی ہے، تو صرف بُرے لوگ ہی اس میں نہیں پِستے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بھلے لوگ بھی بسا اوقات لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک گمراہ اور بدکار معاشرے میں رہنے والے ہر نیک آدمی کو ہر وقت خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ کچھ خبر نہیں کہ کب کس صورت میں ظالموں پر قہرِ الٰہی کا کوڑا برسنا شروع ہو جائے اور کون اس کی زد میں آ جائے۔

مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ

آنکھوں کے سامنے ہی وہ چیز لے آنے کی پُوری قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی ہم انھیں دے رہے ہیں۔

اَے محمدؐ! بُرائی کو اُس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں، وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ اور دُعا کرو کہ ”پروردگار! میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اَے میرے رب! میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔[۸۸]“

(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ ”اے میرے رب! مجھے اُسی دُنیا میں واپس بھیج دیجیے[۸۹] جسے میں چھوڑ آیا ہوں، اُمید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا[۹۰]“ ——— ہرگز نہیں[۹۱]، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔[۹۲]

---

۸۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۷۱-۷۲۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۳۸-۱۵۰ تا ۱۵۳۔ یونس، حاشیہ ۳۹۔ الحِجر، حاشیہ ۴۸۔ النحل، حواشی ۱۲۲ تا ۱۲۴۔ بنی اسرائیل، حواشی ۵۸ تا ۶۳۔ حٰم السجدہ، حواشی ۳۶ تا ۴۱۔

۸۹ – اصل میں رَبِّ ارْجِعُوْنِ کے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خطاب کر کے جمع کے صیغے میں درخواست کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ تعظیم کے لیے ہو، جیسا کہ تمام زبانوں میں طریقہ ہے۔ اور دوسری وجہ بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کی ہے کہ یہ لفظ تکرارِ دعا کا تصور دلانے کے لیے ہے، یعنی وہ اِرْجِعْنِیْ اِرْجِعْنِیْ (مجھے واپس بھیج دے، مجھے واپس بھیج دے) کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ رَبِّ کا خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے، اور ارْجِعُوْنِ کا خطاب ان فرشتوں سے جو اس مجرم روح کو گرفتار کر کے لیے جارہے ہوں گے۔ یعنی بات یوں ہے: ”ہائے میرے رب! مجھ کو واپس کردو۔“

۹۰ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر آیا ہے کہ مجرمین موت کی سرحد میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر آخرت میں واصلِ جہنم ہونے تک، بلکہ اس کے بعد بھی، بار بار یہی درخواستیں کرتے رہیں گے کہ ہمیں بس ایک دفعہ دُنیا میں اور بھیج دیا جائے، اب ہماری توبہ ہے، اب ہم کبھی نافرمانی نہیں کریں گے، اب ہم سیدھی راہ چلیں گے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام،

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ

اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک[93]۔ پھر جُونہی کہ صُور پھُونک دیا گیا، ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پُوچھیں[94] گے۔ اُس وقت جن کے

آیات ۲۷ - ۲۸۔ الاعراف: ۵۳۔ ابراہیم: ۴۴ - ۴۵۔ المومنون: ۱۰۵ تا ۱۱۵۔ الشعراء: ۱۰۲۔ السجدہ: ۱۲ تا ۱۴۔ فاطر: ۳۷۔ الزمر: ۵۸ - ۵۹۔ المومن: ۱۰ تا ۱۲۔ الشُّوریٰ: ۴۴۔ مع حواشی)

**۹۱ -** یعنی اس کو واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ اَز سرِ نو عمل کرنے کے لیے کوئی دوسرا موقع اب اسے نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں دوبارہ امتحان کے لیے آدمی کو اگر واپس بھیجا جائے تو لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک ہی صورت اختیار کرنی ہوگی: یا تو اس کے حافظے اور شُعور میں وہ سب مشاہدے محفوظ ہوں جو مرنے کے بعد اس نے کیے۔ یا ان سب کو محو کر کے اسے پھر ویسا ہی خالی الذہن پیدا کیا جائے جیسا وہ پہلی زندگی میں تھا۔ اوّل الذکر صورت میں امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں تو آدمی کا امتحان ہے ہی اس بات کا کہ وہ حقیقت کا مشاہدہ کیے بغیر اپنی عقل سے حق کو پہچان کر اسے مانتا ہے یا نہیں، اور طَاعت و مَعصِیَت کی آزادی رکھتے ہوئے ان دونوں راہوں میں سے کس راہ کو انتخاب کرتا ہے۔ اب اگر اسے حقیقت کا مشاہدہ بھی کرا دیا جائے اور مَعصِیَت کا انجام عملاً دکھا کر معصیت کے انتخاب کی راہ بھی اس پر بند کر دی جائے، تو پھر امتحان گاہ میں اسے بھیجنا فضول ہے۔ اس کے بعد کون ایمان نہ لائے گا اور کون طاعت سے منہ موڑ سکے گا۔ رہی دوسری صورت، تو یہ آزمودہ را آزمودن کا ہم معنیٰ ہے۔ جو شخص ایک دفعہ اسی امتحان میں ناکام ہو چکا ہے، اُسے پھر بعینہٖ ویسا ہی ایک اور امتحان دینے کے لیے بھیجنا لاحاصل ہے، کیونکہ وہ پھر وہی کچھ کرے گا جیسا پہلے کر چکا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۲۸۔ الانعام، حواشی ۶ - ۱۳۹ - ۱۴۰۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۲۶)

**۹۲ -** یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ "یہ تو اب اسے کہنا ہی ہے۔" مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ بات قابلِ التفات نہیں ہے۔ شامت آ جانے کے بعد اب وہ یہ نہ کہے گا تو اور کیا کہے گا؟ مگر یہ محض کہنے کی بات ہے۔ پلٹے گا تو پھر وہی کچھ کرے گا جو کر کے آیا ہے۔ لہٰذا اِسے بکنے دو۔ واپسی کا دروازہ اس پر نہیں کھولا جا سکتا۔

**۹۳ -** برزخ فارسی لفظ "پردہ" کا مُعَرَّب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اب اِن کے اور دُنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انھیں واپس جانے نہیں دے گی، اور قیامت تک یہ دُنیا اور آخرت کے درمیان کی اِس حدِ فاصل میں ٹھیرے رہیں گے۔

**۹۴ -** اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ باپ نہ رہے گا اور بیٹا بیٹا نہ رہے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس وقت نہ باپ بیٹے کے کام آئے گا نہ بیٹا باپ کے۔ ہر ایک اپنے حال میں کچھ اس طرح گرفتار ہوگا کہ دوسرے کو پوچھنے تک کا

مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا

پلڑے بھاری ہوں[95] گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا[96]۔ وہ جہنّم میں ہمیشہ رہیں گے۔ آگ اُن کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آئیں گے[97] ___ "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو کہ میری آیات تمھیں سُنائی جاتی تھیں تو تم انھیں جھٹلاتے تھے؟" وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار! اب ہمیں یہاں سے نکال دے،

ہوش نہ ہوگا، کجا کہ اس کے ساتھ کوئی ہمدردی یا اُس کی کوئی مدد کر سکے۔ دوسرے مقامات پر اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا، "کوئی جگری دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا۔" (المعارج، آیت ۱۰) اور يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ "اس روز مجرم کا جی چاہے گا کہ اپنی اولاد اور بیوی اور بھائی اور اپنی حمایت کرنے والے قریب ترین کنبے اور دُنیا بھر کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور اپنے آپ کو عذاب سے بچالے۔" (المعارج، آیات ۱۱ تا ۱۴) اور يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۭ "وہ دن کہ آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور اولاد سے بھاگے گا۔ اس روز ہر شخص اپنے حال میں ایسا مبتلا ہوگا کہ اسے کسی کا ہوش نہ رہے گا۔" (عبس، آیات ۳۴ تا ۳۷)

۹۵ - یعنی جن کے قابلِ قدر اعمال وزنی ہوں گے۔ جن کی نیکیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا۔

۹۶ - آغازِ سورہ میں، اور پھر چوتھے رُکوع میں فلاح اور خُسران کا جو معیار پیش کیا جا چکا ہے، اسے ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔

۹۷ - اصل میں لفظ کٰلِحُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ "کالِح" عَربی زبان میں اس چہرے کو کہتے ہیں جس کی کھال الگ ہوگئی ہو اور دانت باہر آگئے ہوں، جیسے بکرے کی بُھنی ہوئی سِری۔ عبداللہؓ بن مسعود سے کسی نے کالح کے معنی پوچھے تو انھوں نے کہا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الرأس المشيط؟ "کیا تم نے بُھنی ہوئی سری نہیں دیکھی؟"

فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخۡسَــُٔوۡا فِيۡهَا وَلَا تُكَلِّمُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡ عِبَادِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَـنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذۡتُمُوۡهُمۡ سِخۡرِيًّا حَتّٰۤى اَنۡسَوۡكُمۡ ذِكۡرِىۡ وَكُنۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ تَضۡحَكُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّىۡ جَزَيۡتُهُمُ الۡيَوۡمَ بِمَا صَبَرُوۡۤا ۙ اَنَّهُمۡ هُمُ الۡفَآٮِٕزُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِى الۡاَرۡضِ عَدَدَ سِنِيۡنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوۡا لَبِثۡنَا يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ فَسۡـَٔلِ الۡعَآدِّيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا لَّوۡ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا

پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے۔“ اللہ تعالیٰ جواب دے گا: ”دُور ہو میرے سامنے سے، پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔[98] تم وہی لوگ تو ہو کہ میرے کچھ بندے جب کہتے تھے کہ اَے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمیں معاف کردے، ہم پر رحم کر، تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے، تو تم نے ان کا مذاق بنالیا۔ یہاں تک کہ ان کی ضد نے تمھیں یہ بھی بُھلا دیا کہ میں بھی کوئی ہوں، اور تم اُن پر ہنستے رہے۔ آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب[99] ہیں۔“ پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: ”بتاؤ، زمین میں تم کتنے سال رہے؟“ وہ کہیں گے: ”ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصّہ ہم وہاں ٹھیرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔“[100] ارشاد ہوگا: ”تھوڑی ہی دیر ٹھیرے ہو نا۔ کاش تم نے یہ اُس وقت جانا ہوتا۔[101] کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمھیں فضول ہی

۹۸ – یعنی اپنی رہائی کے لیے کوئی عرض معروض نہ کرو۔ اپنی معذرتیں پیش نہ کرو۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے بالکل چپ ہو جاؤ۔ بعض رِوایات میں آیا ہے کہ یہ ان کا آخری کلام ہوگا جس کے بعد ان کی زبانیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔ مگر یہ بات بظاہر قرآن کے خلاف پڑتی ہے، کیونکہ آگے خود قرآن ہی ان کی اور اللہ تعالیٰ کی گفتگو نقل کر رہا ہے۔ لٰہذا یا تو یہ رِوایات غلط ہیں، یا پھر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد وہ رہائی کے لیے کوئی عرض معروض نہ کر سکیں گے۔

۹۹ – پھر اسی مضمون کا اعادہ ہے کہ فلاح کا مستحق کون ہے اور خُسران کا مستحق کون۔

۱۰۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔

۱۰۱ – یعنی دنیا میں ہمارے نبی تم کو بتاتے رہے کہ یہ دُنیا کی زندگی محض امتحان کی چندگنی چُنی ساعتیں ہیں، اِنھی

خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

---

پیدا کیا ہے[۱۰۲] اور تمھیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟“

پس بالا و برتر ہے[۱۰۳] اللہ، پادشاہِ حقیقی، کوئی خدا اُس کے سوا نہیں، مالک ہے عرشِ بزرگ کا۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اَور معبُود کو پکارے، جس کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں[۱۰۴]، تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے[۱۰۵]۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے[۱۰۶]۔

---

کو اصل زندگی اور بس ایک ہی زندگی نہ سمجھ بیٹھو۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہاں کے وقتی فائدوں اور عارضی لذتوں کی خاطر وہ کام نہ کرو جو آخرت کی اَبدی زندگی میں تمھارے مستقبل کو برباد کر دینے والے ہوں۔ مگر اُس وقت تم نے ان کی بات سن کر نہ دی۔ تم اِس عالَمِ آخرت کا انکار کرتے رہے۔ تم نے زندگی بعدِ موت کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھا۔ تم اپنے اس خیال پر مُصِرّ رہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دُنیا میں ہے، اور جو کچھ مزے لُوٹنے ہیں یہیں لوٹ لینے چاہییں۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوش آنے کا وقت تو وہ تھا جب تم دُنیا کی چند روزہ زندگی کے لُطف پر یہاں کی اَبدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر رہے تھے۔

۱۰۲ – اصل میں عَبَثًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ایک مطلب تو ہے: ”کھیل کے طور پر“۔ اور دوسرا مطلب ہے: ”کھیل کے لیے“۔ پہلی صورت میں آیت کے معنیٰ یہ ہوں گے: ”کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں یونہی بطورِ تفریح بنا دیا ہے، تمھاری تخلیق کی کوئی غرض و غایت نہیں ہے، محض ایک بے مقصد مخلوق بنا کر پھیلا دی گئی ہے۔“ دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا: ”کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ تم بس کھیل کود اور تفریح اور ایسی لاحاصل مصروفیتوں کے لیے پیدا کیے گئے ہو، جن کا کبھی کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔“

۱۰۳ – یعنی بالا و برتر ہے اس سے کہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب اس سے ہو، اور بالا و برتر ہے اس سے کہ اس کے بندے اور مملوک اس کی خدائی میں اس کے شریک ہوں۔

۱۰۴ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبُود کو پکارے، اُس کے لیے اپنے اس فعل کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔“

۱۰۵ – یعنی وہ محاسبے اور بازپُرس سے بچ نہیں سکتا۔

۱۰۶ – یہ پھر اسی مضمون کا اعادہ ہے کہ اصل میں فلاح پانے والے کون ہیں اور اس سے محروم رہنے والے کون۔

ع ۶
۶

وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

اَے محمدؐ! کہو: "میرے رب! درگزر فرما، اور رحم کر، اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔"[۱۰۷] ع

۱۰۷ - یہاں اِس دعا کی لطیف معنویت نگاہ میں رہے۔ ابھی چند سطر اُوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے دشمنوں کو معاف کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمائے گا کہ میرے جو بندے یہ دُعا مانگتے تھے، تم ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اس کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (اور ضمناً صحابۂ کرامؓ کو بھی) یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ٹھیک وہی دُعا مانگو جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔ ہماری صاف تنبیہ کے باوجود اب اگر یہ تمھارا مذاق اُڑائیں تو آخرت میں اپنے خلاف گویا خود ہی ایک مضبوط مُقدّمہ تیار کر دیں گے۔

# تفہیم القرآن

## النور

(۲۴)

# النور

**نام** پانچویں رکوع کی پہلی آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے ماخوذ ہے۔

**زمانۂ نُزُول** یہ امر مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ یہ سورت غزوۂ بنی المُصْطَلِق کے بعد نازل ہوئی ہے۔ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نُزُول واقعۂ اِفک کے سلسلے میں ہوا ہے (جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دوسرے اور تیسرے رکوع میں آیا ہے) اور وہ تمام معتبر رِوایات کی رُو سے غزوۂ بنی المُصْطَلِق کے سفر میں پیش آیا تھا۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا یہ غزوہ ۵ ہجری میں غزوۂ اَحزاب سے پہلے ہوا تھا، یا ۶ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد۔ اصل واقعہ کیا ہے، اِس کی تحقیق اس لیے ضروری ہے کہ پردے کے احکام قرآنِ مجید کی دو ہی سورتوں میں آئے ہیں: ایک یہ سورت، دوسری سورۂ احزاب جس کا نزول بالاتفاق غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا ہے۔ اب اگر غزوۂ اَحزاب پہلے ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ پردے کے احکام کی ابتدا اُن ہدایات سے ہوئی جو سورۂ احزاب میں وارد ہوئی ہیں، اور تکمیل اُن احکام سے ہوئی جو اس سورت میں آئے ہیں۔ اور اگر غزوۂ بنی المُصْطَلِق پہلے ہو تو احکام کی ترتیب اُلٹ جاتی ہے اور آغاز سورۂ نور سے مان کر تکمیل سورۂ اَحزاب والے احکام پر ماننی پڑتی ہے۔ اس طرح اُس حکمتِ تشریع کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو احکامِ حجاب میں پائی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے ہم آگے بڑھنے سے پہلے زمانہ نزول کی تحقیق کر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ غزوۂ بنی المُصْطَلِق شعبان ۵ ہجری میں پیش آیا اور پھر ذی القعدہ ۵ ھ میں غزوۂ احزاب (یا غزوۂ خندق) واقع ہوا۔ اس کی تائید میں سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ واقعۂ اِفک کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے جو رِوایات مروی ہیں، ان میں سے بعض میں حضرت سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ کے جھگڑے کا ذکر آتا ہے، اور تمام معتبر روایات کی رُو سے حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا انتقال غزوۂ بنی قُرَیظہ میں ہوا تھا، جس کا زمانۂ وقوع غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد ہے، لہٰذا ۶ھ میں ان کے موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

دوسری طرف محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ غزوۂ احزاب شوال ۵ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ بنی المُصْطَلِق شعبان ۶ھ کا۔ اس کی تائید وہ کثیر التعداد معتبر روایات کرتی ہیں جو اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے لوگوں سے مروی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ اِفک سے پہلے احکامِ حجاب نازل ہو چکے تھے، اور وہ سورۂ اَحزاب میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت

حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہو چکا تھا، اور وہ غزوۂ احزاب کے بعد ذی القعدہ ۵ ھ کا واقعہ ہے، اور سورۂ احزاب میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ علاوہ بریں ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ کی بہن حَمْنَہ بنت جَحْش نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں محض اس وجہ سے حصّہ لیا تھا کہ حضرت عائشہؓ ان کی بہن کی سوکن تھیں، اور ظاہر ہے کہ بہن کی سوکن کے خلاف اس طرح کے جذبات پیدا ہونے کے لیے سوکناپے کا رشتہ شروع ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ مدّت درکار ہوتی ہے۔ یہ سب شہادتیں ابنِ اسحاق کی رِوایَت کو مضبوط کر دیتی ہیں۔

اس روایت کو قبول کرنے میں صرف یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ واقعۂ اِفک کے زمانے میں حضرت سعدؓ بن مُعاذ کی موجودگی کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس مشکل کو جو چیز رفع کر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس واقعے کے متعلق حضرت عائشہؓ سے جو روایات مروی ہیں، ان میں سے بعض میں حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا ذکر ہے اور بعض میں ان کے بجائے حضرت اُسَیْدؓ بن حُضَیر کا۔ اور یہ دوسری روایت اُن دوسرے واقعات کے ساتھ پوری طرح مطابق ہو جاتی ہے جو اس سلسلے میں خود حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہیں۔ ورنہ محض سعدؓ بن مُعاذ کے زمانۂ حیات سے مطابق کرنے کی خاطر اگر غزوۂ بنی المُصطَلِق اور قصّۂ اِفک کو غزوۂ احزاب و قُرَیظَہ سے پہلے کے واقعات مان لیا جائے تو اس پیچیدگی کا کوئی حل نہیں ملتا کہ پھر آیتِ حجاب کا نزول اور نکاحِ زینبؓ کا واقعہ اس سے بھی پہلے پیش آنا چاہیے، حالانکہ قرآن اور کثیر التعداد رِوایاتِ صحیحہ، دونوں اس پر شاہد ہیں کہ نکاحِ زینبؓ اور حکمِ حجاب، احزاب و قُرَیظَہ کے بعد کے واقعات ہیں۔ اسی بنا پر ابنِ حَزْم اور ابنِ قَیِّم اور بعض دوسرے محققین نے محمد بن اسحاق کی روایت ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور ہم بھی اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔

**تاریخی پسِ منظر** اب یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ سورۂ نور ۶ ھ کے نصفِ آخر میں سورۂ احزاب کے کئی مہینے بعد نازل ہوئی ہے، ہمیں اُن حالات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے جن میں اس کا نزول ہوا۔

جنگِ بَدر کی فتح سے عرب میں تحریکِ اسلامی کا جو عروج شروع ہوا تھا، وہ غزوۂ خندق تک پہنچتے پہنچتے اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مشرکین، یہود، منافقین اور مُتَربّصین، سب ہی یہ محسُوس کرنے لگے تھے کہ اس نوخیز طاقت کو محض ہتھیاروں اور فوجوں کے بل پر شکست نہیں دی جا سکتی۔ جنگِ خندق میں یہ لوگ متحد ہو کر ۱۰ ہزار فوج کے ساتھ مدینے پر چڑھ آئے تھے، مگر ایک مہینے تک سر مارنے کے بعد آخرکار ناکام ہو کر چلے گئے، اور ان کے جاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عَلَی الاعلان فرما دیا: لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا، ولکنکم تغزونھم، ’’اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔‘‘ (ابنِ ہِشَام، جلد۳، ص ۲۶۶)

یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ مخالفِ اسلام طاقتوں کی قوت اقدام ختم ہو چکی ہے، اب اسلام بچاؤ کی نہیں بلکہ اقدام کی لڑائی لڑے گا اور کفر کو اقدام کے بجائے بچاؤ کی لڑائی لڑنی پڑے گی۔ یہ حالات کا

بالکل صحیح جائزہ تھا جسے دوسرا فریق بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

اسلام کے اِس روز افزوں عروج کی اصل وجہ مسلمانوں کی تعداد نہ تھی۔ بدر سے خندق تک ہر لڑائی میں کفار اُن سے کئی گنی زیادہ قوت لے کر آئے تھے، اور مَردُم شماری کے لحاظ سے بھی مسلمان اس وقت تک عرب میں بمشکل ۱۰/۱ فی صد تھے۔ اس عروج کی وجہ مسلمانوں کے اسلحے کی برتری بھی نہ تھی۔ ہر طرح کے ساز و سامان میں کفار ہی کا پلّا بھاری تھا۔ مَعاشی طاقت اور اثر و رُسوخ کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا اُن سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اُن کے پاس تمام عرب کے مَعاشی وسائل تھے، اور مسلمان بھوکوں مر رہے تھے۔ اُن کی پشت پر تمام عرب کے مشرک اور اہلِ کتاب قبائل تھے، اور مسلمان ایک نئے دین کی دعوت دے کر قدیم نظام کے سارے حامیوں کی ہمدردیاں کھو چکے تھے۔ ان حالات میں جو چیز مسلمانوں کو برابر آگے بڑھائے لیے جا رہی تھی، وہ دراصل مسلمانوں کی اَخلاقی برتری تھی، جسے تمام دشمنان اسلام خود بھی محسُوس کر رہے تھے۔ ایک طرف وہ دیکھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی بے داغ سیرتیں ہیں جن کی طہارت و پاکیزگی اور مضبوطی دلوں کو مسخر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ انفرادی و اجتماعی اَخلاق کی طہارت نے مسلمانوں کے اندر کمال درجے کا اتحاد اور نظم و ضبط بھی پیدا کر دیا ہے، جس کے سامنے مشرکین اور یہود کا ڈھیلا نظامِ جماعت امن اور جنگ، دونوں حالتوں میں شکست کھاتا چلا جاتا ہے۔

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصّہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں، اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اُس کی خوبیاں اُسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انھیں گرا رہی ہیں، تو انھیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دُور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں، بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے، اُس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اُوپر خوب گندگی اُچھالیں، تاکہ دُنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کا رخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر رذیلانہ حملوں اور داخلی فتنہ انگیزیوں کی طرف پھیر دیا۔ اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے، اس لیے بالارادہ یا بلا ارادہ طریقِ کار یہ قرار پایا کہ مدینے کے منافقین اندر سے فتنے اٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذی القعدہ ۵ھ میں ہوا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے تَبَنِّیت[1] کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے مُتَبَنّٰی (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) کی مُطَلَّقہ بیوی (زینبؓ بنت

---

[1] دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانا اور خاندان میں اسے بالکل صُلبی بیٹے کی حیثیت دے دینا۔

جَحْش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینے کے منافقین پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پردازیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے عجیب عجیب قصّے گھڑ گھڑ کر پھیلا دیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے، اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دست بردار ہو گیا، اور پھر کس طرح انھوں نے خود اپنی بہو سے بیاہ کر لیا۔ یہ قصّے اس کثرت سے پھیلائے گئے کہ مسلمان تک ان کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ محدثین اور مفسّرین کے ایک گروہ نے حضرت زینبؓ اور زیدؓ کے متعلق جو روایتیں نقل کی ہیں، اِن میں آج تک ان من گھڑت قصّوں کے اجزا پائے جاتے ہیں اور مُستَشرِقینِ مغرب ان کو خوب نمک مرچ لگا کر اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی (اُمَیمَہ بنت عبدالمُطّلِب) کی صاحبزادی تھیں، بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضوؐر کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، ان کو اتفاقاً ایک روز دیکھ لینے اور معاذ اللہ، ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعے سے ایک ہی سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو مجبُور کر کے حضرت زیدؓ سے ان کی شادی کی تھی۔ ان کے بھائی عبداللہؓ بن جَحْش اس شادی سے ناراض تھے۔ خود حضرت زینبؓ اس پر راضی نہ تھیں، کیونکہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی بننا قریش کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی طبعًا قبول نہ کر سکتی تھی۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں معاشرتی مُساوات قائم کرنے کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کریں، انھیں حکماً اس پر راضی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوست اور دشمن سب کو معلوم تھیں، اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہ تھا کہ حضرت زینبؓ کا احساسِ فخرِ نسبی ہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ان کا اور زیدؓ بن حارثہ کا نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچی۔ مگر اس کے باوجود بے شرم افترا پردازوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بدترین اَخلاقی الزامات لگائے اور ان کو اس کثرت سے رواج دیا کہ آج تک ان کا یہ پروپیگنڈا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔

اس کے بعد دوسرا حملہ غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر کیا گیا، اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ بنی المُصطَلِق قبیلۂ بنی خُزَاعہ کی ایک شاخ تھی جو ساحلِ بحرِ اَحمر پر جِدّے اور رابغ کے درمیان قُدَید کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے چشمے کا نام مُرَیسِیع تھا جس کے آس پاس اس قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس مناسبت سے احادیث میں اس مہم کا نام غزوۂ مُرَیسِیع بھی آیا ہے۔ نقشے سے اس کی صحیح جائے وقوع معلوم ہو سکتی ہے۔

شعبان ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپؐ

ایک لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہوگئے، تاکہ فتنے کے سر اُٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ اس مہم میں عبداللہ بن اُبَیّ بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپ کے ساتھ ہوگیا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے۔ مُرَیسِیع کے مقام پر آنحضرتؐ نے اچانک دشمن کو جالیا، اور تھوڑی سی زدوخورد کے بعد پورے قبیلے کو مال اسباب سمیت گرفتار کرلیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابھی مُرَیسِیع ہی پر لشکرِ اسلام پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم (جَہجاہ بن مسعود غِفاری) اور قبیلۂ خَزرَج کے ایک حلیف (سِنان بن وبر جُہَنی) کے درمیان پانی پر جھگڑا ہوگیا۔ ایک نے انصار کو پکارا۔ دوسرے نے مہاجرین کو آواز دی۔ لوگ دونوں طرف سے جمع ہوگئے اور معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ لیکن عبداللہ بن اُبَیّ نے، جو انصار کے قبیلۂ خَزرَج سے تعلق رکھتا تھا، بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اس نے انصار کو یہ کہہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ ”یہ مہاجرین ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ہمارے حریف بن بیٹھے ہیں۔ ہماری اور ان قریشی کنگلوں کی مثال ایسی ہے کہ کتّے کو پال تاکہ تجھی کو بھنبھوڑ کھائے۔ یہ سب کچھ تمھارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود ہی انھیں لاکر اپنے ہاں بسایا ہے اور ان کو اپنے مال و جائداد میں حصہ دار بنایا ہے۔ آج اگر تم ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔“ پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ ”مدینے واپس پہنچنے کے بعد جو ہم میں سے عزت والا ہے، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کر دے گا۔[1]“ اُس کی ان باتوں کی اطلاع جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کرا دینا چاہیے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا: فکیف یا عمر اذا تحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ (عمرؓ! دنیا کیا کہے گی کہ محمدؐ خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے)۔ پھر آپؐ نے فوراً ہی اس مقام سے کوچ کا حکم دے دیا اور دوسرے دن دوپہر تک کسی جگہ پڑاؤ نہ کیا، تاکہ لوگ خوب تھک جائیں اور کسی کو بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرنے اور سننے کی مُہلت نہ ملے۔ راستے میں اُسَیدؓ بن حُضَیر نے عرض کیا: ”یا نبیؐ اللہ! آج آپؐ نے اپنے معمول کے خلاف ناوقت کوچ کا حکم دے دیا؟“ آپؐ نے جواب دیا: ”تم نے سُنا نہیں کہ تمھارے صاحب نے کیا باتیں کی ہیں؟“ انھوں نے پوچھا: ”کون صاحب؟“ آپؐ نے فرمایا: ”عبداللہ بن اُبَیّ۔“ انھوں نے عرض کیا: ”یارسولؐ اللہ! اس شخص سے رعایت فرمائیے، آپؐ جب مدینہ تشریف لائے ہیں تو ہم لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپؐ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اسی کی جلن وہ نکال رہا ہے۔“

یہ شوشہ ابھی تازہ ہی تھا کہ اسی سفر میں اُس نے ایک اور خطرناک فتنہ اُٹھا دیا، اور فتنہ بھی ایسا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کمال درجے ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینے کی نوخیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا فتنہ تھا۔

---

[1] سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے خود اُس کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

اس کا واقعہ خود انھی کی زبان سے سنیے جس سے پوری صورتِ حال سامنے آ جائے گی۔ بیچ بیچ میں جو اُمور تشریح طلب ہوں گے، انھیں ہم دوسری معتبر روایات کی مدد سے قوسین میں بڑھاتے جائیں گے، تاکہ جنابِ صدیقہؓ کے تسلسلِ بیان میں خلل نہ واقع ہو۔ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپؐ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپؐ کی بیویوں میں سے کون آپؐ کے ساتھ جائے۔[1] غزوۂ بنی المُصطَلِق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپؐ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت رسولؐ اللہ نے پڑاؤ کیا، اور ابھی رات کا کچھ حصّہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں اُٹھ کر رفعِ حاجت کے لیے گئی، اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسُوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی، اور اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہَودے میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اُٹھا کر اُونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب سے بہت ہلکی پُھلکی تھیں۔ میرا ہَودہ اُٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہَودہ اُونٹ پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آ گئی۔ صبح کے وقت صَفوانؓ بن مُعَطَّل سُلَمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے، کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ صاحب بدری صحابیوں میں سے تھے۔ ان کو صبح دیر تک سونے کی عادت[2] تھی، اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں

---

[1] اس قرعہ اندازی کی نوعیت لاٹری کی سی نہ تھی۔ دراصل تمام بیویوں کے حُقوق برابر کے تھے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود کسی کو انتخاب کرتے تو دوسری بیویوں کی دل شکنی ہوتی، اور ان میں باہم رشک و رقابت پیدا ہونے کے لیے بھی یہ ایک محرک بن جاتا۔ اس لیے آپؐ قرعہ اندازی سے اس کا فیصلہ فرماتے تھے۔ شریعت میں قرعہ اندازی ایسی ہی صورتوں کے لیے ہے جب کہ چند آدمیوں کا جائز حق بالکل برابر ہو، اور کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو، مگر حق کسی ایک ہی کو دیا جا سکتا ہو۔

[2] ابوداؤد اور دوسری کُتُبِ سُنَن میں یہ ذکر آتا ہے کہ ان کی بیوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صبح کی نماز وقت پر نہیں پڑھتے۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ یا رسولؐ اللہ! یہ میرا خاندانی عیب ہے، دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دُور نہیں کر سکتا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا، جب آنکھ کھلے، نماز ادا کر لیا کرو۔ بعض محدثین نے ان کے قافلے سے پیچھے رہ جانے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ مگر بعض دوسرے محدثین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اُٹھ کر مدینے جارہے تھے)۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اُونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی یہیں رہ گئیں۔'' اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اُٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لاکر اپنا اُونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اُونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جالیا، جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھیرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتا نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اُٹھانے والوں نے بہتان اُٹھا دیے، اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن اُبَیّ تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔''

(دوسری روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صَفوانؓ کے اُونٹ پر حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح پیچھے چھوٹ گئی تھیں، اُسی وقت عبداللہ بن اُبَیّ پکار اٹھا کہ ''خدا کی قسم! یہ بچ کر نہیں آئی ہے، لو دیکھو، تمھارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے عَلانِیَہ لیے چلا آرہا ہے۔'')

''مدینے پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی، وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپؐ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے: کیف تیکم (کیسی ہیں یہ؟) خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپؐ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی، تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کرسکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اُس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مِسطَحؓ بن اُثاثَہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ (دوسری رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ذمّے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مِسطَحؓ بھی اُن لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے)۔ راستے میں اُن کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ''غارت ہو مِسطَح!'' میں نے کہا: ''اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگِ بَدر میں حصّہ لیا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''بِٹیا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر

---

ان کو اس خدمت پر مقرر کیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں کوچ کرنے کی وجہ سے اگر کسی کی کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو صبح اسے تلاش کر کے لیتے آئیں۔

نہیں؟'' پھر انھوں نے سارا قصّہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اُڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے، ان میں مِسطَحؓ، حَسّانؓ بن ثابت مشہور شاعرِ اسلام، اور حَمنَہؓ بنت جَحش، حضرت زینبؓ کی بہن کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔) یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی، سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی۔''

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''میرے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ اور اُسامہ بن زیدؓ کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اُسامہؓ نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اور عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! بھلائی کے سوا آپؐ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کِذب اور باطل ہے جو اُڑایا جا رہا ہے۔'' رہے علیؓ، تو انھوں نے کہا: ''یا رسولؐ اللہ! عورتوں کی کمی نہیں ہے، آپؐ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں، اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔'' چنانچہ خدمت گار کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا: ''اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اُن میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بی بی! ذرا آٹے کا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے۔'' اسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: ''مسلمانو! کون ہے جو اُس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا! میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔'' اس پر اُسَیدؓ بن حُضَیر (بعض رِوایات میں سعدؓ بن معاذ)[1] نے اُٹھ کر کہا: ''یا رسولؐ اللہ! اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خَزرَجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں، ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔'' یہ سنتے ہی سعدؓ بن عُبادہ، رئیسِ خَزرَج اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''جھوٹ کہتے ہو، تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اِس کی گردن مارنے کا نام صرف اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خَزرَج میں سے ہے۔ اگر وہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے۔''[2] اُسَیدؓ بن حُضیر رضی اللہ عنہ

---

[1] غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے نام لینے کے بجائے سَیّدِ اَوس کے الفاظ استعمال فرمائے ہوں گے۔ کسی راوی نے اس سے مراد حضرت سعدؓ بن مُعاذ کو سمجھ لیا، کیونکہ اپنی زندگی میں وہی قبیلہ اَوس کے سردار تھے، اور تاریخ میں وہی اس حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ حالانکہ دراصل اس واقعے کے وقت ان کے چچازاد بھائی اُسَیدؓ بن حُضَیر اوس کے سردار تھے۔

[2] حضرت سعدؓ بن عُبادہ اگرچہ نہایت صالح اور مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبیؐ سے گہری عقیدت ومحبّت رکھتے تھے، اور مدینے میں جن لوگوں کے ذریعے سے اسلام پھیلا تھا، ان میں ایک نمایاں شخص وہ بھی تھے، لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان کے اندر قومی حمیت (اور عرب میں اس وقت قوم کے معنیٰ قبیلے کے تھے) بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے عبداللہ بن اُبَیّ کی پشت پناہی کی، کیونکہ وہ ان کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اِسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ ''الیوم یوم الملحمۃ،

نے جواب میں کہا: ''تم منافق ہو، اسی لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔'' اس پر مسجدِ نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اَوس اور خَزرَج مسجد ہی میں لڑ پڑتے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اُتر آئے۔''

حضرت عائشہؓ کے قصّے کی باقی تفصیلات ہم اثنائے تفسیر میں اُس جگہ نقل کریں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی براءت نازل ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ نے یہ شوشہ چھوڑ کر بیک وقت کئی شکار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی عزت پر حملہ کیا۔ دوسری طرف اس نے اسلامی تحریک کے بلند ترین اَخلاقی وقار کو گرانے کی کوشش کی۔ تیسری طرف اس نے یہ ایک ایسی چنگاری پھینکی تھی کہ اگر اسلام اپنے پیرووُں کی کایا نہ پلٹ چکا ہوتا تو مہاجرین اور انصار، اور خود انصار کے بھی دونوں قبیلے آپس میں لڑ مرتے۔

## موضوع اور مباحث

یہ تھے وہ حالات جن میں پہلے حملے کے موقع پر سورۂ احزاب کے آخری ۲ رکوع نازل ہوئے، اور دوسرے حملے کے موقع پر یہ سورۂ نور اُتری۔ اس پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر اِن دونوں سورتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیا جائے تو وہ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو ان کے احکام میں مضمر ہے۔

منافقین مسلمانوں کو اُس میدان میں شکست دینا چاہتے تھے جو ان کے تَفَوُّق کا اصل میدان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے، بجائے اس کے کہ وہ اُن کے اَخلاقی حملوں پر ایک غضب ناک تقریر فرماتا، یا مسلمانوں کو جوابی حملے کرنے پر اُکساتا، تمام تر توجہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دینے پر صَرف فرمائی کہ تمھارے اَخلاقی محاذ میں جہاں جہاں رخنے موجود ہیں، ان کو بھرو اور اِس محاذ کو اور زیادہ مضبوط کرلو۔ ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ نکاحِ زینبؓ کے موقع پر منافقین اور کفار نے کیا طوفان اُٹھایا تھا۔ اب ذرا سورۂ اَحزاب نکال کر پڑھیے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ ٹھیک اُسی طوفان کا زمانہ تھا جب کہ معاشرتی اصلاح کے متعلق حسبِ ذیل ہدایات دی گئیں:

(۱) ازواجِ مطہراتؓ کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ نکلو،

---

الیوم تستحل الحرمۃ (آج کُشت وخون کا دن ہے۔ آج یہاں کی حرمت حلال کی جائے گی)، اور اس پر عتاب فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لشکر کا جھنڈا واپس لے لیا۔ پھر آخرِ کار یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفۂ بنی ساعِدہ میں یہ دعویٰ کیا کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور جب ان کی بات نہ چلی اور انصار ومہاجرین، سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو تنہا وہی ایک تھے جنھوں نے بیعت سے انکار کر دیا اور مرتے دم تک قریشی خلیفہ کی خلافت تسلیم نہ کی۔ (مُلاحظہ ہو: الإصابہ، لابنِ حَجَر، اور الاستیعاب، لابنِ عبدالبَرّ، ذکر سعدؓ بن عُبادہ، صفحہ ۱۰-۱۱)

اور غیر مردوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو، کہ کوئی شخص بے جا توقعات قائم کر لے۔ (آیات ۳۲-۳۳)

(۲) حضورؐ کے گھروں میں غیر مردوں کے بلا اجازت داخل ہو جانے کو روک دیا گیا، اور ہدایت کی گئی کہ ازواجِ مطہراتؓ سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ (آیت ۵۳)

(۳) غیر محرم مردوں اور محرم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ازواجِ مطہراتؓ کے صرف محرم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپؐ کے گھروں میں آ جا سکتے ہیں۔ (آیت ۵۵)

(۴) مسلمانوں کو بتایا گیا کہ نبی کی بیویاں تمھاری مائیں ہیں اور ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے لیے اَبداً حرام ہیں جس طرح اس کی حقیقی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں ہر مسلمان اپنی نیت کو بالکل پاک رکھے۔ (آیت ۵۳-۵۴)

(۵) مسلمانوں کو مُتنَبّہ کر دیا گیا کہ نبیؐ کو اذیت دینا دُنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت اور رُسوا کُن عذاب کا موجب ہے، اور اسی طرح کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا اور اس پر ناحق الزام لگانا بھی سخت گناہ ہے۔ (آیات ۵۷-۵۸)

(۶) تمام مسلمان عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلا کریں۔ (آیت ۵۹)

پھر جب واقعۂ اِفک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلچل برپا ہوئی تو یہ سورۂ نور اَخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام وہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ اوّل تو مسلم معاشرے کو برائیوں کی پیداوار اور ان کے پھیلاؤ سے محفوظ رکھا جائے، اور اگر وہ پیدا ہو ہی جائیں تو پھر ان کا پورا پورا تدارُک کیا جائے۔ ان احکام وہدایات کو ہم اُسی ترتیب کے ساتھ یہاں خلاصتاً درج کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ اس سورہ میں نازل ہوئے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ قرآن ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح وتعمیر کے لیے کس طرح قانونی، اَخلاقی اور معاشرتی تدابیر بیک وقت تجویز کرتا ہے:

(۱) زِنا، جسے معاشرتی جرم پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا (سورۂ نساء، آیات ۱۵-۱۶)، اب اس کو فوج داری جرم قرار دے کر اس کی سزا سو کوڑے مقرر کر دی گئی۔

(۲) بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور اُن کے ساتھ رشتۂ مُناکحت جوڑنے سے اہلِ ایمان کو منع کر دیا گیا۔

(۳) جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

(۴) شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لِعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۵) حضرت عائشہؓ پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو۔ اس طرح کی افواہیں اگر اُڑ رہی ہوں تو انھیں دبانا اور ان کا سدِّباب کرنا چاہیے، نہ یہ کہ ایک منہ سے لے کر دوسرا منہ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ اسی سلسلے میں یہ بات ایک اُصولی حقیقت کے طور پر سمجھائی گئی کہ طیّب آدمی کا جوڑ طیّب عورت ہی سے لگ سکتا ہے، خبیث عورت کے اطوار سے اس کا مزاج چند روز بھی مُوافقت نہیں کرسکتا۔ اور ایسا ہی حال طیّب عورت کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی رُوح طیّب مرد ہی سے مُوافقت کر سکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اب اگر رسولؐ کو تم جانتے ہو کہ وہ ایک طیّب، بلکہ اطیب انسان ہیں، تو کس طرح یہ بات تمھاری عقل میں سما گئی کہ ایک خبیث عورت ان کی محبُوب ترین رفیقۂ حیات بن سکتی تھی۔ جو عورت عملاً زنا تک کر گزرے، اس کے عام اطوار کب ایسے ہو سکتے ہیں کہ رسولؐ جیسا پاکیزہ انسان اس کے ساتھ یوں نباہ کرے۔ پس صرف یہ بات کہ ایک کمینے آدمی نے ایک بے ہودہ الزام کسی پر لگا دیا ہے، اسے قابلِ قبول کیا معنٰی، قابلِ توجہ اور ممکن الوقوع سمجھ لینے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ الزام لگانے والا کون ہے اور الزام لگا کس پر رہا ہے۔

(۶) جو لوگ بے ہودہ خبریں اور بری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فُحش اور فواحش کو رواج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

(۷) یہ قاعدۂ کُلِّیّہ مقرر کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلّقات کی بنیاد باہمی حسنِ ظن پر ہونی چاہیے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ اس کے گناہ گار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گناہ گار سمجھا جائے جب تک کہ اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

(۸) لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلّف نہ گُھس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جائیں۔

(۹) عورتوں اور مردوں کو غَضِّ بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گُھورنے یا جھانک تاک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

(۱۰) عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سَر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔

(۱۱) عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے مَحرَم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سوا کسی کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔

(۱۲) ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چُھپا کر نکلیں، بلکہ بجنے والے زیور بھی پہن کر نہ نکلیں۔

(۱۳) معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم

دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ تجرُّد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مُجرّد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

(۱۴) لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مُکاتبَت کی راہ نکال دی گئی اور مالکوں کے علاوہ دوسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ مُکاتب غلاموں اور لونڈیوں کی مالی مدد کریں۔

(۱۵) لونڈیوں سے کسب کرانا ممنوع قرار دیا گیا۔ عرب میں یہ پیشہ لونڈیوں ہی سے کرانے کا رواج تھا، اس لیے اس کی ممانعت دراصل قحبہ گری کی قانونی بندش تھی۔

(۱۶) گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خَلوَت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گُھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۱۷) بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اُتار کر رکھ دیں تو مُضایقہ نہیں، مگر حکم دیا گیا کہ تبَرُّج (بَن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انھیں نصیحت کی گئی کہ بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اُوپر ڈالے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

(۱۸) اندھے، لنگڑے، لُولے اور بیمار کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ کھانے کی کوئی چیز کسی کے ہاں سے بلا اجازت کھالے تو اس کا شمار چوری اور خیانت میں نہ ہوگا۔ اُس پر کوئی گرفت نہ کی جائے۔

(۱۹) قریبی عزیزوں اور بے تکلف دوستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں بلا اجازت بھی کھا سکتے ہیں، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے گھر میں کھا سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے پردے ہٹا دیے گئے، تاکہ آپس کی محبّت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے اُن رخنوں کو بند کر دیں جن سے کوئی فتنہ پرداز پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

ان ہدایات کے ساتھ ساتھ منافقین اور مومنین کی وہ کُھلی کُھلی علامتیں بیان کر دی گئیں جن سے ہر مسلمان یہ جان سکے کہ معاشرے میں مخلص اہلِ ایمان کون لوگ ہیں اور منافق کون۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جماعتی نظم وضبط کو اور کَس دیا گیا اور اس کے لیے چند مزید ضابطے بنا دیے گئے، تاکہ وہ طاقت اور زیادہ مضبوط ہو جائے جس سے غیظ کھا کر کفار و منافقین فساد انگیزیاں کر رہے تھے۔

اس تمام بحث میں نمایاں چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ پوری سورۂ نور اُس تلخی سے خالی ہے جو شرم ناک اور بے ہودہ حملوں کے جواب میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک طرف اُن حالات کو دیکھیے جن میں یہ سورت نازل ہوئی ہے، اور دوسری طرف سورت کے مضامین اور اندازِ کلام کو دیکھیے۔ اس قدر اشتعال انگیز صورتِ حال میں

کیسے ٹھنڈے طریقے سے قانون سازی کی جا رہی ہے، مصلحانہ احکام دیے جا رہے ہیں، حکیمانہ ہدایات دی جا رہی ہیں، اور تعلیم و نصیحت کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اس سے صرف یہی سبق نہیں ملتا کہ ہم کو فتنوں کے مقابلے میں سخت سے سخت اشتعال کے مواقع پر بھی کس طرح ٹھنڈے تدبُّر اور عالی ظرفی اور حکمت سے کام لینا چاہیے، بلکہ اس سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہ کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، کسی ایسی ہستی ہی کا نازل کیا ہوا ہے جو بہت بلند مَقام سے انسانی حالات اور معاملات کا مشاہدہ کر رہی ہے، اور اپنی ذات میں ان حالات و معاملات سے غیر مُتأثّر رہ کر خالص ہدایت و رہنمائی کا منصب ادا کر رہی ہے۔ اگر یہ آنحضرتؐ کا اپنا کلام ہوتا تو آپؐ کی انتہائی بلند نظری کے باوجود اس میں اُس فطری تلخی کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پایا جاتا جو خود اپنی عزت و ناموس پر کمینہ حملوں کو سن کر ایک شریف آدمی کے جذبات میں لازماً پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

---

۶۴ آیاتھا — سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ — ۹ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ① اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اور اسے ہم نے فرض کیا ہے، اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں[1]، شاید کہ تم سبق لو۔

زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو[2]۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور

۱ - ان سب فقروں میں ''ہم نے'' پر زور ہے۔ یعنی اس کا نازل کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ''ہم'' ہیں، اس لیے اسے کسی بے زور ناصح کے کلام کی طرح ایک ہلکی چیز نہ سمجھ بیٹھنا۔ خوب جان لو کہ اس کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کے قبضے میں تمھاری جانیں اور قسمتیں ہیں، اور جس کی گرفت سے تم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔

دوسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو باتیں اس سورہ میں کہی گئی ہیں، وہ ''سِفارشات'' نہیں ہیں کہ آپ کا جی چاہے تو مانیں ورنہ جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، بلکہ یہ قطعی احکام ہیں جن کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اگر مومن اور مسلم ہو تو تمھارا فرض ہے کہ ان کے مطابق عمل کرو۔

تیسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو ہدایات اس سورہ میں دی جا رہی ہیں، ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ صاف صاف اور کھلی کھلی ہدایات ہیں، جن کے متعلق تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ فلاں بات ہماری سمجھ ہی میں نہیں آئی تھی تو ہم عمل کیسے کرتے۔

بس یہ اس فرمانِ مبارک کی تمہید (preamble) ہے جس کے بعد احکام شروع ہو جاتے ہیں۔ اس تمہید کا اندازِ بیان خود بتا رہا ہے کہ سورۂ نور کے احکام کو اللہ تعالیٰ کتنی اہمیت دے کر پیش فرما رہا ہے۔ کسی دوسری احکامی سورت کا دیباچہ اتنا پُر زور نہیں ہے۔

۲ - اس مسئلے کے بہت سے قانونی، اَخلاقی اور تاریخی پہلو تشریح طلب ہیں، جن کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو موجودہ زمانے میں ایک آدمی کے لیے اس تشریعِ الٰہی کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے ذیل میں ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر سلسلہ وار روشنی ڈالیں گے:

(۱) زنا کا عام مفہوم، جس سے ہر شخص واقف ہے، یہ ہے کہ ''ایک مرد اور ایک عورت، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان جائز رشتۂ زن و شو ہو، باہم مباشرت کا ارتکاب کریں۔'' اس فعل کا اخلاقاً برا ہونا، یا مذہباً گناہ ہونا، یا معاشرتی حیثیت سے معیوب

اور قابلِ اعتراض ہونا، ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام انسانی معاشرے متفق رہے ہیں، اور اس میں بجز اُن متفرق لوگوں کے، جنھوں نے اپنی عقل کو اپنی نفس پرستی کے تابع کر دیا ہے، یا جنھوں نے خبطی پَن کی اُپج کو فلسفہ طرازی سمجھ رکھا ہے، کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس عالم گیر اتفاقِ رائے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زِنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوعِ انسانی کا بقا اور انسانی تمدُّن کا قیام، دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کے لیے ملنے اور پھر الگ ہو جانے میں آزاد نہ ہوں، بلکہ ہر جوڑے کا باہمی تعلق ایک ایسے مستقل اور پائیدار عہدِ وفا پر اُستوار ہو، جو معاشرے میں معلوم و معروف بھی ہو اور جسے معاشرے کی ضمانت بھی حاصل ہو۔ اس کے بغیر انسانی نسل ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی، کیونکہ انسان کا بچہ اپنی زندگی اور اپنے انسانی نَشْو و نَما کے لیے کئی برس کی دردمندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور تنہا عورت اس بار کو اُٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مرد اس کا ساتھ نہ دے جو اس بچے کے وجود میں آنے کا سبب بنا ہو۔ اسی طرح اس معاہدے کے بغیر انسانی تمدُّن بھی برقرار نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمدُّن کی تو پیدائش ہی ایک مرد اور ایک عورت کے مل کر رہنے، ایک گھر اور ایک خاندان وجود میں لانے، اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر عورت اور مرد گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطعِ نظر کر کے محض لطف و لذت کے لیے آزادانہ ملنے لگیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں، اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے، اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدُّن کی یہ عمارت اُٹھی ہے۔ ان وُجوہ سے عورت اور مرد کا ایسا آزادانہ تعلق، جو کسی معلوم و معروف اور مسلَّم عہدِ وفا پر مبنی نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انھی وجوہ سے انسان اِس کو ہر زمانے میں ایک سخت عیب، ایک بڑی بد اَخلاقی، اور مذہبی اصطلاح میں ایک شدید گناہ سمجھتا رہا ہے۔ اور انھی وجوہ سے ہر زمانے میں انسانی معاشروں نے نکاح کی ترویج کے ساتھ ساتھ زِنا کے سَدِّ باب کی بھی کسی نہ کسی طور پر ضرور کوشش کی ہے۔ البتہ اس کوشش کی شکلوں میں مختلف قوانین اور اَخلاقی تمدُّنی اور مذہبی نظاموں میں فرق رہا ہے، جس کی بنیاد دراصل اس فرق پر ہے کہ نوع اور تمدُّن کے لیے زِنا کے نقصان دِہ ہونے کا شُعور کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ، کہیں واضح ہے اور کہیں دوسرے مسائل سے اُلجھ کر رہ گیا ہے۔

(۲) زِنا کی حرمت پر متفق ہونے کے بعد اختلاف جس امر میں ہوا ہے، وہ اس کے جرم، یعنی قانوناً مُستلزِمِ سزا ہونے کا مسئلہ ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور دوسرے مذاہب اور قوانین کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ انسانی فطرت سے قریب جو معاشرے رہے ہیں، انھوں نے ہمیشہ زنا، یعنی عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کو بجائے خود ایک جرم سمجھا ہے اور اس کے لیے سخت سزائیں رکھی ہیں۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشروں کو تمدُّن خراب کرتا گیا ہے، رَوِیّہ نرم ہوتا چلا گیا ہے۔

اس معاملے میں اوّلین تساہُل، جس کا ارتکاب بالعُموم کیا گیا، یہ تھا کہ ''محض زنا'' (fornication) اور ''زنا بزنِ غیر'' (adultery) میں فرق کر کے، اوّل الذکر کو ایک معمولی سی غَلَطی، اور صرف مؤخر الذکر کو جرمِ مُستلزِمِ سزا قرار دیا گیا۔

محض زنا کی تعریف جو مختلف قوانین میں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''کوئی مرد، خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ، کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو کسی دوسرے شخص کی بیوی نہ ہو۔'' اس تعریف میں اصل اعتبار مرد کی حالت کا نہیں، بلکہ عورت کی حالت کا کیا گیا ہے۔ عورت اگر بے شوہر ہے تو اس سے مباشرت محض زنا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ مرد بیوی رکھتا ہو

یا نہ رکھتا ہو۔ قدیم مصر، بابل، اَشُّور (اَسیریا) اور ہندوستان کے قوانین میں اس کی سزا بہت ہلکی تھی۔ اسی قاعدے کو یونان اور روم نے اختیار کیا، اور اسی سے آخر کار یہودی بھی متأثّر ہو گئے۔ بائبل میں یہ صرف ایک ایسا قصور ہے جس سے مرد پر محض مالی تاوان واجب آتا ہے۔ کتابِ ''خُروج'' میں اس کے متعلق جو حکم ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو، جس کی نسبت (یعنی منگنی) نہ ہوئی ہو، پُھسلا کر اس سے مباشرت کرے تو وہ ضرور ہی اسے مَہر دے کر اس سے بیاہ کر لے، لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے، تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق (یعنی جتنا مَہر کسی کنواری لڑکی کو دیا جاتا ہو) اسے نقدی دے۔'' (باب ۲۲، آیت ۱۶-۱۷)

کتابِ ''اِستِثنا'' میں یہی حکم ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوا ہے، اور پھر تصریح کی گئی ہے کہ مرد سے لڑکی کے باپ کو پچاس مِثقال چاندی (تقریباً ۵۵ روپے) تاوان دلوایا جائے۔ (باب ۲۲، آیت ۲۸-۲۹) البتہ اگر کوئی شخص کاہن (یعنی پروہت، priest) کی بیٹی سے زنا کرے تو اس کے لیے یہودی قانون میں پھانسی کی سزا ہے، اور لڑکی کے لیے زندہ جلانے کی۔ (Everyman's Talmud, p. 319-20)

یہ تخیل ہندوؤں کے تخیل سے کس قدر مشابہ ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے منو کی دھرم شاستر سے مقابلہ کر کے دیکھیے۔ وہاں لکھا ہے کہ:

> ''جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زِنا کرے، وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کر لے۔ البتہ اگر لڑکی اُونچی ذات کی ہو اور مرد نیچ ذات کا، تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطعِ اعضا کی سزا دینی چاہیے۔'' (ادھیائے ۸، اشلوک ۳۶۵-۳۶۶) ''اور یہ سزا زندہ جلا دیے جانے کی سزا میں تبدیل کی جا سکتی ہے جب کہ لڑکی برَہمَن ہو۔ (اشلوک ۳۷۷)

دراصل ان سب قوانین میں زنا بزنِّ غیر ہی اصلی اور بڑا جرم تھا، یعنی یہ کہ کوئی شخص (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو دوسرے شخص کی بیوی ہو۔ اس فعل کے جرم ہونے کی بنیاد یہ نہ تھی کہ ایک مرد اور عورت نے زِنا کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ یہ تھی کہ ان دونوں نے مل کر ایک شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسے کسی ایسے بچے کو پالنا پڑے جو اس کا نہیں ہے۔ گویا زنا نہیں بلکہ اختلاطِ نسب کا خطرہ اور ایک کے بچے کا دوسرے کے خرچ پر پلنا اور اس کا وارث ہونا اصل بنائے جرم تھا جس کی وجہ سے عورت اور مرد، دونوں مجرم قرار پاتے تھے۔ مصریوں کے ہاں اس کی سزا یہ تھی کہ مرد کو لاٹھیوں سے خوب پیٹا جائے اور عورت کی ناک کاٹ دی جائے۔ قریب قریب ایسی ہی سزائیں بابل، اَشُّور اور قدیم ایران میں بھی رائج تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں عورت کی سزا یہ تھی کہ اس کو کُتّوں سے پھڑوا دیا جائے، اور مرد کی یہ کہ اسے لوہے کے گرم پلنگ پر لٹا کر چاروں طرف آگ جلا دی جائے۔ یونان اور روم میں ابتداءً ایک مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو زنا کرتے دیکھ لے تو اسے قتل کر دے، یا چاہے تو اس سے مالی تاوان وصول کر لے۔ پھر پہلی صدی قبلِ مسیح میں قیصر آگسٹس

نے یہ قانون مقرر کیا کہ مرد کی آدھی جائداد ضبط کر کے اسے جلاوطن کر دیا جائے، اور عورت کا آدھا مَہر ساقط اور اس کی ۱/۳ جائداد ضبط کر کے اُسے بھی مملکت کے کسی دُور دراز حصّے میں بھیج دیا جائے۔ قسطنطین نے اس قانون کو بدل کر عورت اور مرد، دونوں کے لیے سزائے موت مقرر کی۔ لیو (Leo) اور مارسِین (Marcian) کے دور میں اس سزا کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر قیصر جَسٹِنِین نے اس میں مزید تخفیف کر کے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ عورت کو کوڑوں سے پیٹ کر کسی راہب خانے میں ڈال دیا جائے، اور اس کے شوہر کو یہ حق دیا جائے کہ چاہے تو دو سال کے اندر اُسے نکلوا لے، ورنہ ساری عمر وہیں پڑا رہنے دے۔

یہودی قانون میں زِنا بزَنِ غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

> ''اگر کوئی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو، تو ان دونوں کو سزا ملے، لیکن وہ جان سے مارے نہ جائیں، اس لیے کہ وہ عورت آزاد نہ تھی۔'' (اَحبار، ۱۹:۲۰)

> ''جو شخص دوسرے کی بیوی سے، یعنی اپنے ہمسایے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ، دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔'' (اَحبار، ۲۰:۱۰)

> ''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔'' (اِستثنا، ۲۲:۲۲)

> ''اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو (یعنی اس کی منگنی ہو) اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم اُن دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چِلّائی، اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسایے کی بیوی کو بے حرمت کیا...... پر اگر اس آدمی کو وہی لڑکی، جس کی نسبت ہو چکی ہو، کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے، تو فقط وہ آدمی ہی، جس نے صحبت کی، مار ڈالا جائے، پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔'' (استثنا، ۲۲: ۲۳ تا ۲۶)

لیکن حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے بہت پہلے یہودی علما، فقہا، اُمَرا اور عوام، سب اس قانون کو عملاً منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ بائبل میں لکھا ہوا تھا اور خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتّٰی کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسیٰؑ جب دعوتِ حق لے کر اُٹھے اور علمائے یہود نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا: اس کا فیصلہ فرمایئے۔ (یُوحنّا، باب ۸، آیت ۱-۱۱) اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو کنویں یا کھائی، دونوں میں سے کسی ایک میں کُودنے پر مجبُور کر دیں۔ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لیجیے، یہ نرالے پیغمبر صاحب تشریف لائے ہیں جنھوں نے دنیوی مصلحتوں کی خاطر خدائی قانون بدل ڈالا۔ اور اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف رومی قانون سے آپ کو ٹکرا دیا جائے، اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانو ان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا، اب تورات کی پوری شریعت تمھاری پیٹھوں اور جانوں پر برسے گی۔ لیکن

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انھی پر اُلٹ دیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے جو خود پاک دامن ہو، وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بِھیڑ چھٹ گئی، ایک ایک منہ چھپا کر رخصت ہو گیا، اور ''حاملانِ شرعِ متین'' کی اَخلاقی حالت بالکل برَہنہ ہو کر رہ گئی۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کے رخصت کر دیا، کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ اس کے مُقدّمے کا فیصلہ کرتے، نہ اُس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اس واقعے سے اور آپ کے چند اور متفرق اقوال سے، جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، عیسائیوں نے غلط اِستنباط کر کے زنا کے جرم کا ایک اور تصور قائم کر لیا۔ ان کے ہاں زنا اگر غیر شادی شدہ مرد، غیر شادی شدہ عورت سے کرے تو یہ گناہ تو ہے، مگر جرم مُستلزِمِ سزا نہیں ہے۔ اور اگر اس فعل کا کوئی ایک فریق، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، شادی شدہ ہو، یا دونوں شادی شدہ ہوں، تو یہ جرم ہے، مگر اس کو جرم بنانے والی چیز دراصل ''عہد شکنی'' ہے، نہ کہ محض زنا۔ ان کے نزدیک جس نے بھی شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا، وہ اس لیے مجرم ہے کہ اس نے اس عہدِ وفا کو توڑ دیا جو قربان گاہ کے سامنے اس نے پادری کے توسُّط سے اپنی بیوی یا اپنے شوہر کے ساتھ باندھا تھا۔ مگر اِس جرم کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ زانی مرد کی بیوی اپنے شوہر کے خلاف بے وفائی کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے، اور زانیہ عورت کا شوہر ایک طرف اپنی بیوی پر دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے اور دوسری طرف اُس شخص سے بھی تاوان لینے کا حق دار ہو جس نے اس کی بیوی کو خراب کیا۔ بس یہ سزا ہے جو مسیحی قانون شادی شدہ زانیوں اور زانیات کو دیتا ہے، اور غضب یہ ہے کہ یہ سزا بھی دو دھاری تلوار ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے، تو وہ بے وفا شوہر سے تو نجات حاصل کر لے گی، لیکن مسیحی قانون کی رُو سے پھر وہ عمر بھر کوئی دوسرا نکاح نہ کر سکے گی۔ اور ایسا ہی حشر اُس مرد کا بھی ہو گا جو بیوی پر ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے، کیونکہ مسیحی قانون اس کو بھی نکاحِ ثانی کا حق نہیں دیتا۔ گویا زوجین میں سے جس کو بھی تمام عمر راہب بن کر رہنا ہو، وہ اپنے شریکِ زندگی کی بے وفائی کا شکوہ مسیحی عدالت میں لے جائے۔

موجودہ زمانے کے مغربی قوانین، جن کی پیروی اب خود مسلمانوں کے بھی بیش تر ممالک کر رہے ہیں، انھی مختلف تصورات پر مبنی ہیں۔ ان کے نزدیک زنا، عیب یا بد اَخلاقی یا گناہ جو کچھ بھی ہو، جرم بہر حال نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی چیز جرم بنا سکتی ہے تو وہ جبر ہے، جب کہ فریقِ ثانی کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے مباشرت کی جائے۔ رہا کسی شادی شدہ مرد کا ارتکاب زنا، تو وہ اگر وجۂ شکایت ہے تو اس کی بیوی کے لیے ہے، وہ چاہے تو اس کا ثبوت دے کر طلاق حاصل کر لے۔ اور زنا کی مرتکب اگر شادی شدہ عورت ہے تو اس کے شوہر کو نہ صرف اس کے خلاف بلکہ زانی مرد کے خلاف بھی وجۂ شکایت پیدا ہوتی ہے، اور دونوں پر دعویٰ کر کے وہ بیوی سے طلاق اور زانی مرد سے تاوان وصول کر سکتا ہے۔

(۳) اسلامی قانون ان سب تصورات کے برعکس زنا کو بجائے خود ایک جرم مستلزِمِ سزا قرار دیتا ہے اور شادی شدہ ہو کر زنا کرنا اس کے نزدیک جرم کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے، نہ اس بنا پر کہ مجرم نے کسی سے ''عہد شکنی'' کی، یا کسی دوسرے کے بستر پر دست درازی کی، بلکہ اس بنا پر کہ اس کے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک جائز ذریعہ موجود تھا اور پھر بھی

اس نے ناجائز ذریعہ اختیار کیا۔ اسلامی قانون زنا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کی اگر آزادی ہو جائے تو ایک طرف نوعِ انسانی کی اور دوسری طرف تمدُّنِ انسانی کی جَڑ کٹ جائے۔ نوع کے بقا اور تمدُّن کے قیام، دونوں کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق صرف قانون کے مطابق قابلِ اعتماد رابطے تک محدود ہو۔ اور اسے محدود رکھنا ممکن نہیں ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ آزادانہ تعلق کی بھی کھلی گنجایش موجود رہے۔ کیونکہ گھر اور خاندان کی ذمّہ داریوں کا بوجھ سنبھالے بغیر جہاں لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کے مواقع حاصل رہیں، وہاں ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ اِنھی خواہشات کی تسکین کے لیے وہ پھر اتنی بھاری ذمّہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بیٹھنے کے لیے ٹکٹ کی شرط بے معنیٰ ہے اگر بلاٹکٹ سفر کرنے کی آزادی بھی لوگوں کو حاصل رہے۔ ٹکٹ کی شرط اگر ضروری ہے تو اسے مؤثر بنانے کے لیے بلاٹکٹ سفر کو جرم ہونا چاہیے۔ پھر اگر کوئی شخص پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بے ٹکٹ سفر کرے تو کم درجے کا مجرم ہے، اور مال دار ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت کرے تو جرم اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

(۴) اسلام انسانی معاشرے کو زنا کے خطرے سے بچانے کے لیے صرف قانونی تعزیر کے ہتھیار پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرتا ہے، اور یہ قانونی تعزیر اس نے محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر تجویز کی ہے۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روز ان پر کوڑے برسانے کے لیے ٹکٹکیاں لگی رہیں، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا ارتکاب نہ کریں اور کسی کو اس پر سزا دینے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے، اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بٹھاتا ہے، اُسے آخرت کی باز پُرس کا احساس دلاتا ہے، جس سے مر کر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اُس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے، اور پھر اسے بار بار مُتنبّہ کرتا ہے کہ زنا اور بے عصمتی اُن بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت باز پرس کرے گا۔ یہ مضمون سارے قرآن میں جگہ جگہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ آدمی کے لیے نکاح کی تمام ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ ایک بیوی سے تسکین نہ ہو تو چار چار تک سے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے۔ دل نہ ملیں تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خُلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ اور نا مُوافقَت کی صورت میں خاندانی پنچایت سے لے کر سرکاری عدالت تک کی طرف رُجوع کا راستہ کھول دیتا ہے، تاکہ یا تو مُصالحَت ہو جائے، یا پھر زوجین ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جہاں دل ملے، نکاح کر لیں۔ یہ سب کچھ آپ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اسی سورۂ نور میں آپ ابھی دیکھیں گے کہ مَردوں اور عورتوں کے بِن بیاہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور صاف حکم دے دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے نکاح کر دیے جائیں، حتّٰی کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی مُجرَّد نہ چھوڑا جائے۔ پھر وہ معاشرے سے اُن اسباب کا خاتمہ کرتا ہے جو زنا کی رغبت دلانے والے، اس کی تحریک کرنے والے، اور اس کے لیے مواقع پیدا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ زنا کی سزا بیان کرنے سے ایک سال پہلے سورۂ اَحزاب میں عورتوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ گھر سے نکلیں تو چادریں اوڑھ کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلیں، اور مسلمان عورتوں کے لیے جس نبی کا گھر نمونے کا گھر تھا، اس کی عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ گھروں میں وقار و سکینت کے ساتھ بیٹھو، اپنے حسن اور بناؤ سنگھار کی نمایش نہ کرو، اور باہر کے مرد تم سے کوئی چیز لیں تو پردے کے پیچھے سے لیں۔

یہ نمونہ دیکھتے دیکھتے ان تمام صاحبِ ایمان عورتوں میں پھیل گیا جن کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کی بے حیا عورتیں نہیں بلکہ نبیؐ کی بیویاں اور بیٹیاں تقلید کے لائق تھیں۔ اس طرح فوج داری قانون کی سزا مقرر کرنے سے پہلے عورتوں اور مردوں کی خَلط مَلط معاشرت بند کی گئی، بنی سنوری عورتوں کا باہر نکلنا بند کیا گیا، اور ان اسباب و ذرائع کا دروازہ بند کر دیا گیا جو زنا کے مواقع اور اس کی آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سب کے بعد جب زنا کی فوج داری سزا مقرر کی گئی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ اسی سورۂ نور میں اشاعتِ فحش کو بھی روکا جا رہا ہے، قحبہ گری (prostitution) کی قانونی بندش بھی کی جا رہی ہے، عورتوں اور مردوں پر بدکاری کے بے ثبوت الزام لگانے اور ان کے چرچے کرنے کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی جا رہی ہے، غضِّ بصر کا حکم دے کر نگاہوں پر پہرے بھی بٹھائے جا رہے ہیں، تاکہ دیدہ بازی سے حُسن پرستی تک اور حُسن پرستی سے عشق بازی تک نوبت نہ پہنچے، اور عورتوں کو یہ حکم بھی دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں محرَم اور غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان تمیز کریں اور غیر محرَموں کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔ اس سے آپ اُس پوری اصلاحی اسکیم کو سمجھ سکتے ہیں جس کے ایک جُز کے طور پر زنا کی قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزا اس لیے ہے کہ تمام داخلی و خارجی تدابیرِ اصلاح کے باوجود جو شریر النفس لوگ کھلے ہوئے جائز مواقع کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے ہی اپنی خواہشِ نفس پوری کرنے پر اصرار کریں، ان کی کھال اُدھیڑ دی جائے، اور ایک بدکار کو سزا دے کر معاشرے کے اُن بہت سے لوگوں کا نفسیاتی آپریشن کر دیا جائے جو اس طرح کے میلانات رکھتے ہوں۔ یہ سزا محض ایک مجرم کی عقوبت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بالفعل اعلان بھی ہے کہ مسلم معاشرہ بدکاروں کی تفریح گاہ نہیں ہے، جس میں ذَوّاقین اور ذَوّاقات اخلاقی قُیود سے آزاد ہو کر مزے لُوٹتے پھریں۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی شخص اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو سمجھے تو وہ بآسانی محسوس کر لے گا کہ اس پوری اسکیم کا ایک جُز بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ردّ و بدل کا خیال یا تو وہ نادان کر سکتا ہے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھے بغیر مُصلح بن بیٹھا ہو، یا پھر وہ مفسد ایسا کر سکتا ہے جس کی اصل نیّت اُس مقصد کو بدل دینے کی ہو جس کے لیے یہ اسکیم حکیمِ مُطلَق نے تجویز کی ہے۔

(۵) زنا کو قابلِ سزا فعل تو ۳ھ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اس وقت یہ ایک ''قانونی'' جرم نہ تھا جس پر ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے، بلکہ اس کی حیثیت ایک ''معاشرتی'' یا ''خاندانی'' جرم کی سی تھی، جس پر اہلِ خاندان ہی کو بطورِ خود سزا دے لینے کا اختیار تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر چار گواہ اِس امر کی شہادت دے دیں کہ انھوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو دونوں کو مارا پیٹا جائے، اور عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ قاعدہ ''تاحکمِ ثانی'' ہے، اصل قانون بعد میں آنے والا ہے۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۳۱) اس کے ڈھائی تین سال بعد یہ حکم نازل ہوا جو آپ اس آیت میں پا رہے ہیں، اور اس نے حکمِ سابق کو منسوخ کر کے زنا کو ایک قانونی جرم قابلِ دست اندازیِ سرکار (cognizable offence) قرار دے دیا۔

(٦) اس آیت میں زنا کی جو سزا مقرر کی گئی ہے، وہ دراصل ''محض زنا'' کی سزا ہے، زنا بعدِ احصان (یعنی شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کے ارتکاب) کی سزا نہیں ہے جو اسلامی قانون کی نگاہ میں سخت تر جرم ہے۔ یہ بات خود قرآن ہی کے ایک اشارے

سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہاں اُس زنا کی سزا بیان کر رہا ہے جس کے فریقین غیر شادی شدہ ہوں۔ سورۂ نساء میں پہلے ارشاد ہوا کہ:

وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا۝ (آیت ۱۵)

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔

اس کے بعد تھوڑی دُور آگے چل کر پھر فرمایا:

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ ...... فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ (آیت ۲۵)

اور تم میں سے جو لوگ اتنی مَقدِرَت نہ رکھتے ہوں کہ مومنوں میں سے مُحْصَنات کے ساتھ نکاح کریں تو وہ تمھاری مومن لونڈیوں سے نکاح کر لیں...... پھر اگر وہ (لونڈیاں) مُحْصَنَہ ہو جانے کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے، جو مُحْصَنات کو (ایسے جرم پر) دی جائے۔

اِن میں سے پہلی آیت میں توقع دلائی گئی ہے کہ زانیہ عورتیں جن کو سرِدست قید کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کا یہ دوسرا حکم وہی چیز ہے جس کا وعدہ سورۂ نساء کی مذکورۂ بالا آیت میں کیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں شادی شدہ لونڈی کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ یہاں ایک ہی آیت اور ایک ہی سلسلۂ بیان میں دو جگہ مُحْصَنات کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ دونوں جگہ اس کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ اب آغاز کے فقرے کو دیکھیے تو وہاں کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ ''مُحْصَنات سے نکاح کرنے کی مَقدِرَت نہ رکھتے ہوں۔'' ظاہر ہے کہ اس سے مراد شادی شدہ عورت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک آزاد خاندان کی بِن بیاہی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اختتام کے فقرے میں فرمایا جاتا ہے کہ لونڈی منکوحہ ہونے کے بعد اگر زنا کرے تو اس کو اُس سزا سے آدھی سزا دی جائے جو مُحْصَنات کو اس جرم پر ملنی چاہیے۔ سیاقِ عبارت صاف بتاتا ہے کہ اس فقرے میں بھی مُحْصَنات کے معنیٰ وہی ہیں جو پہلے فقرے میں تھے، یعنی شادی شدہ عورت نہیں بلکہ آزاد خاندان کی حفاظت میں رہنے والی بن بیاہی عورت۔ اس طرح سورۂ نساء کی یہ دونوں آیتیں مل کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ سورۂ نور کا یہ حکم، جس کا وہاں وعدہ کیا گیا تھا، غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کرتا ہے۔ (مزید توضیح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۴۶)

(۷) یہ امر کہ زنا بعدِ اِحصان کی سزا کیا ہے، قرآنِ مجید نہیں بتاتا، بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قولاً اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے، بلکہ عملاً آپؐ نے متعدّد مقدّمات میں یہی سزا نافذ بھی کی ہے۔ پھر آپؐ کے بعد چاروں خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے دَور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ میں یہ مسئلہ بالکل مُتَّفَق عَلَیہ تھا۔ کسی ایک شخص کا بھی

کوئی قول ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ قرنِ اوّل میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکمِ شرعی ہونے میں کوئی شک تھا۔ ان کے بعد تمام زمانوں اور ملکوں کے فقہائے اسلام اس بات پر متفق رہے ہیں کہ یہ ایک سنتِ ثابتہ ہے، کیونکہ اس کی صحّت کے اتنے متواتر اور قوی ثبوت موجود ہیں جن کے ہوتے کوئی صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اُمّت کی پوری تاریخ میں بجز خوارج اور بعض مُعتزِلہ کے، کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، اور ان کے انکار کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی نشان دہی کر سکے ہوں، بلکہ وہ اسے ''قرآن کے خلاف'' قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے فہمِ قرآن کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ کے مطلق الفاظ استعمال کر کے اس کی سزا سو کوڑے بیان کرتا ہے، لہٰذا قرآن کی رُو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے، اور اس سے زانی مُحْصِن کو الگ کر کے اس کی کوئی اور سزا تجویز کرنا قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں، وہی قانونی وزن ان کی اُس تشریح کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، بشرطیکہ وہ آپؐ سے ثابت ہو۔ قرآن نے ایسے ہی مُطلَق الفاظ میں وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ کا حکم بھی قطعِ ید بیان کیا ہے۔ اس حکم کو اگر ان تشریحات سے مُقیَّد نہ کیا جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں تو اس کے الفاظ کی عُمومیّت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک سُوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی آدمی کو سارق قرار دیں اور پھر پکڑ کر اس کا ہاتھ شانے کے پاس سے کاٹ دیں۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری کرنے والا بھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو آپ کو اسے چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کہتا ہے: فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ (المائدہ، آیت ۳۹) اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے، رضاعی بیٹی کی حرمت اس اِستِدلال کی رُو سے قرآن کے خلاف ہونی چاہیے۔ قرآن صرف دو بہنوں کے جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی، اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو جو شخص حرام کہے، اس پر قرآن کے خلاف حکم لگانے کا الزام عائد ہونا چاہیے۔ قرآن صرف اُس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جب کہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ مطلقاً اس کی حرمت خلافِ قرآن قرار پانی چاہیے۔ قرآن صرف اُس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے جب کہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ آئے۔ حضر میں، اور کاتب کے قابلِ حصول ہونے کی صورت میں رہن کا جواز قرآن کے خلاف ہونا چاہیے۔ قرآن عام لفظوں میں حکم دیتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ (گواہ بناؤ جب کہ آپس میں خرید و فروخت کرو)۔ اب وہ تمام خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے جو رات دن ہماری دکانوں پر گواہی کے بغیر ہو رہی ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ہی اُن لوگوں کے اِستِدلال کی غَلَطی معلوم ہو جاتی ہے جو رجم کے حکم کو خلافِ قرآن کہتے ہیں۔ نظامِ شریعت میں نبی کا یہ منصب ناقابلِ انکار ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد ہمیں بتائے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے، اُس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے، کن معاملات پر اس کا اطلاق ہوگا، اور کن معاملات کے لیے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار صرف اُصولِ دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے اتنی عملی قباحتیں لازم آتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔

(۸) زنا کی قانونی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حَنَفِیَّہ اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ''ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قُبُل میں مباشرت کرنا جو نہ تو اس کے نکاح یا مِلکِ یَمِین میں ہو اور نہ اس امر کے شبہے کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یا مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے۔'' اس تعریف کی رُو سے وطی فی الدُّبُر، عملِ قومِ لوط، بہائم سے مُجامَعَت وغیرہ، ماہیّتِ زِنا سے خارج ہو جاتے ہیں اور صرف عورت سے قُبُل میں مباشرت ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جب کہ شرعی حق یا اس کے شبہے کے بغیر یہ فعل کیا گیا ہو۔ بخلاف اس کے شافعیہ اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: ''شرم گاہ کو ایسی شرم گاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جاسکتی ہو۔'' اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے: ''شرعی حق یا اس کے شبہے کے بغیر قُبُل یا دُبُر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا۔'' ان دونوں تعریفوں کی رو سے عملِ قومِ لوط بھی زنا میں شمار ہو جاتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں تعریفیں لفظِ زنا کے معروف معنوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔ قرآنِ مجید ہمیشہ الفاظ کو اُن کے معروف اور عام فہم معنیٰ میں استعمال کرتا ہے، اِلّا یہ کہ وہ کسی لفظ کو اپنی اصطلاحِ خاص بنا رہا ہو، اور اصطلاحِ خاص بنانے کی صورت میں وہ خود اپنے مفہُومِ خاص کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ لفظِ زنا کو کسی مخصوص معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہو، لہٰذا اسے معروف معنیٰ ہی میں لیا جائے گا، اور وہ عورت سے فطری مگر ناجائز تعلق تک ہی محدود ہے، شہوت رانی کی دوسری صورتوں تک وسیع نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں یہ بات معلوم ہے کہ عملِ قومِ لوطؑ کی سزا کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس فعل کا شمار بھی اسلامی اصطلاح کی رُو سے زنا میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اختلافِ رائے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

(۹) قانوناً ایک فعلِ زنا کو مُستَلزِمِ سزا قرار دینے کے لیے صرف اِدخالِ حَشَفَہ کافی ہے۔ پورا اِدخال یا تکمیلِ فعل اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر اِدخالِ حَشَفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر یک جا پایا جانا، یا مُلاعَبَت کرتے ہوئے دیکھا جانا، یا برہنہ پایا جانا، کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا ڈاکٹری معاینہ کرا کے زنا کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حدِّ زِنا جاری کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی بے حیائی میں مبتلا پائے جائیں، ان پر صرف تعزیر ہے، جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے حاکمِ عدالت خود کرے گا، یا جس کے لیے اسلامی حکومت کی مجلسِ شُوریٰ کوئی سزا تجویز کرنے کی مجاز ہوگی۔ یہ تعزیر اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو دس کوڑوں سے زیادہ نہیں لگائے جاسکتے، کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ لا یجلد فوق عشر جلداتٍ الّا فی حدٍّ من حدود اللّٰہ، ''اللہ کی مقرر کردہ حدود کے سوا کسی اور جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد) اور اگر کوئی شخص پکڑا نہ گیا ہو بلکہ خود نادم ہو کر ایسے کسی قصور کا اعتراف کرے تو اس کے لیے صرف توبہ کی تلقین کافی ہے۔ عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایَت ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''شہر کے باہر میں ایک عورت سے سب کچھ کر گزرا بجز جماع کے۔ اب حضور جو چاہیں مجھے سزا دیں۔'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''جب خدا نے پردہ ڈال دیا تھا تو تُو بھی پردہ پڑا رہنے دیتا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور وہ شخص چلا گیا۔ پھر آپؐ نے اسے واپس بلایا اور یہ آیت پڑھی: اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ''نماز قائم کر دن کے دونوں

سِروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔" (ہود، آیت ۱۱۴) ایک شخص نے پوچھا: "کیا یہ اسی کے لیے خاص ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "نہیں، سب کے لیے ہے۔" (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی) یہی نہیں بلکہ شریعت اس کو بھی جائز نہیں رکھتی کہ کوئی شخص اگر جُرم کی تصریح کے بغیر اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرے تو کھوج لگا کر اس سے پوچھا جائے کہ تو نے کون سا جرم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے۔" مگر آپؐ نے اس سے نہیں پوچھا کہ تو کس حد کا مستحق ہوا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر وہ شخص پھر اُٹھا اور کہنے لگا کہ میں مجرم ہوں، مجھے سزا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تو نے ابھی ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی ہے؟" اس نے عرض کیا: "جی ہاں"۔ فرمایا: "بس تو اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔" (بخاری، مسلم، احمد)

(۱۰) کسی شخص (مرد یا عورت) کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعلِ زنا صادر ہوا ہے، بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہییں۔ یہ شرطیں زنائے محض کے معاملے میں اَور ہیں، اور زنا بعدِ احصان کے معاملے میں اور۔

زنائے محض کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل ہو اور بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حدِّ زنا کا مستحق نہیں ہے۔

اور زنا بعدِ احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ چند مزید شرطیں بھی ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ اس شرط پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ قرآن خود اشارہ کرتا ہے کہ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ لونڈی اگر نکاح کے بعد زنا کی مرتکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھی سزا دینی چاہیے۔ فقہا نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہوگا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ شادی شدہ ہو۔ یہ شرط بھی مُتَّفَق عَلَیہ ہے، اور اس شرط کی رُو سے کوئی ایسا شخص جو مِلکِ یمین کی بنا پر تمتُّع کر چکا ہو، یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو، شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا، یعنی اُس سے اگر زنا کا صدور ہو تو اس کو رجم کی نہیں بلکہ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا محض نکاح ہی نہ ہوا ہو بلکہ نکاح کے بعد خَلْوَتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو۔ صرف عقدِ نکاح کسی مرد کو مُحْصِن، یا عورت کو مُحصِنہ نہیں بنا دیتا کہ زنا کے ارتکاب کی صورت میں اس کو رجم کر دیا جائے۔ اس شرط پر بھی اکثر فقہا متفق ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اس میں اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو مُحْصِن صرف اسی صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوتِ صحیحہ کے وقت زوجین آزاد، بالغ اور عاقل ہوں۔ اس مزید شرط سے جو فرق واقع ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک مرد کا نکاح ایسی عورت سے ہوا ہو جو لونڈی ہو، یا نابالغ ہو، یا مجنون ہو، تو خواہ وہ اس حالت میں اپنی بیوی سے لذت اندوز ہو بھی چکا ہو، پھر بھی وہ مرتکبِ زنا ہونے کی صورت میں رجم کا مستحق نہ ہوگا۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے کہ اگر اس کو اپنے نابالغ، یا مجنون، یا غلام شوہر سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل چکا ہو، پھر بھی وہ مرتکبِ زنا ہونے کی صورت میں رجم کی مستحق نہ ہوگی۔ غور کیا جائے تو محسُوس ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی معقول اضافہ ہے جو ان دونوں بالغ النظر بزرگوں نے کیا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور

امام احمدؒ اس کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ذِمّی بھی اگر زنا بعدِ اِحصان کا مرتکب ہوگا تو رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعدِ احصان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔ اس کے دلائل میں سے سب سے زیادہ معقول اور وزنی دلیل یہ ہے کہ ایک آدمی کو سنگساری جیسی خوف ناک سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل ''اِحصان'' کی حالت میں ہو اور پھر بھی زنا کے ارتکاب سے باز نہ آئے۔ اِحصان کا مطلب ہے: ''اَخلاقی قَلعَہ بندی''، اور اس کی تکمیل تین حصاروں سے ہوتی ہے: اوّلین حصار یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہو، آخرت کی جواب دِہی کا قائل ہو اور شریعتِ خداوندی کو تسلیم کرتا ہو۔ دوسرا حصار یہ ہے کہ وہ معاشرے کا آزاد فرد ہو، کسی دوسرے کی غلامی میں نہ ہو جس کی پابندیاں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز تدابیر اختیار کرنے میں مانع ہوتی ہیں، اور لاچاری و مجبوری اس سے گناہ کرا سکتی ہے، اور کوئی خاندان اسے اپنے اخلاق اور اپنی عزت کی حفاظت میں مدد دینے والا نہیں ہوتا۔ تیسرا حصار یہ ہے کہ اس کا نکاح ہو چکا ہو اور اسے تسکینِ نفس کا جائز ذریعہ حاصل ہو۔ یہ تینوں حصار جب پائے جاتے ہوں تب ''قَلعَہ بندی'' مکمل ہوتی ہے اور تب ہی وہ شخص بجا طور پر سنگساری کا مستحق قرار پا سکتا ہے جس نے ناجائز شہوت رانی کی خاطر تین تین حصار توڑ ڈالے۔ لیکن جہاں پہلا اور سب سے بڑا حصار، یعنی خدا اور آخرت اور قانونِ خداوندی پر ایمان ہی موجود نہ ہو، وہاں یقیناً قَلعَہ بندی مکمل نہیں ہے اور اس بنا پر فُجور کا جرم بھی اس شدت کو پہنچا ہوا نہیں ہے جو اسے انتہائی سزا کا مستحق بنا دے۔ اسی دلیل کی تائید ابنِ عمرؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے اسحاق بن رَاہَوَیہ نے اپنی مسند میں اور دارقُطنی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ من اشرك باللّٰہ فلیس بمحصن ''جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا وہ مُحصِن نہیں ہے۔'' اگرچہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ابنِ عمرؓ نے اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے، یا یہ ان کا اپنا فتویٰ ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود اس کا مضمون اپنے معنٰی کے لحاظ سے نہایت قوی ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہودیوں کے اُس مُقدّمے سے اِستِدلال کیا جائے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم نافذ فرمایا تھا، تو ہم کہیں گے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس مقدّمے کے متعلق تمام معتبر رِوایات کو جمع کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اسلام کا ملکی قانون (law of the land) نہیں بلکہ ان کا اپنا مذہبی قانون (personal law) نافذ فرمایا تھا۔ بخاری و مسلم کی مُتّفَقہ روایت ہے کہ جب یہ مقدّمہ آپؐ کے پاس لایا گیا تو آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا کہ ما تجدون فی التوراۃ فی شان الرجم یاما تجدون فی کتابکم، یعنی ''تمھاری کتاب تورات میں اس کا کیا حکم ہے؟'' پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کے ہاں رجم کا حکم ہے تو حضورؐ نے فرمایا: فانی احکم بما فی التوراۃ ''میں وہی فیصلہ کرتا ہوں جو تورات میں ہے۔'' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: اللھم انی اول من احیا امرك اذا ماتوہ، ''خداوندا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جب کہ انھوں نے اسے مُردہ کر دیا تھا۔'' (مسلم، ابوداؤد، احمد)

(۱۱) فعلِ زنا کے مرتکب کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی آزاد مرضی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبر و اِکراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبُور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے پر شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ ''آدمی جبراً کرائے ہوئے کاموں کی ذمّہ داری سے بَری ہے''، بلکہ آگے چل کر اسی

سورہ میں خود قرآن اُن عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبُور کیا گیا ہو۔ نیز متعدِّد احادیث میں تصریح ہے کہ زنا بالجبر کی صورت میں صرف زانیِ جابر کو سزا دی گئی اور جس پر جبر کیا گیا تھا، اسے چھوڑ دیا گیا۔ ترمِذی و ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک عورت اندھیرے میں نماز کے لیے نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو گرا لیا اور زبردستی اس کی عِصمت دری کر دی۔ اس کے شور مچانے پر لوگ آ گئے اور زانی پکڑا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجم کرا دیا اور عورت کو چھوڑ دیا۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک شخص نے ایک لڑکی سے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ آپ نے اسے کوڑے لگوائے اور لڑکی کو چھوڑ دیا۔ ان دلائل کی بنا پر عورت کے معاملے میں تو قانون مُتَّفق عَلَیہ ہے۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہُوا ہے کہ آیا مرد کے معاملے میں بھی جبر و اکراہ معتبر ہے یا نہیں۔ امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام حَسَنؒ بن صالح کہتے ہیں کہ مرد بھی اگر زِنا کرنے پر مجبُور کیا گیا ہو تو معاف کیا جائے گا۔ امام زُفَرؒ کہتے ہیں کہ اسے معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ انتشارِ عُضُو کے بغیر اس فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اور انتشارِ عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرک ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبُور کیا ہو تو سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ جب خود حکومت ہی جرم پر مجبور کرنے والی ہو تو اُسے سزا دینے کا حق نہیں رہتا۔ لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزا دی جائے گی، کیونکہ ارتکابِ زنا بہرحال وہ اپنی شہوت کے بغیر نہ کر سکتا تھا اور شہوت جبراً پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ان تینوں اقوال میں سے پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انتشارِ عضو چاہے شہوت کی دلیل ہو مگر رضا و رغبت کی لازمی دلیل نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ظالم کسی شریف آدمی کو زبردستی پکڑ کر قید کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک جوان، خوب صورت عورت کو بھی برہنہ کر کے ایک ہی کمرے میں بند رکھتا ہے، اور اسے اس وقت تک رہا نہیں کرتا جب تک کہ وہ زنا کا مرتکب نہ ہو جائے۔ اس حالت میں اگر یہ دونوں زنا کے مرتکب ہو جائیں اور وہ ظالم اس کے چار گواہ بنا کر انھیں عدالت میں پیش کر دے، تو کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان کے حالات کو نظر انداز کر کے انھیں سنگسار کر دیا جائے یا ان پر کوڑے برسائے جائیں؟ اس طرح کے حالات عقلاً یا عادتاً ممکن ہیں جن میں شہوت لاحق ہو سکتی ہے، بغیر اس کے کہ اس میں آدمی کی اپنی رضا و رغبت کا دخل ہو۔ اگر کسی شخص کو قید کر کے شراب کے سوا پینے کو کچھ نہ دیا جائے، اور اس حالت میں وہ شراب پی لے، تو کیا محض اس دلیل سے اس کو سزا دی جا سکتی ہے کہ حالات تو واقعی اس کے لیے مجبُوری کے تھے، مگر حلق سے شراب کا گھونٹ وہ اپنے ارادے کے بغیر نہ اُتار سکتا تھا؟ جرم کے متحقق ہونے کے لیے محض ارادے کا پایا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آزاد ارادہ ضروری ہے۔ جو شخص زبردستی ایسے حالات میں مبتلا کیا گیا ہو کہ وہ جرم کا ارادہ کرنے پر مجبُور ہو جائے، وہ بعض صورتوں میں تو قطعی مجرم نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں اس کا جرم بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

(۱۲) اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے، اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام اُمّت کے فقہا کا اتفاق ہے کہ آیت زیرِ بحث میں حکم فَاجْلِدُوْا (ان کو کوڑے مارو) کے مخاطَب عوام نہیں ہیں بلکہ اسلامی حکومت کے حکام اور قاضی ہیں۔ البتہ غلام کے معاملے میں اختلاف ہے کہ اس پر اس کا آقا حد جاری کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ مذہبِ حَنَفی کے تمام ائمہّ اس پر متفق ہیں کہ وہ اس کا مجاز نہیں ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مجاز ہے۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ آقا کو سرقے میں ہاتھ کاٹنے کا تو حق نہیں ہے، مگر زِنا، قَذْف اور شراب نوشی پر وہ حد

جاری کرسکتا ہے۔

(۱۳) اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانونِ مملکت کا ایک حصّہ قرار دیتا ہے، اس لیے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہوگا، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس سے امام مالکؒ کے سوا غالباً ائمہ میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ رجم کی سزا غیر مسلموں پر جاری کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف اس بنیاد پر نہیں ہے کہ یہ قانونِ مملکت نہیں ہے، بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک رجم کی شرائط میں سے ایک شرط زانی کا پورا مُحصِن ہونا ہے اور اِحصان کی تکمیل اسلام کے بغیر نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ کے نزدیک اس حکم کے مخاطَب مسلمان ہیں نہ کہ کافر، اس لیے وہ حدِّزنا کو مسلمانوں کے شخصی قانون (پرسنل لا) کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔ رہا مُستامن (جو کسی دوسرے ملک سے دارالاسلام میں اجازت لے کر آیا ہو)، تو امام شافعیؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک وہ بھی اگر دارالاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اُس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔

(۱۴) اسلامی قانون یہ لازم نہیں کرتا کہ کوئی شخص اپنے جرم کا خود اقرار کرے، یا جو لوگ کسی شخص کے جرم زنا پر مطلع ہوں، وہ ضرور ہی اس کی خبر حکام تک پہنچائیں۔ البتہ جب حکام اس پر مُطّلع ہو جائیں تو پھر اس جرم کے لیے معافی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من اتی شیئا من ھٰذہ القاذورات فلیستتر بستر اللّٰہ فان ابدیٰ لنا صفحتہ اقمنا علیہ کتاب اللّٰہ ”تم میں سے جو شخص ان گندے کاموں میں سے کسی کا مرتکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پردے میں چھپا رہے۔ لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے۔“ (احکام القرآن، للجصّاص) ابوداؤد میں ہے کہ ماعزؓ بن مالک اَسلمی سے جب زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو ہزّالؓ بن نُعیم نے ان سے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے اس جرم کا اقرار کرو۔ چنانچہ انھوں نے جا کر حضورؐ سے اپنا جُرم بیان کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ایک طرف تو انھیں رجم کی سزا دی اور دوسری طرف ہزّالؓ سے فرمایا: لو سترتہ بثوبك کان خیرًا لك، ”کاش! تم اس کا پردہ ڈھانک دیتے تو تمھارے لیے زیادہ اچھا تھا۔“ ابوداؤد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تعافوا الحدود فی ما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب۔ ”حدود کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو۔ مگر جس حد (یعنی جُرم مُستَلزِم حد) کا معاملہ مجھ تک پہنچ جائے گا پھر وہ واجب ہو جائے گی۔“

(۱۵) اسلامی قانون میں یہ جرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کُتبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اُجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کیا۔ مگر جب یہ مقدمہ نبیؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے فرمایا: اما غنمك وجاریتك فردٌّ علیك ”تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھی کو واپس“، اور پھر آپؐ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرما دی۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس جرم میں راضی نامے کی کوئی گنجایش نہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں عِصمتوں کا معاوضہ مالی تاوانوں کی شکل میں نہیں دلوایا جا سکتا۔ آبرو کی قیمت کا یہ دَیُّوثانہ تصوّر مغربی قوانین ہی کو مبارک رہے۔

(۱۶) اسلامی حکومت کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت

نہ مل جائے۔ ثبوتِ جرم کے بغیر کسی کی بدکاری خواہ کتنے ہی ذرائع سے حکام کے علم میں ہو، وہ بہرحال اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ مدینے میں ایک عورت تھی جس کے متعلق روایات ہیں کہ وہ کھلی کھلی فاحشہ تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے: کانت تظھر فی الاسلام السوء۔ دوسری روایت میں ہے: کانت قد اعلنت فی الاسلام۔ ابنِ ماجہ کی روایت ہے: فقد ظھر منھا الرّیبۃ فی منطقھا وھیئتھا ومن یدخل علیھا۔ لیکن چونکہ اس کے خلاف بدکاری کا ثبوت نہ تھا، اس لیے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالانکہ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ تک نکل گئے تھے کہ لو کنت راجمًا احدًا بغیر بینۃ لرجمتھا، ”اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو ضرور رجم کرا دیتا۔“

(۱۷) جرمِ زنا کا پہلا ممکن ثبوت یہ ہے کہ شہادت اس پر قائم ہو۔ اس کے متعلق قانون کے اہم اجزا یہ ہیں:

الف۔ قرآن تصریح کرتا ہے کہ زنا کے لیے کم سے کم چار عینی شاہد ہونے چاہییں۔ اس کی صراحت سورۂ نساء، آیت ۱۵ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے اسی سورۂ نور میں بھی دو جگہ آ رہی ہے۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا، خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکابِ جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔

ب۔ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہییں جو اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے قابلِ اعتماد ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ پہلے کسی مُقدّمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں، مُلزَم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو، وغیرہ۔ بہرحال ناقابلِ اعتماد شہادت کی بنا پر نہ تو کسی کو رجم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا سکتے ہیں۔

ج۔ گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیے کہ انھوں نے مُلزَم اور مُلزَمہ کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے، یعنی کالمیل فی المکحلۃ والرشاء فی البئر (اس طرح جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنویں میں رسّی)۔

د۔ گواہوں کو اس امر میں متفق ہونا چاہیے کہ انھوں نے کب، کہاں، کس کو، کس سے زنا کرتے دیکھا ہے۔ ان بنیادی اُمور میں اختلاف ان کی شہادت کو ساقط کر دیتا ہے۔

شہادت کی یہ شرائط خود ظاہر کر رہی ہیں کہ اسلامی قانون کا منشا یہ نہیں ہے کہ ٹکٹکیاں لگی ہوں اور روز لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے برستے رہیں۔ بلکہ وہ ایسی حالت ہی میں یہ سخت سزا دیتا ہے جب کہ تمام اصلاحی اور انسدادی تدابیر کے باوجود اسلامی معاشرے میں کوئی جوڑا ایسا بے حیا ہو کہ چار چار آدمی اس کو جرم کرتے دیکھ لیں۔

(۱۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا، جب کہ عورت کا کوئی شوہر، یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم و معروف نہ ہو، ثبوتِ زنا کے لیے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے، اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کو رجم کر دیا جائے، یا کسی کی پیٹھ پر سو کوڑے برسا دیے جائیں۔ اتنی بڑی سزا کے لیے ناگزیر ہے کہ یا تو شہادت موجود ہو، یا پھر اقرار۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ شبہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کے لیے محرک ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ادفعوا الحدود ما وجدتم لھا مدفعاً، ”سزاؤں کو دفع کرو جہاں تک بھی ان کو دفع کرنے کی گنجایش پاؤ۔“ (ابنِ ماجہ) ایک دوسری حدیث میں ہے: ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان لہٗ

مخرجٌ فخلوا سبیله، فان الامام ان یخطئی فی العفو خیر من ان یخطئی فی العقوبة، ”مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی مُلزَم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غَلَطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غَلَطی کر جائے۔“ (ترمذِی) اس قاعدے کے لحاظ سے حمل کی موجودگی، چاہے شبہے کے لیے کتنی ہی قوی بنیاد ہو، زنا کا یقینی ثبوت بہر حال نہیں ہے، اس لیے کہ لاکھ میں ایک درجے کی حد تک اس امر کا بھی امکان ہے کہ مباشرت کے بغیر کسی عورت کے رحم میں کسی مرد کے نطفے کا کوئی جز پہنچ جائے اور وہ حاملہ ہو جائے۔ اتنے خفیف شبہے کا امکان بھی اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ مُلزَمہ کو زنا کی ہولناک سزا سے معاف رکھا جائے۔

(۱۹) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ اگر زنا کے گواہوں میں اختلاف ہو جائے، یا اور کسی وجہ سے ان کی شہادتوں سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا اُلٹے گواہ جھوٹے الزام کی سزا پائیں گے؟ فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس صورت میں وہ قاذف قرار پائیں گے اور انھیں ۸۰ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہ گواہ کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ مُدّعی کی حیثیت سے۔ اور اگر اس طرح گواہوں کو سزا دی جائے تو پھر زنا کی شہادت بہم پہنچنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ آخر کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ سزا کا خطرہ مول لے کر شہادت دینے آئے، جب کہ اس امر کا یقین کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ چاروں گواہوں میں سے کوئی ٹوٹ نہ جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے معقول ہے، کیونکہ شبہے کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملنا چاہیے، اسی طرح گواہوں کو بھی ملنا چاہیے۔ اگر ان کی شہادت کی کمزوری اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ مُلزَم کو زِنا کی خوف ناک سزا دے ڈالی جائے، تو اسے اس بات کے لیے بھی کافی نہ ہونا چاہیے کہ گواہوں پر قذف کی خوف ناک سزا برسا دی جائے، اِلّا یہ کہ ان کا صریح جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ پہلے قول کی تائید میں دو بڑی دلیلیں دی جاتی ہیں: اوّل یہ کہ قرآن زنا کی جھوٹی تہمت کو مُستوجِبِ سزا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ دلیل اس لیے غلط ہے کہ قرآن خود قاذف (تہمت لگانے والے) اور شاہد کے درمیان فرق کر رہا ہے، اور شاہد محض اس بنا پر قاذف قرار نہیں پا سکتا کہ عدالت نے اس کی شہادت کو ثبوتِ جرم کے لیے کافی نہیں پایا۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے میں حضرت عمرؓ نے ابوبَکرہؓ اور ان کے دو ساتھی شاہدوں کو قذف کی سزا دی تھی۔ لیکن اس مقدمے کی پوری تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نظیر ہر اُس مقدّمے پر چسپاں نہیں ہوتی جس میں ثبوتِ جرم کے لیے شہادتیں ناکافی پائی جائیں۔ مُقدّمے کے واقعات یہ ہیں کہ بصرے کے گورنر مُغیرہؓ بن شُعبہ سے ابوبکرہؓ کے تعلّقات پہلے سے خراب تھے۔ دونوں کے مکان ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے واقع تھے۔ ایک روز یکایک ہوا کے زور سے دونوں کے کمروں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ ابوبکرہؓ اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیے اُٹھے تو ان کی نگاہ سامنے کے کمرے پر پڑی اور انھوں نے حضرت مُغیرہؓ کو مباشرت میں مشغول دیکھا۔ ابوبکرہؓ کے پاس ان کے تین دوست (نافع بن کَلَدہ، زیاد اور شِبل بن مَعبَد) بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آؤ، دیکھو، اور گواہ رہو کہ مغیرہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستوں نے پوچھا: یہ عورت کون ہے؟ ابوبکرہؓ نے کہا: اُمِّ جمیل۔ دوسرے روز اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی گئی۔ انھوں نے فوراً حضرت مغیرہؓ کو معطّل کر کے حضرت ابوموسیٰ اَشعَریؓ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا اور مُلزَم کو گواہوں سمیت مدینے طلب کر لیا۔ پیشی پر ابوبکرہؓ

اور دو گواہوں نے کہا کہ ہم نے مُغیرہ کو اُمِّ جمیل کے ساتھ بالفعل مباشرت کرتے دیکھا۔ مگر زیاد نے کہا کہ عورت صاف نظر نہیں آتی تھی، اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اُمِّ جمیل تھی۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ نے جرح میں یہ ثابت کر دیا کہ جس رُخ سے یہ لوگ اُنھیں دیکھ رہے تھے، اس سے دیکھنے والا عورت کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ان کی بیوی اور اُمِّ جمیل باہم بہت مشابہ ہیں۔ قرائن خود بتا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت میں، ایک صوبے کا گورنر، خود اپنے سرکاری مکان میں، جہاں اس کی بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی، ایک غیر عورت کو بلا کر زِنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ابوبکرہؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ سمجھنا کہ مغیرہؓ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے بجائے اُمِّ جمیل سے مباشرت کر رہے ہیں، ایک نہایت بے جا بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صرف مُلزَم کو بَری کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابوبکرہؓ، نافع اور شِبْل پر حدِّ قَذْف بھی جاری فرمائی۔ یہ فیصلہ اس مُقدّمے کے مخصوص حالات کی بنا پر تھا، نہ کہ اِس قاعدۂ کُلِّیّہ کی بنا پر کہ جب کبھی شہادتوں سے جُرمِ زنا ثابت نہ ہو تو گواہ ضرور پیٹ ڈالے جائیں۔ (مقدّمے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: احکام القرآن لابن العَرَبی، جلد ۲، صفحہ ۸۸-۸۹)

(۲۰) شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے، وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ یہ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں فعلِ زنا کے ارتکاب کا ہونا چاہیے، یعنی اسے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے ایک ایسی عورت سے، جو اس کے لیے حرام تھی کالمیل فی المکحلة یہ فعل کیا ہے۔ اور عدالت کو پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطورِ خود بحالتِ ہوش وحواس یہ اقرار کر رہا ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیے۔ (یہ امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، ابنِ ابی لیلٰی، اسحاق بن رَاہَوَیہ اور حسن بن صالح کا مسلک ہے)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے۔ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عثمان اَلْبَتّی اور حسن بصریؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں)۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ کسی دوسرے تائیدی ثبوت کے بغیر صرف مجرم کے اپنے ہی اقرار پر فیصلہ کیا گیا ہو، اگر عین سزا کے دَوران میں بھی مجرم اپنے اقرار سے پھر جائے تو سزا کو روک دینا چاہیے، خواہ یہ بات صریحاً ہی کیوں نہ ظاہر ہو رہی ہو کہ وہ مار کی تکلیف سے بچنے کے لیے اقرار سے رُجوع کر رہا ہے۔ اِس پورے قانون کا ماخذ وہ نظائر ہیں جو زنا کے مُقدّمات کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مقدّمہ ماعِزؓ بن مالک اَسْلَمی کا ہے جسے متعدّد صحابہؓ سے بکثرت راویوں نے نقل کیا ہے اور قریب قریب تمام کُتُبِ حدیث میں اس کی روایات موجود ہیں۔ یہ شخص قبیلۂ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا جس نے حضرت ہَزّالؓ بن نُعَیم کے ہاں پرورش پائی تھی۔ یہاں وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زِنا کر بیٹھا۔ حضرت ہَزّالؓ نے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس گناہ کی خبر دے، شاید کہ آپؐ تیرے لیے دعائے مغفرت فرما دیں۔ اس نے جا کر مسجد نبویؐ میں حضورؐ سے کہا: یا رسولؐ اللہ! مجھے پاک کر دیجیے، میں نے زنا کیا ہے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: ویحك ارجع فاستغفر اللّٰہ وتب الیه ”ارے، چلا جا اور اللہ سے توبہ واِسْتِغْفار کر۔“ مگر اس نے پھر سامنے آ کر وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری بار وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو مُتَنَبِّہ کیا کہ دیکھ، اب چوتھی بار اگر تو نے اقرار کیا تو رسولؐ اللہ تجھے رجم کرا دیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دُہرائی۔ اب حضورؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا:

لعلك قبلت او غمزت او نظرت، ”شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا، یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی، یا نظرِ بد ڈالی ہوگی“ (اور تو سمجھ بیٹھا ہوگا کہ یہ زنا کا ارتکاب ہے)۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے پوچھا: ”کیا تو اس سے ہم بستر ہوا؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: ”کیا تو نے اس سے مباشرت کی؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: ”کیا تو نے اس سے مُجامَعَت کی؟“ اس نے کہا: ہاں۔ پھر آپؐ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عَرَبی زبان میں صریحاً فعلِ مباشرت کے لیے بولا جاتا ہے اور فحش سمجھا جاتا ہے۔ ایسا لفظ حضورؐ کی زبان سے نہ پہلے کبھی سنا گیا نہ اس کے بعد کسی نے سنا۔ اگر ایک شخص کی جان کا معاملہ نہ ہوتا تو زبانِ مبارک سے کبھی ایسا لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیا۔ آپؐ نے پوچھا: حتّٰی غاب ذٰلك منك فی ذٰلك منها۔ (کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اس کی اس چیز میں غائب ہوگئی؟) اس نے کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: کما یغیب المیل فی المکحلة والرشاء فی البئر (کیا اس طرح غائب ہوگئی جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنویں میں رسّی؟) اس نے کہا: ہاں۔ پوچھا: ”کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔“ آپؐ نے پوچھا: ”کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں“۔ آپؐ نے پوچھا: ”تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟“ اس نے کہا: نہیں۔ ایک شخص نے اُٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپؐ نے اس کے محلّے والوں سے دریافت کیا کہ یہ دیوانہ تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: ”ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔“ آپؐ نے ہَزّالؓ سے فرمایا: لو سترته بثوبك کان خیرًا لك، ”کاش! تم نے اس کا پردہ ڈھانک دیا ہوتا تو تمھارے لیے اچھا تھا۔“ پھر آپؐ نے ماعِز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا اور اسے شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا گیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعِز بھاگا اور اس نے کہا: ”لوگو! مجھے رسولؐ اللہ کے پاس واپس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انھوں نے مجھے دھوکا دیا کہ رسولؐ اللہ مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔“ مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں جب حضورؐ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا: ”تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، میرے پاس لے آئے ہوتے، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔“

دوسرا واقعہ غامِدِیّہ کا ہے جو قبیلہ غامِد (قبیلہ جُہَینَہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اُس نے بھی آ کر چار مرتبہ اقرار کیا کہ وہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اسے ناجائز حمل ہے۔ آپؐ نے اس سے بھی پہلے اقرار پر فرمایا: ویحك، ارجعی فاستغفری الی اللّٰہ وتوبی الیه (”اری، چلی جا، اللہ سے معافی مانگ اور توبہ کر۔“) مگر اس نے کہا: ”یا رسولؐ اللہ! کیا آپ مجھے ماعِز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں؟ میں زنا سے حاملہ ہوں۔“ یہاں چونکہ اقرار کے ساتھ حمل بھی موجود تھا، اس لیے آپؐ نے اُس قدر مفصّل جَرح نہ فرمائی جو ماعز کے ساتھ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا، نہیں مانتی تو جا، وضعِ حمل کے بعد آئیو۔“ وضعِ حمل کے بعد وہ بچے کو لے کر آئی اور کہا: ”اب مجھے پاک کر دیجیے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”جا اور اس کو دودھ پلا۔ دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو۔“ پھر وہ دودھ چھُٹانے کے بعد آئی اور ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لیتی آئی۔ بچے کو روٹی کا ٹکڑا کھلا کر حضورؐ کو دکھایا اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے، اور دیکھیے، یہ روٹی کھانے لگا ہے۔ تب آپؐ نے بچے کو پرورش کے لیے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

ان دونوں واقعات میں بصراحت چار اقراروں کا ذکر ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت بُرَیدَہؓ کی رِوایت ہے کہ صحابۂ کِرام کا عام خیال یہی تھا کہ اگر ماعِز اور غامِدِیّہ چار مرتبہ اقرار نہ کرتے تو انھیں رجم نہ کیا جاتا۔ البتہ تیسرا واقعہ (جس کا ذکر ہم

اُوپر نمبر ۱۵ میں کر چکے ہیں) اس میں صرف یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ’’جا کر اس کی بیوی سے پوچھ، اور اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔‘‘ اس میں چار اعترافوں کا ذکر نہیں ہے، اور اسی سے فقہا کے ایک گروہ نے اِستدلال کیا ہے کہ ایک ہی اعتراف کافی ہے۔

(۲۱) اُوپر ہم نے جن تین مُقدّمات کی نظیریں پیش کی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقراری مجرم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اس طرح ایک کے بجائے دو کو سزا دینی پڑے گی، اور شریعت لوگوں کو سزائیں دینے کے لیے بے چین نہیں ہے۔ البتہ اگر مجرم خود یہ بتائے کہ اس فعل کا فریقِ ثانی فلاں ہے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ بھی اعتراف کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ انکار کر دے تو صرف اقراری مجرم ہی حد کا مستحق ہوگا۔ اس امر میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اِس دوسری صورت میں (یعنی جب کہ فریقِ ثانی اس کے ساتھ مرتکبِ زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے) اُس پر آیا حدِّ زنا جاری کی جائے گی یا حدِّ قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حدِّ زنا کا مُستَوجِب ہے، کیونکہ اسی جرم کا اس نے اقرار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام اَوزاعیؒ کی رائے میں اس پر حدِّ قذف جاری کی جائے گی، کیونکہ فریقِ ثانی کے انکار نے اس کے جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے، البتہ اس کا جرمِ قذف بہرحال ثابت ہے۔ اور امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے (امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے) کہ اسے زنا کی سزا بھی دی جائے گی اور قَذف کی بھی، کیونکہ اپنے جرمِ زنا کا وہ خود معترف ہے، اور فریقِ ثانی پر اپنا الزام وہ ثابت نہیں کر سکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اس قسم کا ایک مقدّمہ آیا تھا۔ اس کی ایک رِوایَت جو مُسندِ احمد اور ابوداؤد میں سَہلؓ بن سعد سے منقول ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ’’ایک شخص نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار کیا کہ وہ فلاں عورت سے زنا کا مرتکب ہوا ہے۔ آپؐ نے عورت کو بلا کر پوچھا۔ اس نے انکار کیا۔ آپؐ نے اس پر حدّ جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔‘‘ اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کون سی حدّ جاری کی۔ دوسری روایت ابوداؤد اور نَسائی نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ پہلے اس کے اقرار پر آپؐ نے حدِّ زنا جاری کی، پھر عورت سے پوچھا، اور اس کے انکار پر اس شخص کو حدِّ قَذف کے کوڑے لگوائے۔ لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے ایک راوی قاسم بن فَیّاض کو متعدّد محدثین نے ساقط الاعتبار ٹھیرایا ہے، اور قیاس کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپؐ نے اسے کوڑے لگوانے کے بعد عورت سے پوچھا ہوگا۔ صریح عقل اور انصاف کا تقاضا، جسے حضورؐ نظر انداز نہیں فرما سکتے تھے، یہ تھا کہ جب اس نے عورت کا نام لے دیا تھا تو عورت سے پوچھے بغیر اس کے مُقدّمے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ اسی کی تائید سَہلؓ بن سعد والی روایت بھی کر رہی ہے۔ لہٰذا دوسری روایت لائقِ اعتماد نہیں ہے۔

(۲۲) ثبوتِ جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کیا سزا دی جائے گی، اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ مختلف فقہا کے مسلک اس باب میں حسبِ ذیل ہیں:

**شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا:**

—— امام احمدؒ، داؤد ظاہری اور اسحاق بن رَاہَوَیہ کے نزدیک سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا ہے۔

—— باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم اور سزائے تازیانہ کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

غیر شادی شدہ کی سزا:

—— امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اسحاق، داؤد ظاہری، سفیان ثَوری، ابنِ ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح کے نزدیک سو کوڑے اور ایک سال کی جَلا وطنی، مرد و عورت ہر دو کے لیے۔

—— امام مالکؒ اور امام اَوزاعیؒ کے نزدیک مرد کے لیے ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جَلا وطنی، اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے۔

(جَلا وطنی سے مراد ان سب کے نزدیک یہ ہے کہ مجرم کو اس کی بستی سے نکال کر کم از کم اتنے فاصلے پر بھیج دیا جائے جس پر نماز میں قصر واجب ہوتا ہے۔ مگر زید بن علیؒ اور امام جعفر صادقؒ کے نزدیک قید کر دینے سے بھی جلاوطنی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے)۔

—— امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف، امام زُفَر اور امام محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حدِّ زنا مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ اس پر کسی اور سزا، مثلاً قید یا جلاوطنی کا اضافہ حدّ نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ قاضی اگر یہ دیکھے کہ مجرم بدچلن ہے، یا مجرم اور مجرمہ کے تعلّقات بہت گہرے ہیں، تو حسبِ ضرورت وہ انھیں خارج البلد بھی کر سکتا ہے اور قید بھی کر سکتا ہے۔

(حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ حد ایک مقرر سزا ہے جو ثبوتِ جرم کی شرائط پوری ہونے کے بعد لازماً دی جائے گی۔ اور تعزیر اُس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظِ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدّمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو)۔

ان مختلف مسالک میں سے ہر ایک نے مختلف احادیث کا سہارا لیا ہے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عُبَادہؓ بن صامت کی رِوایت، جسے مسلم، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، ترمذی اور امام احمد نے نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خذوا عنی خذوا عنی، قد جعل اللّٰہ لھن سبیلا، البکر بالبکر جلد مأۃ وتغریب عام والثیب بالثیب جلد مأۃ و الرجم (او رمی بالحجارۃ ۔ او رجم بالحجارۃ) ”مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے زانیہ عورتوں کے لیے طریقہ مقرر کر دیا۔ غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جَلا وطنی، اور شادی شدہ مرد کی شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور سنگساری۔“ (یہ حدیث اگرچہ سنداً صحیح ہے، مگر روایاتِ صحیحہ کا ایک جمِ غفیر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر نہ عہدِ نبویؐ میں کبھی عمل ہوا، نہ عہدِ خلفائے راشدینؓ میں، اور نہ فقہا میں سے کسی نے ٹھیک اس کے مضمون کے مطابق فتویٰ دیا۔ فقہِ اسلامی میں جو بات مُتَّفَق عَلَیہ ہے، وہ یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کے مُحصِن اور غیر مُحصِن ہونے کا الگ الگ اعتبار کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ عورت سے، دونوں حالتوں میں اس کی سزا ایک ہے، اور شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ سے، ہر دو حالتوں میں اس کو ایک ہی سزا دی جائے گی۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ وہ شادی شدہ ہو تو ہر حالت میں ایک ہی سزا پائے گی، خواہ اس سے زنا کرنے والا مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اور باکرہ ہونے کی صورت میں بھی اس کے لیے ایک ہی سزا ہے، بِلا اس لحاظ کے کہ اس کے ساتھ زنا کرنے والا مُحصِن ہے یا غیر مُحصِن)۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زیدؓ بن خالد جُہَنی کی رِوایت، جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، نسائی، ابنِ ماجہ اور امام احمدؒ نے نقل کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو اَعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدّمہ لائے۔ ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اِس شخص کے ہاں اُجرت پر کام کرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی سے مُلَوَّث ہو گیا۔ مَیں نے اس کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر راضی کیا۔ مگر اہلِ علم نے بتایا کہ یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ دوسرے نے بھی کہا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ حضورؐ نے فرمایا: میں کتاب اللہ ہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور لونڈی تجھی کو واپس۔ تیرے بیٹے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جَلاوطنی۔ پھر آپ نے قبیلۂ اسلم کے ایک شخص سے فرمایا: اے اُنَیس! تو جا کر اس کی بیوی سے پوچھ۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔ چنانچہ اس نے اعتراف کیا اور رجم کر دی گئی۔ (اس میں رجم سے پہلے کوڑے لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور غیر شادی شدہ مرد کو شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے پر تازیانے اور جَلاوطنی کی سزا دی گئی ہے)۔

ماعز اور غامِدِیّہ کے مقدّمات کی جتنی رُودادیں احادیث کی مختلف کتابوں میں مروی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ملتا کہ حضورؐ نے رجم کرانے سے پہلے ان کو سو کوڑے بھی لگوائے ہوں۔

کوئی روایت کسی حدیث میں نہیں ملتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقدّمے میں رجم کے ساتھ سزائے تازیانہ کا بھی فیصلہ فرمایا ہو۔ زنا بعدِ اِحصان کے تمام مقدمات میں آپؐ نے صرف رجم کی سزا دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور خطبہ، جس میں انھوں نے پورے زور کے ساتھ زنا بعدِ احصان کی سزا رجم بیان کی ہے، بخاری و مسلم اور ترمِذی و نَسائی نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے اور امام احمد نے بھی اس کی متعدّد روایتیں لی ہیں، مگر اس کی کسی روایت میں بھی رجم مع سزائے تازیانہ کا ذکر نہیں ہے۔

خلفائے راشدینؓ میں سے صرف حضرت علیؓ نے سزائے تازیانہ اور سنگساری کو ایک سزا میں جمع کیا ہے۔ امام احمدؒ اور بخاریؒ عامر شَعْبِی سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت شُراحَہ نامی نے ناجائز حمل کا اعتراف کیا، حضرت علیؓ نے جمعرات کے روز اسے کوڑے لگوائے اور جمعے کے روز اس کو رجم کرایا، اور فرمایا: ہم نے اسے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے لگائے ہیں اور سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق سنگسار کرتے ہیں۔ اس ایک واقعے کے سوا عہدِ خلافتِ راشدہ کا کوئی دوسرا واقعہ رجم مع تازیانہ کے حق میں نہیں ملتا۔

جابرؓ بن عبداللہ کی ایک روایت، جسے ابوداؤد اور نَسائی نے نقل کیا ہے، یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص زنا کا مرتکب ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف سزائے تازیانہ دی، پھر معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ تھا، تب آپؐ نے اسے رجم کرایا۔ اس کے علاوہ متعدّد روایات ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کو آپؐ نے صرف سزائے تازیانہ دی۔ مثلاً وہ شخص جس نے نماز کے لیے جاتی ہوئی عورت سے زنا بالجبر کی تھی، اور وہ شخص جس نے زنا کا اعتراف کیا اور عورت نے انکار کیا۔

حضرت عمرؓ نے رَبیعہ بن اُمَیَّہ بن خَلَف کو شراب نوشی کے جرم میں جَلاوطن کیا اور وہ بھاگ کر رومیوں سے جا ملا۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آیندہ میں کسی کو جَلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے غیر شادی شدہ مرد وعورت کو زنا کے جرم میں جلاوطن کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، جلد ۳، صفحہ ۳۱۵)

اِن تمام روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہی صحیح ہے، یعنی زنا بعدِ احصان کی حدّ صرف رجم ہے، اور محض زنا کی حدّ صرف ۱۰۰ کوڑے۔ تازیانے اور رجم کو جمع کرنے پر تو عہدِ نبویؐ سے لے کر عہدِ عثمانی تک کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ رہا تازیانے اور جلاوطنی کو جمع کرنا، تو اس پر کبھی عمل ہوا ہے اور کبھی نہیں ہوا۔ اس سے مسلکِ حَنَفی کی صحّت صاف ثابت ہو جاتی ہے۔

(۲۳) ضربِ تازیانہ کی کیفیت کے متعلق پہلا اشارہ خود قرآن کے لفظ فَاجْلِدُوْا میں ملتا ہے۔ جَلْد کا لفظ جِلْد (یعنی کھال) سے ماخوذ ہے۔ اس سے تمام اہلِ لغت اور علمائے تفسیر نے یہی معنیٰ لیے ہیں کہ مار ایسی ہونی چاہیے جس کا اثر جِلد تک رہے، گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضربِ تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اُڑ جائیں، یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے، قرآن کے خلاف ہے۔

مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں وہ اوسط درجے کا ہونا چاہیے۔ نہ بہت موٹا اور سخت، اور نہ بہت پتلا اور نرم۔ مُوَطّا میں امام مالکؒ کی رِوایَت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضربِ تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرت استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: فوق ھٰذا (اس سے زیادہ سخت لاؤ)۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں کے درمیان۔ پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا۔ اس سے آپؐ نے ضرب لگوائی۔ اسی مضمون سے مِلتی جُلتی روایت ابوعثمان النَّہدی نے حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کی ہے کہ وہ اوسط درجے کا کوڑا استعمال کرتے تھے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) گرہ لگا ہوا کوڑا یا دوشاخہ سہ شاخہ کوڑا بھی استعمال کرنا ممنوع ہے۔

مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ مارنے والے کو ہدایت کرتے تھے کہ لا ترفع (یا لا تخرج) ابطك "اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے۔" یعنی پوری طاقت سے ہاتھ کو تان کر نہ مار۔ (احکام القرآن، ابنِ عَرَبی، ج ۲، ص ۸۴۔ احکام القرآن، جَصَّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ ضرب مُبَرِّح نہیں ہونی چاہیے، یعنی زخم ڈال دینے والی۔ ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہیے بلکہ تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔ صرف منہ اور شرم گاہ کو (اور حَنَفِیَّہ کے نزدیک سر کو بھی) بچالینا چاہیے، باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیے۔ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو کوڑے لگواتے وقت فرمایا: "ہر عضو کو اس کا حق دے اور صرف منہ اور شرم گاہ کو بچالے۔" دوسری روایت میں ہے: "صرف سر اور شرم گاہ کو بچالے۔" (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا ضرب احد کم فلیتق الوجه "جب تم میں سے کوئی مارے تو منہ پر نہ مارے۔" (ابوداؤد)

مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیے اور عورت کو بٹھا کر۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں کوفے کے قاضی ابنِ ابی لیلیٰ نے ایک عورت کو کھڑا کر کے پٹوایا۔ اس پر امام ابوحنیفہؒ نے سخت گرفت کی اور عَلانِیَہ ان کے فیصلے کو غلط ٹھیرایا۔ (اس سے قانونِ توہینِ عدالت کے معاملے میں بھی امام صاحب کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے)۔ ضربِ تازیانہ کے وقت عورت اپنے پورے

کپڑے پہنے رہے گی، بلکہ اس کے کپڑے اچھی طرح باندھ دیے جائیں گے، تاکہ اس کا جسم کُھل نہ جائے۔ صرف موٹے کپڑے اُتروا دیے جائیں گے۔ مرد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ وہ صرف پاجامہ پہنے رہے گا، اور بعض کہتے ہیں کہ قمیص بھی نہ اُتروایا جائے گا۔ حضرت ابوعُبَیدہؓ بن الجَرّاح نے ایک زانی کو سزائے تازیانہ کا حکم دیا۔ اس نے کہا: ''اِس گناہ گار جسم کو اچھی طرح مار کھانی چاہیے''، اور یہ کہہ کر وہ قمیص اُتارنے لگا۔ حضرت ابوعُبَیدہؓ نے فرمایا: ''اسے قمیص نہ اُتارنے دو۔'' (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۲۲) حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک شخص کو کوڑے لگوائے گئے اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

سخت سردی اور سخت گرمی کے وقت مارنا ممنوع ہے۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔

باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اِلّا یہ کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں: لا یحل فی ھٰذہ الامۃ تجرید ولا مدّ ''اس اُمّت میں ننگا کر کے اور ٹکٹکی پر باندھ کر مارنا حلال نہیں ہے۔''

فقہا نے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اَولیٰ یہی ہے کہ بیک وقت پوری سزا دے دی جائے۔

مار کا کام اُجڈ جلّادوں سے نہیں لینا چاہیے بلکہ صاحبِ علم و بصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے، جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابنِ قَیّم نے زَادُالمَعَاد میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زُبیرؓ، مِقدادؓ بن عَمرو، محمدؓ بن مَسْلَمہ، عاصمؓ بن ثابت اور ضَحّاکؓ بن سُفیان جیسے صلحا و معززین سے جلّادی کی خدمت لی جاتی تھی۔ (ج ۱، ص ۴۴-۴۵)

اگر مجرم مریض ہو، اور اس کے صحّت یاب ہونے کی اُمید نہ ہو، یا بہت بوڑھا ہو، تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی، یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینا چاہیے، تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بوڑھا مریض زنا کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور آپؐ نے اس کے لیے یہی سزا تجویز فرمائی تھی۔ (احمد، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ) حاملہ عورت کو سزائے تازیانہ دینی ہو تو وضعِ حمل کے بعد نفاس کا زمانہ گزر جانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور رجم کرنا ہو تو جب تک اس کے بچے کا دودھ نہ چُھوٹ جائے، سزا نہیں دی جا سکتی۔

اگر زنا شہادتوں سے ثابت ہو تو گواہ ضرب کی ابتدا کریں گے، اور اگر اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہو تو قاضی خود ابتدا کرے گا، تاکہ گواہ اپنی گواہی کو اور جج اپنے فیصلوں کو کھیل نہ سمجھ بیٹھیں۔ شُراحہ کے مقدّمے میں جب حضرت علیؓ نے رجم کا فیصلہ کیا تو فرمایا: ''اگر اس کے جرم کا کوئی گواہ ہوتا تو اسی کو مار کی ابتدا کرنی چاہیے تھی، مگر اس کو اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہے، اس لیے میں خود ابتدا کروں گا۔'' حَنَفِیَّہ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ شافعیہ اس کو واجب نہیں مانتے، مگر سب کے نزدیک اَولیٰ یہی ہے۔

ضربِ تازیانہ کے قانون کی ان تفصیلات کو دیکھیے اور پھر ان لوگوں کی جرأت کی داد دیجیے جو اسے تو وحشیانہ سزا کہتے ہیں، مگر وہ سزائے تازیانہ ان کے نزدیک بڑی مہذّب سزا ہے جو آج جیلوں میں دی جا رہی ہے۔ موجودہ قانون کی رُو سے صرف عدالت ہی نہیں، جیل کا ایک معمولی سپرنٹنڈنٹ بھی ایک قیدی کو حکم عدولی یا گستاخی کے قصور میں ۳۰ ضرب بید تک کی سزا دینے کا مجاز ہے۔ یہ بید لگانے کے لیے ایک آدمی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس غرض کے لیے بید بھی خاص طور پر بھگو بھگو کر تیار کیے جاتے ہیں، تاکہ جسم کو چھری کی طرح کاٹ دیں۔ مجرم کو ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ تڑپ بھی نہ سکے۔ صرف ایک پتلا سا کپڑا اس کے ستر کو چھپانے کے لیے رہنے دیا جاتا ہے اور وہ ٹنکچر آیوڈین سے بھگو دیا جاتا ہے۔ جلاد دور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور پوری طاقت سے مارتا ہے۔ ضرب ایک ہی مخصوص حصّۂ جسم (یعنی سُرین) پر مسلسل لگائی جاتی ہے، یہاں تک کہ گوشت قیمہ ہو کر اُڑتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات ہڈی نظر آنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور آدمی بھی پورے تیس بید کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے زخم بھرنے میں ایک مدّت لگ جاتی ہے۔ اِس ''مہذب'' سزا کو جو لوگ آج جیلوں میں خود نافذ کر رہے ہیں، اُن کا یہ منہ ہے کہ اسلام کی مقرر کی ہوئی سزائے تازیانہ کو ''وحشیانہ'' سزا کے نام سے یاد فرمائیں! پھر ان کی پولیس ثابت شدہ مجرموں کو نہیں بلکہ محض مُشتبہ لوگوں کو تفتیش کی خاطر (خصوصاً سیاسی جرائم کے شبہات میں) جیسے جیسے عذاب دیتی ہے، وہ آج کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

(۲۴) رجم کی سزا میں جب مجرم مر جائے تو پھر اس سے پوری طرح مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کی تجہیز و تکفین کی جائے گی۔ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کو عزت کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے گی اور کسی کے لیے جائز نہ ہوگا کہ اس کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرے۔ بخاری میں جابرؓ بن عبداللہ انصاری کی رِوایَت ہے کہ جب رجم سے ماعِز بن مالک کی موت واقع ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ''خیر سے یاد فرمایا اور اس کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی۔'' مسلم میں حضرت بُرَیدہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: استغفرو الماعز بن مالك، لقد تاب توبة لو قسمت بين امة لوسعتهم، ''ماعِز بن مالک کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری امت پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔'' اسی روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ غامِدِیَّہ جب رجم سے مرگئی تو حضورؐ نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی، اور جب حضرت خالدؓ بن ولید نے اس کا ذکر برائی سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: مهلا يا خالد، فوالذی نفسی بيده لقد تابت توبة لو تابها صاحب مكس لغفرله، ''خالد! اپنی زبان روکو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ظالمانہ محصول وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔'' ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ماعز کے واقعے کے بعد ایک روز حضورؐ راستے سے گزر رہے تھے۔ آپؐ نے دو شخصوں کو ماعز کا ذکر برائی سے کرتے سنا۔ چند قدم آگے جا کر ایک گدھے کی لاش پڑی نظر آئی۔ حضورؐ ٹھیر گئے اور ان دونوں آدمیوں سے کہا: ''آپ حضرات اس میں سے کچھ نوشِ جان فرمائیں۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یا نبی اللہ! اسے کون کھا سکتا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی آبرو سے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو[3] اور ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔[4]

جو کچھ آپ ابھی تناول فرما رہے تھے، وہ اسے کھانے کی بہ نسبت بدتر چیز تھی۔" مسلم میں عمرانؓ بن حُصَین کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے غامدِیّہ کی نماز جنازہ کے موقع پر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا اب اِس زانیہ کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟" آپ نے فرمایا: لقد تابت توبة لو قسمت بين اهل المدينة لوسعتهم، "اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہلِ مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔" بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص کو شراب نوشی کے جرم میں سزا دی جا رہی تھی۔ کسی کی زبان سے نکلا: "خدا تجھے رُسوا کرے!" اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس طرح نہ کہو، اُس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو۔" ابوداؤد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "بلکہ یوں کہو: اللّٰھمّ اغفر لہ، اللّٰھمّ ارحمہ، "خدایا! اسے معاف کر دے، خدایا! اس پر رحم کر۔" یہ ہے اسلام میں سزا کی اصل روح۔ اسلام کسی بڑے سے بڑے مجرم کو بھی دشمنی کے جذبے سے سزا نہیں دیتا بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے دیتا ہے، اور جب سزا دے چکتا ہے تو پھر اسے رحمت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کم ظرفی صرف موجودہ تہذیب نے پیدا کی ہے کہ حکومت کی فوج یا پولیس جسے مار دے، اور کوئی عدالتی تحقیقات جس کے مارنے کو جائز ٹھیرا دے، اس کے متعلق یہ تک گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی اس کا جنازہ اُٹھائے یا کسی کی زبان سے اس کا ذکرِ خیر سنا جائے۔ اس پر اَخلاقی جرأت (یہ موجودہ تہذیب میں ڈِھٹائی کا مہذّب نام ہے) کا یہ عالَم ہے کہ دنیا کو رواداری کے وعظ سنائے جاتے ہیں۔

(۲۵) محرّمات سے زنا کے متعلق شریعت کا قانون تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۳۳۶ پر، اور عملِ قومِ لوط کے متعلق شرعی فیصلہ تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۵۱-۵۴ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ رہا جانور سے فعلِ بد، تو بعض فقہا اس کو بھی زنا کے حکم میں شمار کرتے ہیں اور اس کے مرتکب کو حدِّ زنا کا مستحق ٹھیراتے ہیں، مگر امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زُفرؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ زنا نہیں ہے، اس لیے اس کا مرتکب تعزیر کا مستحق ہے نہ کہ حدِّ زنا کا۔ تعزیر کے متعلق ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس کا فیصلہ قاضی کی رائے پر چھوڑا گیا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شُوریٰ ضرورت سمجھے تو اس کے لیے کوئی مناسب شکل خود تجویز کر سکتی ہے۔

۳- اوّلین چیز جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ یہاں فوج داری قانون کو "دِیْنِ اللہِ" فرمایا جا رہا ہے۔ **معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں، مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظامِ شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو، وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا ادھورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو ردّ کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ ردّ کر دیا گیا۔**

دوسری چیز جو اس میں قابلِ توجہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی یہ تنبیہ ہے کہ زانی اور زانیہ پر میری تجویز کردہ سزا نافذ کرنے

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ۡ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَآ

زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے

میں مجرم کے لیے رحم اور شفقت کا جذبہ تمھارا ہاتھ نہ پکڑے۔ اس بات کو اور زیادہ کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے: یؤتٰی بوالٍ نقص من الحد سوطا فیقال لہ لِمَ فعلت ذاك؟ فیقول رحمۃ لعبادك۔ فیقال لہ انت ارحم بھم منی؟ فیومر بہ الی النار۔ ویؤتٰی بمن زاد سوطا فیقال لہ لم فعلت ذاك؟ فیقول لینتھوا عن معاصیك۔ فیقول انت احکم بھم منی؟ فیومر بہ الی النار ''قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حدّ میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا: یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا: آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہوگا: اچھا، تو اُن کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا! پھر حکم ہوگا: لے جاؤ اسے دوزخ میں۔ ایک اور حاکم لایا جائے گا جس نے حدّ پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا: تو نے یہ کس لیے کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا: تاکہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا: اچھا، تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا! پھر حکم ہوگا: لے جاؤ اسے دوزخ میں۔'' (تفسیر کبیر، ج ۶، ص ۲۲۵) یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ کمی بیشی کا عمل رحم یا مَصلَحَت کی بنا پر ہو۔ لیکن اگر کہیں احکام میں ردّ و بدل مجرموں کے مرتبے کی بنا پر ہونے لگے تو پھر یہ ایک بدترین جرم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی رِوایَت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: ''لوگو! تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں وہ ہلاک ہوگئیں، اس لیے کہ جب ان میں کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے، اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''ایک حدّ جاری کرنا اہلِ زمین کے لیے ۴۰ دن کی بارش سے زیادہ مفید ہے۔'' (نَسائی و ابنِ ماجہ)

بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد چھوڑ نہ دیا جائے اور نہ سزا میں کمی کی جائے، بلکہ پورے سو کوڑے مارے جائیں۔ اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہلکی مار نہ ماری جائے، جس کی کوئی تکلیف ہی مجرم محسوس نہ کرے۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ دونوں ہی مراد معلوم ہوتے ہیں۔ اور مزید برآں یہ مراد بھی ہے کہ زانی کو وہی سزا دی جائے جو اللہ نے تجویز فرمائی ہے، اسے کسی اور سزا سے نہ بدل دیا جائے۔ کوڑوں کے بجائے کوئی اور سزا دینا اگر رحم اور شفقت کی بنا پر ہو تو مَعْصِیَت ہے، اور اگر اس خیال کی بنا پر ہو کہ کوڑوں کی سزا ایک وحشیانہ سزا ہے تو یہ قطعی کفر ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی ایمان کے ساتھ ایک سینے میں جمع نہیں ہوسکتا۔ خدا کو خدا بھی ماننا اور اس کو، معاذ اللہ، وحشی بھی کہنا صرف انھی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو ذلیل ترین قسم کے منافق ہیں۔

۴ – یعنی سزا عَلَی الاعلان عام لوگوں کے سامنے دی جائے، تاکہ ایک طرف مجرم کو فضیحت ہو اور دوسری طرف

اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③

مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔ ⁵

عوام الناس کو نصیحت۔ اس سے اسلام کے نظریۂ سزا پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں چوری کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ "ان کے کیے کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے جرم کو روکنے والی سزا" (آیت ۳۸) اور اب یہاں ہدایت کی جا رہی ہے کہ زانی کو عَلانیہ لوگوں کے سامنے عذاب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون میں سزا کے تین مقصد ہیں: اوّل یہ کہ مجرم سے اُس زیادتی کا بدلہ لیا جائے اور اس کو اُس بُرائی کا مزا چکھایا جائے جو اُس نے کسی دوسرے شخص یا معاشرے کے ساتھ کی تھی۔ دوم یہ کہ اُسے اعادۂ جرم سے باز رکھا جائے۔ سوم یہ کہ اس کی سزا کو ایک عبرت بنا دیا جائے، تاکہ معاشرے میں جو دوسرے لوگ بُرے میلانات رکھنے والے ہوں، ان کے دماغ کا آپریشن ہو جائے اور وہ اس طرح کے کسی جرم کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ عَلانیہ سزا دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں حُکام سزا دینے میں بے جا رعایت یا بے جا سختی کرنے کی کم ہی جرأت کر سکتے ہیں۔

۵ – یعنی زانیِ غیر تائب کے لیے اگر موزوں ہے تو زانیہ ہی موزوں ہے، یا پھر مشرکہ۔ کسی مومنۂ صالحہ کے لیے وہ موزوں نہیں ہے، اور حرام ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ وہ جانتے بُوجھتے اپنی لڑکیاں ایسے فاجروں کو دیں۔ اسی طرح زانیہ (غیر تائبہ) عورتوں کے لیے اگر موزوں ہیں تو انھی جیسے زانی یا پھر مشرک۔ کسی مومنِ صالح کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں، اور حرام ہے مومنوں کے لیے کہ جن عورتوں کی بدچلنی کا حال انھیں معلوم ہو، ان سے وہ دانستہ نکاح کریں۔ اس حکم کا اطلاق صرف انھی مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو اپنی بُری رَوِش پر قائم ہوں۔ جو لوگ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں، ان پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ توبہ و اصلاح کے بعد "زانی" ہونے کی صفت ان کے ساتھ لگی نہیں رہتی۔

زانی کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا مطلب امام احمد بن حنبلؒ نے یہ لیا ہے کہ سرے سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد محض مُمانَعَت ہے، نہ یہ کہ اس حکمِ ممانعت کے خلاف اگر کوئی نکاح کرے تو وہ قانوناً نکاح ہی نہ ہو اور اس نکاح کے باوجود فریقین زانی شمار کیے جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ایک قاعدۂ کُلِّیَّہ کے طور پر ارشاد فرمائی ہے کہ الحرام لا یحرم الحلال، "حرام حلال کو حرام نہیں کر دیتا۔" (طَبَرانی، دارقُطنی) یعنی ایک غیر قانونی فعل کسی دوسرے قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنا دیتا۔ لہٰذا کسی شخص کا ارتکابِ زنا اس بات کا موجب نہیں ہو سکتا کہ وہ نکاح بھی کرے تو اس کا شمار زنا ہی میں ہو، اور معاہدۂ نکاح کا دوسرا فریق جو بدکار نہیں ہے، وہ بھی بدکار قرار پائے۔ اُصولاً بغاوت کے سوا کوئی غیر قانونی فعل اپنے مرتکب کو خارج از حدودِ قانون (outlaw) نہیں بنا دیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی فعل بھی قانونی نہ ہو سکے۔ اس چیز کو نگاہ میں رکھ کر اگر آیت پر غور کیا جائے تو اصل منشا صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی بدکاری جانی بُوجھی ہو، ان کو نکاح کے لیے منتخب کرنا ایک گناہ ہے، جس سے اہلِ ایمان کو پرہیز

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اَسّی کوڑے

کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بدکاروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے، حالانکہ شریعت انھیں معاشرے کا ایک مکروہ اور قابلِ نفرت عُنصر قرار دینا چاہتی ہے۔

اسی طرح اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ زانیِ مسلم کا نکاح مشرک عورت سے، اور زانیۂ مُسلِمہ کا نکاح مشرک مرد سے صحیح ہے۔ آیت کا منشا دراصل یہ بتانا ہے کہ زنا ایسا سخت قبیح فعل ہے کہ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ مسلم معاشرے کے پاک اور صالح لوگوں سے اس کا رشتہ ہو۔ اسے یا تو اپنے ہی جیسے زانیوں میں جانا چاہیے، یا پھر ان مشرکوں میں جو سرے سے احکامِ الٰہی پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

آیت کے منشا کی صحیح ترجمانی وہ احادیث کرتی ہیں جو اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ مُسنَدِ احمد اور نَسائی میں عبداللہؓ بن عَمرو بن عاص کی رِوایت ہے کہ ایک عورت اُمِّ مَہزول نامی تھی جو قَحبہ گری کا پیشہ کرتی تھی۔ ایک مسلمان نے اس سے نکاح کرنا چاہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی۔ آپؐ نے منع فرمایا اور یہی آیت پڑھی۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ مَرثَدؓ بن ابی مَرثَد ایک صحابی تھے، جن کے زمانۂ جاہلیّت میں مکّے کی ایک بدکار عورت عِناق سے ناجائز تعلّقات رہ چکے تھے۔ بعد میں انھوں نے چاہا کہ اس سے نکاح کرلیں اور حضورؐ سے اجازت مانگی۔ دو دفعہ پوچھنے پر آپؐ خاموش رہے۔ تیسری دفعہ پھر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: یا مرثد، الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة فلا تنکحھا۔ اس کے علاوہ متعدّد روایات حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عَمّار بن یاسرؓ سے منقول ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص دَیُّوث ہو (یعنی جسے معلوم ہو کہ اس کی بیوی بدکار ہے اور یہ جان کر بھی وہ اس کا شوہر بنا رہے)، وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔“ (احمد، نَسائی، ابوداؤد طَیالِسی) شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو غیر شادی شدہ مرد و عورت زِنا کے الزام میں گرفتار ہوتے، ان کو وہ پہلے سزائے تازیانہ دیتے تھے اور پھر انھی کا آپس میں نکاح کر دیتے تھے۔ ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک روز ایک شخص بڑی پریشانی کی حالت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور کچھ اس طرح بات کرنے لگا کہ اس کی زبان پوری طرح کھلتی نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اسے الگ لے جا کر معاملہ پوچھو۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ ایک شخص اس کے ہاں مہمان کے طور پر آیا تھا، وہ اس کی لڑکی سے مُلَوَّث ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: قبحك الله، الاستر علی ابنتك، ”تیرا بُرا ہو، تُو نے اپنی لڑکی کا پردہ ڈھانک نہ دیا؟“ آخرِ کار لڑکے اور لڑکی پر مقدّمہ قائم ہوا، دونوں پر حدّ جاری کی گئی، اور پھر ان دونوں کا باہم نکاح کر کے حضرت ابوبکرؓ نے ایک سال کے لیے ان کو شہر بدر کر دیا۔ ایسے ہی اور چند واقعات قاضی ابوبکر ابن العَرَبی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں نقل کیے ہیں۔ (جلد ۲، ص ۸۶)

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۟ۙ ﴿۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

---

مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں، سوائے اُن لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہوجائیں اور اصلاح کرلیں کہ اللہ ضرور (اُن کے حق میں) غفور و رحیم ہے۔[۶]

---

۶- اس حکم کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی آشنائیوں اور ناجائز تعلّقات کے چرچے قطعی طور پر بند کر دیے جائیں، کیونکہ اس سے بے شمار بُرائیاں پھیلتی ہیں، اور ان میں سب سے بڑی بُرائی یہ ہے کہ اس طرح غیر محسوس طریقے پر ایک عام زنا کارانہ ماحول بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک شخص مزے لے لے کر کسی کے صحیح یا غلط گندے واقعات دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ دوسرے اس میں نمک مرچ لگا کر اَور لوگوں تک انھیں پہنچاتے ہیں، اور ساتھ ساتھ کچھ مزید لوگوں کے متعلق بھی اپنی معلومات یا بدگمانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ شہوانی جذبات کی ایک عام رَو چل پڑتی ہے، بلکہ بُرے میلانات رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ معاشرے میں کہاں کہاں اُن کے لیے قسمت آزمائی کے مواقع موجود ہیں۔ شریعت اِس چیز کا سدِّباب پہلے ہی قدم پر کر دینا چاہتی ہے۔ ایک طرف وہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی زنا کرے اور شہادتوں سے اس کا جرم ثابت ہوجائے تو اس کو وہ انتہائی سزا دو جو کسی اور جرم پر نہیں دی جاتی۔ اور دوسری طرف وہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے، وہ یا تو شہادتوں سے اپنا الزام ثابت کرے، ورنہ اس پر اَسّی کوڑے برسا دو، تاکہ آیندہ کبھی وہ اپنی زبان سے ایسی بات بلا ثبوت نکالنے کی جرأت نہ کرے۔ بالفرض اگر الزام لگانے والے نے کسی کو اپنی آنکھوں سے بھی بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو، تب بھی اسے خاموش رہنا چاہیے اور دوسروں تک اسے نہ پہنچانا چاہیے، تاکہ گندگی جہاں ہے وہیں پڑی رہے، آگے نہ پھیل سکے۔ البتہ اگر اس کے پاس گواہ موجود ہیں تو معاشرے میں بے ہودہ چرچے کرنے کے بجائے معاملہ حُکّام کے پاس لے جائے اور عدالت میں مُلزَم کا جرم ثابت کر کے اسے سزا دلوا دے۔

اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیلات نگاہ میں رہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ان کو نمبروار بیان کرتے ہیں:

(۱) آیت میں الفاظ ”وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ“ استعمال ہوئے ہیں، جن کے معنیٰ ہیں ”وہ لوگ جو الزام لگائیں“۔ لیکن سیاق وسباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد ہر قسم کا الزام نہیں، بلکہ مخصوص طور پر زنا کا الزام ہے۔ پہلے زنا کا حکم بیان ہوا ہے اور آگے لِعان کا حکم آ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان اس حکم کا آنا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں ”الزام“ سے مراد کس نوعیت کا الزام ہے۔ پھر الفاظ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (الزام لگائیں پاک دامن عورتوں پر) سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مراد وہ الزام ہے جو پاک دامنی کے خلاف ہو۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانونِ اسلامی میں صرف زنا کا نصابِ شہادت ہے۔ اِن قرائن کی بنا پر تمام اُمت کے علما کا اجماع ہے کہ اس آیت میں صرف

الزامِ زنا کا حکم بیان ہُوا ہے، جس کے لیے علما نے ''قَذْف'' کی مستقل اصطلاح مقرر کر دی ہے، تاکہ دوسری تہمت تراشیاں (مثلاً کسی کو چور، یا شرابی، یا سود خوار، یا کافر کہہ دینا) اس حکم کی زد میں نہ آئیں۔ ''قَذْف'' کے سوا دوسری تہمتوں کی سزا قاضی خود تجویز کر سکتا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شُوریٰ حسبِ ضرورت ان کے لیے توہین اور ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا کوئی عام قانون بنا سکتی ہے۔

(۲) آیت میں اگرچہ الفاظ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں) استعمال ہوئے ہیں، لیکن فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حکم صرف عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے، بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لیے الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف مردوں ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اگر جرمِ قذف کی مرتکب ہوں تو وہ اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔ کیونکہ جرم کی شُناعت میں قاذِف یا مقذوف کے مرد یا عورت ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا قانون کی شکل یہ ہوگی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے، اس کا یہ حکم ہے۔ (واضح رہے کہ یہاں مُحصِن اور مُحصِنہ سے مراد شادی شدہ مرد و عورت نہیں بلکہ پاک دامن مرد و عورت ہیں)۔

(۳) یہ حکم صرف اسی صورت میں نافذ ہوگا جب کہ الزام لگانے والے نے مُحصِنین یا مُحصَنات پر الزام لگایا ہو۔ کسی غیر مُحصِن پر الزام لگانے کی صورت میں اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ غیر مُحصِن اگر بدکاری میں معروف ہو تب تو اس پر ''الزام'' لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلاثبوت الزام لگانے والے کے لیے قاضی خود سزا تجویز کر سکتا ہے، یا ایسی صورتوں کے لیے مجلسِ شُوریٰ حسبِ ضرورت قانون بنا سکتی ہے۔

(۴) کسی فعلِ قذف کے مُستلزِمِ سزا ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بدکاری کا بلاثبوت الزام لگایا ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں، اور کچھ مقذوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) میں، اور کچھ خود فعلِ قذف میں پائی جانی ضروری ہیں۔

قاذف میں جو شرطیں پائی جانی چاہییں، وہ یہ ہیں: اوّل یہ کہ وہ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جاسکتی ہے، مگر اس پر حدّ جاری نہیں کی جاسکتی۔ دوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ مجنون پر حدِّ قذف جاری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں، مثلاً کلوروفارم کے زیرِ اثر الزام لگانے والے کو بھی مجرم نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ سوم یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (فقہا کی اصطلاح میں طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چہارم یہ کہ وہ مقذوف کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ اُن پر حدِ قذف جاری نہیں کی جاسکتی۔ ان کے علاوہ حَنَفِیَّہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ وہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حدِّ قذف کا مُستوجِب نہ ہوگا۔ لیکن امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، تو وہ قاذف ہے، کیونکہ اس کا اشارہ ایک شخص کو بدنام و رُسوا کر دینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کے برعکس حَنَفِیَّہ کے نزدیک محض اشارے کی صراحت اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ایک آدمی کو

۸۰ کوڑوں کی سزا دے ڈالی جائے۔ وہ اس پر صرف تعزیر دیتے ہیں۔

مقذوف میں جو شرطیں پائی جانی چاہییں، وہ یہ ہیں: پہلی شرط یہ کہ وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالتِ عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ مجنون پر (خواہ وہ بعد میں عاقل ہو گیا ہو یا نہ ہُوا ہو) الزام لگانے والا حدِّ قذف کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون اپنی عِصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حدِّ زنا کا مستحق ہوتا ہے، نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لہٰذا اس پر الزام لگانے والا بھی حدِّ قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن امام مالکؒ اور امام لَیث بن سعدؒ کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذِف حدّ کا مستحق ہے، کیونکہ بہر حال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔ یعنی اس پر بحالتِ بلوغ زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو۔ بچے پر الزام لگانا، یا جوان پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، حدِّ قذف کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عِصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، نہ وہ حدِّ زنا کا مُستَوجِب ہوتا ہے، اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ سِنّ بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذِف حدّ کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرانے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو، تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو جاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہو جاتا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، یعنی اس پر بحالتِ اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ کفر اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حدّ نہیں ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ لونڈی یا غلام پر الزام، یا آزاد پر یہ الزام کہ وہ بحالتِ غلامی اس کا مرتکب ہوا تھا، موجبِ حدّ نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عِصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔ خود قرآن میں بھی غلامی کی حالت کو اِحصان کی حالت قرار نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ نساء میں مُحْصَنَات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ لیکن داؤد ظاہریؒ اس دلیل کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حدّ کا مستحق ہے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شُبۂ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرمِ زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبۂ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاحِ فاسد، یا خفیہ نکاح، یا مُشتَبَہ مِلکیت، یا شبۂ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالاتِ زندگی ایسے ہوں جن میں اُس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں ہو سکتا ہو، اور نہ زنا سے کم تر درجے کی بداَخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی عفّت مجروح ہو جاتی ہے، اور ایسی مجروح عفت پر الزام لگانے والا ۸۰ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حتّٰی کہ اگر حدِّ قذف جاری ہونے سے پہلے مقذوف کے خلاف کسی جرمِ زنا کی شہادت قائم ہو جائے، تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔

مگر ان پانچوں صورتوں میں حدّ نہ ہونے کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ مجنون، یا بچے، یا کافر، یا غلام، یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزامِ زنا لگا دینے والا مستحقِ تعزیر بھی نہیں ہے۔

اب وہ شرطیں لیجیے جو خود فعلِ قذف میں پائی جانی چاہییں۔ ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز

قذف بناسکتی ہے۔ یا تو قاذف نے مقذوف پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقذوف پر حد واجب ہو جائے۔ یا پھر اس نے مقذوف کو وَلَد الزنا قرار دیا ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام صاف اور صریح ہونا چاہیے۔ کنایات کا اعتبار نہیں ہے، جن سے زنا یا طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے۔ مثلاً کسی کو فاسق، فاجر، بدکار، بدچلن وغیرہ الفاظ سے یاد کرنا، یا کسی عورت کو رنڈی، کسبن، یا چھنال کہنا، یا کسی سَیِّد کو پٹھان کہہ دینا کِنایہ ہے، جس سے صریح قذف لازم نہیں آتا۔ اسی طرح جو الفاظ محض گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً حرامی یا حرام زادہ وغیرہ، ان کو بھی صریح قذف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے یوں کہے کہ ''ہاں، مگر میں تو زانی نہیں ہوں''، یا ''میری ماں نے تو زنا کرا کے مجھے نہیں جنا ہے''۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض جس سے صاف سمجھ میں آجائے کہ قائل کی مراد مخاطَب کو زانی یا وَلَدُ الزِّنا قرار دینا ہے، قذف ہے، جس پر حدّ واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، اور امام شافعیؒ، سفیان ثَورِی، ابنِ شُبْرُمَہ اور حسن بن صالح اس بات کے قائل ہیں کہ تعریض میں بہر حال شک کی گنجایش ہے، اور شک کے ساتھ حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن رَاہَوَیہؒ کہتے ہیں کہ تعریض اگر لڑائی جھگڑے میں ہو تو قذف ہے، اور ہنسی مذاق میں ہو تو قذف نہیں ہے۔ خلفاؓ میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تعریض پر حد جاری کی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''نہ میرا باپ زانی تھا نہ میری ماں زانیہ تھی۔'' معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا: آپ لوگ اِس سے کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا: اِس نے اپنے باپ اور ماں کی تعریف کی ہے، اُس کے ماں باپ پر تو حملہ نہیں کیا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا: اِس کے لیے اپنے ماں باپ کی تعریف کرنے کے لیے کیا یہی الفاظ رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ کو اس موقع پر استعمال کرنے سے صاف مراد یہی ہے کہ اُس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے گروہ سے اتفاق کیا اور حد جاری کر دی۔ (جَصَّاص، ج ۳، ص ۳۳۰) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کسی پر عملِ قومِ لوط کے ارتکاب کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اسے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

(۵) جرمِ قذف قابلِ دست اندازیِ سرکار (cognizable offence) ہے یا نہیں، اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ ابی لیلٰی کہتے ہیں کہ یہ حقُّ اللہ ہے، اس لیے قاذف پر بہر حال حد جاری کی جائے گی، خواہ مقذوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنٰی میں تو حق اللہ ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پر مقدّمہ چلانا مقذوف کے مطالبے پر موقوف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حقِّ آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ اور امام اَوزاعیؒ کی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم قابلِ دست اندازیِ سرکار ہے، ورنہ اس پر کارروائی کرنا مقذوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

(۶) جرمِ قذف قابلِ راضی نامہ (compoundable offence) نہیں ہے۔ مقذوف عدالت میں

دعویٰ لے کر نہ آئے تو یہ دوسری بات ہے، لیکن عدالت میں معاملہ آجانے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے، اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حدّ جاری کی جائے گی۔ نہ عدالت اس کو معاف کرسکتی ہے اور نہ خود مقذوف۔ نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہوسکتا ہے، نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ **تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حدٍ فقد وجب**، "حدود کو آپس ہی میں معاف کردو، مگر جس حدّ کا معاملہ میرے پاس پہنچ گیا، وہ پھر واجب ہوگئی۔"

(۷) حَنَفِیَّہ کے نزدیک حدِّ قذف کا مطالبہ یا تو خود مقذوف کرسکتا ہے، یا پھر وہ جس کے نسب پر اس سے حرف آتا ہو اور مطالبہ کرنے کے لیے خود مقذوف موجود نہ ہو، مثلاً باپ، ماں، اولاد اور اولاد کی اولاد۔ مگر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حق قابلِ توریث ہے۔ مقذوف مرجائے تو اس کا ہر شرعی وارث حدّ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعیؒ بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے اور بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی دلیلیں کمزور ہیں۔ مطالبۂ حد کو قابلِ توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، خود قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملے میں چاہے صحیح ہو، مگر بیوی کے معاملے میں تو قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام رکھا جائے، اس کی تو پوری اولاد کا نسب مُشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حدِّ قذف صرف نسب پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے۔ نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے، اور ایک شریف مرد یا عورت کے لیے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بدکار قرار دیا جائے۔ لہٰذا اگر حدِّ قذف کا مطالبہ قابلِ توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

(۸) یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز اُسے حد سے بچا سکتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انھوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے۔ حَنَفِیَّہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہییں اور انھیں بیک وقت شہادت دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا، اور اس کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؒ اور عثمان اَلبَتّیؒ نے کہی ہے کہ گواہوں کے بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرے مقدّمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔ حَنَفِیَّہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر قاذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو وہ حدِّ قذف سے بچ جائے گا، اور ساتھ ہی مقذوف بھی حدِّ زنا سے محفوظ رہے گا، کیونکہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر، یا اندھے، یا غلام، یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کر کے قاذف سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مگر امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قاذف اگر فاسق گواہ پیش کرے تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے۔

اور یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک ہی اَقرب اِلَی الصَّواب معلوم ہوتا ہے۔ گواہ اگر عادل ہوں تو قاذف جرمِ قذف سے بَری ہو جائے گا اور مقذوف پر جرمِ زنا ثابت ہو جائے گا۔ لیکن اگر گواہ عادل نہ ہوں تو قاذف کا قذف، اور مقذوف کا فعلِ زنا، اور گواہوں کا صِدق و کِذب، ساری ہی چیزیں مشکوک قرار پائیں گی اور شک کی بنا پر کسی کو بھی حدّ کا مُستوجِب قرار نہ دیا جاسکے گا۔

(۹) جو شخص ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے جرمِ قذف سے بَری کر سکتی ہو، اس کے لیے قرآن نے تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ اسے ۸۰ کوڑے لگائے جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سوائے اُن لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں، کہ اللہ غفور اور رحیم ہے)۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فقرے میں توبہ اور اصلاح سے جس معافی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے۔ فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں ہے، یعنی توبہ سے حد ساقط نہ ہوگی اور مجرم کو سزائے تازیانہ بہر حال دی جائے گی۔ فقہا اس پر بھی متفق ہیں کہ اس معافی کا تعلق آخری حکم سے ہے، یعنی توبہ اور اصلاح کے بعد مجرم فاسق نہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ (اِس میں اختلاف صرف اس پہلو سے ہے کہ آیا مجرم نفسِ قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔ امام شافعیؒ اور لیث بن سعدؒ کے نزدیک وہ نفسِ قذف سے فاسق ہو جاتا ہے، اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے، اس لیے وہ نفاذِ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مجرم کا عند اللہ فاسق ہونا نفسِ قذف کا نتیجہ ہے، اور عند الناس فاسق ہونا اس پر موقوف ہے کہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو اور وہ سزا پا جائے)۔ اب رہ جاتا ہے بیچ کا حکم، یعنی یہ کہ ''قاذف کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔'' فقہا کے درمیان اس پر بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کے فقرے کا تعلق اِس حکم سے بھی ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس فقرے کا تعلق صرف آخری حکم سے ہے، یعنی جو شخص توبہ اور اصلاح کر لے گا، وہ عند اللہ اور عند الناس فاسق نہ رہے گا، لیکن پہلے دونوں حکم اس کے باوجود برقرار رہیں گے، یعنی مجرم پر حدّ بھی جاری کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت بھی رہے گا۔ اِس گروہ میں قاضی شُریح، سَعید بن مُسَیَّب، سعید بن جُبَیر، حسن بصری، ابراہیم نَخعی، ابنِ سیرِین، مَکحُول، عبد الرحمٰن بن زید، ابو حنیفہ، ابو یوسف، زُفَر، محمد، سفیان ثَوری اور حسن بن صالح رحمہم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کا تعلق پہلے حکم سے تو نہیں ہے مگر آخری دونوں حکموں سے ہے، یعنی توبہ کے بعد قذف کے سزا یافتہ مجرم کی شہادت بھی قُبول کی جائے گی اور وہ فاسق بھی نہ شمار ہوگا۔ اس گروہ میں عطاء، طاؤس، مجاہد، شَعْبی، قاسم بن محمد، سالم، زُہری، عِکرِمہ، عمر بن عبد العزیز، ابنِ ابی نَجیح، سلیمان بن یَسار، مَسرُوق، ضَحّاک، مالک بن اَنَس، عثمان البَتّی، لَیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل اور ابنِ جَریر طَبَری رحمہم اللہ جیسے بزرگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنی تائید میں دوسرے دلائل کے ساتھ حضرت عمرؓ کے

اُس فیصلے کو بھی پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے میں کیا تھا، کیونکہ اس کی بعض رِوایات میں یہ ذکر ہے کہ حدّ جاری کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوبکرہؓ اوران کے دونوں ساتھیوں سے کہا: اگر تم توبہ کرلو(یا ''اپنے جھوٹ کا اقرار کرلو'') تو میں آیندہ تمھاری شہادت قبول کروں گا، ورنہ نہیں۔ دونوں ساتھیوں نے اقرار کرلیا، مگر ابوبکرہؓ اپنے قول پر قائم رہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی قوی تائید معلوم ہوتی ہے، لیکن مُغیرہؓ بن شُعبہ کے مقدّمے کی جو رُوداد ہم پہلے درج کرچکے ہیں، اُس پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس نظیر سے اس مسئلے میں اِستِدلال کرنا دُرست نہیں ہے۔ وہاں نفسِ فعل مُتَّفَق عَلَیہ تھا اور خود مغیرہؓ بن شعبہ کو بھی اس سے انکار نہ تھا۔ بحث اس میں تھی کہ عورت کون تھی۔ مغیرہؓ بن شعبہ کہتے تھے کہ وہ اُن کی اپنی بیوی تھیں جنھیں یہ لوگ اُمِّ جمیل سمجھ بیٹھے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ حضرت مغیرہؓ کی بیوی اور اُمِّ جَمیل باہم اس حد تک مشابہ تھیں کہ واقعہ جتنی روشنی میں جتنے فاصلے سے دیکھا گیا، اس میں یہ غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ عورت اُمِّ جمیل ہے۔ مگر قرائن سارے کے سارے مغیرہؓ بن شعبہ کے حق میں تھے اور خود اِستِغاثے کا بھی ایک گواہ اقرار کرچکا تھا کہ عورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ کے حق میں فیصلہ دیا اور ابوبکرہؓ کو سزا دینے کے بعد وہ بات کہی جو مذکورۂ بالا رِوایتوں میں منقول ہوئی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشا دراصل یہ تھا کہ تم لوگ مان لو کہ تم نے بے جا بدگمانی کی تھی، اور آیندہ کے لیے ایسی بدگمانیوں کی بنا پر لوگوں کے خلاف الزامات عائد کرنے سے توبہ کرو، ورنہ آیندہ تمھاری شہادت کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو شخص صریح جھوٹا ثابت ہوجائے، وہ بھی حضرت عمرؓ کے نزدیک توبہ کرکے مقبول الشہادت ہوسکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں پہلے گروہ ہی کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ آدمی کی توبہ کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہمارے سامنے جو شخص توبہ کرے گا ہم اسے اس حد تک تو رعایت دے سکتے ہیں کہ اسے فاسق کے نام سے یاد نہ کریں، لیکن اس حد تک رعایت نہیں دے سکتے کہ جس کی زبان کا اعتبار ایک دفعہ جاتا رہا ہے اس پر پھر محض اس لیے اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ہمارے سامنے توبہ کررہا ہے۔ علاوہ بریں خود قرآن کی عبارت کا اندازِ بیان بھی یہی بتا رہا ہے کہ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کا تعلق صرف اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ سے ہے۔ اس لیے کہ عبارت میں پہلی دو باتیں حکم کے الفاظ میں فرمائی گئی ہیں: ''ان کو اَسّی کوڑے مارو''، ''اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو''۔ اور تیسری بات خبر کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے: ''وہ خود ہی فاسق ہیں''۔ اس تیسری بات کے بعد متصلاً یہ فرمانا کہ ''سوائے اُن لوگوں کے جو توبہ کرلیں''، خود ظاہر کردیتا ہے کہ یہ استثنا آخری فقرۂ خبریہ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ پہلے دو حکمی فقروں سے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ استثنا آخری فقرے تک محدود نہیں ہے، تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ''شہادت قبول نہ کرو'' کے فقرے تک پہنچ کر رُک کیسے گیا، ''اسّی کوڑے مارو'' کے فقرے تک بھی کیوں نہ پہنچ گیا۔

(۱۰) سوال کیا جاسکتا ہے کہ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کا استثنا آخر پہلے حکم سے بھی متعلق کیوں نہ مان لیا جائے؟ قذف آخر ایک قسم کی توہین ہی تو ہے۔ ایک آدمی اس کے بعد اپنا قصور مان لے، مقذوف سے معافی مانگ لے اور آیندہ کے لیے اس حرکت سے توبہ کرلے، تو آخر کیوں نہ اسے چھوڑ دیا جائے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ خود حکم بیان کرنے کے بعد فرمارہا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ......... فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ یہ تو ایک عجیب بات ہوگی کہ خدا معاف کردے اور بندے معاف نہ کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ دراصل ت و ب ہ کے تلفّظ کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کے احساسِ ندامت اور عزمِ اصلاح اور رُجوع الی الخیر کا نام ہے، اور اس چیز کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے توبہ سے دنیوی سزائیں معاف نہیں ہوتیں بلکہ صرف اخروی سزا معاف ہوتی ہے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو تم انھیں چھوڑ دو، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ توبہ کرلیں گے، میں ان کے حق میں غفور و رحیم ہوں۔ اگر توبہ سے دنیوی سزائیں بھی معاف ہونے لگیں، تو آخر وہ کون سا مجرم ہے جو سزا سے بچنے کے لیے توبہ نہ کرلے گا؟

(۱۱) یہ بھی سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنے الزام کے ثبوت میں شہادت نہ لاسکنا لازماً یہی معنیٰ تو نہیں رکھتا کہ وہ جھوٹا ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا الزام واقعی صحیح ہو اور وہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے صرف ثبوت نہ دے سکنے کی بنا پر فاسق ٹھیرایا جائے، اور وہ بھی عندالناس ہی نہیں، عنداللہ بھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنی آنکھوں سے بھی کسی کو بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو، پھر بھی وہ اس کا چرچا کرنے اور شہادت کے بغیر اس پر الزام عائد کرنے میں گناہ گار ہے۔ شریعتِ الٰہی یہ نہیں چاہتی کہ ایک شخص اگر ایک گوشے میں نجاست لیے بیٹھا ہو تو دوسرا شخص اسے اُٹھا کر سارے معاشرے میں پھیلانا شروع کردے۔ اس نجاست کی موجودگی کا اگر اُس کو علم ہے تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں: یا اُس کو جہاں وہ پڑی ہے وہیں پڑا رہنے دے، یا پھر اس کی موجودگی کا ثبوت دے، تاکہ حکومتِ اسلامی کے حکام اسے صاف کردیں۔ ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اگر وہ پبلک میں چرچا کرے گا تو محدود گندگی کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کا مجرم ہوگا۔ اور اگر وہ قابلِ اطمینان شہادت کے بغیر حکام تک معاملہ لے جائے گا تو حکام اس گندگی کو صاف نہ کرسکیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اس مقدّمے کی ناکامی گندگی کی اشاعت کا سبب بھی بنے گی اور بدکاروں میں جرأت بھی پیدا کردے گی۔ اسی لیے ثبوت اور شہادت کے بغیر قذف کا ارتکاب کرنے والا بہرحال فاسق ہے، خواہ وہ اپنی جگہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۲) حدِّ قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی بہ نسبت ہلکی مار ماری جائے۔ یعنی تازیانے تو ۸۰ ہی ہوں، مگر ضرب اتنی سخت نہ ہونی چاہیے جتنی زانی کو لگائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس الزام کے قصور میں اسے سزا دی جارہی ہے، اس میں اس کا جھوٹا ہونا بہرحال یقینی نہیں ہے۔

(۱۳) تکرارِ قذف کے بارے میں حنفیہ اور جُمہورِ فقہا کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو، اس پر ایک ہی حدّ جاری کی جائے گی۔ اور اگر اجرائے حدّ کے بعد وہ اپنے سابق الزام ہی کی تکرار کرتا رہے، تو جو حد اسے لگائی جاچکی ہے وہی کافی ہوگی۔ البتہ اگر اجرائے حد کے بعد وہ اس شخص پر ایک نیا الزام زنا عائد کردے تو پھر نئے سرے سے مقدّمہ قائم کیا جائے گا۔ مغیرہؓ بن شعبہ کے مقدّمے میں سزا پانے کے بعد ابوبکرہؓ کھلے بندوں کہتے رہے کہ ''میں شہادت دیتا ہوں کہ مغیرہ نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔'' حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ان پر پھر مقدمہ قائم کریں۔ مگر چونکہ وہ سابق الزام ہی کو دُہرا رہے تھے، اس لیے حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اس پر دوسرا مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا، اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے قبول کرلی۔ اس کے بعد فقہا میں اس بات پر قریب قریب اتفاق ہوگیا کہ سزا یافتہ قاذف کو صرف نئے الزام ہی پر پکڑا جاسکتا ہے، سابق الزام کے اعادے پر نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۶﴾ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۷﴾ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۸﴾ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دُوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچّا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھُوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اُس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچّا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے، تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمھیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)۔

(۱۴) قذفِ جماعت کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پر بھی الزام لگائے، خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں، تو اس پر ایک ہی حدّ لگائی جائے گی، اِلّا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔ اس لیے کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: ”جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں۔“ اس سے معلوم ہُوا کہ ایک فرد ہی نہیں، ایک جماعت پر الزام لگانے والا بھی صرف ایک ہی حد کا مستحق ہوتا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ زنا کا کوئی الزام ایسا نہیں ہوسکتا جو کم از کم دو شخصوں پر نہ لگتا ہو۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایک ہی حد کا حکم دیا، عورت پر الزام کے لیے الگ اور مرد پر الزام کے لیے الگ حد کا حکم نہیں دیا۔ بخلاف اس کے، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک جماعت پر الزام لگانے والا خواہ ایک لفظ میں الزام لگائے یا الگ الگ الفاظ میں، اس پر ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔ یہی رائے عثمان البَتّی کی بھی ہے۔ اور ابنِ ابی لیلیٰ کا قول، جس میں شَعْبی اور اَوزاعی بھی ان کے ہم نوا ہیں،

یہ ہے کہ ایک لفظ میں پوری جماعت کو زانی کہنے والا ایک حدّ کا مستحق ہے، اور الگ الگ الفاظ میں ہر ایک کو کہنے والا ہر ایک کے لیے الگ حد کا مستحق۔

۷ – یہ آیات پچھلی آیات کے کچھ مدّت بعد نازل ہوئی ہیں۔ حدِّقذف کا حکم جب نازل ہُوا تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور عورت کی بدچلنی دیکھ کر تو آدمی صبر کر سکتا ہے، گواہ موجود نہ ہوں تو زبان پر قُفل چڑھا لے اور معاملے کو نظرانداز کر دے۔ لیکن اگر وہ خود اپنی بیوی کی بدچلنی دیکھ لے تو کیا کرے؟ قتل کر دے تو اُلٹا سزا کا مُستوجِب ہو۔ گواہ ڈھونڈنے جائے تو ان کے آنے تک مجرم کب ٹھیرا رہے گا۔ صبر کرے تو آخر کیسے کرے؟ طلاق دے کر عورت کو رخصت کر سکتا ہے، مگر نہ اس عورت کو کسی قسم کی مادّی یا اخلاقی سزا ملی نہ اس کے آشنا کو۔ اور اگر اسے ناجائز حمل ہو تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ یہ سوال ابتداءً تو حضرت سعدؓ بن عُبادہ نے ایک فرضی سوال کی حیثیت میں پیش کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں اگر خدانخواستہ اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو گواہوں کی تلاش میں نہیں جاؤں گا بلکہ تلوار سے اُسی وقت معاملہ طے کر دوں گا۔ (بخاری و مسلم) لیکن تھوڑی ہی مدّت گزری تھی کہ بعض ایسے مُقدّمات عملاً پیش آ گئے جن میں شوہروں نے اپنی آنکھوں سے یہ معاملہ دیکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی شکایت لے گئے۔ عبداللہؓ بن مسعود اور ابنِ عمرؓ کی رِوایات ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (غالباً عُوَیمِر عَجلانی) نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے اور منہ سے بات نکالے تو آپ حدِّ قذف جاری کر دیں گے، قتل کر دے تو آپ اسے قتل کر دیں گے، چپ رہے تو غیظ میں مبتلا رہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ اس پر حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! اس مسئلے کا فیصلہ فرما۔ (مسلم، بخاری، ابوداؤد، احمد، نَسائی) ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ہِلالؓ بن اُمَیَّہ نے آ کر اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا جسے انھوں نے بچشمِ خود مُلوّث دیکھا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ثبوت لاؤ، ورنہ تم پر حدِّ قذف جاری ہوگی۔“ صحابہؓ میں اس پر عام پریشانی پھیل گئی، اور ہِلالؓ نے کہا: اُس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے، میں بالکل صحیح واقعہ عرض کر رہا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ایسا حکم نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ بچا دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری، احمد، ابوداؤد) اس میں جو طریقِ تصفیہ تجویز کیا گیا ہے، اُسے اسلامی قانون کی اصطلاح میں ”لِعان“ کہا جاتا ہے۔

یہ حکم آ جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مقدّمات کا فیصلہ فرمایا، ان کی مفصل رودادیں کُتُبِ حدیث میں منقول ہیں اور وہی لِعان کے مفصّل قانون اور ضابطۂ کارروائی کا ماخَذ ہیں۔

ہِلالؓ بن اُمَیَّہ کے مقدّمے کی جو تفصیلات صحاح سِتّہ اور مُسنَدِ احمد اور تفسیر ابنِ جَریر میں ابنِ عباس اور اَنَس بن مالک رضی اللہ عنہما سے منقول ہوئی ہیں، ان میں بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ہِلالؓ اور ان کی بیوی، دونوں عدالتِ نبوی میں حاضر کیے گئے۔ حضورؐ نے پہلے حکمِ خداوندی سنایا، پھر فرمایا: ”خوب سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دُنیا کے عذاب سے زیادہ سخت چیز ہے۔“ ہِلالؓ نے عرض کیا: میں نے اس پر بالکل صحیح الزام لگایا ہے۔ عورت نے کہا: یہ بالکل جھوٹ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ”اچھا، تو اِن دونوں میں مُلاعَنت کرائی جائے۔“ چنانچہ پہلے ہِلالؓ اُٹھے اور انھوں نے حکمِ قرآنی کے مطابق قسمیں کھانی شروع کیں۔ نبیؐ اس دَوران میں بار بار فرماتے رہے: ”اللہ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟“

پانچویں قَسم سے پہلے حاضرین نے ہِلالؓ سے کہا: ’’خدا سے ڈرو، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ یہ پانچویں قسم تم پر عذاب واجب کردے گی۔‘‘ مگر ہِلالؓ نے کہا: ’’جس خدا نے یہاں میری پیٹھ بچائی ہے، وہ آخرت میں بھی مجھے عذاب نہیں دے گا۔‘‘ یہ کہہ کر انھوں نے پانچویں قسم بھی کھا لی۔ پھر عورت اُٹھی اور اس نے بھی قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قَسم سے پہلے اسے بھی روک کر کہا گیا کہ ’’خدا سے ڈر، آخرت کے عذاب کی بہ نسبت دُنیا کا عذاب برداشت کرلینا آسان ہے۔ یہ آخری قسم تجھ پر عذابِ الٰہی کو واجب کردے گی۔‘‘ یہ سن کر وہ کچھ دیر رُکتی اور جھجکتی رہی۔ لوگوں نے سمجھا، اعتراف کرنا چاہتی ہے۔ مگر پھر کہنے لگی: ’’میں ہمیشہ کے لیے اپنے قبیلے کو رُسوا نہیں کروں گی۔‘‘ اور پانچویں قَسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی اور فیصلہ فرمایا کہ اس کا بچہ (جو اس وقت پیٹ میں تھا) ماں کی طرف منسوب ہوگا، باپ کا نہیں پکارا جائے گا، کسی کو اس پر یا اِس کے بچے پر الزام لگانے کا حق نہ ہوگا، جو اس پر یا اس کے بچّے پر الزام لگائے گا وہ حدِّقذف کا مستحق ہوگا، اور اِس کو زمانۂ عدّت کے نَفقے اور سُکونت کا کوئی حق ہِلالؓ پر حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ طلاق یا وفات کے بغیر شوہر سے جدا کی جا رہی ہے۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ اس کے ہاں جب بچہ ہو تو دیکھو، وہ کس پر گیا ہے۔ اگر اِس اِس شکل کا ہو تو ہِلال کا ہے، اور اگر اس صورت کا ہو تو اُس شخص کا ہے جس کے بارے میں اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ وضعِ حمل کے بعد دیکھا گیا کہ وہ مؤخر الذکر صورت کا تھا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: لولا الایمان (یا بروایتِ دیگر لولا مضٰی من کتاب اللّٰہ) لکان لی ولھا شان، یعنی اگر قَسمیں نہ ہوتیں (یا خدا کی کتاب پہلے ہی فیصلہ نہ کرچکی ہوتی) تو میں اس عورت سے بُری طرح پیش آتا۔

عُوَیمِر عَجلانیؓ کے مُقدّمے کی رُوداد سَہل بن سعد ساعِدی اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ اور مُسنَدِ احمد میں ملتی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ عُوَیمِرؓ اور ان کی بیوی، دونوں مسجدِ نبوی میں بلائے گئے۔ مُلاعَنَت سے پہلے حضورؐ نے ان کو بھی تنبیہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: ’’اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟‘‘ جب کسی نے توبہ نہ کی تو دونوں میں مُلاعَنَت کرائی گئی۔ اس کے بعد عُوَیمِرؓ نے کہا: ’’یا رسولؐ اللہ! اب اگر میں اس عورت کو رکھوں تو جھوٹا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر انھوں نے تین طلاقیں دے دیں بغیر اس کے کہ حضورؐ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ سہلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ ان طلاقوں کو حضورؐ نے نافذ فرما دیا اور ان کے درمیان تفریق کرادی اور فرمایا کہ ’’یہ تفریق ہے ہر ایسے جوڑے کے معاملے میں جو باہم لِعان کرے۔‘‘ اور سنّت یہ قائم ہوگئی کہ لِعان کرنے والے زوجین کو جدا کردیا جائے، پھر وہ دونوں کبھی جمع نہیں ہوسکتے۔ مگر ابنِ عمرؓ صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ان کے درمیان تفریق کرادی۔ سہلؓ بن سعد یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عورت حاملہ تھی اور عُوَیمِرؓ نے کہا کہ یہ حمل میرا نہیں ہے۔ اس بنا پر بچہ ماں کی طرف منسوب کیا گیا، اور سنّت یہ جاری ہوئی کہ اس طرح کا بچہ ماں سے میراث پائے گا اور ماں ہی اس سے میراث پائے گی۔

ان دو مقدّموں کے علاوہ متعدِّد روایات ہم کو کُتُبِ حدیث میں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ کن اشخاص کے مقدموں کی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض انھی دونوں مقدموں سے تعلق رکھتی ہوں، مگر بعض میں کچھ دوسرے مقدّمات کا بھی ذکر ہے اور ان سے قانونِ لِعان کے بعض اہم نِکات پر روشنی پڑتی ہے۔

ابنِ عمرؓ ایک مقدمے کی رُوداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زوجین جب لِعان کرچکے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کے درمیان تفریق کر دی۔ (بخاری، مسلم، نَسائی، احمد، ابنِ جَریر) ابنِ عمرؓ کی ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص اور اس کی بیوی کے درمیان لِعان کرایا گیا۔ پھر اس نے حمل سے انکار کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ بچہ صرف ماں کا ہوگا۔ (صِحاح ستّہ اور احمد) ابنِ عمرؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ مُلاعَنَت کے بعد حضورؐ نے فرمایا: ''تمھارا حساب اب اللہ کے ذمے ہے، تم میں سے ایک بہرحال جھوٹا ہے۔'' پھر آپؐ نے مرد سے فرمایا: لا سبیل لك علیھا (یعنی اب یہ تیری نہیں رہی۔ نہ تُو اس پر کوئی حق جتا سکتا ہے، نہ کسی قسم کی دست درازی یا دوسری منتقمانہ حرکت اس کے خلاف کرنے کا مجاز ہے)۔ مرد نے کہا: یا رسولؐ اللہ! اور میرا مال؟ (یعنی وہ مہر تو مجھے دلوائیے جو میں نے اسے دیا تھا)۔ فرمایا: لا مال لك، ان کنت صدقت علیھا فھو بما استحللت من فرجھا وان کنت کذبت علیھا فذاك ابعد لك منھا (یعنی مال واپس لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے، اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو وہ مال اُس لذت کا بدل ہے جو تو نے حلال کر کے اس سے اُٹھائی، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی زیادہ دور چلا گیا، وہ اس کی بہ نسبت تجھ سے زیادہ دُور ہے)۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

دارقُطنی نے علی بن ابی طالب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: ''سنّت یہ مقرر ہو چکی ہے کہ لِعان کرنے والے زوجین پھر کبھی باہم جمع نہیں ہو سکتے'' (یعنی ان کا دوبارہ نکاح پھر کبھی نہیں ہو سکتا)۔ اور دارقُطنی ہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ یہ دونوں پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

قَبِیصَہ بن ذُؤَیب کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے حمل کو ناجائز قرار دیا، پھر اعتراف کر لیا کہ یہ حمل اُس کا اپنا ہے، پھر وضعِ حمل کے بعد کہنے لگا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے اس پر حدِّ قذف جاری کی اور فیصلہ کیا کہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ (دارقُطنی، بَیہقی)

ابنِ عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری ایک بیوی ہے جو مجھے بہت محبوب ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہے کہ کسی ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی۔ (واضح رہے کہ یہ کِنایہ تھا، جس کے معنیٰ زنا کے بھی ہو سکتے ہیں اور زِنا سے کم تر درجے کی اَخلاقی کمزوری کے بھی)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طلاق دے دے۔ اس نے کہا: مگر میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ فرمایا: تو اسے رکھے رہ! (یعنی آپؐ نے اُس سے اِس کِنایے کی تشریح نہیں کرائی اور اس کے قول کو الزام زنا پر محمول کر کے لِعان کا حکم نہیں دیا)۔ (نَسائی)

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری بیوی نے کالا لڑکا جنا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرا ہے (یعنی محض لڑکے کے رنگ نے اسے شبہے میں ڈالا تھا، ورنہ بیوی پر زنا کا الزام لگانے کے لیے اس کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی)۔ آپؐ نے پوچھا: تیرے پاس کچھ اُونٹ تو ہوں گے۔ اس نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے پوچھا: ان کے رنگ کیا ہیں؟ کہنے لگا: سُرخ۔ آپؐ نے پوچھا: ان میں کوئی خاکستری بھی ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں، بعض ایسے بھی ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ رنگ کہاں سے آیا؟ کہنے لگا: شاید کوئی رَگ کھینچ لے گئی (یعنی ان کے باپ دادا میں سے کوئی اس رنگ کا ہوگا اور اسی کا اثر ان میں آ گیا)۔ فرمایا: ''شاید اس بچے کو بھی کوئی رَگ کھینچ لے گئی'' اور آپؐ نے اسے نفیِ وَلَد (بچے کے نسب سے انکار) کی

اجازت نہ دی۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد)

ابو ہریرہؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ لِعان پر کلام کرتے ہوئے فرمایا: ''جو عورت کسی خاندان میں ایسا بچہ گھُسا لائے جو اس خاندان کا نہیں ہے، (یعنی حرام کا پیٹ رکھوا کر شوہر کے سر منڈھ دے) اُس کا اللہ سے کچھ واسطہ نہیں، اللہ اس کو جنت میں ہرگز داخل نہ کرے گا۔ اور جو مرد اپنے بچے کے نسب سے انکار کرے حالانکہ بچہ اس کو دیکھ رہا ہو، اللہ قیامت کے روز اس سے پردہ کرے گا اور اسے تمام اگلی پچھلی خلق کے سامنے رُسوا کر دے گا۔ (ابوداؤد، نسائی، دارمی)

آیتِ لِعان اور یہ روایات و نظائر اور شریعت کے اُصولِ عامّہ اسلام میں قانونِ لِعان کے وہ مآخذ ہیں جن کی روشنی میں فقہا نے لِعان کا مفصّل ضابطہ بنایا ہے۔ اس ضابطے کی اہم دفعات یہ ہیں:

(۱) جو شخص بیوی کی بدکاری دیکھے اور لِعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قتل کا مرتکب ہو جائے، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس کو بطورِ خود حدّ جاری کرنے کا حق نہ تھا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے فعل پر کوئی مواخذہ ہوگا، بشرطیکہ اُس کی صداقت ثابت ہو جائے (یعنی یہ کہ فی الواقع اس نے زنا ہی کے ارتکاب پر یہ فعل کیا)۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن رَاہُوَیہؒ کہتے ہیں کہ اُسے اس امر کے دو گواہ لانے ہوں گے کہ قتل کا سبب یہی تھا۔ مالکیہ میں سے ابن القاسم اور ابنِ حبیب اس پر مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ زانی جسے قتل کیا گیا وہ شادی شدہ ہو، ورنہ کنوارے زانی کو قتل کرنے پر اُس سے قِصاص لیا جائے گا۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اس کو قِصاص سے صرف اُس صورت میں معاف کیا جائے گا جب کہ وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے، یا مقتول مرنے سے پہلے خود اس امر کا اعتراف کر چکا ہو کہ وہ اس کی بیوی سے زنا کر رہا تھا، اور مزید یہ کہ مقتول شادی شدہ ہو۔ (نَیْلُ الْاَوْطَار، ج ۶، ص ۲۲۸)

(۲) لِعان گھر بیٹھے آپس ہی میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔

(۳) لِعان کے مطالبے کا حق صرف مرد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت بھی عدالت میں اس کا مطالبہ کر سکتی ہے، جب کہ شوہر اُس پر بدکاری کا الزام لگائے یا اس کے بچے کا نسب تسلیم کرنے سے انکار کرے۔

(۴) کیا لِعان ہر زوج اور زوجہ کے درمیان ہو سکتا ہے یا اس کے لیے دونوں میں کچھ شرائط ہیں؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس کی قسم قانونی حیثیت سے معتبر ہو اور جس کو طلاق دینے کا اختیار ہو، وہ لعان کر سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صرف عاقل اور بالغ ہونا اہلیّتِ لِعان کے لیے کافی ہے، خواہ زوجین مسلم ہوں یا کافر، غلام ہوں یا آزاد، مقبول الشہادت ہوں یا نہ ہوں، اور مسلم شوہر کی بیوی مسلمان ہو یا ذِمّی۔ قریب قریب یہی رائے امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی بھی ہے۔ مگر حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ لعان صرف ایسے آزاد مسلمان زوجین ہی میں ہو سکتا ہے جو قذف کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔ اگر عورت اور مرد دونوں کافر ہوں، یا غلام ہوں، یا قَذْف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ ہوں تو ان کے درمیان لِعان نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں اگر عورت کبھی اس سے پہلے حرام یا مُشتَبَہ طریقے پر کسی مرد سے مُلَوَّث ہو چکی ہو، تب بھی لِعان دُرست نہ ہوگا۔ یہ شرطیں حنفیہ نے اس بنا پر لگائی ہیں کہ ان کے نزدیک لِعان کے قانون اور قذف کے قانون میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ غیر آدمی اگر قذف کا مرتکب ہو تو اس کے لیے حدّ ہے، اور شوہر اس کا ارتکاب کرے تو وہ لِعان

کر کے چھوٹ سکتا ہے۔ باقی تمام حیثیتوں سے لِعان اور قذف ایک ہی چیز ہے۔ علاوہ بریں حَنَفِیَّہ کے نزدیک چونکہ لِعان کی قسمیں شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے وہ کسی ایسے شخص کو اُس کی اجازت نہیں دیتے جو شہادت کا اہل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں حَنَفِیَّہ کا مسلک کمزور ہے اور صحیح بات وہی ہے جو امام شافعیؒ نے فرمائی ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے قذفِ زوجہ کے مسئلے کو آیتِ قذف کا ایک جُز نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے لیے الگ قانون بیان کیا ہے، اس لیے اس کو قانونِ قذف کے ضمن میں لا کر وہ تمام شرائط اس میں شامل نہیں کی جا سکتیں جو قذف کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ آیتِ لِعان کے الفاظ آیتِ قذف کے الفاظ سے مختلف ہیں اور دونوں الگ الگ حکم ہیں، اس لیے لِعان کا قانون آیتِ لِعان ہی سے اخذ کرنا چاہیے نہ کہ آیتِ قذف سے۔ مثلاً آیتِ قذف میں سزا کا مستحق وہ شخص ہے جو پاک دامن عورتوں (مُحْصَنَات) پر الزام لگائے۔ لیکن آیتِ لِعان میں پاک دامن بیوی کی شرط کہیں نہیں ہے۔ ایک عورت چاہے کبھی گناہ گار بھی رہی ہو، اگر بعد میں وہ توبہ کر کے کسی شخص سے نکاح کر لے اور پھر اس کا شوہر اُس پر ناحق الزام لگائے تو آیتِ لعان یہ نہیں کہتی کہ اس عورت پر تہمت رکھنے کی یا اس کی اولاد کے نسب سے انکار کر دینے کی شوہر کو کھلی چھٹی دے دو، کیونکہ اس کی زندگی کبھی داغ دار رہ چکی ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم وجہ یہ ہے کہ قذفِ زوجہ اور قذفِ اجنبیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ان دونوں کے بارے میں قانون کا مزاج ایک نہیں ہو سکتا۔ غیر عورت سے آدمی کا کوئی واسطہ نہیں۔ نہ جذبات کا، نہ عزت کا، نہ معاشرت کا، نہ حُقوق کا، اور نہ نسل و نسب کا۔ اُس کے چال چلن سے اگر ایک آدمی کو کوئی بڑی سے بڑی باوقعت دلچسپی ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ معاشرے کو بد اَخلاقی سے پاک دیکھنے کا جوش اُسے لاحق ہو۔ اِس کے برعکس اپنی بیوی سے آدمی کا تعلق ایک طرح کا نہیں، کئی طرح کا ہے اور بہت گہرا ہے۔ وہ اس کے نسب اور اس کے مال اور اس کے گھر کی امانت دار ہے۔ اس کی زندگی کی شریک ہے۔ اس کے رازوں کی امین ہے۔ اس کے نہایت گہرے اور نازک جذبات اس سے وابستہ ہیں۔ اُس کی بدچلنی سے آدمی کی غیرت اور عزت پر، اُس کے مفاد پر، اور اُس کی آیندہ نسل پر سخت چوٹ لگتی ہے۔ یہ دونوں معاملے آخر ایک کس حیثیت سے ہیں کہ دونوں کے لیے قانون کا مزاج ایک ہی ہو۔ کیا ایک ذِمّی، یا ایک غلام، یا ایک سزا یافتہ آدمی کے لیے اُس کی بیوی کا معاملہ کسی آزاد اہلِ شہادت مسلمان کے معاملے سے کچھ بھی مختلف یا اہمیت اور نتائج میں کچھ بھی کم ہے؟ اگر وہ اپنی آنکھوں سے کسی کے ساتھ اپنی بیوی کو ملوث دیکھ لے، یا اس کو یقین ہو کہ اس کی بیوی غیر سے حاملہ ہے، تو کون سی معقول وجہ ہے کہ اسے لِعان کا حق نہ دیا جائے؟ اور یہ حق اس سے سلب کرنے کے بعد ہمارے قانون میں اس کے لیے اور کیا چارۂ کار ہے؟ قرآنِ مجید کا منشا تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ جوڑوں کو اُس پیچیدگی سے نکالنے کی ایک صورت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں بیوی کی حقیقی بدکاری یا ناجائز حمل سے ایک شوہر، اور شوہر کے جھوٹے الزام یا اولاد کے نسب سے بے جا انکار کی بدولت ایک بیوی مبتلا ہو جائے۔ یہ ضرورت صرف اہلِ شہادت آزاد مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے، اور قرآن کے الفاظ میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کو صرف انھی تک محدود کرنے والی ہو۔ رہا یہ اِستِدلال کہ قرآن نے لِعان کی قسموں کو شہادت قرار دیا ہے اس لیے شہادت کی شرائط یہاں عائد ہوں گی، تو اس کا تقاضا پھر یہ ہے کہ اگر عادل مقبول الشہادت شوہر قسمیں کھالے اور عورت قسم کھانے سے پہلو تہی کرے تو عورت کو رجم کر دیا جائے، کیونکہ اس کی بدکاری پر شہادت قائم ہو چکی ہے۔ لیکن یہ

عجیب بات ہے کہ اِس صورت میں حَنَفِیہّ رجم کا حکم نہیں لگاتے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ خود بھی ان قسموں کو بعینہٖ شہادت کی حیثیت نہیں دیتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود قرآن بھی ان قسموں کو شہادت کے لفظ سے تعبیر کرنے کے باوجود شہادت نہیں قرار دیتا، ورنہ عورت کو چار کے بجائے آٹھ قسمیں کھانے کا حکم دیتا۔

(۵) لِعان محض کِنایے اور استعارے یا اظہارِ شک وشبہ پر لازم نہیں آتا، بلکہ صرف اُس صورت میں لازم آتا ہے جب کہ شوہر صریح طور پر زنا کا الزام عائد کرے، یا صاف الفاظ میں بچے کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ امام مالکؒ اور لَیث بن سعدؒ اس پر یہ مزید شرط بڑھاتے ہیں کہ قسم کھاتے وقت شوہر کو یہ کہنا چاہیے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بیوی کو زنا میں مبتلا دیکھا ہے۔ لیکن یہ قید بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی اصل نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔

(۶) اگر الزام لگانے کے بعد شوہر قسم کھانے سے پہلوتہی کرے تو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ اسے قید کردیا جائے گا، اور جب تک وہ لعان نہ کرے یا اپنے الزام کا جھوٹا ہونا نہ مان لے، اسے نہ چھوڑا جائے گا، اور جھوٹ مان لینے کی صورت میں اس کو حدِّ قذف لگائی جائے گی۔ اس کے برعکس امام مالکؒ، شافعیؒ، حسن بن صالح اور لَیث بن سعد کی رائے یہ ہے کہ لعان سے پہلوتہی کرنا خود ہی اقرارِ کِذب ہے، اس لیے حدِّ قذف واجب آجاتی ہے۔

(۷) اگر شوہر کے قسم کھا چکنے کے بعد عورت لِعان سے پہلوتہی کرے، تو حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اسے قید کردیا جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ لِعان نہ کرے، یا پھر زنا کا اقرار نہ کرلے۔ دوسری طرف مذکورۂ بالا ائمہؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اسے رجم کردیا جائے گا۔ ان کا اِستِدلال قرآن کے اس ارشاد سے ہے کہ عورت سے عذاب صرف اس صورت میں دفع ہوگا جب کہ وہ بھی قسم کھالے۔ اب چونکہ وہ قسم نہیں کھاتی، اس لیے لامحالہ وہ عذاب کی مستحق ہے۔ لیکن اس دلیل میں کمزوری یہ ہے کہ قرآن یہاں ''عذاب'' کی نوعیت تجویز نہیں کرتا بلکہ مطلقاً سزا کا ذکر کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سزا سے مراد یہاں زنا ہی کی سزا ہوسکتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ زنا کی سزا کے لیے قرآن نے صاف الفاظ میں چار گواہوں کی شرط لگائی ہے۔ اس شرط کو محض ایک شخص کی چار قسمیں پورا نہیں کردیتیں۔ شوہر کی قسمیں اس بات کے لیے تو کافی ہیں کہ وہ خود قذف کی سزا سے بچ جائے اور عورت پر لِعان کے احکام مُترتّب ہوسکیں، مگر اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ان سے عورت پر زنا کا الزام ثابت ہوجائے۔ عورت کا جوابی قسمیں کھانے سے انکار شبہ ضرور پیدا کرتا ہے اور بڑا قوی شبہ پیدا کردیتا ہے، لیکن شبہات پر حُدود جاری نہیں کی جاسکتیں۔ اس معاملے کو مرد کی حدِّ قذف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا قذف تو ثابت ہے، جبھی تو اس کو لِعان پر مجبُور کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس عورت پر زنا کا الزام ثابت نہیں ہے، کیونکہ وہ اُس کے اپنے اقرار یا چار عینی شہادتوں کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا۔

(۸) اگر لعان کے وقت عورت حاملہ ہو تو امام احمد کے نزدیک لِعان بجائے خود اس بات کے لیے کافی ہے کہ مرد اس حمل سے بَری الذمہ ہوجائے اور بچہ اُس کا قرار نہ پائے، قطعِ نظر اِس سے کہ مرد نے حمل کو قبول کرنے سے انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مرد کا الزامِ زنا اور نفیِ حمل دونوں ایک چیز نہیں ہیں، اس لیے مرد جب تک حمل کی ذمّہ داری قبول کرنے سے صریح طور پر انکار نہ کرے وہ الزامِ زنا کے باوجود اُسی کا قرار پائے گا، کیونکہ عورت کے زانیہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو حمل

بھی زنا ہی کا ہو۔

(۹) امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دورانِ حمل میں مرد کو نفیِ حمل کی اجازت دیتے ہیں اور اس بنیاد پر لِعان کو جائز رکھتے ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مرد کے الزام کی بنیاد زِنا نہ ہو بلکہ صرف یہ ہو کہ اس نے عورت کو ایسی حالت میں حاملہ پایا ہے جب کہ اُس کے خیال میں حمل اُس کا نہیں ہوسکتا، تو اس صورت میں لعان کے معاملے کو وضعِ حمل تک ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات کوئی بیماری حمل کا شبہ پیدا کر دیتی ہے اور درحقیقت حمل ہوتا نہیں ہے۔

(۱۰) اگر باپ بچے کے نسب سے انکار کرے تو بالاتفاق لِعان لازم آتا ہے۔ اور اس امر میں بھی اتفاق ہے کہ ایک دفعہ بچے کو قبول کر لینے کے بعد (خواہ یہ قبول کر لینا صریح الفاظ میں ہو یا قبولیت پر دلالت کرنے والے افعال، مثلاً پیدائش پر مبارک باد لینے یا بچے کے ساتھ پدرانہ شفقت برتنے اور اس کی پرورش سے دلچسپی لینے کی صورت میں) پھر باپ کو انکارِ نسب کا حق نہیں رہتا، اور اگر کرے تو حدِّ قذف کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ باپ کو کس وقت تک انکارِ نسب کا حق حاصل ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر شوہر اُس زمانے میں گھر پر موجود رہا ہے جب کہ بیوی حاملہ تھی، تو زمانۂ حمل سے لے کر وضعِ حمل تک اس کے لیے انکار کا موقع ہے، اس کے بعد وہ انکار کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ اگر وہ غائب تھا اور اس کے پیچھے ولادت ہوئی تو جس وقت اُسے علم ہو، وہ انکار کرسکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر پیدائش کے بعد ایک دو روز کے اندر وہ انکار کرے تو لعان کر کے وہ بچے کی ذمّہ داری سے بَری ہو جائے گا، لیکن اگر سال دو سال بعد انکار کرے تو لِعان ہو گا مگر وہ بچے کی ذمّہ داری سے بَری نہ ہو سکے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ولادت کے بعد، یا ولادت کا علم ہونے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر باپ کو انکارِ نسب کا حق ہے، اس کے بعد یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ مگر یہ چالیس دن کی قید بے معنٰی ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے فرمائی ہے کہ ولادت کے بعد یا اس کا علم ہونے کے بعد ایک دو روز کے اندر ہی انکارِ نسب کیا جاسکتا ہے، اِلّا یہ کہ اس میں کوئی ایسی رکاوٹ ہو جسے معقول رکاوٹ تسلیم کیا جاسکے۔

(۱۱) اگر شوہر طلاق دینے کے بعد مُطلّقہ بیوی پر زِنا کا الزام لگائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لِعان نہیں ہو گا بلکہ اس پر قذف کا مقدّمہ قائم کیا جائے گا، کیونکہ لِعان زوجین کے لیے ہے اور مُطلّقہ عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ طلاقِ رَجعی ہو اور مدّتِ رُجوع کے اندر وہ الزام لگائے۔ مگر امام مالکؒ کے نزدیک یہ قذف صرف اس صورت میں ہے جب کہ کسی حمل یا بچے کا نسب قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ درمیان میں نہ ہو۔ ورنہ مرد کو طلاقِ بائن کے بعد بھی لِعان کا حق حاصل ہے، کیونکہ وہ عورت کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود ایک ایسے بچے کی ذمّہ داری سے بچنے کے لیے لِعان کر رہا ہے جسے وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ قریب قریب یہی رائے امام شافعیؒ کی بھی ہے۔

(۱۲) لِعان کے قانونی نتائج میں سے بعض مُتَّفَق عَلَیہ ہیں، اور بعض میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

مُتَّفَق عَلَیہ نتائج یہ ہیں: عورت اور مرد، دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے۔ مرد بچے کے نسب کا منکر ہو تو بچہ صرف ماں کا قرار پائے گا۔ نہ باپ کی طرف منسوب ہو گا نہ اس سے میراث پائے گا۔ ماں اس کی وارث ہو گی اور وہ ماں کا وارث ہو گا۔ عورت کو زانیہ اور اس کے بچے کو وَلَدُ الزِّنا کہنے کا کسی کو حق نہ ہو گا، خواہ لِعان کے وقت اس کے حالات ایسے ہی

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ

جولوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں[8] وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں[9]۔ اس واقعے کو اپنے

کیوں نہ ہوں کہ لوگوں کو اس کے زانیہ ہونے میں شک نہ رہے۔ جو شخص لِعان کے بعد اس پر یا اس کے بچے پر سابق الزام کا اعادہ کرے گا، وہ حدّ کا مستحق ہوگا۔ عورت کا مہر ساقط نہ ہوگا۔ عورت دورانِ عدّت میں مرد سے نَفَقہ اور مسکن پانے کی حق دار نہ ہوگی۔ عورت اس مرد کے لیے حرام ہو جائے گی۔

اختلاف دو مسئلوں میں ہے: ایک یہ کہ لعان کے بعد عورت اور مرد کی علیٰحدگی کیسے ہوگی؟ دوسرے یہ کہ لعان کی بنا پر علیٰحدہ ہو جانے کے بعد کیا ان دونوں کا پھر مل جانا ممکن ہے؟ پہلے مسئلے میں امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس وقت مرد لِعان سے فارغ ہو جائے، اسی وقت فرقت آپ سے آپ واقع ہو جاتی ہے، خواہ عورت جوابی لِعان کرے یا نہ کرے۔ امام مالک، لَیث بن سَعد اور زُفَر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں جب لِعان سے فارغ ہوں تب فُرقَت واقع ہوتی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ لعان سے فرقت آپ ہی آپ واقع نہیں ہو جاتی بلکہ عدالت کے تفریق کرانے سے ہوتی ہے۔ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر، ورنہ حاکِم عدالت ان کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔ دوسرے مسئلے میں امام مالک، ابو یوسف، زُفَر، سُفیان ثَوری، اسحاق بن رَاہَوَیہ، شافعی، احمد بن حنبل اور حَسَن بن زیاد کہتے ہیں کہ لعان سے جو زوجین جدا ہوئے ہیں، وہ پھر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں، دوبارہ وہ باہم نکاح کرنا بھی چاہیں تو کسی حال میں نہیں کر سکتے۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی بھی ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن مُسَیَّب، ابراہیم نَخَعی، شَعْبِی، سعید بن جُبَیر، ابوحنیفہ اور محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر شوہر اپنا جھوٹ مان لے اور اس پر حدِّ قذف جاری ہو جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرنے والی چیز لِعان ہے۔ جب تک وہ اس پر قائم رہیں، حرمت بھی قائم رہے گی۔ مگر جب شوہر اپنا جھوٹ مان کر سزا پا گیا تو لِعان ختم ہو گیا اور حُرمت بھی اُٹھ گئی۔

۸ — اشارہ ہے اُس الزام کی طرف جو حضرت عائشہؓ پر لگایا گیا تھا۔ اس کو اِفک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے۔ اِفک کے معنیٰ ہیں: بات کو اُلٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افترا کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنیٰ سراسر بہتان کے ہیں۔

یہاں سے اُس واقعے پر کلام شروع ہوتا ہے جو اِس سورہ کے نُزول کا اصل سبب تھا۔ دیباچے میں ہم اس کا ابتدائی قصّہ خود حضرت عائشہؓ کی رِوایَت سے نقل کر آئے ہیں۔ بعد کی داستان بھی انھی کی زبان سے سنیے۔ فرماتی ہیں: ”اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری

مدّت میں آپؐ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور اُمِّ رُومانؓ (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کُن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: عائشہ! مجھے تمھارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو اُمید ہے کہ اللہ تمھاری بَراءت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ رسولؐ اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انھوں نے فرمایا: بیٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ ہی کچھ کہیں۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی: آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے، اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں —— اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں —— تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی —— اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی —— تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اُس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا: اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی، کہ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جب کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ان کے بیٹے بِن یَمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا۔ سورۂ یوسف، رُکوع ۱۰ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے)۔ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری براءت ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتّٰی کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپؐ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے، اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دُور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ! اللہ نے تمھاری بَراءت نازل فرما دی، اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں۔ (یعنی آیت ۱۱ سے ۲۱ تک) میری والدہ نے کہا کہ اُٹھو اور رسولؐ اللہ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا: میں نہ اِن کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔'' (واضح رہے کہ یہ کسی ایک روایت کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں جتنی روایتیں حضرت عائشہؓ سے اس سلسلے میں مروی ہیں، ان سب کو جمع کر کے ہم نے ان کا خلاصہ نکال لیا ہے)۔

اس موقع پر یہ نکتہ لطیف بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہؓ کی براءت بیان کرنے سے پہلے پورے ایک رُکوع میں زنا اور قذف اور لِعان کے احکام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل اس حقیقت پر مُتنبّہ فرمایا ہے کہ زنا کے الزام کا معاملہ

شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے۔[۱۰] جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا،

کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے جسے نُقلِ محفل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ الزام لگانے والے کا الزام اگر سچّا ہے تو وہ گواہی لائے۔ زانی اور زانیہ کو انتہائی ہولناک سزا دی جائے گی۔ اگر جھوٹا ہے تو الزام لگانے والا اس لائق ہے کہ اُس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے برسا دیے جائیں، تاکہ آیندہ وہ یا کوئی اور ایسی جرأت نہ کرے۔ اور یہ الزام اگر شوہر لگائے تو عدالت میں لِعان کر کے اُسے معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اس بات کو زبان سے نکال کر کوئی شخص بھی خیریت سے بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ مسلم معاشرہ ہے جسے دُنیا میں بھلائی قائم کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اِس میں نہ زنا ہی تفریح بن سکتی ہے اور نہ اس کے چرچے ہی خوش باشی اور دل لگی کے موضوع قرار پا سکتے ہیں۔

۹ — روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جو یہ افواہیں پھیلا رہے تھے۔ عبداللہ بن اُبَیّ، زید بن رفاعہ (جو غالباً رفاعہ بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)، مِسْطَحؓ بن اُثاثہ، حَسّانؓ بن ثابت اور حَمْنَہؓ بنتِ جَحْش۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے، جو غلطی اور کمزوری سے اِس فتنے میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سوا اور جو لوگ اِس گناہ میں کم و بیش مبتلا ہوئے، ان کا ذکر حدیث و سیرت کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

۱۰ — مطلب یہ ہے کہ گھبراؤ نہیں، منافقین نے اپنی دانست میں تو یہ بڑے زور کا وار تم پر کیا ہے، مگر اِن شاء اللہ یہ انھی پر اُلٹا پڑے گا اور تمھارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، منافقین نے یہ شوشہ اس لیے چھوڑا تھا کہ مسلمانوں کو اُس میدان میں شکست دیں جو اُن کے تفوّق کا اصل میدان تھا، یعنی اَخلاق، جس میں فائق ہونے ہی کی وجہ سے وہ ہر میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لیے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی مسلمانوں کے لیے سببِ خیر بنا دیا۔ اس موقع پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان والوں نے، اور تیسری طرف عام اہلِ ایمان نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اُس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابط و متحمل، کیسے انصاف پسند اور کس درجے کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اشارہ اُن لوگوں کی گردنیں اُڑا دینے کے لیے کافی تھا جنھوں نے آپؐ کی عزت پر یہ حملہ کیا تھا، مگر مہینے بھر تک آپؐ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو صرف اُن تین مسلمانوں کو، جن پر جرمِ قذف ثابت تھا، حدّ لگوا دی، منافقین کو پھر بھی کچھ نہ کہا۔ حضرت ابوبکرؓ کا اپنا رشتہ دار، جس کی اور جس کے گھر بھر کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل وجگر پر یہ تیر چلاتا رہا، مگر اللہ کے اُس نیک بندے نے اس پر بھی نہ برادری کا تعلق منقطع کیا، نہ اس کی اور اس کے خاندان کی مدد ہی بند کی۔ ازواجِ مُطہّراتؓ میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرّہ برابر حصّہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ درجے میں بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا۔ حتّٰی کہ حضرت زینبؓ کی سگی بہن حَمْنَہؓ بنتِ جَحْش محض اُن کی خاطر اُن کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انھوں نے سوکن کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہا۔

وَالَّذِىْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١﴾ لَوْ لَآ اِذْ

اور جس شخص نے اِس کی ذمّہ داری کا بڑا حصّہ اپنے سر لیا،[11] اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت

حضرت عائشہؓ کی اپنی روایت ہے کہ ازواجِ رسولؐ اللہ میں سب سے زیادہ زینبؓ ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر واقعۂ اِفک کے سلسلے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ عائشہ کے متعلق تم کیا جانتی ہو، تو انھوں نے کہا: یارسولؐ اللہ! خدا کی قسم! میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسّانؓ بن ثابت نے انھیں بدنام کرنے میں نمایاں حصّہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا، تو یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دشمنِ اسلام شعرا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا اُن لوگوں کا حال جن کا اس معاملے سے براہِ راست تعلق تھا۔ اور عام مسلمانوں کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ان کی بیوی نے جب ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے: ”ایوب کی ماں! اگر تم عائشہ کی جگہ اُس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟“ بولیں: ”خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی۔“ حضرت ابوایوبؓ نے کہا: ”تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صَفوانؓ کی جگہ مَیں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کرسکتا تھا، صَفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔“ اِس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اَخلاقی تفوّق پہلے سے زیادہ نمایاں ہوگیا۔

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا، اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین واحکام اور تمدّنی ضوابط میں بڑے اہم اضافوں کا موجب بن گیا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل ہوئیں جن پر عمل کرکے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برائیوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اور پیدا ہوجائیں تو ان کا بروقت تدارُک کیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں اس میں خیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں ہیں، جو کچھ اللہ بتاتا ہے وہی کچھ جانتے ہیں، اس کے ماسوا آپؐ کا علم اُتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہوسکتا ہے۔ ایک مہینے تک آپؐ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے۔ کبھی خادمہ سے پوچھتے تھے، کبھی ازواجِ مطہراتؓ سے، کبھی حضرت علیؓ سے اور کبھی حضرت اُسامہؓ سے۔ آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کرو، اور نہیں کیا تو امید ہے کہ اللہ تمھاری بے گناہی ثابت کردے گا۔ اگر آپؐ عالم الغیب ہوتے تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقینِ توبہ کیوں ہوتی؟ البتہ جب وحیِ خداوندی نے حقیقت بتادی تو آپؐ کو وہ علم حاصل ہوگیا جو مہینے بھر تک حاصل نہ تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے مسلمانوں کو اُس غلُوّ اور مبالغے سے بچانے کا انتظام فرمادیا جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملے میں لوگوں کو مبتلا کردیتا ہے۔

سَمِعۡتُمُوۡهُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِهِمۡ خَيۡرًا ۙ وَّقَالُوۡا هٰذَاۤ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۲﴾ لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ

تم لوگوں نے اسے سُنا تھا، اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا[۱۲] اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے[۱۳]؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟

بعید نہیں کہ مہینے بھر تک وحی نہ بھیجنے میں اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو۔ اوّل روز ہی وحی آجاتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوسکتا۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۹۵ تا ۵۹۸)

۱۱ — یعنی عبداللہ بن اُبَیّ، جو اس الزام کا اصل مصنف اور فتنے کا اصل بانی تھا۔ بعض رِوایات میں غَلَطی سے حضرت حَسّانؓ بن ثابت کو اس آیت کا مِصداق بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلط فہمی ہے، ورنہ حضرت حَسّانؓ کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابلِ ذکر تک نہ تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا جھوٹ، بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی اُمَیَّہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِس آیت کا مِصداق قرار دیا۔ بخاری، طَبَرانی اور بَیہَقی میں ہِشام بن عبدالملک اُمَوی کا یہ قول منقول ہے کہ اَلَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَہٗ کے مِصداق علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا سرے سے اس فتنے میں کوئی حصّہ ہی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انھوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشان دیکھا تو حضورؐ کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں آپؐ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں۔ آپ چاہیں تو عائشہ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اُس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہؓ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرتؐ کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

۱۲ — دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے لوگوں، یا اپنی مِلّت اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، اور اس ذو معنیٰ فقرے کے استعمال میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جو صورتِ معاملہ حضرت عائشہؓ اور صَفوانؓ بن مُعَطَّل کے ساتھ پیش آئی تھی، وہ یہی تو تھی کہ قافلے کی ایک خاتون (قطعِ نظر اس سے کہ وہ رسول کی بیوی تھیں) اتفاق سے پیچھے رہ گئی تھیں اور قافلے ہی کا ایک آدمی، جو خود اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا، انھیں دیکھ کر اپنے اُونٹ پر ان کو بٹھا لایا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ، یہ دونوں تنہا ایک دوسرے کو پا کر گناہ میں مبتلا ہو گئے، تو اس کا یہ کہنا اپنے ظاہر الفاظ کے پیچھے دو اور مفروضے بھی رکھتا ہے: ایک یہ کہ قائل (خواہ مرد ہو یا عورت) اگر خود اس جگہ ہوتا تو کبھی گناہ کیے بغیر نہ رہتا، کیونکہ وہ اگر گناہ سے رُکا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے صِنفِ مقابل کا کوئی فرد اِس طرح تنہائی میں ہاتھ نہ آ گیا، ورنہ ایسے نادر موقع کو وہ چھوڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جس معاشرے سے وہ تعلق رکھتا ہے، اس کی اخلاقی حالت کے متعلق اس کا گمان یہ ہے کہ یہاں کوئی عورت بھی ایسی

نہیں ہے اور نہ کوئی مرد ایسا ہے جسے اس طرح کا کوئی موقع پیش آجائے اور وہ گناہ سے باز رہ جائے۔ یہ تو اُس صورت میں ہے جب کہ معاملہ محض ایک مرد اور ایک عورت کا ہو۔ اور بالفرض اگر وہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہوں، اور عورت جو اتفاقاً قافلے سے بچھڑ گئی تھی، اُس مرد کے کسی دوست، یا رشتہ دار یا ہمسایے، یا واقف کار کی بیوی، بہن، یا بیٹی ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس کے معنٰی پھر یہ ہو جاتے ہیں کہ کہنے والا خود اپنی ذات کے متعلق بھی اور اپنے معاشرے کے متعلق بھی ایسا سخت گِھناؤنا تصور رکھتا ہے جسے شرافت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ کون بھلا آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے کسی دوست یا ہمسایے یا واقف کار کے گھر کی کوئی عورت اگر اتفاق سے کہیں بھولی بھٹکی اُسے راستے میں مل جائے تو وہ پہلا کام بس اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے ہی کا کرے گا، پھر کہیں اُسے گھر پہنچانے کی تدبیر سوچے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ہزار گنا زیادہ سخت تھا۔ خاتون کوئی اور نہ تھیں، رسولؐ اللہ کی بیوی تھیں، جنھیں ہر مسلمان اپنی ماں سے بڑھ کر احترام کے لائق سمجھتا تھا، جنھیں اللہ نے خود ہر مسلمان پر ماں کی طرح حرام قرار دیا تھا۔ مرد نہ صرف یہ کہ اسی قافلے کا ایک آدمی، اسی فوج کا ایک سپاہی اور اسی شہر کا ایک باشندہ تھا، بلکہ وہ مسلمان تھا، اُن خاتون کے شوہر کو اللہ کا رسول اور اپنا ہادی و پیشوا مانتا تھا، اور ان کے فرمان پر جان قربان کرنے کے لیے جنگِ بَدر جیسے خطرناک معرکے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں تو اس قول کا ذہنی پَسِ منظر گِھناؤنے پن کی اُس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے بڑھ کر کسی گندے تخیّل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مسلم معاشرے کے جن افراد نے یہ بات زبان سے نکالی یا اسے کم از کم شک کے قابل خیال کیا، انھوں نے خود اپنے نفس کا بھی بہت بُرا تصور قائم کیا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو بھی بڑے ذلیل اَخلاق و کردار کا مالک سمجھا۔

**۱۳ -** یعنی یہ بات تو قابلِ غور تک نہ تھی۔ اسے تو سنتے ہی ہر مسلمان کو سراسر جھوٹ اور کِذب و افترا کہہ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے، کوئی شخص یہاں یہ سوال کرے کہ جب یہ بات تھی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے کیوں نہ اوّل روز ہی جُھٹلا دیا اور کیوں انھوں نے اسے اتنی اہمیّت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر اور باپ کی پوزیشن عام آدمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک شوہر سے بڑھ کر کوئی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتا، اور ایک شریف و صالح بیوی کے متعلق کوئی صحیح الدماغ شوہر لوگوں کے بہتانوں پر فی الواقع بدگمان نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کی بیوی پر الزام لگا دیا جائے تو وہ اس مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اسے بہتان کہہ کر رَدّ کر بھی دے تو کہنے والوں کی زبان نہ رُکے گی، بلکہ وہ اس پر ایک اور رَدّا یہ چڑھائیں گے کہ بیوی نے میاں صاحب کی عقل پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے، سب کچھ کر رہی ہے اور میاں یہ سمجھتے ہیں کہ میری بیوی بڑی پاک دامن ہے۔ ایسی ہی مشکل ماں باپ کو پیش آتی ہے۔ وہ غریب اپنی بیٹی کی عِصمت پر صریح جھوٹے الزام کی تردید میں اگر زبان کھولیں بھی تو بیٹی کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی۔ کہنے والے یہی کہیں گے کہ ماں باپ ہیں، اپنی بیٹی کی حمایت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہی چیز تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور اُمِّ رُومانؓ کو اندر ہی اندر غم سے گھلائے دے رہی تھی۔ ورنہ حقیقت میں کوئی شک ان کو لاحق نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطبے ہی میں صاف فرما دیا تھا کہ میں نے نہ اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں،

فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

---

اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔[۱۴] اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آلیتا۔ (ذرا غور تو کرو، اُس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جب کہ تمھاری ایک زبان سے دُوسری زبان اس جھُوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

---

جس کے متعلق یہ الزام لگایا جا رہا ہے۔

۱۴۔ ”اللہ کے نزدیک“ یعنی اللہ کے قانون میں، یا اللہ کے قانون کے مطابق۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو الزام بجائے خود جھوٹا تھا، اس کا جھوٹ ہونا اس بات پر مبنی نہ تھا کہ یہ لوگ گواہ نہیں لائے ہیں۔

اس جگہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہاں الزام کے غلط ہونے کی دلیل اور بنیاد محض گواہوں کی غیر موجودگی کو ٹھیرایا جا رہا ہے، اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی صرف اس وجہ سے اس کو صریح بہتان قرار دو کہ الزام لگانے والے چار گواہ نہیں لائے ہیں۔ یہ غلط فہمی اُس صورتِ واقعہ کو نگاہ میں نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جو فی الواقع وہاں پیش آئی تھی۔ الزام لگانے والوں نے الزام اس وجہ سے نہیں لگایا تھا کہ انھوں نے، یا ان میں سے کسی شخص نے وہ بات دیکھی تھی جو وہ زبان سے نکال رہے تھے، بلکہ صرف اس بنیاد پر اتنا بڑا الزام تصنیف کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہؓ قافلے سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوانؓ بعد میں ان کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قافلے میں لے آئے۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی بھی اس موقع پر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا اس طرح پیچھے رہ جانا، معاذ اللہ، کسی ساز باز کا نتیجہ تھا۔ ساز باز کرنے والے اس طریقے سے تو ساز باز نہیں کیا کرتے کہ سالارِ لشکر کی بیوی چپکے سے قافلے کے پیچھے ایک شخص کے ساتھ رہ جائے اور پھر وہی شخص اس کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دن دہاڑے، ٹھیک دوپہر کے وقت لیے ہوئے عَلانیہ لشکر کے پڑاؤ پر پہنچے۔ یہ صورتِ حال خود ہی ان دونوں کی معصومیت پر دلالت کر رہی تھی۔ اس حالت میں اگر الزام لگایا جا سکتا تھا تو صرف اِس بنیاد پر ہی لگایا جا سکتا

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ

کیوں نہ اسے سُنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ”ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سُبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔“ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمھیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم[15] ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے، وہ دُنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں[16]، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے[17]۔ اگر اللہ کا فضل اور

---

تھا کہ کہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی معاملہ دیکھا ہو۔ ورنہ قرائن، جن پر ظالموں نے الزام کی بِنا رکھی تھی، کسی شک وشبہ کی گنجایش نہ رکھتے تھے۔

۱۵ – اِن آیات سے، اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ ”مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا“ یہ قاعدۂ کُلِّیّہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تمام معاملات کی بنا حُسنِ ظن پر ہونی چاہیے، اور سُوءِ ظن صرف اُس حالت میں کیا جانا چاہیے جب کہ اس کے لیے کوئی ثبوتی وایجابی بنیاد ہو۔ اُصول یہ ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے، جب تک کہ اس کے مجرم ہونے یا اس پر جرم کا شبہ کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو۔ اور ہر شخص اپنی بات میں سچّا ہے جب تک کہ اس کے ساقط الاعتبار ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

۱۶ – موقع ومحل کے لحاظ سے تو آیت کا براہِ راست مفہُوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انھیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بداَخلاقی پھیلانے اور اُمّتِ مسلمہ کے اخلاق پر دَھبّا لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں، وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن آیت کے الفاظ فُحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اِطلاق عملاً بدکاری کے اڈّے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بداَخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اُکسانے والے قصوں، اشعار،

النصف ع ۱۰/۸

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے، ع (تو یہ چیز جو ابھی تمھارے اندر پھیلائی گئی تھی، بدترین نتائج دکھا دیتی)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فُحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔[18] مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔[19]

---

گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلبّ اور ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آ جاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں، دُنیا میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعتِ فُحش کے اِن تمام ذرائع و وسائل کا سَدِّباب کرے۔ اس کے قانونِ تعزیرات میں ان تمام افعال کو مُستلزِمِ سزا، قابلِ دست اندازیِ پولیس ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں پبلک کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

۱۷ – یعنی تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں، کتنے افراد کو متأثّر کرتے ہیں، اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے، انھیں پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ دراصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

۱۸ – یعنی شیطان تو تمھیں برائی کی نجاستوں میں آلودہ کرنے کے لیے اس طرح تُلا بیٹھا ہے کہ اگر اللہ اپنے

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مَقدِرَت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انھیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صِفَت یہ ہے کہ وہ غَفُور اور رحیم ہے۔[20]

---

فضل و کرم سے تم کو نیک و بد کی تمیز نہ سمجھائے اور تم کو اصلاح کی تعلیم و توفیق سے نہ نوازے تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے بل بُوتے پر پاک نہ ہو سکے۔

**۱۹ –** یعنی اللہ کی یہ مَشِیَّت کہ وہ کسے پاکیزگی بخشے، اندھا دُھند نہیں ہے بلکہ علم کی بنا پر ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس میں بھلائی کی طلب موجود ہے اور کون برائی کی رغبت رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنی خَلْوَتوں میں جو باتیں کرتا ہے، انھیں اللہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں بھی جو کچھ سوچا کرتا ہے، اللہ اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ اسی براہِ راست علم کی بنا پر اللہ فیصلہ کرتا ہے کہ کسے پاکیزگی بخشے اور کسے نہ بخشے۔

**۲۰ –** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مذکورۂ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرما دی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھالی کہ وہ آیندہ کے لیے مِسطَح بن اُثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، کیونکہ انھوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ اُن احسانات ہی کی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر اُن پر اور اُن کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس کو سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا: بلٰی واللّٰہ انا نحب ان تغفر لنا یا ربنا، ”واللہ! ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔“ چنانچہ آپ نے پھر مِسطَحؓ کی مدد شروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رِوایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ بعض اور صحابہؓ نے بھی کھالی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصّہ لیا ہے، ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔ اس آیت کے نُزول کے بعد اِن سب نے اپنے عہد سے رُجوع کر لیا۔ اس طرح وہ تلخی آناً فاناً دور ہو گئی جو اس فتنے نے پھیلا دی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کر لے جس میں بھلائی ہے، تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفّارہ ادا کرنا چاہیے

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَ

جولوگ پاک دامن، بے خبر[۲۱]، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بُھول نہ جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے

یا نہیں۔ فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کَفّارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفّارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے اِستدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کفّارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر وذٰلك کفارتہٗ۔ (جو شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، تو اسے وہی بات کرنی چاہیے جو بہتر ہے، اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفّارہ ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے (البقرہ، آیت ۲۲۵، المائدہ، آیت ۸۹)، جسے اس آیت نے نہ تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے۔ اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کے لیے تو ضرور فرمایا ہے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کفّارہ واجب نہیں ہے۔ رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھا لینے سے جو گناہ ہوتا ہے، وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے دُھل جاتا ہے۔ اس ارشاد کا مقصد کفّارۂ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے، چنانچہ دوسری حدیث اس کی توضیح کر دیتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہٖ (جس نے کسی بات کی قسم کھالی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفّارہ ادا کر دے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے، اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفّارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے، اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص، حاشیہ ۴۶)

**۲۱** – اصل میں لفظ غَافِلَاتِ استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹّے نہیں جانتیں، جن کے دل پاک ہیں، جنھیں کچھ خبر نہیں کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگا بیٹھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا اُن سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو ''موبقات'' (تباہ کُن) ہیں۔ اور طَبَرانی میں حضرت حُذَیفہؓ کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: قذف المحصنۃ یھدم عمل مأۃ سَنَۃ، ''ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے۔''

اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ يَوۡمَئِذٍ يُّوَفِّيۡهِمُ اللّٰهُ دِيۡنَهُمُ الۡحَقَّ وَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ الۡمُبِيۡنُ ﴿۲۵﴾ اَلۡخَبِيۡثٰتُ لِلۡخَبِيۡثِيۡنَ وَالۡخَبِيۡثُوۡنَ لِلۡخَبِيۡثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيۡنَ وَالطَّيِّبُوۡنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا يَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ﴿۲۶﴾ ع

ع ۳

اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔[۲۱ الف] اس دن اللہ وہ بدلہ انھیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا۔

خبیث عورتیں خبیث مَردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں،[۲۲] ان کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم ع

**۲۱، الف** – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۵۵، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۲۵۔

**۲۲** – اس آیت میں ایک اُصولی بات سمجھائی گئی ہے کہ خبیثوں کا جوڑ خبیثوں ہی سے لگتا ہے، اور پاکیزہ لوگ پاکیزہ لوگوں ہی سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک بدکار آدمی صرف ایک ہی برائی نہیں کیا کرتا ہے، کہ اور تو سب حیثیتوں سے وہ بالکل ٹھیک ہو مگر بس ایک بُرائی میں مبتلا ہو۔ اس کے تو اطوار، عادات، خصائل، ہر چیز میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں جو اس کی ایک بڑی برائی کو سہارا دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی میں یکایک کوئی ایک برائی کسی ازغیبی گولے کی طرح پھٹ پڑے، جس کی کوئی علامت اس کے چال چلن میں اور اس کے رنگ ڈھنگ میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تم ہر وقت انسانی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اب کس طرح تمھاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایک پاکیزہ انسان، جس کی ساری زندگی سے تم واقف ہو، کسی ایسی عورت سے نباہ کر لے اور برسوں نہایت محبّت کے ساتھ نباہ کیے چلا جاتا رہے جو زناکار ہو۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بدکار بھی ہو اور پھر اس کی رفتار، گفتار، انداز، اطوار، کسی چیز سے بھی اس کے برے لچھن ظاہر نہ ہوتے ہوں؟ یا ایک شخص پاکیزہ نفس اور بلند اخلاق بھی ہو اور پھر ایسی عورت سے خوش بھی رہے جس کے یہ لچھن ہوں؟ یہ بات یہاں اس لیے سمجھائی جا رہی ہے کہ آیندہ اگر کسی پر کوئی الزام لگایا جائے تو لوگ اندھوں کی طرح اسے بس سنتے ہی نہ مان لیا کریں، بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ کس پر الزام لگایا جا رہا ہے، کیا الزام لگایا جا رہا ہے، اور وہ کسی طرح وہاں چسپاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ بات لگتی ہوئی ہو تو آدمی ایک حد تک اسے مان سکتا ہے، یا کم از کم ممکن اور متوقع سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک انوکھی بات، جس کی صداقت کی تائید کرنے والے آثار

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ[۲۳]

کہیں نہ پائے جاتے ہوں، صرف اس لیے کیسے مان لی جائے گی کہ کسی احمق یا خبیث نے اسے منہ سے خارج کر دیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ بُری باتیں برے لوگوں کے لیے ہیں (یعنی وہ ان کے مستحق ہیں) اور بھلی باتیں بھلے لوگوں کے لیے ہیں، اور بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ باتیں ان پر چسپاں ہوں جو بدگو اشخاص ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بُرے اعمال بُرے ہی لوگوں کو سجتے ہیں اور نیک اعمال نیک ہی لوگوں کو سزاوار ہیں، نیک لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ بُرے اعمال ان پر چسپاں ہوں جو منسوب کرنے والے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بری باتیں بُرے ہی لوگوں کے کرنے کی ہیں اور بھلے لوگ بھلی باتیں ہی کیا کرتے ہیں، بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں کریں جیسی یہ افترا پرداز لوگ کر رہے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں ان سب تفسیروں کی گنجایش ہے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر پہلا مفہوم جو ذہن میں آتا ہے وہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور موقع و محل کے لحاظ سے بھی جو معنویت اُس میں ہے وہ ان دوسرے مفہومات میں نہیں ہے۔

**۲۳** – سورہ کے آغاز میں جو احکام دیے گئے تھے، وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں برائی رُونما ہو جائے تو اس کا تدارُک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دیے جا رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے برائیوں کی پیدایش ہی کو روک دیا جائے اور تمدُّن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے اُن اسباب کا سدِّ باب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رُونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ واقعۂ اِفک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشخیص میں زوجۂ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نُفُوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے، اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دِید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے، عورتوں کو ایک قریبی حلقے کے سوا غیر مَحرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے، قَحبہ گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے، مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مُجَرَّد نہ رہنے دیا جائے، اور لونڈی غلاموں تک کے تجرد کا مداوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی، اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مُجَرَّد رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے، اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، اُن کے کان، ان کی زبانیں، ان کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (scandal) میں پڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ

تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝٢٧ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ

گھر والوں کی رضا نہ لے لو[۲۴] اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔[۲۵] پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی

---

تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ شریعتِ الٰہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ اُن اسباب کا بھی خاتمہ کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اُس برائی میں مبتلا ہونے پر اُکساتے ہوں، یا اس کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسبابِ جرم، محرکاتِ جرم اور وسائل و ذرائعِ جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے، تاکہ آدمی کو اصل جرم کی عین سرحد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹہلتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (prosecutor) ہی نہیں ہے بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو برائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

**۲۴** — اصل میں لفظ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا استعمال ہوا ہے، جس کو عُموماً لوگوں نے حَتّٰى تَسْتَاْذِنُوْا کے معنٰی میں لے لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حَتّٰى تَسْتَاْذِنُوْا فرمایا جاتا تو آیت کے معنٰی یہ ہوتے کہ ”لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔“ اس طرزِ تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادّہ اُنس ہے جو اُردو زبان میں بھی اُسی معنٰی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عَرَبی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادّے سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اس کے معنٰی ہوں گے: اُنس معلوم کرنا، یا اپنے سے مانوس کرنا۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ”لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کر لو، یا ان کا اُنس معلوم نہ کر لو“، یعنی یہ معلوم نہ کر لو کہ تمھارا آنا صاحبِ خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ”اجازت لینے“ کے بجائے ”رضا لینے“ کے الفاظ سے کیا ہے، کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

**۲۵** — جاہلیّت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حییتم صَبَاحًا، حییتم مَسَاءً (صبح بخیر، شام بخیر) کہتے ہوئے بے تکلُّف ایک دوسرے کے گھر میں گُھس جاتے تھے، اور بسا اوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کی اصلاح کے لیے یہ اُصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیہ (privacy) کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیے میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلل انداز

ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے، انھیں ہم ذیل میں نمبروار بیان کرتے ہیں:

(۱) حضورؐ نے تخلیے کے اس حق کو صرف گھروں میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا، جس کی رُو سے دوسرے کے گھروں میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتّٰی کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثوبانؓ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا دخل البصر فلا اذن، "جب نگاہ داخل ہوگئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا؟" (ابوداؤد) حضرت ہُزَیل بن شُرَحْبِیْل کہتے ہیں: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا۔ حضورؐ نے اسے فرمایا: ھٰکذا عنك، فانما الاستیذان من النظر، "پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اسی لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے۔" (ابوداؤد) حضورؐ کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے، کیونکہ اُس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپؐ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے۔ (ابوداؤد) حضرت اَنَسؓ خادمِ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضورؐ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپؐ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے۔ (ابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار، "جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی، وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔" (ابوداؤد) صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لو ان امرأ اطلع علیك بغیر اذن فخذفته محصاۃ ففقأت عینه ما کان علیك من جناح، "اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں۔" اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے: من اطلع دار قوم بغیر اذنهم ففقؤا عینه فقد ھدرت عینه، "جس نے کسی کے گھر میں جھانکا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ مؤاخذہ نہیں۔" امام شافعیؒ نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حَنَفِیَہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جب کہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گُھس آئے اور گھر والوں کے روکنے پر وہ باز نہ آئے اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کش مکش اور مزاحمت میں اُس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عُضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ (احکام القرآن، جَصّاص، ج ۳، ص ۳۸۵)

(۲) فقہا نے نگاہ ہی کے حکم میں سَماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیے کے حق میں بے جا مداخلت ہے۔

(۳) اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی

اجازت طلب کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے، کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا: اتحب ان تراھا عریانۃ، ''کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟'' (ابنِ جَرِیر عن عطاء بن یَسار مُرسَلاً) عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے: علیکم ان تستاذنوا علٰی امھاتکم واخواتکم، ''اپنی ماں بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔'' (ابنِ کثیر) بلکہ ابنِ مسعودؓ تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ اُن کی بیوی زینب کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آرہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں۔ (ابنِ جَرِیر)

(۴) اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مُستثنٰی ہے کہ کسی کے گھر پر اچانک کوئی مصیبت آجائے، مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور گھس آئے۔ ایسے مواقع پر مدد کے لیے بلا اجازت جا سکتے ہیں۔

(۵) اوّل اوّل جب اِستیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا: أألج (کیا میں گھس آؤں؟) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی روضہ سے فرمایا: یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اُٹھ کر اسے بتا کہ یوں کہنا چاہیے: السلام علیکم أأدخل؟ (ابنِ جَرِیر، ابوداؤد) جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرتؐ کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے عرض کیا: ''میں ہوں۔'' آپؐ نے دو تین مرتبہ فرمایا: ''میں ہوں؟ میں ہوں؟'' یعنی اس ''میں ہوں'' سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو۔ (ابوداؤد) ایک صاحب کَلَدہ بن حَنْبل ایک کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئے اور سلام کے بغیر یونہی جا بیٹھے۔ آپؐ نے فرمایا: باہر جاؤ، اور ''السلام علیکم'' کہہ کر اندر آؤ۔ (ابوداؤد) استیذان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کرے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق رِوایَت ہے کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے: السلام علیکم یا رسول اللہ، ایدخل عمر۔ (ابوداؤد) اجازت لینے کے لیے حضورؐ نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا: اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد) یہی حضورؐ کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عُبادہ کے ہاں گئے اور ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت سعدؓ اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! میں آپؐ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا۔ (ابوداؤد، احمد) یہ تین مرتبہ پکارنا پے در پے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھیر ٹھیر کر پکارنا چاہیے، تاکہ صاحبِ خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

(۶) اجازت یا تو خود صاحبِ خانہ کی معتبر ہے، یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذمہ دار قسم کا فرد۔

وَ اِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ لَـيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ مَسۡكُوۡنَةٍ فِيۡهَا مَتَاعٌ لَّـكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكَ

جائے،[۲۶] اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے[۲۷] اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ البتہ تمھارے لیے اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمھارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو،[۲۸] تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اَے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں[۲۹] اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں،[۳۰] یہ

---

کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آجاؤ، تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

(۷) اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جم کر کھڑے ہو جانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ اِستیذان کے بعد صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

۲۶ – یعنی کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ صاحبِ خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر وہ کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کر دیتی کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

۲۷ – یعنی اس پر برا نہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشغولیت ملاقات میں مانع ہو تو معذرت کر دے۔ اِرۡجِعُوۡا (واپس ہو جاؤ) کے حکم کا فقہا نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھیر کر اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

۲۸ – اس سے مراد ہیں: ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دکانیں، مسافر خانے وغیرہ، جہاں لوگوں کے لیے داخلے

کی عام اجازت ہو۔

**۲۹** – اصل میں الفاظ ہیں: یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۔ غَضّ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور پست کرنے کے۔ غَضِّ بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہ نیچی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس حکم کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا، اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔ یہ مفہوم ''نظر بچانے'' سے ٹھیک ادا ہوتا ہے، یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو، اس سے نظر ہٹا لی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچی کرے یا کسی اور طرف اسے بچالے جائے۔ مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق و سباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے، وہ ہے مردوں کا عورتوں کو دیکھنا، یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا، یا فُحش مناظر پر نگاہ جمانا۔

کتاب اللہ کے اس حکم کی جو تشریح سنت نے کی ہے، اس کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرَم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زِنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے۔ لگاوٹ کی بات چیت زبان کا زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کا زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کا زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہو چکتی ہیں تب شرم گاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد) حضرت بُرَیْدَہؓ کی رِوایَت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یا علی لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولی ولیست لك الاٰخرة، ''اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری معاف نہیں۔'' (احمد، تِرْمِذی، ابوداؤد، دارمی) حضرت جریر بن عبداللہ بَجَلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو۔ (مسلم، احمد، تِرْمِذی، ابوداؤد، نَسائی) عبداللہؓ بن مسعود رِوایَت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان النظر سهم من سهام ابلیس مسموم، من ترکها مخافتی ابدلته ایمانا یجد حلاوته فی قلبه، ''نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا، میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (طَبَرانی) ابواُمامہؓ کی رِوایَت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ما من مسلم ینظر الی محاسن امرأة ثم یغض بصره الا اخلف اللّٰہ له عبادة یجد حلاوتها، ''جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حُسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔'' (مُسْنَدِ احمد) امام جعفر صادقؒ اپنے والد امام محمد باقرؒ سے اور وہ حضرت

جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی فضل بن عباسؓ (جو اس وقت ایک نوجوان لڑکے تھے) مَشعَرِ حرام سے واپسی کے وقت حضورؐ کے ساتھ اُونٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضلؓ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسری طرف پھیر دیا۔ (ابوداؤد) اسی حجۃ الوداع کا قصّہ ہے کہ قبیلۂ خَثْعَم کی ایک عورت راستے میں حضورؐ کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباسؓ نے اُس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

(۲) اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غَضِّ بصر کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال؟ یہ اِستِدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعے کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جب کہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے۔ اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رائج ہونے کے باوجود بہرحال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہٰذا محض غَضِّ بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مُستَلزِم ہے۔ اور واقعے کے اعتبار سے یہ اس لیے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا، اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعۂ اِفک کے متعلق حضرت عائشہؓ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے، اُس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صَفوانؓ بن مُعطَّل وہاں سے گزرا تو دُور سے کسی کو پڑے دیکھ کر اُدھر آ گیا۔ **فعرفنی حین راٰنی و کان قد راٰنی قبل الحجاب فاستیقظت باسترجاعه حین عرفنی فخمرت وجهی بجلبابی،** ''وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا، کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے پہچان کر جب اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانک لیا۔'' (بخاری، مسلم، احمد، ابنِ جَرِیر، سیرت ابنِ ہِشَام) ابوداؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُمِّ خَلّاد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر اس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بعض صحابہؓ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اس اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں: **ان ارزأ ابنی فلن ارزأ حیائی،** ''میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیا تو نہیں کھو دی۔'' ابوداؤد ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست دی۔ حضورؐ نے پوچھا: یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اُس نے عرض کیا: عورت ہی کا ہے۔ فرمایا: ''عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے

رنگ لیے ہوتے۔" رہے حج کے موقع کے وہ دو واقعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، تو وہ عہدِ نبویؐ میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ احرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالتِ احرام مکے کی طرف جا رہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں، اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں۔ (ابوداؤد، باب فی المحرمۃ تغطّی وجھھا)

(۳) غَضِّ بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو۔ اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ کی رِوایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم نے لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: انظر الیھا فانہ احری ان یُّؤدم بینکما، "اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تمھارے درمیان مُوافقت ہوگی۔" (احمد، تِرمذِی، نَسائی، ابنِ ماجہ، دارمی) ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انظر الیھا فان فی اعین الانصار شیئًا، "لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے۔" (مسلم، نَسائی، احمد) جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا خطب احدکم المرأۃ فَقَدَرَ اَن یریٰ منھا بعض ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل، "تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا خواستگار ہو تو حتی الامکان اُسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اُس کے ساتھ نکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو۔" (احمد، ابوداؤد) مُسنَدِ احمد میں ابو حُمَیدَہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فلا جناح علیہ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مُضَایقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی سے فقہا نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تفتیشِ جرائم کے سلسلے میں کسی مُشتبَہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا، یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

(۴) غَضِّ بصر کے حکم کا منشا یہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا تنظر المرأۃ الی عورۃ المرأۃ، "کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے، اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔" (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذِی) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: لا تنظر الی فخذ حی ولا میت، "کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو۔" (ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

**۳۰-** شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد محض ناجائز شہوت رانی سے پرہیز ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے پرہیز بھی ہے۔ مرد کے لیے ستر کے حُدود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائے ہیں۔ عورۃ الرجل ما بین سرتہ الی رکبتہ، "مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے۔" (دارقُطنی، بَیہقی)

اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا

اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر رہتا ہے۔

اور اَے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں[۳۱]، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں[۳۲]، اور[۳۳] اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں[۳۴] بجز اُس کے

اِس حصۂ جسم کو بیوی کے سوا کسی کے سامنے قصداً کھولنا حرام ہے۔ حضرت جَرْہَد اَسلَمیؓ، جو اصحابِ صُفّہ میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کُھلی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا: اما علمت ان الفخذ عورة، ''کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے؟'' (ترمذی، ابوداؤد، مؤطّا) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تُبرِز (یا لا تکشف) فخذك، ''اپنی ران کبھی نہ کھولو۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ) صرف دوسروں کے سامنے ہی نہیں، تنہائی میں بھی ننگا رہنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے: ایاکم والتعرّی فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الٰی اھلہ فاستحیوھم واکرموھم، ''خبردار! کبھی ننگے نہ رہو، کیونکہ تمھارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے)، سوائے اس وقت کے جب تم رفعِ حاجت کرتے ہو، یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو، لٰہذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام ملحوظ رکھو۔'' (ترمذی) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: احفظ عورتك الا من زوجتك او ما ملکت یمینك، ''اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو۔'' سائل نے پوچھا: اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا: فاللّٰه تبارك وتعالٰی احق ان یستحیا منه، ''تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔'' (ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ)

۳۱- عورتوں کے لیے بھی غَضِّ بصر کے احکام وہی ہیں جو مَردوں کے لیے ہیں، یعنی انھیں قصداً غیر مردوں کو نہ دیکھنا چاہیے، نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے، اور دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مرد کو دیکھنے کے معاملے میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت اُمّ سَلَمہؓ اور حضرت مَیمونہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ آ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں بیویوں سے فرمایا: احتجبا منه، ''ان سے پردہ کرو۔'' بیویوں نے عرض کیا: یا رسول اللّٰه الیس اعمٰی لا یبصرنا ولا یعرفنا، ''یا رسولؐ اللہ! کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے۔'' فرمایا: افعمیا وان انتما، الستما تبصرانه، ''کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟'' حضرت اُمِّ سَلَمہؓ تصریح کرتی ہیں کہ ذٰلك بعد ان امر بالحجاب، ''یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آ چکا تھا۔'' (احمد، ابوداؤد، ترمذی) اور اس کی تائید مُؤطّا کی یہ

روایت کرتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اُس سے پردہ کیا۔ کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں، یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا؟ جواب میں اُمُّ المومنین نے فرمایا: لٰکنی انظر الیه، ''میں تو اسے دیکھتی ہوں۔'' دوسری طرف ہمیں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ملتی ہے کہ ۷ ھ میں حبشیوں کا وفد مدینے آیا اور اس نے مسجدِ نبوی کے احاطے میں ایک تماشا کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا۔ (بخاری، مسلم، احمد) تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فاطمہؓ بنتِ قیس کو جب اُن کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدّت کہاں گزاریں۔ پہلے حضورؐ نے فرمایا: اُمِّ شریک انصاریہ کے ہاں رہو۔ پھر فرمایا: ''ان کے ہاں میرے صحابہ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مال دار اور فیّاض خاتون تھیں، بکثرت لوگ اُن کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں)، لہٰذا تم ابنِ اُمِّ مکتوم کے ہاں رہو، وہ اندھے آدمی ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکوگی۔'' (مسلم، ابوداؤد) اِن روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی مردوں کے عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں ہے۔ ایک مجلس میں آمنے سامنے بیٹھ کر دیکھنا ممنوع ہے۔ راستہ چلتے ہوئے یا دور سے کوئی جائز قسم کا کھیل تماشا دیکھتے ہوئے مردوں پر نگاہ پڑنا ممنوع نہیں ہے۔ اور کوئی حقیقی ضرورت پیش آ جائے تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دیکھنے میں مُضایقہ نہیں ہے۔ امام غزّالیؒ اور ابنِ حَجَر عَسقلانیؒ نے بھی رِوایات سے قریب قریب یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ شَوکانی نَیْلُ الاَوطار میں ابنِ حَجَر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''جواز کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں، اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مرد ان کو نہ دیکھیں، مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے۔'' (ج ۶ ص ۱۰۱) تاہم یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں اطمینان سے مردوں کو گھُوریں اور ان کے حُسن سے آنکھیں سینکیں۔

**۳۲** — یعنی ناجائز شہوت رانی سے بھی پرہیز کریں، اور اپنا ستر دوسروں کے سامنے کھولنے سے بھی۔ اس معاملے میں عورتوں کے لیے بھی وہی احکام ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ لیکن عورت کے ستر کے حُدود مردوں سے مختلف ہیں۔ نیز عورت کا ستر مردوں کے لیے الگ ہے اور عورتوں کے لیے الگ۔

مردوں کے لیے عورت کا ستر ہاتھ اور منہ کے سوا اُس کا پورا جسم ہے جسے شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد، حتّٰی کہ باپ اور بھائی کے سامنے بھی نہ کھلنا چاہیے، اور عورت کو ایسا باریک یا چست لباس بھی نہ پہننا چاہیے جس سے بدن اندر سے جھلکے یا بدن کی ساخت نمایاں ہو۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اُن کی بہن حضرت اسماؓ بنتِ ابی بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ حضورؐ نے فوراً منہ پھیر لیا اور فرمایا: یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح لھا ان یرٰی منھا الا ھٰذا وھٰذا واشار الٰی وجھه و کفیه، ''اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا اُس کے جسم کا کوئی حصّہ نظر آئے۔'' (ابوداؤد) اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابنِ جَریر نے حضرت عائشہؓ سے رِوایَت کیا ہے کہ ان کے ہاں ان کے اَخیافی بھائی عبداللہ بن الطُّفَیل کی صاحبزادی آئی ہوئی تھیں۔ رسولؐ اللہ گھر میں تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! یہ میری بھتیجی ہے۔

مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ وَلَا

جو خود ظاہر ہو جائے[۳۵]، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں[۳۶]۔ وہ اپنا

آپؐ نے فرمایا: اذا عرکت المرأۃ لم یحل لھا ان تظھر الا وجھھا والا مادون ھٰذا وقبض علٰی ذراع نفسہ وترك بین قبضتہ وبین الکف مثل قبضۃ اخرٰی، ''جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ ظاہر کرے اپنے منہ کے سوا اور اپنے ہاتھ کے سوا، اور ہاتھ کی حد آپؐ نے خود اپنی کلائی پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بتائی کہ آپؐ کی مٹھی اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی کی جگہ اور باقی تھی۔'' اس معاملے میں صرف اتنی رعایت ہے کہ اپنے مَحرَم رشتہ داروں (مثلاً باپ بھائی وغیرہ) کے سامنے عورت اپنے جسم کا اُتنا حصّہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جیسے آٹا گوندھتے ہوئے آستینیں اُوپر چڑھا لینا، یا گھر کا فرش دھوتے ہوئے پائینچے کچھ اُوپر کر لینا۔

اور عورت کے لیے عورت کے ستر کے حُدود وہی ہیں جو مرد کے لیے مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصّہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برہنہ رہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصّہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصّوں کا ڈھانکنا فرض نہیں ہے۔

**۳۳** – یہ بات نگاہ میں رہے کہ شریعتِ الٰہی عورتوں سے صرف اُتنا ہی مطالبہ نہیں کرتی جو مردوں سے اس نے کیا ہے، یعنی نظر بچانا اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، بلکہ وہ اُن سے کچھ اور مطالبے بھی کرتی ہے جو اس نے مردوں سے نہیں کیے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں عورت اور مرد یکساں نہیں ہیں۔

**۳۴** – ''بناؤ سنگھار'' ہم نے ''زینت'' کا ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے دوسرا لفظ آرایش بھی ہے۔ اس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے: خوش نما کپڑے، زیور، اور سر، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی مختلف آرایشیں جو بالعُموم عورتیں دُنیا میں کرتی ہیں، جن کے لیے موجودہ زمانے میں make up کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار کس کو نہ دکھایا جائے، اِس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

**۳۵** – اِس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مُبہَم بنا دیا ہے، ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے۔ پہلے فقرے میں ارشاد ہوا ہے کہ لَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ، ''وہ اپنی آرایش و زیبایش کو ظاہر نہ کریں۔'' اور دوسرے فقرے میں اِلَّا بول کر اس حکمِ نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ ہے مَا ظَهَرَ مِنۡهَا'' جو کچھ اس آرایش و زیبایش میں سے ظاہر ہو، یا ظاہر ہو جائے''۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمایش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اُڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا) یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہر حال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے، اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہر حال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اس پر خدا کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حسن بصریؒ، ابنِ سیرین اور ابراہیم نَخَعی نے بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے مَا ظَهَرَ مِنۡهَا

کا مطلب لیا ہے: ما یظھرہ الانسان علی العادۃ الجاریۃ (جسے عادتاً انسان ظاہر کرتا ہے)، اور پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرایشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منہ کو مسّی اور سرمے اور سُرخی پاؤڈر سے، اور اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی چھلے اور چوڑیوں اور کنگن وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہائے حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے۔ (احکام القرآن، جَصّاص، جلد ۳، صفحہ ۳۸۸ - ۳۸۹) لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ مَا ظَھَرَ کے معنیٰ مَا یُظْھِرُ عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ ''ظاہر ہونے'' اور ''ظاہر کرنے'' میں کھلا ہوا فرق ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر ''ظاہر کرنے'' سے روک کر ''ظاہر ہونے'' کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو ''ظاہر کرنے'' کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور اُن رِوایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں حکمِ حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں، اور حکمِ حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب، تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکامِ حجاب کی ہے۔

**۳۶** — زمانۂ جاہلیّت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں، جن کی گرہ جُوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کا ایک حصّہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینے کا بالائی حصّہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اور پیچھے دو دو تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں۔ (تفسیر کَشّاف، جلد ۲، صفحہ ۹۰۔ ابنِ کثیر، جلد ۳، صفحہ ۲۸۳ - ۲۸۴) اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹّا رائج کیا گیا، جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج کل کی صاحبزادیوں کی طرح بس اُسے بل دے کر گلے کا ہار بنا لیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ، سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں۔ اہلِ ایمان خواتین نے قرآن کا یہ حکم سنتے ہی فوراً جس طرح اس کی تعمیل کی، اس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سورۂ نور نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انھوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو آیت وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اُٹھی اور کسی نے اپنا کمر پٹّا کھول کر اور کسی نے چادر اُٹھا کر فوراً اس کا دوپٹّا بنایا اور اوڑھ لیا۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت جتنی عورتیں مسجدِ نبویؐ میں حاضر ہوئیں، سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور رِوایت میں حضرت عائشہؓ مزید تفصیل یہ بتاتی ہیں کہ عورتوں نے باریک کپڑے چھوڑ کر اپنے موٹے موٹے کپڑے چھانٹے اور ان کے دوپٹے بنائے۔ (ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۴۔ ابوداؤد، کتاب اللباس)

یہ بات کہ دوپٹا باریک کپڑے کا نہ ہونا چاہیے، ان احکام کے مزاج اور مقصد پر غور کرنے سے خود ہی آدمی کی

يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ

بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اِن لوگوں کے سامنے:[37] شوہر، باپ، شوہروں کے باپ[38]، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے[39]، بھائی[40]، بھائیوں کے بیٹے[41]،

سمجھ میں آ جاتی ہے۔ چنانچہ انصار کی خواتین نے حکم سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا منشا کس طرح کے کپڑے کا دوپٹا بنانے سے پورا ہوسکتا ہے۔ لیکن صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بھی صرف لوگوں کے فہم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ خود اس کی تصریح فرما دی۔ دِحیَہ کَلبیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک مَلمَل (قَبَاطی) آئی۔ آپؐ نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور فرمایا: ایک حصّہ پھاڑ کر اپنا کُرتا بنالو اور ایک حصّہ اپنی بیوی کو دوپٹّا بنانے کے لیے دے دو، مگر ان سے کہہ دینا کہ تجعل تحته ثوبًا لا یصفها "اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگالیں، تاکہ جسم کی ساخت اندر سے نہ جھلکے۔" (ابوداؤد، کتاب اللباس)

۳۷ – یعنی جس حلقے میں ایک عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے رہ سکتی ہے، وہ اِن لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہیں، خواہ وہ رشتے دار ہوں یا اجنبی، بہر حال ایک عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آئے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے فقرے میں جو حکم دیا گیا تھا، اس کا مطلب یہاں کھول دیا گیا ہے کہ اس محدود حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہوں، ان کے سامنے ایک عورت کو اپنی آرایش قصداً یا بے پروائی کے ساتھ خود نہ ظاہر کرنی چاہیے، البتہ جو ان کی کوشش کے باوجود یا ان کے ارادے کے بغیر ظاہر ہوجائے، یا جس کا چھپانا ممکن نہ ہو، وہ اللہ کے ہاں معاف ہے۔

۳۸ – اصل میں لفظ اٰبَآء استعمال ہوا ہے، جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا پَردادا اور نانا پَرنانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی دَدھیال اور نَنھیال، اور اپنے شوہر کی دَدھیال اور ننھیال کے اِن سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آ سکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خُسَر کے سامنے آ سکتی ہے۔

۳۹ – بیٹوں میں پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب شامل ہیں۔ اور اس معاملے میں سگے سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہارِ زینت کر سکتی ہے جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

۴۰ – "بھائیوں" میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے، بھائی سب شامل ہیں۔

۴۱ – بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہے، یعنی ان کے پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ

بہنوں کے بیٹے[۴۲]، اپنے میل جول کی عورتیں[۴۳]، اپنے مملوک[۴۴]، وہ زیردست مرد

**۴۲** – یہاں چونکہ رشتہ داروں کا حلقہ ختم ہو رہا ہے اور آگے غیر رشتہ دار لوگوں کا ذکر ہے، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے تین مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے، کیونکہ ان کو نہ سمجھنے سے متعدد اُلجھنیں واقع ہوتی ہیں:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اظہارِ زینت کی آزادی کو صرف اُن رشتہ داروں تک محدود سمجھتے ہیں جن کا نام یہاں لیا گیا ہے، باقی سب لوگوں کو، حتّٰی کہ سگے چچا اور سگے ماموں تک کو ان رشتہ داروں میں شمار کرتے ہیں جن سے پردہ کیا جانا چاہیے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سگے چچا اور ماموں تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو رضاعی چچا اور ماموں سے بھی پردہ کرنے کی حضرت عائشہؓ کو اجازت نہ دی۔ صِحاح ستہ اور مُسندِ احمد میں حضرت عائشہؓ کی اپنی روایت ہے کہ ابوالقُعَیس کے بھائی اَفلَح ان کے ہاں آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ چونکہ پردے کا حکم آ چکا تھا اس لیے حضرت عائشہؓ نے اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہلا کر بھیجا کہ تم تو میری بھتیجی ہو، کیونکہ میرے بھائی ابوالقُعَیس کی بیوی کا تم نے دودھ پیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو اس میں تأمل تھا کہ یہ رشتہ بھی ایسا ہے جس میں پردہ اٹھا دینا جائز ہو۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپؐ نے فرمایا کہ وہ تمھارے پاس آ سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اِس آیت کو اس معنٰی میں نہیں لیا ہے کہ اس میں جن جن رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے ان سے پردہ نہ ہو اور باقی سب سے ہو۔ بلکہ آپؐ نے اس سے یہ اُصول اخذ کیا ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے، وہ سب اِسی آیت کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً چچا، ماموں، داماد اور رضاعی رشتہ دار۔ تابعین میں سے حضرت حَسَن بصریؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور اسی کی تائید علامہ ابوبکر جَصّاص نے احکام القرآن میں فرمائی ہے۔ (ج ۳، ص ۳۹۰)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے اَبدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ نہ تو محرم رشتہ داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف ان کے سامنے اپنی زینت کے ساتھ آئیں، اور نہ بالکل اجنبیوں کے حکم میں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پردہ کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رَوِیّہ ہونا چاہیے، یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا تعیّن ہو نہیں سکتا۔ اس کے حُدود مختلف رشتہ داروں کے معاملے میں اُن کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط، اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہییں۔ اِس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرزِ عمل جو کچھ تھا، اس سے ہم کو یہی رہنمائی ملتی ہے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت اَسماءؓ بنتِ ابی بکر، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں، آپؐ کے سامنے ہوتی تھیں، اور آخر وقت تک آپؐ کے اور ان کے درمیان کم از کم چہرے اور ہاتھوں کی حد تک کوئی پردہ نہ تھا۔ حجۃ الوداع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے، اور اُس وقت بھی یہی حالت تھی۔ (مُلاحَظہ ہو: ابوداؤد، کتاب الحج، باب المحرم یؤدِّب غلامہٗ)

اسی طرح حضرت اُمّ ہانیؓ، جو ابوطالب کی صاحبزادی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن تھیں، آخر وقت تک حضورؐ کے سامنے ہوتی رہیں، اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انھوں نے آپؐ سے کبھی نہیں کیا۔ فتحِ مکہ کے موقع کا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتی ہیں جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ (مُلاحَظہ ہو: ابوداؤد، کتاب الصوم، بابٌ فی النیۃ فی الصوم والرخصۃ فیہ) دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ اپنے بیٹے فضل کو اور ربیعہ بن حارث بن عبدالمُطَّلِب (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی) اپنے بیٹے عبدالمُطَّلِب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم لوگ جوان ہوگئے ہو، تمھیں جب تک روزگار نہ ملے، تمھاری شادیاں نہیں ہوسکتیں، لہٰذا تم رسولؐ اللہ کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔ یہ دونوں حضرت زینبؓ کے مکان پر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینبؓ فضلؓ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اور عبدالمُطَّلِب بن ربیعہ کے والد سے بھی ان کا وہی رشتہ ہے جو فضلؓ سے۔ لیکن وہ ان دونوں کے سامنے نہیں ہوتیں اور حضورؐ کی موجودگی میں ان کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کرتی ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الخَراج) اِن دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو مسئلے کی صورت وہی کچھ سمجھ میں آتی ہے جو اُوپر ہم بیان کر آئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں رشتے میں شبہ پڑ جائے، وہاں مُحَرَّم رشتہ دار سے بھی احتیاطاً پردہ کرنا چاہیے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضرت سَودَہؓ اُمُّ المومنین کا ایک بھائی لونڈی زادہ تھا۔ (یعنی ان کے باپ کی لونڈی کے بطن سے تھا)۔ اس کے متعلق حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کو ان کے بھائی عُتبہ نے وصیت کی کہ اس لڑکے کو اپنا بھتیجا سمجھ کر اس کی سرپرستی کرنا، کیونکہ وہ دراصل میرے نُطفے سے ہے۔ یہ مُقدّمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے حضرت سعدؓ کا دعویٰ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ ''بیٹا اس کا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، رہا زانی، تو اس کے حصے میں کنکر پتھر''، لیکن ساتھ ہی آپؐ نے حضرت سَودَہؓ سے فرمایا کہ اس لڑکے سے پردہ کرنا (احتجبی منه)، کیونکہ یہ اطمینان نہ رہا تھا کہ وہ واقعی ان کا بھائی ہے۔

۴۳– اصل میں لفظ نِسَآىِٕهِنَّ استعمال ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ہے: ''ان کی عورتیں''۔ اس سے کون عورتیں مراد ہیں، یہ بحث تو بعد کی ہے۔ سب سے پہلے جو بات قابلِ غور اور قابلِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ محض ''عورتوں'' (النِّسَآء) کا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے مسلمان عورت کے لیے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہارِ زینت کرنا جائز ہو جاتا، بلکہ نِسَآىِٕهِنَّ کہہ کر عورتوں کے ساتھ اُس کی آزادی کو بہرحال ایک خاص دائرے تک محدود کر دیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ دائرہ کوئی سا ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کون سا دائرہ ہے، اور وہ کون عورتیں ہیں جن پر لفظ نِسَآىِٕهِنَّ کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں فقہا اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذِمّی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔ ابنِ عباسؓ، مُجاہد اور ابن جُرَیج کی یہی رائے ہے، اور یہ لوگ اپنی تائید میں یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعُبَیدہؓ کو لکھا: ''میں نے سنا ہے مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں۔ حالانکہ جو عورت اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہو،

اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس کے جسم پر اس کے اہلِ ملّت کے سوا کسی اَور کی نظر پڑے۔" یہ خط جب حضرت ابوعُبَیدہؓ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "خدایا! جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے اِن حماموں میں جائے، اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے۔" (ابنِ جَرِیر، بَیْہَقی، ابنِ کثیر)

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازیؒ کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا تو پھر نِسَآئِهِنَّ کہنے کا کیا مطلب؟ اس صورت میں تو محض النِّسَآءِ کہنا چاہیے تھا۔

تیسری رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں، اُن کی جانی بُوجھی عورتیں، ان سے تعلّقات رکھنے والی اور ان کے کام کاج میں حصّہ لینے والی عورتیں مراد ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اور مقصود اُن عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں کہ ان کے اَخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو، یا جن کے ظاہری حالات مُشتبَہ ہوں اور ان پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔ اس رائے کی تائید اُن صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مُطہّرات کے پاس ذِمّی عورتوں کی حاضری کا ذکر آتا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا، وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں، ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں، خواہ "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے، کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کُن نہیں ہے۔ رہیں اَن جانی عورتیں، جن کی حالت معلوم نہیں ہے، تو ان سے ملاقات کی حد ہمارے نزدیک وہی ہے جو غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے آزادی کی زیادہ سے زیادہ حد ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ عورت صرف منہ اور ہاتھ ان کے سامنے کھولے، باقی اپنا سارا جسم اور آرایش چھپا کر رکھے۔

۴۴ — اِس حکم کا مطلب سمجھنے میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ایک گروہ اس سے مراد صرف وہ لونڈیاں لیتا ہے جو کسی عورت کی مِلک میں ہوں۔ ان حضرات کے نزدیک ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لونڈی خواہ مشرکہ ہو یا اہلِ کتاب میں سے، مسلمان مالکہ اس کے سامنے تو اظہارِ زینت کر سکتی ہے مگر غلام، چاہے وہ عورت کا اپنا مملوک ہی کیوں نہ ہو، پردے کے معاملے میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی آزاد اجنبی مرد کی ہے۔ یہ عبداللہؓ بن مسعود، مجاہد، حسن بصری، ابنِ سیرین، سعید بن مُسَیَّب، طاؤس اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے، اور ایک قول امام شافعیؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ اِن بزرگوں کا اِستدلال یہ ہے کہ غلام کے لیے اُس کی مالکہ محرم نہیں ہے۔ اگر وہ آزاد ہو جائے تو اپنی اسی سابق مالکہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ لٰہذا محض غلامی اس امر کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہی آزادی برتے جس کی اجازت محرم مردوں کے سامنے برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں، جو لونڈی اور غلام، دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، پھر اسے لونڈیوں کے لیے خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟

غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى

جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں[۴۵]، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف

اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر موقع و محل ان کا مفہوم لونڈیوں کے لیے خاص کر رہا ہے۔ پہلے نِسَآىِٕهِنَّ فرمایا، پھر مَامَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ ارشاد ہوا۔ نِسَآىِٕهِنَّ کے الفاظ سن کر عام آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کسی عورت کی ملنے جُلنے والی یا رشتہ دار ہوں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی کہ شاید لونڈیاں اس میں شامل نہ ہوں۔ اس لیے مَامَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ کہہ کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ آزاد عورتوں کی طرح لونڈیوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس اجازت میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں۔ یہ حضرت عائشہؓ اور اُمّ ِسَلَمَہؓ اور بعض ائمۂ اہلِ بیت کا مذہب ہے، اور امام شافعیؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ ان کا اِستدلال صرف لفظ مَامَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ کے عُموم ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ سنت سے بھی اپنی تائید میں شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام عبداللہ بن مسعدہ الفَزَارِی کو لیے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے، اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا: لیس علیكِ باسٌ، انما هو ابوك وغلامك ''کوئی حرج نہیں، یہاں بس تمھارا باپ ہے اور تمھارا غلام۔'' (ابوداؤد، احمد، بَیْہَقی بروایتِ اَنَسؓ بن مالک۔ ابنِ عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ غلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو دے دیا تھا، انھوں نے اسے پرورش کیا اور پھر آزاد کر دیا، مگر اس احسان کا جو بدلہ اس نے دیا، وہ یہ تھا کہ جنگِ صِفّین کے زمانے میں وہ حضرت علیؓ کا بدترین دشمن اور امیرِ معاویہؓ کا پرجوش حامی تھا)۔ اسی طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اذا کان لاحداکن مکاتب وکان له مایؤدی فلتحتجب منه، ''جب تم میں سے کوئی اپنے غلام سے مُکاتَبَت کرے اور وہ مالِ کتابت ادا کرنے کی مَقدِرَت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے غلام سے پردہ کرے''۔ (ابوداؤد، تِرمِذی، ابنِ ماجہ، بروایتِ اُمّ ِسَلَمَہؓ)

۴۵ – اصل میں التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ کے الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ہوگا: ''مردوں میں سے وہ مرد جو تابع ہوں خواہش نہ رکھنے والے۔'' ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محرم مردوں کے سوا دوسرے کسی مرد کے سامنے ایک مسلمان عورت صرف اُس صورت میں اظہارِ زینت کرسکتی ہے جب کہ اس میں دو صفات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ تابع، یعنی زیردست اور ماتحت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خواہش نہ رکھنے والا ہو، یعنی اپنی عمر یا جسمانی عَدَمِ اہلیّت، یا عقلی کمزوری، یا فَقر و مَسکَنت، یا زیردستی و محکومی کی بنا پر جس میں یہ طاقت یا جراٴت نہ ہو کہ صاحبِ خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کے متعلق کوئی بری نیّت دل میں لاسکے۔ اس حکم کو جو شخص بھی فرماں برداری کی نیت سے، نہ کہ نافرمانی کی گنجایشیں ڈھونڈنے کی نیت سے، پڑھے گا، وہ اوّل نظر ہی میں محسوس کرلے گا کہ آج کل کے بیرے،

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ

نہ ہوئے ہوں[46]۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے[47]۔

خانسامے، شوفر اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہرحال اس تعریف میں نہیں آتے۔ مفسرین اور فقہا نے اس کی جو تشریحات کی ہیں، ان پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اہلِ علم ان الفاظ کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں:

ابنِ عباسؓ: اس سے مراد وہ سیدھا سادھا بُدّھو (مُغَفَّل) آدمی ہے جو عورتوں سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

قَتَادَہؒ: ایسا دست نگر آدمی جو پیٹ کی روٹی پالنے کے لیے تمھارے ساتھ لگا رہے۔

مجاہد: اَبلَہ، جو روٹی چاہتا ہے اور عورتوں کا طالب نہیں ہے۔

شَعْبی: وہ جو صاحبِ خانہ کا تابع و دست نگر ہو اور جس کی اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ عورتوں پر نگاہ ڈال سکے۔

ابنِ زید: وہ جو کسی خاندان کے ساتھ لگا رہے، حتّٰی کہ گویا اسی گھر کا ایک فرد بن گیا ہو اور اسی گھر میں پلا بڑھا ہو۔ جو گھر والوں کی عورتوں پر نگاہ نہ رکھتا ہو، نہ اس کی ہمّت ہی کر سکتا ہو۔ وہ ان کے ساتھ اس لیے لگا رہتا ہو کہ ان سے اس کو روٹی ملتی ہے۔

طاؤس اور زُہری: بے وقوف آدمی جس میں نہ عورتوں کی طرف رغبت ہو اور نہ اس کی ہمّت۔

(ابنِ جَرِیر، ج ۱۸، ص ۹۵-۹۶۔ ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۵)

ان تشریحات سے بھی زیادہ واضح تشریح وہ واقعہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آیا تھا اور جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نَسائی اور احمد وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہؓ اور اُمّ سَلَمہؓ سے رِوایت کیا ہے۔ مدینۂ طیّبہ میں ایک مُخَنَّث تھا جسے ازواجِ مطہراتؓ اور دوسری خواتین غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ میں شمار کر کے اپنے ہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپؐ نے اس کو حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے بھائی عبداللہؓ بن ابی اُمَیّہ سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہو جائے تو غَیلان ثَقَفی کی بیٹی بادِیَہ کو حاصل کیے بغیر نہ رہنا۔ پھر اُس نے بادِیَہ کے حُسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے پوشیدہ اعضا تک کی صفت بیان کر ڈالی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا: ”خدا کے دشمن! تُو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں۔“ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آیندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپؐ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مُخَنَّثوں کو بھی گھروں میں گھُسنے سے منع فرما دیا، کیونکہ ان کو مُخَنَّث سمجھ کر عورتیں ان سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے لائق نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صِنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾

اَے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو[48]، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے[49]۔

سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہرحال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

۴۶ – یعنی جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تعریف زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس کی عمر تک کے لڑکوں پر صادق آ سکتی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ نابالغ ہوں، مگر ان میں صنفی احساسات بیدار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

۴۷ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو صرف زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا ہے کہ نگاہ کے سوا دوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اُس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہارِ زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ ولکن لیخرجن وھن تفلات، ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، مگر وہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔'' (ابوداؤد، احمد) اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ انھوں نے اسے روک کر پوچھا: ''اے خدائے جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آ رہی ہے؟'' اس نے کہا: ہاں۔ بولے: ''میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے، اس کی نماز اُس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسلِ جنابت نہ کر لے۔'' (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، احمد، نَسائی) ابوموسیٰ اَشعَریؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا استعطرت المرأۃ فمرت علی القوم لیجدوا ریحھا فھی کذا و کذا قال قولا شدیدا، ''جو عورت عِطر لگا کر راستے سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے، آپؐ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔'' (ترمذی، ابوداؤد، نَسائی) آپؐ کی ہدایت یہ تھی کہ عورتوں کو وہ خوشبو استعمال کرنی چاہیے جس کا رنگ تیز ہو اور بُو ہلکی ہو۔ (ابوداؤد)

اسی طرح آپؐ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ عورتیں بلاضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ ضرورت پڑنے پر بات کرنے کی اجازت تو خود قرآن میں دی گئی ہے، اور لوگوں کو دینی مسائل خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ بتایا کرتی تھیں۔ لیکن جہاں اس کی نہ ضرورت ہو اور نہ کوئی دینی یا اخلاقی فائدہ، وہاں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا ہے کہ عورتیں اپنی آواز غیر مردوں کو سنائیں۔ چنانچہ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر امام کو مُتنبِّہ کریں۔ التسبیح للرجال والتصفیق للنساء۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ)

۴۸ – یعنی اُن لغزشوں اور غلطیوں سے توبہ کرو جو اس معاملے میں اب تک کرتے رہے ہو، اور آیندہ کے لیے

اپنے طرزِ عمل کی اصلاح اُن ہدایات کے مطابق کرلو جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہیں۔

۴۹ – اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن دوسری اصلاحات کا بھی ایک خلاصہ دے دیا جائے جو اِن احکام کے نُزول کے بعد قرآن کی روح کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں رائج فرمائیں:

(۱) آپؐ نے محرم رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں دوسرے لوگوں کو (خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) کسی عورت سے تنہا ملنے اور اس کے پاس تنہا بیٹھنے سے منع فرما دیا۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم، ''جن عورتوں کے شوہر باہر گئے ہوئے ہوں ان کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تم میں سے ایک شخص کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔'' (ترمذی)۔ انھی حضرت جابرؓ کی دوسری روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یخلون بامرأۃ لیس معھا ذو محرم منھا فان ثالثھما الشیطان، ''جو شخص اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتا ہو، وہ کبھی کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی مَحْرَم نہ ہو، کیونکہ تیسرا اس وقت شیطان ہوتا ہے۔'' (احمد) قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور روایت امام احمدؒ نے عامر بن رَبیعہ سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں حضورؐ کی اپنی احتیاط کا یہ عالَم تھا کہ ایک دفعہ رات کے وقت آپؐ حضرت صَفِیہؓ کے ساتھ اُن کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں دو انصاری پاس سے گزرے۔ آپؐ نے ان کو روک کر ان سے فرمایا: یہ میرے ساتھ میری بیوی صَفِیہؓ ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: سبحان اللہ! یا رسولؐ اللہ! بھلا آپ کے متعلق بھی کوئی بدگمانی ہوسکتی ہے؟ فرمایا: شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہیں وہ تمھارے دل میں کوئی برا گمان نہ ڈال دے۔ (ابوداؤد، کتاب الصوم)

(۲) آپؐ نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو لگے۔ چنانچہ آپؐ مردوں سے بیعت تو ہاتھ میں ہاتھ لے کر کرتے تھے، لیکن عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ آپؐ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی غیر عورت کے جسم کو نہیں لگا۔ آپؐ عورت سے صرف زبانی عہد لیتے تھے، اور جب وہ عہد کر چکتی تھی تو فرماتے: جاؤ بس تمھاری بیعت ہوگئی۔'' (ابوداؤد، کتاب الخَراج)

(۳) آپؐ نے عورت کو مَحْرَم کے بغیر تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ بخاری و مسلم میں ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: لا یخلون رجل بامرأۃ الا ومعھا ذومحرم، ولا تسافر المرأۃ الا مع ذی محرم، ''کوئی مرد کسی عورت سے خَلْوَت میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم نہ ہو، اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا کوئی محرم اس کے ساتھ نہ ہو۔'' ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کیا: میری بیوی حج کو جارہی ہے اور میرا نام فُلاں مہم پر جانے والوں میں لکھا جا چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فانطلق فحج مع امرأتك، ''اچھا، تو تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلے جاؤ۔'' اس مضمون کی متعدِّد احادیث ابنِ عمر، ابوسعید خُدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے معتبر کُتُبِ حدیث میں مروی ہیں جن میں صرف مدّتِ سفر یا مَسافتِ سفر کے اعتبار سے اختلافِ بیان ہے، مگر اس امر میں اتفاق ہے کہ کسی مومن عورت کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کو مانتی ہو، محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں ہے۔ ان میں سے کسی حدیث میں ۱۲ میل یا اس سے

زیادہ کے سفر پر پابندی کا ذکر ہے، کسی میں ایک دن، کسی میں ایک شب و روز، کسی میں دو دن اور کسی میں تین دن کی حد بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان احادیث کو نہ تو ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے یہی ضروری ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک رِوایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اُس حد کو قانونی مقدار قرار دینے کی کوشش کریں جو اس روایت میں بیان ہوئی ہو۔ اس لیے کہ اِس اختلاف کی یہ معقول وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ مختلف مواقع پر جیسی صورتِ معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوئی ہو، اسی کے لحاظ سے آپؐ نے حکم بیان فرمایا ہو۔ مثلاً کوئی عورت تین دن کی مَسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے محرم کے بغیر جانے سے منع فرمایا ہو، اور کوئی ایک دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے بھی روک دیا ہو۔ اس میں مختلف سائلوں کے الگ الگ حالات اور ہر ایک کو آپؐ کے مختلف جوابات اصل چیز نہیں ہیں، بلکہ اصل چیز وہ قاعدہ ہے جو اُوپر ابنِ عباسؓ والی روایت میں ارشاد ہوا ہے، یعنی سفر، جسے عرفِ عام میں سفر کہا جاتا ہے، محرم کے بغیر کسی عورت کو نہ کرنا چاہیے۔

(۴) آپؐ نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو روکنے کی عملاً بھی کوشش فرمائی اور قولاً بھی اس سے منع فرمایا۔ اسلامی زندگی میں جمعہ اور جماعت کی جو اہمیت ہے، کسی صاحبِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ جمعہ کو اللہ نے خود فرض کیا ہے، اور نمازِ باجماعت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر مسجد میں حاضر نہ ہو اور اپنے گھر میں نماز پڑھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق اس کی نماز مقبول ہی نہیں ہوتی۔ (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دارقُطنی، حاکم بروایت ابنِ عباسؓ) لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جمعے کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ (ابوداؤد بروایت اُمّ عَطِیہؓ، دارقُطنی و بَیْہقی بروایتِ جابرؓ، ابوداؤد و حاکم بروایتِ طارقؓ بن شہاب) اور نمازِ باجماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ ابنِ عمرؓ اور ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ، ”اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔“ (ابوداؤد) دوسری روایات ابنِ عمرؓ سے اِن الفاظ اور ان سے ملتے جُلتے الفاظ میں ہیں: ائذنوا للنساء الی المساجد باللیل، ”عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو۔“ (بخاری، مسلم، ترمِذی، نَسائی، ابوداؤد) اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے: لا تمنعوا نساء کم المساجد و بیوتھن خیر لھن، ”اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگر چہ ان کے گھر اُن کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔“ (احمد، ابوداؤد) اُمِّ حُمَیْد ساعِدِیَّہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا: ”تمھارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمھارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلّے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمھارا اپنے محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔“ (احمد، طَبَرانی) قریب قریب اسی مضمون کی روایت ابوداؤد میں عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے، اور حضرت اُمِّ سَلَمَہؓ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، ”عورتوں کے لیے بہترین مسجد ان کے گھروں کے اندرونی حصّے ہیں۔“ (احمد، طَبَرانی) لیکن حضرت عائشہؓ دورِ بنی اُمیَّہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں: ”اگر نبیؐ

عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جو اَب ہیں تو اُن کا مسجدوں میں آنا اُسی طرح بند فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا۔'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد) مسجدِ نبویؐ میں حضورؐ نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ مخصوص کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ اپنے دورِ حکومت میں مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت مُمانَعت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد، باب اعتزال النساء فی المساجد اور باب ماجاء فی خُروج النساء الی المساجد) جماعت میں عورتوں کی صفیں مردوں سے پیچھے رکھی جاتی تھیں اور نماز کے خاتمے پر حضورؐ سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے، تاکہ مردوں کے اُٹھنے سے پہلے عورتیں اُٹھ کر چلی جائیں۔ (احمد و بخاری بروایتِ اُمّ سَلَمَہؓ) آپؐ کا ارشاد تھا کہ مردوں کی بہترین صف سب سے آگے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے پیچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صف۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے پیچھے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے آگے کی (یعنی مردوں سے قریب کی) صف ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمِذی، نَسائی، احمد) عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں مگر ان کی جگہ مردوں سے الگ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے۔ (ابوداؤد بروایتِ جابرؓ بن عبداللہ، بخاری و مسلم بروایتِ ابنِ عباسؓ) ایک مرتبہ مسجدِ نبویؐ کے باہر آنحضرتؐ نے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپؐ نے عورتوں سے فرمایا: استاخرن فانہ لیس لکن ان تحتضن الطریق، علیکن بحافات الطریق، ''ٹھیر جاؤ، تمھارے لیے سڑک کے بیچ میں چلنا دُرست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔'' یہ ارشاد سنتے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ (ابوداؤد) ان احکام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجلس اسلام کے مزاج سے کیسی سخت مُغایرت رکھتی ہے۔ جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی دونوں صِنفوں کو خَلَط مَلَط نہیں ہونے دیتا، اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور جلسوں میں اِسی اختلاط کو جائز رکھے گا؟

(۵) عورتوں کو اعتدال کے ساتھ بناؤ سنگھار کرنے کی آپؐ نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بسا اوقات خود اس کی ہدایت فرمائی ہے، مگر اس میں حد سے گزر جانے کو بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اُس زمانے میں جس قسم کے بناؤ سنگھار عرب کی عورتوں میں رائج تھے، اُن میں سے حسبِ ذیل چیزوں کو آپؐ نے قابلِ لعنت اور سببِ ہلاکتِ اقوام قرار دیا: اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا کر ان کو زیادہ لمبا اور گھنا دِکھانے کی کوشش کرنا۔ جسم کے مختلف حصوں کو گُودنا اور مصنوعی تِل بنانا۔ بال اُکھاڑ اُکھاڑ کر بھویں خاص وضع کی بنانا اور روئیں نوچ نوچ کر منہ صاف کرنا، دانتوں کو گِھس گِھس کر باریک بنانا، یا دانتوں کے درمیان مصنوعی چھِنیاں پیدا کرنا۔ زَعفران یا وَرس وغیرہ کے مصنوعی اُبٹنے مل کر چہرے پر مصنوعی رنگ پیدا کرنا۔ یہ احکام صِحاح سِتّہ اور مُسنَدِ احمد میں حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ بنتِ ابی بکر، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور امیر معاویہؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہیں۔

اللہ اور رسولؐ کی ان صاف صاف ہدایات کو دیکھ لینے کے بعد ایک مومن انسان کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی، اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو اُن اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سَدِّباب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسولؐ نے سنت میں اس قدر تفصیلی احکام دیے ہیں۔ یا پھر اگر وہ

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَ الصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَ اِمَآئِكُمۡ ؕ

تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں[50] اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں[51]، ان کے نکاح کر دو۔[52]

اپنے نفس کی کمزوری کے باعث اِن کی یا اِن میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ مانے، اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے گناہ کو صواب بنانے کی کوشش نہ کرے۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر جو لوگ قرآن و سنت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر انھی کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور عَلانیہ دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردے کا حکم موجود ہی نہیں ہے، وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھٹائی کا اور اضافہ کر لیتے ہیں، جس کی قدر نہ دُنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے اس کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں تو منافقوں سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا اور رسولؐ کے ان احکام کو غلط اور اُن طریقوں کو صحیح و برحق سمجھتے ہیں جو انھوں نے غیر مسلم قوموں سے سیکھے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اِس کے بعد بھی اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر اسلام اور کفر کے الفاظ قطعاً بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نام بدل دیتے اور عَلانیہ اسلام سے نکل جاتے تو ہم کم از کم ان کی اَخلاقی جرأت کا اعتراف کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دُنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اس سیرت و اَخلاق کے لوگوں سے کوئی جَعل سازی، کوئی فریب، کوئی دغا بازی اور کوئی خیانت بھی خلافِ توقع نہیں ہے۔

۵۰ – اصل میں لفظ اَیَامٰی استعمال ہوا ہے، جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ اَیَامٰی جمع ہے اَیِّم کی، اور اَیِّم ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مُجرّد کیا ہے۔

۵۱ – یعنی جن کا رَوِیّہ تمھارے ساتھ بھی اچھا ہو، اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ اِزدِواجی زندگی نباہ لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یا لونڈی کا رَوِیّہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکے گا، اُس کا نکاح کر دینے کی ذمّہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے فرد کی زندگی کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذمّہ داری درحقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعۂ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ ناکح اور منکوح کی اپنی ہی رضامندی سے ہوتا ہے۔ لیکن غلام یا لونڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذمّہ داری اس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر جان بُوجھ کر کسی غریب کو ایک بدمزاج اور بدسرِشت آدمی کے ساتھ بندھوا دے تو اس کا سارا وبال اُسی کے سر ہو گا۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے گا[۵۳]، اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انھیں چاہیے کہ عِفَّت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے[۵۴]۔

۵۲ – بظاہر یہاں صیغۂ امر دیکھ کر علما کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود بتا رہی ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نکاح کر دینا دوسروں پر واجب کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر کس کا کس سے نکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بالفرض اگر واجب ہو بھی تو خود اُس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نکاح پیشِ نظر ہے؟ کیا دوسرے لوگ جہاں بھی اس کا نکاح کرنا چاہیں، اسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اس پر فرض ہے تو گویا اس کے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں۔ اور اگر اسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے، وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سبُک دوش ہوں؟ انھی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جُمہور فقہا نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں بلکہ مندوب قرار دیتا ہے، یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بِن بیاہے نہ بیٹھے رہیں۔ خاندان والے، دوست، ہمسایے، سب اس معاملے میں دلچسپی لیں، اور جس کا کوئی نہ ہو اس کو حکومت اس کام میں مدد دے۔

۵۳ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نکاح ہو جائے گا اللہ اس کو مال دار بنا دے گا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے۔ اور نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کُشایش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ تھوڑی آمدنی بھی ہو تو اللہ کے بھروسے پر شادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات دُرست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آ جاتے ہیں۔ ذمّہ داریاں سر پر آ جانے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات بُرے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں، اور بُرے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ

اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مُکاتَبت کی درخواست کریں[55] ان سے مکاتبت کر لو[56] اگر تمھیں

۵۴ – ان آیات کی بہترین تفسیر وہ احادیث ہیں جو اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: یا معشر الشباب، من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء، ''نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اسے کر لینی چاہیے، کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔'' (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ثلثۃ حق علی اللہ عونھم، الناکح یرید العفاف، والمکاتب یرید الاداء، والغازی فی سبیل اللہ، ''تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذمے ہے: ایک وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے۔ دوسرے وہ مُکاتَب جو مالِ کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے۔ تیسرے وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔'' (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد۔ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، آیت ۲۵)

۵۵ – مُکاتَبت کے لفظی معنٰی تو ہیں ''لکھا پڑھی''، مگر اصطلاح میں یہ لفظ اِس معنٰی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیش کش کرے اور جب آقا اسے قبول کر لے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔ آقا کے لیے کوئی خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہو جائیں۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بے جا رکاوٹیں ڈالے۔ وہ اس کو مالِ کتابت فراہم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دے گا اور مدّتِ مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمّے کی رقم یا خدمت انجام دے دے، وہ اس کو آزاد کر دے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مُکاتَبت کی اور مدّتِ مقررہ سے پہلے ہی مالِ کتابت فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سال بہ سال اور ماہ بہ ماہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے فرمایا: یہ رقم بیت المال میں داخل کر دے اور جا، تُو آزاد ہے۔ پھر مالکہ کو کہلا بھیجا کہ تیری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے، اب تُو چاہے تو یک مشت لے لے ورنہ ہم تجھے سال بہ سال اور ماہ بہ ماہ دیتے رہیں گے۔ (دارقطنی بروایتِ ابوسعید مقبُری)

۵۶ – اس آیت کا مطلب فقہا کے ایک گروہ نے یہ لیا ہے کہ جب کوئی لونڈی یا غلام مُکاتَبت کی درخواست کرے تو آقا پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ یہ عطاء، عَمرْو بن دینار، ابنِ سِیرین، مَسْرُوق، ضَحّاک، عِکْرِمہ، ظاہریہ اور ابنِ جَرِیر طَبَری کا مسلک ہے اور امام شافعیؒ بھی پہلے اسی کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب اور مندوب ہے۔ اس گروہ میں شَعْبِی، مُقاتِل بن حَیّان، حسن بصری، عبدالرحمٰن بن زید، سُفیان ثَوری، ابوحنیفہ اور مالک بن اَنَس جیسے

عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ‌ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ

معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے[57]، اور ان کو اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔[58]

بزرگ شامل ہیں، اور آخر میں امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ پہلے گروہ کے مسلک کی تائید دو چیزیں کرتی ہیں: ایک یہ کہ آیت کے الفاظ ہیں: کَاتِبُوْهُمْ ''ان سے مُکاتبَت کرلو۔'' یہ الفاظ صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ مشہور فقیہ و محدث حضرت محمد بن سِیرینؒ کے والد سِیرین نے اپنے آقا حضرت اَنسؓ سے جب مُکاتبت کی درخواست کی اور انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو سِیرین حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لے گئے۔ انھوں نے واقعہ سنا تو دُرّہ لے کر حضرت اَنسؓ پر پِل پڑے اور فرمایا: ''اللہ کا حکم ہے کہ مُکاتبَت کرلو۔'' (بخاری) اس واقعے سے اِستدلال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذاتی فعل نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر اظہارِ اختلاف نہیں کیا، لہٰذا یہ اس آیت کی مستند تفسیر ہے۔ دوسرے گروہ کا اِستدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف فَکَاتِبُوْهُمْ نہیں فرمایا ہے بلکہ فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ارشاد فرمایا ہے، یعنی ''ان سے مُکاتبت کرلو، اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ۔'' یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، اور کوئی متعین معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جانچ سکے۔ قانونی احکام کی یہ شان نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اس حکم کو تلقین اور ہدایت ہی کے معنیٰ میں لیا جائے گا، نہ کہ قانونی حکم کے معنیٰ میں۔ اور سیرین کی نظیر کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں کوئی ایک غلام تو نہ تھا جس نے مکاتبت کی درخواست کی ہو۔ ہزارہا غلام عہدِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں موجود تھے، اور بکثرت غلاموں نے مکاتبت کی ہے۔ سیرین والے واقعے کے سوا کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ کسی آقا کو عدالتی حکم کے ذریعے سے مُکاتبت پر مجبور کیا گیا ہو۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو ایک عدالتی فعل سمجھنے کے بجائے ہم اس معنیٰ میں لیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محض قاضی ہی نہ تھے بلکہ افرادِ ملّت کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور اولاد کا سا تھا۔ بسا اوقات وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں ایک باپ تو دخل دے سکتا ہے مگر ایک حاکمِ عدالت دخل نہیں دے سکتا۔

۵۷ - بھلائی سے مراد تین چیزیں ہیں:

ایک یہ کہ غلام میں مالِ کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو، یعنی وہ کما کر یا محنت کر کے اپنی آزادی کا فدیہ ادا کر سکتا ہو، جیسا کہ ایک مُرسَل حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان علمتم فيهم حرفة ولا ترسلوهم كلًّا على النّاس، ''اگر تمھیں معلوم ہو کہ وہ کما سکتا ہے تو مُکاتبَت کرو۔ یہ نہ ہو کہ اسے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرنے کے لیے چھوڑ دو۔'' (ابنِ کثیر، بحوالہ ابوداؤد)

دوسرے یہ کہ اس میں اتنی دیانت اور راست بازی موجود ہو کہ اس کے قول پر اعتماد کر کے معاہدہ کیا جا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ مکاتبت کر کے وہ مالک کی خدمت سے چھٹی بھی پا لے اور جو کچھ اس دوران میں کمائے، اسے کھا پی کر برابر بھی کر دے۔

تیسرے یہ کہ مالک اس میں ایسے بُرے اَخلاقی رُجحانات، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے ایسے تلخ جذبات نہ پاتا ہو جن کی بنا پر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی آزادی مسلم معاشرے کے لیے خطرناک ہو گی۔ بالفاظِ دیگر، اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ مسلم معاشرے کا ایک اچھا آزاد شہری بن سکے گا نہ کہ آستین کا سانپ بن کر رہے گا۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ معاملہ جنگی قیدیوں کا بھی تھا جن کے بارے میں یہ احتیاطیں ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت تھی۔

۵۸ – یہ عام حکم ہے جس کے مخاطَب آقا بھی ہیں، عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔

آقاؤں کو ہدایت ہے کہ مالِ کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دو، چنانچہ متعدّد روایات سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرامؓ اپنے مُکاتبوں کو مالِ کتابت کا ایک مُعتَدبِہٖ حصّہ معاف کر دیا کرتے تھے، حتّٰی کہ حضرت علیؓ نے تو ہمیشہ ۱/۴ حصّہ معاف کیا ہے اور اسی کی تلقین فرمائی ہے۔ (ابنِ جَریر)

عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ جو مُکاتَب بھی اپنا مالِ کتابت ادا کرنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرے، وہ دل کھول کر اس کی امداد کریں۔ قرآنِ مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فِی الرِّقَابِ بھی ہے، یعنی "گردنوں کو بندِ غلامی سے رہا کرانا"۔ (سورۂ توبہ، آیت ۶۰) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک فَكُّ رَقَبَةٍ "گردن کا بند کھولنا" ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔ (سورۂ بَلَد، آیت ۱۳) حدیث میں ہے کہ ایک اَعرابی نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔" حضورؐ نے فرمایا "تو نے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈالی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور تیرا جو رشتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلائی کی تلقین کر، برائی سے منع کر۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اپنی زبان کو روک کر رکھ۔ کھلے تو بھلائی کے لیے کھلے، ورنہ بند رہے۔" (بَیْہقی فی شُعَب الایمان عن البراءؓ بن عازِب)

اسلامی حکومت کو بھی ہدایت ہے کہ بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع ہو، اُس میں سے مُکاتَب غلاموں کی رہائی کے لیے ایک حصّہ خرچ کریں۔

اِس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے: ایک، جنگی قیدی۔ دوسرے، آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرے، وہ جو نسلوں سے غلام چلے آرہے تھے اور کچھ پتا نہ تھا کہ ان کے آبا واجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام تھے۔ اسلام جب آیا تو عرب اور بیرونِ عرب، دُنیا بھر کا معاشرہ اِن تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا مَعاشی و معاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ اِن غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ اسلام کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آرہے ہیں، اُن کا کیا کیا جائے۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آیندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا کیا حل ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یکلخت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر سے لوگوں کے حُقوقِ مِلکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و مَعاشی نظام مفلوج ہو جاتا، بلکہ عرب کو امریکا کی خانہ جنگی سے بھی بدرجہا زیادہ سخت تباہ کُن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا، اور

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دُنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبُور نہ کرو جب کہ وہ خود پاک دامن

پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا، جس طرح امریکا میں حل نہ ہو سکا اور سیاہ فام لوگوں (negroes) کی ذلت کا مسئلہ بہر حال باقی رہ گیا۔ اس احمقانہ طریقِ اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے فَكُّ رَقَبَةٍ کی ایک زبردست اَخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیب، مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعے سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کریں، یا اپنے قصوروں کے کَفّارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انھیں رہا کریں، یا مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیں، اس تحریک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۳ غلام آزاد کیے۔ آپؐ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے اپنی زندگی میں ۷۰ غلاموں کو آزاد کیا۔ حکیمؓ بن حزام نے ۱۰۰، عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار، ذُوالکلاع حِمیَریؒ نے آٹھ ہزار، عبدالرحمٰنؓ بن عَوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہؓ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید خرید کر آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں تک سابق دَور کے غلاموں کا تعلق ہے وہ خلفائے راشدینؓ کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔

اب رہ گیا آیندہ کا مسئلہ۔ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اِس شکل کو تو قطعی حرام اور قانوناً مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا اور بیچا اور خریدا جائے۔ البتہ جنگی قیدیوں کو صرف اُس صورت میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت (حکم نہیں بلکہ اجازت) دی جب کہ اُن کی حکومت ہمارے جنگی قیدیوں سے اُن کا تبادلہ کرنے پر راضی نہ ہو اور وہ خود بھی اپنا فدیہ ادا نہ کریں۔ پھر ان غلاموں کے لیے ایک طرف اِس امر کا موقع کھلا رکھا گیا کہ وہ اپنے مالکوں سے مُکاتبَت کر کے رہائی حاصل کر لیں، اور دوسری طرف وہ تمام ہدایات ان کے حق میں موجود رہیں جو قدیم غلاموں کے بارے میں تھیں کہ نیکی کا کام سمجھ کر رضائے الٰہی کے لیے انھیں آزاد کیا جائے، یا گناہوں کے کَفّارے میں ان کو آزادی بخش دی جائے، یا کوئی شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور بعد کے لیے وصیت کر دے کہ اس کے مرتے ہی وہ آزاد ہو جائے گا (جسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدبیر اور ایسے غلام کو مُدَبَّر کہتے ہیں)، یا کوئی شخص اپنی لونڈی سے تمتُّع کرے اور اس کے ہاں اولاد ہو جائے، اس صورت میں مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی، خواہ مالک نے وصیّت کی ہو یا نہ کی ہو —— یہ حل ہے جو اسلام نے غلامی کے مسئلے کا کیا ہے۔ جاہل معترضین اس کو سمجھے بغیر اعتراضات جَڑتے ہیں اور معذرت پیشہ حضرات اس کی معذرتیں پیش کرتے کرتے آخر کار اس امرِ واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا تھا۔

الدُّنۡيَا ؕ وَمَنۡ يُّكۡرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۳﴾

رہنا چاہتی ہوں[59]، اور جو کوئی اُن کو مجبُور کرے تو اِس جبر کے بعد اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم ہے۔

**۵۹** – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو ان کو قَحبہ گری پر مجبُور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لونڈی خود اپنی مرضی سے بدکاری کی مرتکب ہو تو وہ اپنے جرم کی آپ ذمہ دار ہے، قانون اس کے جرم پر اُسی کو پکڑے گا، لیکن اگر اس کا مالک جبر کر کے اس سے یہ پیشہ کرائے تو ذمہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جبر کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا '' دنیوی فائدوں کی خاطر'' کا فقرہ، تو دراصل یہ ثبوت حکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے کہ اگر مالک اس کی کمائی نہ کھا رہا ہو تو لونڈی کو قَحبہ گری پر مجبُور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اِس سے مقصود اُس کمائی کو بھی حرمت کے حکم میں شامل کرنا ہے جو اس ناجائز جبر کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہو۔

لیکن اِس حکم کا پورا مقصد محض اس کے الفاظ اور سِیاق وسَباق سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اُس وقت عرب میں قَحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں: ایک، خانگی کا پیشہ۔ دوسرے، باقاعدہ چکلا۔

'' خانگی'' کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت رفع کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت اُن مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے، اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلَّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیّت ایک قسم کا '' نکاح'' سمجھتے تھے۔ اسلام نے آ کر نکاح کے صرف اُس معروف طریقے کو قانونی نکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے، اور اس طرح باقی تمام صورتیں زِنا میں شمار ہو کر آپ سے آپ جرم ہو گئیں۔ (ابوداؤد، باب فی وجوہ النکاح التی کان یتناکح اہل الجاہلیہ)

دوسری صورت، یعنی کھلی قَحبہ گری، تمام تر لونڈیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے: ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں، اس کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعے سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گُنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنھیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ '' حاجت مند'' آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں '' قلیقیات'' کہلاتی تھیں اور ان کے گھر '' مَواخیر'' کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے

چکلے کھول رکھے تھے۔خود عبداللہ بن اُبَیّ (رئیس المنافقین، وہی صاحب جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے) مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلا موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی گئی تھیں۔ان کے ذریعے سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضُع بھی انھی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خَدَم وحَشَم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔انھی لونڈیوں میں سے ایک، جس کا نام مُعاذَہ تھا، مسلمان ہوگئی اور اس نے توبہ کرنی چاہی۔ابنِ اُبَیّ نے اُس پر تشدد کیا۔اس نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے معاملہ سرکار تک پہنچایا، اور سرکارِ رسالت مآبؐ نے حکم دے دیا کہ لونڈی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے۔ (ابنِ جَریر، ج ۱۸، ص ۵۵ تا ۵۸-۱۰۳-۱۰۴-اَلْاِستِیعاب لابنِ عبدالبرؒ، ج ۲، ص ۷۶۲۔ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۸-۲۸۹) یہی زمانہ تھا جب بارگاہِ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔اس پَس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود محض لونڈیوں کو جرمِ زنا پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دولتِ اسلامیہ کے حدود میں قَحبہ گری (prostitution) کے کاروبار کو بالکل خلافِ قانون قرار دے دینا ہے، اور ساتھ ساتھ اُن عورتوں کے لیے اعلانِ معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آ جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا: لا مساعاۃ فی الاسلام ”اسلام میں قَحبہ گری کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔“ (ابوداؤد بروایتِ ابنِ عباسؓ، باب فی ادعاء وَلَد الزنا) دوسرا حکم جو آپؐ نے دیا، وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعے سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافعؓ بن خَدِیج کی رِوایَت ہے کہ آپؐ نے مهر البَغی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شر المکاسب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا۔ (ابوداؤد، ترِمذی، نَسائی) ابوجُحَیفَہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے کسب البغی یعنی پیشہ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھیرایا۔ (بخاری، مسلم، احمد) ابومسعود عُقبَہؓ بن عَمرو کی روایت ہے کہ آپؐ نے مَهر البَغی کا لین دین ممنوع قرار دیا۔ (صحاح سِتّہ واحمد) تیسرا حکم آپؐ نے یہ دیا کہ لونڈی سے جائز طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جا سکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کر سکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لاتی ہے۔ رافعؓ بن خَدِیج کہتے ہیں کہ نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم عن کسب الْاَمَة حتی یُعلَم من این ھو، ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ آمدنی اُسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔“ (ابوداؤد، کتاب الاِجارہ) رافعؓ بن رِفاعَہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ نھانا نبی اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم عن کسب الامة الا ما عملت بیدھا وقال ھٰکذا باصابعه نحو الخبز والغزل والنفش، ”اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا، بجز اُس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے، اور آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روٹی پکانا، سُوت کاتنا، یا اُون اور رُوئی دھنکنا۔“ (مُسنَدِ احمد، ابوداود کتاب الاجارہ) اسی معنی میں ایک رِوایَت ابوداؤد اور مُسنَدِ احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس میں کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور مهر البغی (زنا کی آمدنی) وصول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اِس آیت کے منشا کے مطابق قَحبہ گری کی ان تمام صورتوں کو مذہباً ناجائز

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۳۴﴾ اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ

ع ۸ / ۱۰

ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمھارے پاس بھیج دی ہیں، اور ان قوموں کی عبرت ناک مثالیں بھی ہم تمھارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں[۶۰]۔ ع

اللہ[۶۱] آسمانوں اور زمین کا نور ہے[۶۲]۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

---

اور قانوناً ممنوع قرار دے دیا جو اس وقت عرب میں رائج تھیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، عبداللہ بن اُبَیّ کی لونڈی مُعاذہ کے معاملے میں جو کچھ آپؐ نے فیصلہ فرمایا، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لونڈی سے اُس کا مالک جبراً پیشہ کرائے، اس پر سے مالک کی مِلکیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ امام زُہریؒ کی روایت ہے جسے ابنِ کثیر نے مُسنَدِ عبدالرزاق کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

۶۰ – اس آیت کا تعلق صرف اوپر کی آخری آیت ہی سے نہیں ہے بلکہ اُس پورے سلسلۂ بیان سے ہے جو آغازِ سورہ سے یہاں تک چلا آ رہا ہے۔ صاف صاف ہدایتیں دینے والی آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں زنا اور قَذْف اور لِعان کا قانون بیان کیا گیا ہے، بدکار مردوں اور عورتوں سے اہلِ ایمان کو شادی بیاہ کے معاملے میں مُقاطَعَہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، شریف لوگوں پر بے بنیاد تہمتیں لگانے اور معاشرے میں فواحش کی اشاعت کرنے سے روکا گیا ہے، مردوں اور عورتوں کو غَضِّ بصر اور حفظِ فُروج کی تاکید کی گئی ہے، عورتوں کے لیے پردے کے حُدود قائم کیے گئے ہیں، شادی کے قابل لوگوں کے مُجرّد بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، غلاموں کی آزادی کے لیے کتابت کی صورت تجویز کی گئی ہے، اور معاشرے کو قَحبہ گری کی لعنت سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان ارشادات کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈر کر سیدھی راہ اختیار کر لینے والوں کو جس طرح تعلیم دی جاتی ہے، وہ تو ہم نے دے دی ہے، اب اگر تم اِس تعلیم کے خلاف چلو گے تو اس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ تم اُن قوموں کا سا انجام دیکھنا چاہتے ہو جن کی عبرتناک مثالیں خود اسی قرآن میں ہم تمھارے سامنے پیش کر چکے ہیں ـــــ غالباً ایک حکم نامے کے اختتام پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ مگر آفرین ہے اس قوم پر جو ماشاء اللہ مومن بھی ہو اور اس حکم نامے کی تلاوت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اس حکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے۔

۶۱ – یہاں سے رُوئے سُخَن منافقین کی طرف پھرتا ہے جو اسلامی معاشرے میں فتنوں پر فتنے اُٹھائے چلے جا رہے تھے اور اسلام، اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست و جماعت کو زک دینے میں اسی طرح سرگرم تھے جس طرح باہر کے کھلے کھلے کافر دشمن سرگرم تھے۔ یہ لوگ ایمان کے مدعی تھے، مسلمانوں میں شامل تھے، مسلمانوں کے ساتھ، اور خصوصاً انصار کے ساتھ، رشتہ و برادری کے تعلقات رکھتے تھے، اسی لیے ان کو مسلمانوں میں اپنے فتنے پھیلانے کا زیادہ موقع ملتا تھا،

اور بعض مخلص مسلمان تک اپنی سادہ لوحی یا کمزوری کی بنا پر ان کے آلۂ کار بھی بن جاتے تھے اور پشت پناہ بھی۔ لیکن درحقیقت ان کی دنیا پرستی نے ان کی آنکھیں اندھی کر رکھی تھیں اور دعوائے ایمان کے باوجود وہ اُس نور سے بالکل بے بہرہ تھے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا میں پھیل رہا تھا۔ اس موقع پر ان کو خطاب کیے بغیر ان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا جا رہا ہے، اس سے مقصود تین اُمور ہیں: اوّل یہ کہ ان کو فہمایش کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رُبوبیّت کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جو بندہ بھی بہکا اور بھٹکا ہوا ہو، اس کی تمام شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود اسے آخر وقت تک سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ ایمان اور نِفاق کا فرق صاف صاف کھول کر بیان کر دیا جائے، تاکہ کسی صاحبِ عقل وخرَد انسان کے لیے مسلم معاشرے کے مومن اور منافق افراد کے درمیان تمیز کرنا مشکل نہ رہے، اور اس توضیح وتصریح کے باوجود جو شخص منافقوں کے پھندے میں پھنسے یا ان کی پشتیبانی کرے وہ اپنے اِس فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہو۔ سوم یہ کہ منافقین کو صاف صاف مُتنبّہ کر دیا جائے کہ اللہ کے جو وعدے اہلِ ایمان کے لیے ہیں، وہ صرف انھی لوگوں کو پہنچتے ہیں جو سچّے دل سے ایمان لائیں اور پھر اُس ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ یہ وعدے ان سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو محض مسلمانوں کی مردُم شماری میں شامل ہوں۔ لہٰذا منافقین اور فاسقین کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ وہ ان وعدوں میں سے کوئی حصّہ پا سکیں گے۔

**۶۲** – آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآنِ مجید میں بالعُموم ”کائنات“ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیا کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سوجھنے کی کیفیت کا نام انسان نے اندھیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے، اور اس کے برعکس جب سب کچھ سُجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ”نور“ کا استعمال اِسی بنیادی مفہُوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے، نہ اس معنیٰ میں کہ معاذاللہ، وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکزِ بینائی کو مُتأثّر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اُس معنیٰ کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہم اُن روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادّی دنیا کے اندر ہمارے تجَرِبے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے جتنے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہُوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں، نہ کہ اُن کے مادّی مدلولات کے اعتبار سے۔ مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عُضو کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔ ہم اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعے سے سنتا ہے۔ اس کے لیے ہم پکڑ اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ وہ ہاتھ نام کے ایک آلے سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اس کے لیے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں، اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سَماعت اور بینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اُس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و بینائی اور گرفت کے سوا ہونی غیر ممکن ہے جو

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ

طاق میں چراغ رکھا ہُوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک[۶۳] درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی،[۶۴] جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اِس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں[۶۵])۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی

ہمارے تجرِبے میں آتی ہے۔ اسی طرح ''نور'' کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تنگ خیالی ہے کہ اس کے معنٰی کا مِصداق صرف اُس شعاع ہی کی صورت میں پایا جاسکتا ہے جو کسی چمکنے والے جِرم سے نکل کر آنکھ کے پردے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اِس محدود معنٰی میں نہیں ہے بلکہ مُطلَق معنٰی میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل ''سببِ ظہور'' ہے، باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اسی کی بخشی ہوئی روشنی سے روشن اور روشن گر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں جس سے وہ یہ کرشمہ دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنٰی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہِ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجتاً ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

۶۳ – مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

۶۴ – یعنی جو کھلے میدان میں یا اونچی جگہ واقع ہو، جہاں صبح سے شام تک اس پر دھوپ پڑتی ہو۔ کسی آڑ میں نہ ہو کہ اس پر صرف صبح کی یا صرف شام کی دُھوپ پڑے۔ زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ محض شرقی یا محض غربی رُخ کے درخت نسبتاً غلیظ تیل دیتے ہیں اور چراغ میں ان کی روشنی ہلکی رہتی ہے۔

۶۵ – اس تمثیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے، اور فانوس سے مراد وہ پردہ ہے جس میں حضرتِ حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پردہ فی الحقیقت خِفا کا نہیں، شدّتِ ظہور کا پردہ ہے۔ نگاہِ خلق جو اس کو دیکھنے سے عاجز ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حائل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پردہ شفاف ہے اور اس شفاف پردے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید اور بسیط اور محیط ہے کہ محدود طاقت

لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ

چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے[۶۶]، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب

رکھنے والی بینائیاں اس کا اِدراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہیں۔ یہ کمزور بینائیاں صرف اُن محدود روشنیوں کا اِدراک کر سکتی ہیں جن کے اندر کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی زائل ہوتی ہیں اور کبھی پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے مقابلے میں کوئی تاریکی موجود ہوتی ہے اور اپنی ضد کے سامنے آ کر وہ نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن نورِ مطلق جس کا کوئی مدِمقابل نہیں، جو کبھی زائل نہیں ہوتا، جو سدا ایک ہی شان سے ہر طرف چھایا رہتا ہے، اس کا اِدراک اِن کے بس سے باہر ہے۔

رہا یہ مضمون کہ ''چراغ ایک ایسے درختِ زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی''، تو یہ صرف چراغ کی روشنی کے کمال اور اس کی شدت کا تصوّر دلانے کے لیے ہے۔ قدیم زمانے میں زیادہ سے زیادہ روشنی روغنِ زیتون کے چراغوں سے حاصل کی جاتی تھی، اور ان میں روشن ترین چراغ وہ ہوتا تھا جو بلند اور کھلی جگہ کے درخت سے نکالے ہوئے تیل کا ہو۔ تمثیل میں اس مضمون کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اللہ کی ذات، جسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، کسی اور چیز سے طاقت (energy) حاصل کر رہی ہے، بلکہ مقصود یہ کہنا ہے کہ مثال میں معمولی چراغ نہیں بلکہ اُس روشن ترین چراغ کا تصور کرو جو تمھارے مشاہدے میں آتا ہے۔ جس طرح ایسا چراغ سارے مکان کو جگمگا دیتا ہے، اسی طرح اللہ کی ذات نے ساری کائنات کو بُقعۂ نور بنا رکھا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''اُس کا تیل آپ سے آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے''، اِس سے بھی چراغ کی روشنی کے زیادہ سے زیادہ تیز ہونے کا تصور دلانا مقصود ہے۔ یعنی مثال میں اس انتہائی تیز روشنی کے چراغ کا تصور کرو جس میں ایسا لطیف اور ایسا سخت اشتعال پذیر تیل پڑا ہوا ہو۔ یہ تینوں چیزیں یعنی زیتون اور اس کا غیر شرقی وغربی ہونا، اور اس کے تیل کا آگ لگے بغیر ہی آپ سے آپ بھڑکا پڑنا، مستقل اجزائے تمثیل نہیں ہیں بلکہ پہلے جزوِ تمثیل یعنی چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں۔ اصل اجزائے تمثیل تین ہیں: چراغ، طاق، اور فانوسِ شفاف۔

آیت کا یہ فقرہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ ''اس کے نور کی مثال ایسی ہے''۔ اِس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' کے الفاظ سے کسی کو ہو سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اللہ کو ''نور'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ، اس کی حقیقت ہی بس ''نور'' ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ایک ذاتِ کامل واکمل ہے جو صاحبِ علم، صاحبِ قدرت، صاحبِ حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نورِ محض اس کے کمالِ نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے، جیسے کسی کے کمالِ فیاضی کا حال بیان کرنے کے لیے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے، یا اس کے کمالِ خوبصورتی کا وصف بیان کرنے کے لیے خود اسی کو حُسن کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے۔

۶۶ – یعنی اگرچہ اللہ کا یہ نورِ مطلق سارے جہان کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا اِدراک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے اِدراک کی توفیق اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ جس طرح اندھے

عَلِيۡمٌ ۙ﴿۳۵﴾ فِيۡ بُيُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَيُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ

واقف ہے[۶۷]۔ (اُس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنھیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے[۶۸]، اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے

کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اُسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی تو روشنی ہے مگر اللہ کا نور اس کو سُجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اس بدنصیب کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ آنکھوں کا اندھا اپنے پاس کی چیز نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک کہ جب اس سے ٹکرا کر چوٹ کھا جاتا ہے تب اسے پتا چلتا ہے کہ یہ چیز یہاں موجود تھی۔ اسی طرح بصیرت کا اندھا اُن حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو عین اُس کے پہلو میں اللہ کے نور سے جگمگا رہی ہوں۔ اُسے ان کا پتا صرف اُس وقت چلتا ہے جب وہ ان سے ٹکرا کر اپنی شامت میں گرفتار ہو چکا ہوتا ہے۔

۶۷ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ وہ جانتا ہے کس حقیقت کو کس مثال سے بہترین طریقے پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کون اِس نعمت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔ جو شخص نورِ حق کا طالب ہی نہ ہو اور ہمہ تن اپنی دنیوی اغراض ہی میں گم اور مادّی لذتوں اور منفعتوں ہی کی جستجو میں منہمک ہو، اسے زبردستی نورِ حق دکھانے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس عطیّے کا مستحق تو وہی ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ وہ اس کا طالب اور مخلص طالب ہے۔

۶۸ – بعض مفسرین نے ان "گھروں" سے مراد مساجد لی ہیں، اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین ان سے مراد اہلِ ایمان کے گھر لیتے ہیں، اور انھیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انھیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔ "اُن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے"، یہ الفاظ بظاہر مسجد والی تفسیر کے زیادہ مؤیّد نظر آتے ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری تفسیر کے بھی اتنے ہی مؤیّد ہیں جتنے پہلی تفسیر کے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی شریعت کہانت زدہ مذاہب کی طرح عبادت کو صرف مَعْبدوں تک ہی محدود نہیں رکھتی جہاں کاہن یا پُجاری طبقے کے کسی فرد کی پیشوائی کے بغیر مراسمِ بندگی ادا نہیں کیے جا سکتے، بلکہ یہاں مسجد کی طرح گھر بھی عبادت گاہ ہے اور ہر شخص اپنا پروہت آپ ہے۔ چونکہ اس سورہ میں تمام تر خانگی زندگی کو اعلیٰ و ارفع بنانے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے دوسری تفسیر ہم کو موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ پہلی تفسیر کو بھی رد کر دینے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔

وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ

---

پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی، (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تا کہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔[۶۹] (اس کے برعکس) جنھوں نے کفر کیا[۷۰] اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب، کہ پیاسا اُس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چُکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔[۷۱] یا پھر

---

کیا مُضایقہ ہے اگر اس سے مراد مومنوں کے گھر اور ان کی مسجدیں، دونوں ہی ہوں۔

۶۹ – یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی جو اللہ کے نورِ مطلق کا اِدراک کرنے اور اس کے فیض سے بہرہ مند ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کہ یونہی جسے چاہا مالا مال کر دیا اور جسے چاہا دھتکار دیا۔ وہ جسے دیتا ہے، کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے، اور نعمتِ حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس کی مَحبّت، اور اس سے دلچسپی، اور اس کا خوف، اور اس کے انعام کی طلب، اور اُس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دنیا پرستی میں گُم نہیں ہے بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اُس کے دل میں اپنے خدا کی یاد بسی رہتی ہے۔ وہ پستیوں میں پڑا نہیں رہنا چاہتا بلکہ اس بلندی کو عملاً اختیار کرتا ہے جس کی طرف اُس کا مالک اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اسی حیاتِ چند روزہ کے فائدوں کا طلب گار نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ آخرت کی اَبدی زندگی پر جمی ہوئی ہے۔ یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ اس کی دین کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۷۰ – یعنی اُس تعلیمِ حق کو بصدقِ دل قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اللہ کی طرف سے اُس کے پیغمبروں نے دی ہے اور جو اُس وقت اللہ کے پیغمبر سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ اُوپر کی آیات خود بتا رہی ہیں کہ اللہ کا نور پانے والوں سے مراد سچے اور صالح مومن ہیں۔ اس لیے اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی حالت بتائی جا رہی ہے جو اس نور کو پانے کے اصلی اور

كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا، کہ اُوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اُوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلّط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔[۷۲]

واحد ذریعے، یعنی رسول ہی کو ماننے اور اس کا اتباع کرنے سے انکار کر دیں، خواہ دل سے انکار کریں اور محض زبان سے اقراری ہوں، یا دل اور زبان دونوں ہی سے انکاری ہوں۔

**۷۱** – اس مثال میں اُن لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو کفر و نفاق کے باوجود بظاہر کچھ نیک اعمال بھی کرتے ہوں اور فی الجملہ آخرت کے بھی قائل ہوں، اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہوں کہ ایمانِ صادق اور صفاتِ اہلِ ایمان، اور اطاعت و اتباعِ رسولؐ کے بغیر ان کے یہ اعمال آخرت میں ان کے لیے کچھ مفید ہوں گے۔ مثال کے پیرایے میں ان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جن ظاہری و نمایشی اعمالِ خیر سے آخرت میں فائدے کی امید رکھتے ہو، ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ ریگستان میں چمکتی ہوئی ریت کو دُور سے دیکھ کر جس طرح پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ پانی کا ایک تالاب موجیں مار رہا ہے اور منہ اٹھائے اس کی طرف پیاس بجھانے کی اُمید لیے ہوئے دوڑتا چلا جاتا ہے، اسی طرح تم اِن اعمال کے جھوٹے بھروسے پر موت کی منزل کا سفر طے کرتے چلے جا رہے ہو۔ مگر جس طرح سراب کی طرف دوڑنے والا جب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے تالاب نظر آ رہا تھا تو کچھ نہیں پاتا، اسی طرح جب تم منزلِ موت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کا تم کوئی فائدہ اٹھا سکو، بلکہ اس کے برعکس اللہ تمھارے کفر و نفاق کا، اور ان بد اعمالیوں کا جو تم ان نمایشی نیکیوں کے ساتھ کر رہے تھے، حساب لینے اور پورا پورا بدلہ دینے کے لیے موجود ہے۔

**۷۲** – اس مثال میں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں نمایشی نیکیاں کرنے والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں، خواہ وہ دنیا کی اصطلاحوں میں علّامۂ دہر اور عُلوم وفُنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو، روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور آواز سے تیز رفتار طیارے، اور چاند تک پہنچنے والی ہوائیاں بنا لینے کا نام علم ہے۔ ان کے نزدیک مَعاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے۔ مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے، اور اس کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ جاہلِ محض ہیں، اور ایک اَن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے اگر وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔

ع

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ع اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ

جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔[۷۳] ع

کیا[۷۴] تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے

۷۳ – یہاں پہنچ کر وہ اصل مدعا کھول دیا گیا ہے جس کی تمہید اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے مضمون سے اُٹھائی گئی تھی۔ جب کائنات میں کوئی نور درحقیقت اللہ کے نور کے سوا نہیں ہے، اور سارا ظہورِ حقائق اسی نور کی بدولت ہو رہا ہے، تو جو شخص اللہ سے نور نہ پائے، وہ اگر کامل تاریکی میں مبتلا نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ کہیں اور تو روشنی موجود ہی نہیں ہے کہ اس سے ایک کرن بھی وہ پا سکے۔

۷۴ – اُوپر ذکر آچکا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے مگر اس نور کے اِدراک کی توفیق صرف صالح اہلِ ایمان ہی کو نصیب ہوتی ہے، باقی سب لوگ اس نورِ کامل و شامل کے محیط ہوتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح تاریکی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اب اس نور کی طرف رہنمائی کرنے والے بے شمار نشانات میں سے صرف چند کو بطورِ نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دل کی آنکھیں کھول کر کوئی انھیں دیکھے تو ہر وقت ہر طرف اللہ کو کام کرتے دیکھ سکتا ہے۔ مگر جو دل کے اندھے ہیں، وہ اپنے سر کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھتے ہیں تو انھیں بیولوجی اور زُولوجی اور طرح طرح کی دوسری لوجیاں تو اچھی خاصی کام کرتی

يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

---

قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے، اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں،[۷۵] اولے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے۔ اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ رات اور دن کا اُلٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اِس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

اور اللہ نے ہر جان دار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں، آگے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

---

نظر آتی ہیں، مگر اللہ کہیں کام کرتا نظر نہیں آتا۔

۷۵ – اِس سے مراد سردی سے جمے ہوئے بادل بھی ہو سکتے ہیں جنھیں مجازاً آسمان کے پہاڑ کہا گیا ہو۔ اور زمین کے پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں جو آسمان میں بلند ہیں، جن کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کے اثر سے بسا اوقات ہوا اتنی سرد ہو جاتی ہے کہ بادلوں میں انجماد پیدا ہونے لگتا ہے اور اولوں کی شکل میں بارش ہونے لگتی ہے۔

وَ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوۡلِ وَ اَطَعۡنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ‏ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ يَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَـقُّ يَاۡتُوۡۤا اِلَيۡهِ مُذۡعِنِيۡنَ ؕ‏ ﴿۴۹﴾

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں[۷۶]۔ جب ان کو بُلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف تاکہ رسولؐ ان کے آپس کے مُقدّمے کا فیصلہ کرے[۷۷] تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے[۷۸]۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں[۷۹]۔

۷۶ – یعنی اطاعت سے رُوگردانی ان کے دعوائے ایمان کی خود تردید کر دیتی ہے، اور اس حرکت سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ انھوں نے جھوٹ کہا جب کہا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی۔

۷۷ – یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسولؐ کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اُس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلایا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلایا جانا نہیں بلکہ اللہ اور رسول، دونوں کی طرف بلایا جانا ہے۔ نیز اس آیت اور اوپر والی آیت سے یہ بات بلا کسی اشتباہ کے بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے بغیر ایمان کا دعویٰ بے معنیٰ ہے اور اطاعتِ خدا و رسول کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمان بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ قوم اُس قانون کے آگے جھک جائیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے ان کو دیا ہے۔ یہ طرزِ عمل اگر وہ اختیار نہیں کرتے تو اُن کا دعوائے ایمان ایک منافقانہ دعویٰ ہے۔ (تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو، سورۂ نساء، آیات ۵۹-۶۱، مع حواشی ۸۹ تا ۹۲)

۷۸ – واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کے لیے نہ تھا، بلکہ آپؐ کے بعد جو بھی اسلامی حکومت کے منصبِ قضا پر ہو اور کتاب اللہ و سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق فیصلے کرے اس کی عدالت کا سمن دراصل اللہ اور رسول کی عدالت کا سمن ہے، اور اس سے منہ موڑنے والا درحقیقت اس سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول سے منہ موڑنے والا ہے۔ اس مضمون کی یہ تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مُرسَل حدیث میں مروی ہے جسے حسن بصری رحمہ اللہ نے رِوایَت کیا ہے کہ من دعی الی حاکم من حکام المسلمین فلم یجب فهو ظالم لا حق له ''جو شخص مسلمانوں کے حُکّام عدالت میں سے کسی حاکم کی طرف بلایا جائے اور وہ حاضر نہ ہو تو وہ ظالم ہے، اس کا کوئی حق نہیں ہے۔'' (احکام القرآن، جصّاص، ج ۳، ص ۴۰۵) بالفاظِ دیگر، ایسا شخص سزا کا بھی مستحق ہے، اور مزید برآں اس کا بھی مستحق ہے کہ اسے برسرِ باطل فرض کر کے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ دے دیا جائے۔

اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَخْشَ اللّٰهَ وَیَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

ع ۶ / ۱۲

کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہُوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔[۸۰] ع ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسولؐ کی طرف بُلائے جائیں تا کہ رسولؐ ان کے مقدّمے کا فیصلہ کرے، تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

۷۹ – یہ آیت اس حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہے کہ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے لے، مگر جو کچھ خدا کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہو اسے رد کر دے، اور اس کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے قوانین کو ترجیح دے، وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے، کیونکہ وہ ایمان خدا اور رسول پر نہیں، اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے۔ اِس رَوِیّے کے ساتھ خدا کی شریعت کے کسی جز کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو خدا کی نگاہ میں اس طرح کے ماننے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

۸۰ – یعنی اِس طرزِ عمل کی تین ہی وجہیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طریقے پر محض دھوکا دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہوگیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اسے اس امر میں ابھی تک شک ہو کہ رسول خدا کا رسول ہے یا نہیں، اور قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں، اور آخرت واقعی آنے والی ہے بھی یا یہ محض ایک افسانہ تراشیدہ ہے، بلکہ خدا بھی حقیقت میں موجود ہے یا یہ بھی ایک خیال ہے جو کسی مصلحت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا کی کتاب نے فلاں حکم دے کر تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا، اور خدا کے رسول کا فلاں ارشاد یا فلاں طریقہ تو ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اِن تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، ایسے لوگوں کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے، وہ بہت بڑا دغاباز، خائن اور جعل ساز ہے۔ وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے ذلیل ترین خصائل کا پیکر بناتا چلا جاتا ہے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اُس کے ظاہری کلمۂ شہادت پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت کا ایک جز مان لیتے ہیں اور

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي

---

یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں۔" اِن سے کہو: "قسمیں نہ کھاؤ، تمھاری اطاعت کا حال معلوم ہے،[81] تمھارے کرتُوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔[82]" کہو: "اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابعِ فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمّہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمّہ دار تم۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔ ورنہ رسولؐ کی ذمّہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔"

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بُنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے

---

پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی، تمدّنی، سیاسی اور اَخلاقی تعلقات قائم کرلیتے ہیں۔

۸۱ – دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ ایمان سے جو اطاعت مطلوب ہے، وہ معروف اور معلوم قسم کی اطاعت ہے جو ہر شبہے سے بالاتر ہو، نہ کہ وہ اطاعت جس کا یقین دلانے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پڑے اور پھر بھی یقین نہ آسکے۔ جو لوگ حقیقت میں مطیعِ فرمان ہوتے ہیں، ان کا رَوِیّہ کسی سے چھپا ہُوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر محسوس کرلیتا ہے کہ یہ اطاعت گزار لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجایش ہی نہیں ہوتی کہ اسے رفع

ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔[۸۳] اور جو اس کے بعد کفر کرے[۸۴] تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

کرنے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پیش آئے۔

۸۲ – یعنی یہ فریب کاریاں مخلوق کے مقابلے میں تو شاید چل بھی جائیں مگر خدا کے مقابلے میں کیسے چل سکتی ہیں جو کھلے اور چھپے سب حالات، بلکہ دلوں کے مخفی ارادے اور خیالات تک سے واقف ہے۔

۸۳ – جیسا کہ اس سلسلۂ کلام کے آغاز میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، اِس ارشاد سے مقصود منافقین کو مُتنبِّہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اُس کے مخاطَب محض مردُم شماری کے مسلمان نہیں ہیں، بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اَخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ اِن صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے۔ لہٰذا وہ اس میں حصّہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و تمکُّن کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں، پھر اِس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے، وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگیِ حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے، اور اِس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اِس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان، صَلاح، دینِ حق، عبادتِ الٰہی اور شرک، ہر چیز کا مفہُوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو اُن کے اِس نظریّے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اِس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنیٰ پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اِس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنھوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکُّن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں، خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فِسق و فُجور کی اُن تمام آلائشوں میں بُری طرح لتھڑے ہوئے ہوں جنھیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے، جیسے سود، زِنا، شراب اور جُوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومنِ صالح ہیں اور اِسی لیے خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنیٰ قوانینِ طَبیعی کو ماننے، اور صَلاح کے معنیٰ اُن قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ اُن قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے

جو انفرادی اور اجتماعی سعی وجُہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ اُن مفید قواعد وضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کر لے؟ مگر کیا کوئی شخص، جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عملِ صالح اور دینِ حق اور عبادتِ الٰہی اور توحید اور شرک کے یہی معنیٰ ہیں؟ یہ معنیٰ یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریّات وتصوُّرات کے مطابق ڈھال لیا ہو، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اُن سب آیات کو اپنے زُعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور الٰہ، اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعۂ ہدایت، اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اُس زندگی میں اپنی جواب دِہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اِس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے، وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں اِن مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح وصاف الفاظ میں بار بار دُہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمان داری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی اُن غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیتِ استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظِ خلافت واستخلاف کے جس معنیٰ پر انھوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے، وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنیٰ کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے، اور ہر جگہ سِیاق وسَباق سے پتا چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنیٰ میں یہ لفظ بولا گیا ہے:

اس کے ایک معنی ہیں: ’’خدا کے دیے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا‘‘۔ اس معنیٰ میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔

دوسرے معنیٰ ہیں: ’’خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کے امرِ شرعی (نہ کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا‘‘۔ اس معنیٰ میں صرف مومنِ صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس کافر وفاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے مُلک میں اُس کے دیے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

تیسرے معنیٰ ہیں: ’’ایک دَور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا‘‘۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنیٰ ’’نیابت‘‘ سے ماخوذ ہیں، اور یہ آخری معنی خلافت بمعنیٰ ’’جانشینی‘‘ سے ماخوذ۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنیٰ لغتِ عرب میں معلوم ومعروف ہیں۔

اب جو شخص بھی یہاں اِس سیاق وسباق میں آیتِ استخلاف کو پڑھے گا، وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اُس حکومت کے معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانینِ فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ

کا پسند کردہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لیے اِس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرّہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اِس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکا سے لے کر رُوس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں بج رہا ہو اُس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طُغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لعنت کا مستحق قرار دیا؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الانبیاء، حاشیہ ۹۹)

اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے، بلا واسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالتِ خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالتِ خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقا کے بڑے حصّے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کُرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اِس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہرِ تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نَہج البلاغہ میں سَیّدنا علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انھوں نے حضرت عمرؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت وقلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا شکر ہے جس کی اس نے تائید ونصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اِس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ...... اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قَیِّم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور پراگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی چکّی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آ جائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہو گی۔ اور اُدھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جما دیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اِسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے، اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہلِ عجم بڑی کثیر تعداد میں اُمنڈ آئے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۵۷﴾ ع یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ

ع ۷ / ۱۳

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ع

اے[۸۵] لوگو جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمھارے مملوک[۸۶] اور تمھارے وہ بچّے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں[۸۷]، تین اوقات میں اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے پہلے بھی ہم جو اُن سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔“

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اِس تقریر میں جنابِ امیر کس کو آیتِ استخلاف کا مِصداق ٹھیرا رہے ہیں۔

۸۴ – کفر سے مراد یہاں کفرانِ نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکارِ حق بھی۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس کے مصداق وہ لوگ ہوں گے جو نعمتِ خلافت پانے کے بعد طریقِ حق سے ہٹ جائیں۔ اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس کے مصداق منافقین ہوں گے جو اللہ کا یہ وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روش نہ چھوڑیں۔

۸۵ – یہاں سے پھر احکامِ معاشرت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ سورۂ نور کا یہ حصّہ اوپر کی تقریر کے کچھ مدت بعد نازل ہوا ہو۔

۸۶ – جُمہور مفسرین و فقہا کے نزدیک اس سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابنِ عمرؓ اور مجاہدؒ اِس آیت میں مملوکوں سے مراد صرف غلام لیتے ہیں اور لونڈیوں کو اس سے مُستثنیٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حکم بیان کیا گیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیے کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کا اچانک آ جانا مناسب نہیں، اُسی طرح خادمہ کا بھی آ جانا غیر مناسب ہے۔

یہ امر مُتّفق عَلَیہ ہے کہ اس آیت کا حکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

۸۷ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالغوں کا سا خواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہا نے لڑکوں

وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۚ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ

اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اُتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشا کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں۔[88] اِن کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ اُن پر،[89] تمھیں ایک دُوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔[90] اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے،

کے معاملے میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے، وہ اس بنا پر قابلِ ترجیح ہے کہ یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامتِ بلوغ قرار دینے کے بعد حکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملے میں ایامِ ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حکم کا منشا یہ ہے کہ جب تک گھر کے بچے اُس عمر کو نہ پہنچیں جس میں ان کے اندر صنفی شعور بیدار ہوا کرتا ہے، وہ اس قاعدے کی پابندی کریں، اور جب اس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

۸۸ – اصل میں لفظ عَوْرٰتٍ استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ”یہ تین وقت تمھارے لیے عورات ہیں۔“ عورت اردو میں تو صنفِ اُناث کے لیے بولا جاتا ہے مگر عَرَبی میں اس کے معنیٰ خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اُس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کُھل جانا آدمی کے لیے باعثِ شرم ہو، یا جس کا ظاہر ہو جانا اُس کو ناگوار ہو، نیز اس معنیٰ میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنیٰ باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے مفہوم میں کسی نہ کسی حد تک سبھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک تمھارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اُن کو یہ ہدایت کرو کہ اِن تین وقتوں میں جب وہ تمھاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

۸۹ – یعنی ان تین وقتوں کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت عورتوں اور مردوں کے پاس اُن کے کمرے میں یا اُن کے تخلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آ جائیں تو تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ پھر یہ تمھاری اپنی حماقت ہو گی کہ کام کاج کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخلیے کے مذکورۂ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آ جائیں، تو وہ قصوروار ہیں اگر تمھاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہو اگر تم نے اپنے بچوں اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۵۸﴾ وَ اِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفَالُ مِنۡکُمُ الۡحُلُمَ فَلۡیَسۡتَاۡذِنُوۡا

اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمھارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں[91] تو چاہیے کہ اُسی طرح اجازت لے کر

**۹۰**- یہ وجہ ہے اُس اجازتِ عام کی جو تین اوقاتِ مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اِس سے اُصولِ فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی عِلّت ضرور ہے، خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

**۹۱**- یعنی بالغ ہو جائیں۔ جیسا کہ اوپر حاشیہ ۸۷ میں بیان کیا جا چکا ہے، لڑکوں کے معاملے میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملے میں ایّامِ ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک اِن جسمانی تغیُّرات سے خالی رہ جائیں، ان کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک اس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا، اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی ایک قول اِس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اِس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقیہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں، لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر ہی کو غیر محتلم لڑکوں اور غیر حائضہ لڑکیوں کے معاملے میں حدِ بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں جسمانی نَشْو ونُما کے حالات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عُموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام اور ایام ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں، اُن کا اوسط فرق نکال لیا جائے، اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے مُعتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مُعتاد عمر پر اِس اوسط کا اضافہ کر کے اُسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعُموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو، تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہو گا، اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سِنّ بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اسی قاعدے پر مختلف مَمالک کے اہلِ قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

۱۵ برس کی حد کے حق میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، اور وہ ابنِ عمرؓ کی یہ رِوایت ہے کہ میں ۱۴ سال کا تھا جب غزوۂ اُحُد کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپؐ نے مجھے شریکِ جنگ ہونے کی اجازت نہ دی، پھر غزوۂ خندق کے موقع پر، جب کہ میں ۱۵ سال کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپؐ نے مجھ کو اجازت دے دی۔ (صِحاح سِتَّہ و مُسنَدِ احمد) لیکن یہ روایت دو وجوہ سے قابلِ اِستِدلال نہیں ہے: اوّل یہ کہ غزوۂ اُحُد شوال ۳ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ خندق بقول محمد بن اسحاق، شوال ۵ھ میں اور بقول ابنِ سعد، ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کا فرق ہے۔ اب اگر غزوۂ اُحُد کے زمانے میں ابنِ عمرؓ ۱۴ سال کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوۂ خندق کے زمانے میں وہ صرف ۱۵ سال کے ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے

كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

آیا کریں جس طرح اُن کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اِس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے سامنے کھولتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔

اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں[۹۲]، نکاح کی اُمیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اُتار کر رکھ دیں[۹۳] تو اُن پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں[۹۴]۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو اُن کے حق میں اچھا ہے، اور اللہ سب کچھ سُنتا ہے اور جانتا ہے۔

---

۱۳ سال ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۴ سال، اور ۱۵ برس ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۵ سال کہہ دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ غیر محتلم لڑکے کے لیے ۱۵ برس کی عمر مقرر کرنا ایک قیاسی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

**۹۲ –** اصل میں قَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی ”عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں“ یا ”بیٹھی ہوئی عورتیں“۔ اس سے مراد ہے سِنِ یاس، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مر چکی ہوں اور اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ نہ پیدا ہوسکتا ہو۔ اسی معنیٰ کی طرف بعد کا فقرہ اشارہ کر رہا ہے۔

**۹۳ –** اصل الفاظ ہیں: يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ، ”اپنے کپڑے اتار دیں“۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد سارے کپڑے اُتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے تمام فقہا اور مفسرین نے بالاتفاق اس سے مراد وہ چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حکم سورۂ احزاب کی آیت يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ میں دیا گیا تھا۔

**۹۴ –** اصل الفاظ ہیں: غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ، ”زینت کے ساتھ تبرّج کرنے والی نہ ہوں“۔ تبرّج کے معنیٰ ہیں اظہار و نمایش کے۔ بارِج اُس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھت نہ ہو۔ اسی معنیٰ میں عورت کے لیے یہ لفظ اُس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرایش کا اظہار کرے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اتار دینے

لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا مِنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اٰبَآئِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اُمَّهٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اِخۡوَانِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَخَوٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَعۡمَامِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ عَمّٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَخۡوَالِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ خٰلٰتِكُمۡ اَوۡ مَا مَلَكۡتُمۡ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوۡ صَدِيۡقِكُمۡ ؕ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا جَمِيۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ فَاِذَا

کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمھارے اُوپر اِس میں کوئی مضایقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ، یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پُھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا اُن گھروں سے جن کی کُنجیاں تمھاری سُپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔[95] اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔[96] البتہ جب

کی یہ اجازت اُن بوڑھی عورتوں کو دی جا رہی ہے جن کے اندر بن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صِنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمایشِ زینت کی شکل اختیار کر رہی ہو، تو پھر اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

**۹۵** – اس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے: اوّل یہ کہ آیت کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اسی طرح کے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اَخلاقی تعلیمات سے اہلِ عرب کی ذہنیت میں جو زبردست انقلاب واقع ہوا تھا، اس کی وجہ سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حِس انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ ابنِ عباسؓ کے بقول، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو حکم دیا کہ لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ (ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے، حتّٰی کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحبِ خانہ کی دعوت و اجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اس میں اپنے گھروں سے کھانے کا جو ذکر ہے، وہ اجازت دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں

دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾ ع اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ

ع ۸ ۴ ۱۴

گھروں میں داخل ہُوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دُعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بُوجھ سے کام لو گے۔ ع

مومن[۹۷] تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام

اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معذور آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھا سکتا ہے، اس کی معذوری بجائے خود سارے معاشرے پر اس کا حق قائم کر دیتی ہے۔ اس لیے جہاں سے بھی اس کو کھانے کے لیے ملے وہ اس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی، تو اُن کے لیے ان کے اپنے گھر اور ان لوگوں کے گھر جن کا ذکر کیا گیا ہے، یکساں ہیں۔ اُن میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اِس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہو گی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جا سکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں، ان میں اولاد کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اس کا اپنا ہی گھر ہے۔

دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ان سے مراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں، جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ ان کا حلوا اُڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو در کنار، انھیں اس پر اُلٹی خوشی ہو۔

۹۶ – قدیم زمانے کے اہلِ عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اور کھائے۔ وہ مل کر ایک ہی جگہ کھانا برا سمجھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض قبیلے تنہا کھانے کو بُرا جانتے تھے، حتّٰی کہ فاقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

۹۷ – یہ آخری ہدایات ہیں جو مسلمانوں کی جماعت کا نظم و ضبط پہلے سے زیادہ کَس دینے کے لیے دی جا رہی ہیں۔

جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ

کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں[۹۸]۔ جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں[۹۹] تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو[۱۰۰] اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دُعائے مغفرت کیا کرو[۱۰۱]، اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔ مسلمانو! اپنے درمیان رسولؐ کے بُلانے کو آپس میں ایک دُوسرے کا سا بُلانا نہ سمجھ بیٹھو[۱۰۲]۔

۹۸ – یہی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشینوں اور اسلامی نظامِ جماعت کے اُمرا کا بھی ہے۔ جب کسی اجتماعی مقصد کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا جائے، قطع نظر اس سے کہ جنگ کا موقع ہو یا حالتِ امن کا، بہر حال ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر واپس چلے جائیں یا منتشر ہو جائیں۔

۹۹ – اس میں یہ تنبیہ ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر اجازت طلب کرنا تو سرے سے ہی ناجائز ہے۔ جواز کا پہلو صرف اُس صورت میں نکلتا ہے جب کہ جانے کے لیے کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو۔

۱۰۰ – یعنی ضرورت بیان کرنے پر بھی اجازت دینا یا نہ دینا رسول کی، اور رسول کے بعد امیرِ جماعت کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہو کہ اجتماعی ضرورت اُس شخص کی انفرادی ضرورت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے تو وہ پورا حق رکھتا ہے کہ اجازت نہ دے، اور اس صورت میں ایک مومن کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۱ – اس میں پھر تنبیہ ہے کہ اجازت طلب کرنے میں اگر ذرا سی بہانہ بازی کا بھی دخل ہو، یا اجتماعی ضروریات پر انفرادی ضروریات کو مُقدّم رکھنے کا جذبہ کارفرما ہو تو یہ ایک گناہ ہے۔ لہٰذا رسول اور اس کے جانشین کو صرف اجازت دینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ جسے بھی اجازت دے، ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ خدا تمھیں معاف کرے۔

۱۰۲ – اصل میں لفظ دُعَآء استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی بلانے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی۔ نیز دُعَآءَ الرَّسُوْلِ کے معنٰی رسول کا بلانا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے، اور رسول کو پکارنا بھی۔ ان مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی صحیح و معقول ہیں:

اوّل یہ کہ "رسولؐ کے بُلانے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بُلانے کی طرح نہ سمجھو"، یعنی رسولؐ کا بُلاوا غیر معمولی اہمیت

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع

ع ۹ ۴ ۱۵

اللہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دُوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چُپکے سے سَٹک جاتے ہیں[۱۰۳]۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو[۱۰۴] جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔ خبردار رہو، آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اُس کی طرف پلٹیں گے وہ اُنھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ع

---

رکھتا ہے۔ دوسرا کوئی بلائے اور تم لبیک نہ کہو تو تمھیں آزادی ہے، لیکن رسولؐ بلائے اور تم نہ جاؤ، یا دل میں ذرّہ برابر بھی تنگی محسوس کرو تو ایمان کا خطرہ ہے۔

دوم یہ کہ ''رسولؐ کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو''۔ وہ تم سے خوش ہو کر دعا دیں تو تمھارے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور ناراض ہو کر بد دعا دے دیں تو تمھاری اس سے بڑھ کر کوئی بدنصیبی نہیں۔

سوم یہ کہ ''رسولؐ کو پکارنا عام آدمیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح نہ ہونا چاہیے''۔ یعنی تم عام آدمیوں کو جس طرح اُن کے نام لے کر بآوازِ بلند پکارتے ہو، اُس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارا کرو۔ اس معاملے میں اُن کا انتہائی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، کیونکہ ذرا سی بے ادبی بھی اللہ کے ہاں مؤاخذے سے نہ بچ سکے گی۔

یہ تینوں مطلب اگرچہ معنٰی کے لحاظ سے صحیح ہیں اور قرآن کے الفاظ تینوں کو شامل ہیں، لیکن بعد کے مضمون سے پہلا مطلب ہی مناسبت رکھتا ہے۔

۱۰۳ – یہ منافقین کی ایک اور علامت بتائی گئی ہے کہ اسلام کی اجتماعی خدمات کے لیے جب بلایا جاتا ہے تو وہ آتو جاتے ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل رہنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حاضری ان کو سخت ناگوار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح چھپ چُھپا کر نکل بھاگتے ہیں۔

۱۰۴ – امام جعفرِ صادق رحمہ اللہ نے فتنے کا مطلب ''ظالموں کا تسلّط'' لیا ہے۔ یعنی اگر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو ان پر جابر و ظالم حکمراں مسلط کر دیے جائیں گے۔ بہرحال فتنے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اس کے سوا دوسری بے شمار صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً آپس کے تَفَرِقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظامِ جماعت کی پراگندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادّی طاقت کا ٹوٹ جانا، غیروں کا محکوم ہو جانا وغیرہ۔

---

# تفہیم القرآن

# الفرقان

(۲۵)

# الفُرقان

**نام** پہلی ہی آیت تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی قرآن کی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے نہ کہ عنوانِ مضمون کے طور پر۔ تاہم مضمونِ سورہ کے ساتھ یہ نام ایک قریبی مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

**زمانۂ نُزُول** اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول بھی وہی ہے جو سورۂ مومنون وغیرہ کا ہے، یعنی زمانۂ قیامِ مکہ کا دورِ متوسط۔ ابنِ جَرِیر اور امام رازی نے ضَحّاک بن مُزاحِم اور مُقاتِل بن سلیمان کی یہ رِوایَت نقل کی ہے کہ یہ سورت سورۂ نساء سے ۸ سال پہلے اُتری تھی۔ اِس حساب سے بھی اس کا زمانۂ نزول وہی دورِ متوسط قرار پاتا ہے۔ (ابنِ جَرِیر، جلد ۱۹، صفحہ ۲۸-۳۰۔ تفسیر کبیر، جلد ۶، صفحہ ۳۵۸)

**موضوع و مَباحِث** اس میں اُن شبہات و اعتراضات پر کلام کیا گیا ہے جو قرآن، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اور آپؐ کی پیش کردہ تعلیم پر کفارِ مکّہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اُن میں سے ایک ایک کا جچا تُلا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دعوتِ حق سے منہ موڑنے کے بُرے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اَخلاقی خوبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اُس کَسَوٹی پر کس کر دیکھ لو، کون کھوٹا ہے اور کون کھرا۔ ایک طرف اِس سیرت و کردار کے لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اب تک تیار ہوئے ہیں اور آیندہ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف وہ نمونۂ اَخلاق ہے جو عام اہلِ عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے جاہلیت کے عَلَم بردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اب خود فیصلہ کرو کہ ان دونوں نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟ یہ ایک غیر ملفوظ سوال تھا جو عرب کے ہر باشندے کے سامنے رکھ دیا گیا، اور چند سال کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس کا جو جواب دیا، وہ جَرِیدۂ روزگار پر ثبت ہو چکا ہے۔

---

آیاتہا ۷۷ ۔ سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ ۔ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ

نہایت متبرک[1] ہے وہ جس نے یہ فرقان[2] اپنے بندے پر نازل[3] کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے

۱ – اصل میں لفظ تَبٰرَكَ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار، ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے۔ اس کا مادّہ ب ر ک ہے، جس سے دو مصدر بَرَکۃ اور بُرُوک نکلے ہیں۔ بَرَکۃ میں افزونی، فراوانی، کثرت اور زیادتی کا تصور ہے، اور بُرُوک میں ثبات، بقا اور لُزُوم کا تصور۔ پھر جب اس مصدر سے تَبَارَکَ کا صیغہ بنایا جاتا ہے تو بابِ تفاعُل کی خصوصیت، مبالغہ اور اظہارِ کمال، اس میں اور شامل ہو جاتی ہے اور اس کا مفہوم انتہائی فراوانی، بڑھتی اور چڑھتی افزونی، اور کمال درجے کی پائیداری ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے کسی چیز کی فراوانی کے لیے، یا اس کے ثبات و دوام کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی اس سے مراد بلندی میں بہت بڑھ جانا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں: تبارکت النخلۃ، یعنی فلاں کھجور کا درخت بہت اونچا ہو گیا۔ اِصْمَعی کہتا ہے کہ ایک بدّو ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: تَبَارَکْتُ عَلَيْكُمْ "میں تم سے اونچا ہو گیا ہوں۔" کبھی اسے عظمت اور بزرگی میں بڑھ جانے کے لیے بولتے ہیں۔ کبھی اس کو فیض رسانی اور خیر اور بھلائی میں بڑھے ہوئے ہونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اس سے پاکیزگی و تقدس کا کمال مراد ہوتا ہے۔ اور یہی کیفیت اس کے معنیِ ثبوت و لُزوم کی بھی ہے۔ موقع و محل اور سیاق و سباق بتا دیتا ہے کہ کس جگہ اِس لفظ کا استعمال کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ یہاں جو مضمون آگے چل کر بیان ہو رہا ہے، اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے تَبٰرَكَ ایک معنیٰ میں نہیں، بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(۱) بڑا محسن اور نہایت باخیر، اس لیے کہ اس نے اپنے بندے کو فرقان کی عظیم الشان نعمت سے نواز کر دنیا بھر کو خبردار کرنے کا انتظام فرمایا۔

(۲) نہایت بزرگ و باعظمت، اس لیے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اُسی کی ہے۔

(۳) نہایت مقدس و مُنزّہ، اس لیے کہ اُس کی ذات ہر شائبۂ شرک سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی ہم جنس کہ ذاتِ خداوندی میں اس کا نظیر و مثیل ہو، اور نہ اس کے لیے فنا و تغیر کہ اسے جانشینی کے لیے بیٹے کی حاجت ہو۔

(۴) نہایت بلند و برتر، اس لیے کہ بادشاہی ساری کی ساری اسی کی ہے اور کسی دوسرے کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اختیارات میں اس کا شریک ہو سکے۔

(۵) کمالِ قدرت کے اعتبار سے برتر، اس لیے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور ہر شے کی تقدیر مقرر

نَذِيۡرَا ۙ۝۱ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ يَتَّخِذۡ وَلَدًا

نذیر ہو[۴] ــــ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک[۵] ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے[۶]،

کرنے والا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حاشیہ ۱۹)

**۲** ــ یعنی قرآنِ مجید۔ فرقان مصدر ہے مادّہ ف ر ق سے، جس کے معنٰی ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا، یا ایک ہی چیز کے اجزا کا الگ الگ ہونا۔ قرآنِ مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارِق کے معنٰی میں ہوا ہے، یا مفروق کے معنٰی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔ اگر اسے پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کَسَوٹی، اور فیصلہ کُن چیز، اور معیارِ فیصلہ (criterion) کے ہوں گے۔ اور اگر دوسرے معنٰی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزا پر مشتمل، اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزا پر مشتمل چیز کے ہوں گے۔ قرآنِ مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے ''الفرقان'' کہا گیا ہے۔

**۳** ــ اصل میں لفظ نَزَّلَ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا۔ اس تمہیدی مضمون کی مناسبت آگے چل کر آیت ۳۲ (رُکوع ۳) کے مطالعے سے معلوم ہوگی جہاں کفارِ مکہ کے اِس اعتراض پر گفتگو کی گئی ہے کہ ''یہ قرآن پورا کا پورا ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟''

**۴** ــ یعنی خبردار کرنے والا، مُتنبِّہ کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرانے والا۔ اِس سے مراد ''فرقان'' بھی ہو سکتا ہے، اور وہ ''بندہ'' بھی جس پر فرقان نازل کیا گیا۔ الفاظ ایسے جامع ہیں کہ دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے چونکہ دونوں ایک ہیں، اور ایک ہی کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہنا چاہیے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا کہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے، اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا ''اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' (الاَعْراف، آیت ۱۵۸) وَاُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ''میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے میں تم کو خبردار کروں اور جس جس کو بھی یہ پہنچے۔'' (الانعام آیت ۱۹) وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ''ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔'' (سبا، آیت ۲۸) وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ''اور ہم نے تم کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (الانبیاء، آیت ۱۰۷) اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بُعثت الی الاحمر والاسود، ''میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' اور کان النبی یبعث الی قومہ خاصة وبعثت الی الناس عامّة، ''پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' (بخاری و مسلم) اور وارسلت الی الخلق کافة وخُتِم بی النبیون، ''میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں، اور ختم کر دیے گئے میری آمد پر انبیا۔'' (مسلم)

وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾

جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے[7]، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔[8]

۵ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ’’ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے‘‘، یعنی وہی اس کا حق دار ہے اور اسی کے لیے وہ مخصوص ہے، کسی دوسرے کو نہ اس کا حق پہنچتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصّہ ہے۔

۶ – یعنی نہ تو کسی سے اس کا کوئی نسبی تعلق ہے، اور نہ کسی کو اس نے اپنا مُتَبَنّٰی بنایا ہے۔ کوئی ہستی کائنات میں ایسی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نسلی تعلق یا تَبَنِّیَت کے تعلق کی بنا پر اس کو معبودیت کا استحقاق پہنچتا ہو۔ اس کی ذات یکتائے محض ہے، کوئی اس کا ہم جنس نہیں، اور کوئی خدائی خاندان نہیں ہے کہ معاذ اللہ، ایک خدا سے کوئی نسل چلی ہو اور بہت سے خدا پیدا ہوتے چلے گئے ہوں۔ اس لیے وہ تمام مشرکین سراسر جاہل و گمراہ ہیں جنھوں نے فرشتوں، یا جنّوں، یا بعض انسانوں کو خدا کی اولاد سمجھا اور اس بنا پر انھیں دیوتا اور معبود قرار دے لیا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی نری جہالت و گمراہی میں مبتلا ہیں جنھوں نے نسلی تعلق کی بنا پر نہ سہی، کسی خُصوصیت کی بنا پر ہی سہی، اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ خداوندِ عالَم نے کسی شخص کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ ’’ بیٹا بنا لینے ‘‘ کے اس تصور کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے، یہ سخت غیر معقول نظر آتا ہے، کجا کہ یہ ایک امرِ واقعی ہو۔ جن لوگوں نے یہ تصور ایجاد یا اختیار کیا، ان کے گھٹیا ذہن ذاتِ الٰہی کی برتری کا تصور کرنے سے عاجز تھے۔ انھوں نے اُس ذاتِ بے ہمتا و بے نیاز کو انسانوں پر قیاس کیا، جو یا تو تنہائی سے گھبرا کر کسی دوسرے کے بچے کو گود لے لیتے ہیں، یا جذباتِ محبّت کے وُفور سے کسی کو بیٹا بنا لیتے ہیں، یا مُتَبَنّٰی بنانے کی اس لیے ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی تو اُن کا وارث اور ان کے نام اور کام کو زندہ رکھنے والا ہو۔ یہی تین وجوہ ہیں جن کی بنا پر انسانی ذہن میں تَبَنِّیَت کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور اِن میں سے جس وجہ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے، سخت جہالت اور گستاخی اور کم عقلی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حواشی ۶۶ تا ۶۸)

۷ – اصل میں لفظ مُلْك استعمال ہوا ہے، جو عَرَبی زبان میں بادشاہی، اقتدارِ اعلیٰ، اور حاکمیت (sovereignity) کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مُطلَق ہے اور فرمانروائی کے اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اِس بات کو مُستلزم ہے کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان جس کو بھی معبود بناتا ہے، یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھا یا برا اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو ملجا و ماویٰ بنانے کے لیے کوئی احمق سے احمق انسان بھی کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کے سوا اس کائنات میں کسی کے پاس بھی کوئی زور نہیں ہے، تو پھر نہ کوئی گردن اُس کے سوا کسی کے آگے اظہارِ عجز و نیاز کے لیے جھکے گی، نہ کوئی ہاتھ اُس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لیے بڑھے گا، نہ کوئی زبان اُس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی، یا دعا و التجا کے لیے کھلے گی، اور نہ دنیا کے کسی نادان سے نادان آدمی سے بھی کبھی یہ حماقت سرزد ہو سکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کی طاعت و بندگی بجا لائے، یا کسی کو بذاتِ خود حکم چلانے کا حق دار مانے۔ اس مضمون کو مزید تقویت اوپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبُود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں[9]، جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں نہ جِلا سکتے ہیں، نہ مَرے ہوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں[10]۔

’’آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے اور اُسی کے لیے ہے۔‘‘

۸ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ’’ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر رکھا‘‘، یا ’’ہر چیز کے لیے ٹھیک پیمانہ مقرر کیا‘‘۔ لیکن خواہ کوئی ترجمہ بھی کیا جائے، بہر حال اس سے پورا مطلب ادا نہیں ہوتا۔ پورا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ کائنات کی ہر چیز کو وجود بخشا ہے، بلکہ وہی ہے جس نے ایک ایک چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت واستعداد، اوصاف وخصائص، کام اور کام کا طریق، بقا کی مدت، عُروج وارتقا کی حد، اور دوسری وہ تمام تفصیلات مقرر کی ہیں جو اُس چیز کی ذات سے متعلق ہیں، اور پھر اسی نے عالَمِ وجود میں وہ اسباب ووسائل اور مواقع پیدا کیے ہیں جن کی بدولت ہر چیز یہاں اپنے اپنے دائرے میں اپنے حصّے کا کام کر رہی ہے۔

اس ایک آیت میں توحید کی پوری تعلیم سمیٹ دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی جامع آیات میں سے یہ ایک عظیم الشان آیت ہے جس کے چند الفاظ میں اتنا بڑا مضمون سمو دیا گیا ہے کہ ایک پوری کتاب بھی اس کی وسعتوں کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ کان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم اذا افصح الغلام من بنی عبدالمطلب علمہ ھٰذہ الاٰیۃ، ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قاعدہ تھا کہ حضورؐ کے خاندان میں جب کسی بچے کی زبان کھل جاتی تھی تو آپؐ یہ آیت اسے سکھاتے تھے۔‘‘ (مُصَنَّفِ عبدالرزاق ومُصَنَّفِ ابنِ ابی شَیْبَہ، بروایت عَمْرو بن شُعَیب عن اَبیہ عن جَدِّہٖ) اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے ذہن میں توحید کا پورا تصور بٹھانے کے لیے یہ آیت ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کے بچے جب ہوشیار ہونے لگیں تو آغاز ہی میں ان کے ذہن پر یہ نقش ثبت کر دے۔

۹ – جامع الفاظ ہیں جو ہر قسم کے جعلی معبودوں پر حاوی ہیں۔ وہ بھی جن کو خدا نے پیدا کیا اور انسان ان کو معبود مان بیٹھا، مثلاً فرشتے، جن، انبیاء، اولیا، سورج، چاند، سیّارے، درخت، دریا، جانور وغیرہ۔ اور وہ بھی جن کو انسان خود بناتا ہے اور خود ہی معبود بنا لیتا ہے، مثلاً پتھر اور لکڑی کے بُت۔

۱۰ – حاصلِ کلام یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ایک بندے پر فرقان اس لیے نازل کیا کہ حقیقت تو تھی وہ، اور لوگ اس سے غافل ہو کر پڑ گئے اِس گمراہی میں، لہٰذا ایک بندہ نذیر بنا کر اُٹھایا گیا ہے، تاکہ لوگوں کو اس حماقت کے بُرے نتائج سے

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶

معانقة ١٠

---

جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اِس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دُوسرے لوگوں نے اِس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم[11] اور سخت جھُوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اِسے صبح و شام سُنائی جاتی ہیں۔ اَے محمدؐ! ان سے کہو کہ ”اِسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے[12]۔“ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفورٌ رحیم ہے[13]۔

---

خبردار کرے، اور اس پر بتدریج یہ فرقان نازل کرنا شروع کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے وہ حق کو باطل سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے دکھا دے۔

**۱۱** – دوسرا ترجمہ ”بڑی بے انصافی کی بات“ بھی ہوسکتا ہے۔

**۱۲** – یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مُستشرقینِ مغرب قرآنِ مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بُحَیرا راہب سے جب ملے تھے، اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے، اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی رَبّیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم تھا۔یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے، اُن کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سیکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں بُحَیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، یا ۲۵ برس کی عمر سے، جب کہ اس نے تجارتی سفر شروع کیے تھے، حاصل ہونی شروع ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمّازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اتنے سفید جھوٹ کی جرأت نہ کی اور اُسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص اَن پڑھ ہے۔خود مُطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔چالیس برس کی عمر تک اُن باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان

ں رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن قتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انھیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انھیں ر کے ہمیں دن کو سناتا ہے۔ رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ تاب تھے، پڑھے لکھے تھے، اور مکے میں رہتے تھے، یعنی عَدّاس (حُوَیطِب بن عبد العُزّٰی کا آزاد کردہ غلام)، یَسار عَلا بن الحَضرَمی کا آزاد کردہ غلام)، اور جَبْرْ (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وَحْی کے دعوے کو ردّ کرنے کے لیے نبی کے مَآخذِ علم کی نشان دِہی کر دینے سے بڑھ کر اور کون سا اعتراض وزنی ہوسکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اُٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کا بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے اور اس کو یوں حقارت سے ردّ کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس ''جھوٹ اور ظلم'' کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا، نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا، اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اِس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گُتّھی کا حل ہمیں اُسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفینِ اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا:

پہلی بات یہ تھی کہ مکے کے وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کُوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمدؐ کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زَعم میں اِس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئین و ضابطہ مانع نہ تھا، اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوتِ محمدی کے خطرے کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کُن قدم اُٹھا کر انھوں نے نہ دکھایا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس سلسلے میں وہ جن لوگوں کے نام لیتے تھے، وہ کہیں باہر کے نہ تھے، اسی شہرِ مکہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چھُپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں، وہ کس پایے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زورِ کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمدؐ ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں، ورنہ اس قول میں کسی شبہے کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے، وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے

تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انھوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انھیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے؟

تیسری بات یہ تھی کہ وہ سب اشخاص، جن کا اس سلسلے میں نام لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقت ور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے وِلاء (سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت، معاذ اللہ، ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپؐ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر ایسے شخص کے وہ مخلص رفیقِ کار اور سچّے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انھی سے کچھ باتیں سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب و مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کُوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انھوں نے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا، اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انھی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چمکائی جا رہی ہے؟

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس ضَرْبُ الْمَثَل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابۂ کرامؓ آنحضورؐ کی ذاتِ مقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود وہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنھوں نے اس کے بنانے کی سازش میں خود حصّہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہلِ ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عدّاس اور یَسار اور جَبر کے بل بُوتے پر، اور نبی کے دستِ راست بنیں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ابوعُبَیدہؓ؟

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جاتا تھا تو وہ زیدؓ بن حارثہ، علیؓ بن ابی طالب، ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے اُن لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب و روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟ اس الزام میں برائے نام بھی کوئی شائبۂ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضورؐ پر ایمان لاتے اور آپؐ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات و نقصانات برداشت کرتے؟ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں، اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔

۱۳ – اس جگہ یہ فقرہ بڑا معنیٰ خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا شان ہے خدا کی رحیمی و غفّاری کی، جو لوگ حق کو نیچا دکھانے

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا

کہتے ہیں: ”یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے[۱۴]؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا[۱۵]؟ یا اور کچھ نہیں تو اِس کے لیے کوئی خزانہ ہی اُتار دیا جاتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا[۱۶]۔“ اور ظالم کہتے ہیں: ”تم لوگ تو ایک سحر زدہ[۱۷] آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔“ دیکھو، کیسی کیسی عجیب حُجّتیں یہ لوگ تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں، ایسے بہکے ہیں کہ کوئی

---

کے لیے ایسے ایسے جھوٹ کے طوفان اٹھاتے ہیں، اُن کو بھی وہ مہلت دیتا ہے اور سنتے ہی عذاب کا کوڑا نہیں برسا دیتا۔ اس تنبیہ کے ساتھ اس میں ایک پہلو تلقین کا بھی ہے کہ ظالمو! اب بھی اگر عناد سے باز آ جاؤ اور حق بات کو سیدھی طرح مان لو تو جو کچھ آج تک کرتے رہے ہو، وہ سب معاف ہو سکتا ہے۔

۱۴ – یعنی اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوندِ عالَم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر، اُن کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۲۶)

۱۵ – یعنی اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔

۱۶ – یہ گویا بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ

ع ۱۲/۱

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹ ع تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا

ٹھکانے کی بات اِن کو نہیں سُوجھتی۔[18] ع بڑا بابرکت ہے[19] وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی

نصیب، اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ ربّ العالمین کے پیغمبر ہیں۔

۱۷۔ یعنی دیوانہ۔ اہلِ عرب کے نزدیک دیوانگی کے دو ہی وجوہ تھے: یا تو کسی پر جن کا سایہ ہو گیا ہو۔ یا کسی دشمن نے جادو کر کے پاگل بنا دیا ہو۔ ایک تیسری وجہ ان کے نزدیک اور بھی تھی، اور وہ یہ کہ کسی دیوی، یا دیوتا کی شان میں آدمی کوئی گستاخی کر بیٹھا ہو اور اس کی مار پڑ گئی ہو۔ کفارِ مکہ وقتاً فوقتاً یہ تینوں وجوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرتے تھے۔ کبھی کہتے: اس شخص پر کسی جن کا تسلط ہو گیا ہے۔ کبھی کہتے: کسی دشمن نے بیچارے پر جادو کر دیا ہے۔ اور کبھی کہتے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی کی بے ادبی کرنے کا خمیازہ ہے جو غریب بھگت رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اتنا ہوشیار بھی مانتے تھے کہ ایک دار الترجمہ اس شخص نے قائم کر رکھا ہے اور پرانی پرانی کتابوں کے اقتباسات نکلوا نکلوا کر یاد کرتا ہے۔ مزید برآں وہ آپؐ کو ساحر اور جادوگر بھی کہتے تھے۔ گویا آپؐ ان کے نزدیک مسحور بھی تھے اور ساحر بھی۔ اس پر ایک اور ردّا شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا۔

۱۸۔ یہ اعتراضات بھی جواب دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ ان کی جو باتیں اوپر نقل کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جائے۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ مخالفین کا دامن معقول دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلّل اُصولی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے: لوگو! یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی، بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے: کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے: جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے: تم دنیا میں شُترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو، تمھیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور اس حقیقت پر یہ اَخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی اُمور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے: شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے: میں خدا کی طرف سے تمھارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی، بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے، اور اس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیرووں کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمھاری اَرْدَلی میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمھارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بے تُکی ہانک رہا ہے۔

مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۟ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا

زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، (ایک نہیں) بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور بڑے بڑے محل۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اُس گھڑی"[20] کو جھٹلا چکے ہیں[21] ـــــــ اور جو اُس گھڑی کو جھٹلائے، اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر رکھی ہے۔ وہ جب

۱۹ — یہاں پھر وہی تَبٰرَكَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنیٰ ہیں "بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے"۔ "غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے"۔ "اِس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے"۔

۲۰ — اصل میں لفظ اَلسَّاعَةِ استعمال ہُوا ہے۔ ساعت کے معنیٰ گھڑی اور وقت کے ہیں اور ال اس پر عہد کا ہے، یعنی وہ مخصوص گھڑی جو آنے والی ہے، جس کے متعلق ہم پہلے تم کو خبر دے چکے ہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر اُس وقتِ خاص کے لیے بولا گیا ہے جب کہ قیامت قائم ہوگی، تمام اوّلین وآخرین ازسرِ نو زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے، سب کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے عقیدہ وعمل کے لحاظ سے جزا یا سزا دے گا۔

۲۱ — یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو واقعی کسی قابلِ لحاظ بنیاد پر قرآن کے جعلی کلام ہونے کا شبہ ہے، یا ان کو درحقیقت یہ گمان ہے کہ جن آزاد کردہ غلاموں کے یہ نام لیتے ہیں، وہی تم کو سکھاتے پڑھاتے ہیں، یا انھیں تمھاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، یا وہ تمھاری تعلیم حق کو مان لینے کے لیے تیار تھے مگر صرف اس لیے رک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمھاری اَرْدَلی میں تھا اور نہ تمھارے لیے کوئی خزانہ اتارا گیا تھا۔ اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ آخرت کا انکار ہے جس نے ان کو حق اور باطل کے معاملے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور وفکر اور تحقیق وجستجو کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، اور تمھاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لیے ایسی ایسی مضحکہ انگیز حجتیں پیش کرنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہن اس تخیل سے خالی ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں انھیں خدا کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس چار دن کی زندگی کے بعد مر کر سب کو مٹی ہو جانا ہے۔ بُت پرست بھی مٹی ہو جائے گا اور خدا پرست بھی اور منکرِ خدا بھی۔ نتیجہ کسی چیز کا بھی کچھ نہیں نکلنا ہے۔ پھر کیا فرق پڑ جاتا ہے مشرک ہو کر مرنے اور مؤحد یا ملحد ہو کر مرنے میں۔ صحیح اور غلط کے امتیاز کی اگر ان کے نزدیک کوئی ضرورت ہے تو اِس دنیا کی کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے ہے۔ اور یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کسی عقیدے یا اَخلاقی اُصول کا بھی کوئی متعین نتیجہ نہیں ہے جو پوری یکسانی کے ساتھ ہر شخص اور ہر رَوِیّے کے معاملے میں نکلتا ہو۔ دہریے، آتش پرست، عیسائی،

رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ سَمِعُوۡا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيۡرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيۡنَ دَعَوۡا هُنَالِكَ ثُبُوۡرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدۡعُوا الۡيَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا كَثِيۡرًا ﴿۱۴﴾ قُلۡ اَذٰلِكَ خَيۡرٌ اَمۡ جَنَّةُ الۡخُلۡدِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ كَانَتۡ لَهُمۡ جَزَآءً وَّمَصِيۡرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ خٰلِدِيۡنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۶﴾

دُور سے اِن کو دیکھے[۲۲] گی تو یہ اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سُن لیں گے۔ اور جب یہ دست و پا بستہ اُس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو۔

اِن سے پوچھو: یہ انجام اچھا ہے یا وہ اَبدی جنّت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے؟ جو اُن کے عمل کی جزا اور اُن کے سفر کی آخری منزل ہوگی، جس میں اُن کی ہر خواہش پُوری ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جس کا عطا کرنا تمھارے رب کے ذمّے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔[۲۳]

موسائی، ستارہ پرست، بُت پرست، سب اچھے اور بُرے دونوں ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی ایک عقیدہ نہیں جس کے متعلق تجرِبہ بتاتا ہو کہ اسے اختیار کرنے والا، یا رد کر دینے والا اِس دنیا میں لازماً خوشحال یا لازماً بدحال رہتا ہو۔ بدکار اور نیکوکار بھی یہاں ہمیشہ اپنے اعمال کا ایک ہی مقرر نتیجہ نہیں دیکھتے۔ ایک بدکار مزے کر رہا ہے اور دوسرا سزا پا رہا ہے۔ ایک نیکوکار مصیبت جھیل رہا ہے تو دوسرا معزز و محترم بنا ہوا ہے۔ لہٰذا دنیوی نتائج کے اعتبار سے کسی مخصوص اخلاقی رَوَیّے کے متعلق بھی منکرینِ آخرت اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ خیر ہے یا شر ہے۔ اس صورتِ حال میں جب کوئی شخص ان کو ایک عقیدے اور ایک اَخلاقی ضابطے کی طرف دعوت دیتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی سنجیدہ اور معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت پیش کرے، ایک منکرِ آخرت کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا، بلکہ طفلانہ اعتراضات کر کے اسے ٹال دے گا۔

۲۲ – آگ کا کسی کو دیکھنا ممکن ہے کہ استعارے کے طور پر ہو، جیسے ہم کہتے ہیں، وہ جامع مسجد کے مینار تم کو دیکھ رہے ہیں، اور ممکن ہے حقیقی معنوں میں ہو، یعنی جہنّم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح بے شعور نہ ہو بلکہ دیکھ بھال کر جلانے والی ہو۔

۲۳ – اصل الفاظ ہیں: وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا یعنی ایسا وعدہ جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شخص یہ سوال اُٹھا سکتا ہے کہ جنت کا یہ وعدہ اور دوزخ کا یہ ڈراوا کسی ایسے شخص پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ

اور وہی دن ہوگا جب کہ (تمھارا رب) اِن لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے اُن معبُودوں[۲۴] کو بھی بُلا لے گا جنھیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پُوج رہے ہیں، پھر وہ اُن سے پُوچھے گا: "کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟[۲۵]" وہ عرض کریں گے: "پاک ہے آپ کی ذات،

جو قیامت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا پہلے ہی منکر ہو؟ اس لحاظ سے تو یہ بظاہر ایک بے محل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ میں ایک بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا تو بحث و حجت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں اپنے مخاطَب سے اِس انداز میں گفتگو کر رہا ہوں کہ زیرِ بحث مسئلہ میری بات ماننے یا نہ ماننے کا نہیں بلکہ تمھارے اپنے مفاد کا ہے، تو مخاطَب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے۔ اس صورت میں مخاطَب کو خود اپنی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہر حال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اور امکان دونوں ہی کا ہے۔ اب اگر دوسری زندگی نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں، تو ہمیں بھی مر کر مٹی ہو جانا ہے اور آخرت کے قائل کو بھی۔ اس صورت میں دونوں برابر رہیں گے۔ لیکن اگر کہیں بات وہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے، تو یقیناً پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ اس طرح یہ طرزِ کلام مخاطَب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جانے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲، حاشیہ ۶۹۔ الاحقاف، آیت ۱۰)

۲۴ – آگے کا مضمون خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں معبُودوں سے مراد بُت نہیں ہیں بلکہ فرشتے، انبیا، اولیا، شہدا اور صالحین ہیں جنھیں مختلف قوموں کے مشرکین معبُود بنا بیٹھے ہیں۔ بظاہر ایک شخص وَمَا يَعْبُدُوْنَ کے الفاظ پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ اس سے مراد بُت ہیں، کیونکہ عربی زبان میں عُموماً مَا غیر ذوی العقول اور مَنْ ذوی العقول کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے ہم اُردو زبان میں "کیا ہے" غیر ذوی العقول اور "کون ہے" ذوی العقول کے لیے بولتے ہیں۔ مگر اردو کی طرح عربی میں بھی یہ الفاظ بالکل اِن معنوں کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ بسا اوقات ہم اُردو میں کسی انسان کے متعلق تحقیر کے طور پر کہتے ہیں: "وہ کیا ہے" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کوئی بڑی ہستی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال عربی زبان کا بھی ہے۔ چونکہ معاملہ اللہ کے مقابلے میں اس کی مخلوق کو معبُود بنانے کا ہے، اس لیے خواہ فرشتوں اور بزرگ انسانوں کی حیثیت بجائے خود بہت بلند ہو مگر اللہ کے مقابلے میں تو گویا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے موقع و محل کی مناسبت سے ان کے لیے مَنْ کے بجائے مَا کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔

مَا كَانَ يَنْبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ

ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے اِن کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا، حتّٰی کہ یہ سبق بُھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔[۲۶] "یوں جُھٹلا دیں گے وہ (تمھارے معبُود) تمھاری اُن باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو،[۲۷] پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے۔

۲۵ – یہ مضمون متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ سَبا میں ہے: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ۝ "جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمھاری ہی بندگی کر رہے تھے؟ وہ کہیں گے: پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اِن سے۔ یہ لوگ تو جِنّوں (یعنی شیاطین) کی بندگی کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر اُنھی کے مومن تھے۔" (آیات: ۴۰–۴۱) اسی طرح سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں ہے: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۚ بِحَقٍّ ۖ ...... مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ "اور جب اللہ پوچھے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ وہ عرض کرے گا: پاک ہے آپ کی ذات، میرے لیے یہ کب زیبا تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا...... میں نے تو ان سے بس وہی کچھ کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔"

۲۶ – یعنی یہ کم ظرف اور کمینے لوگ تھے۔ آپ نے رزق دیا تھا کہ شکر کریں۔ یہ کھا پی کر نمک حرام ہو گئے اور وہ سب نصیحتیں بھلا بیٹھے جو آپ کے بھیجے ہوئے انبیاؑ نے ان کو کی تھیں۔

۲۷ – یعنی تمھارا یہ مذہب، جس کو تم حق سمجھے بیٹھے ہو، بالکل بے اصل ثابت ہو گا، اور تمھارے وہ معبُود جن پر تمھیں بھروسا ہے کہ یہ خدا کے ہاں ہمارے سِفارشی ہیں، اُلٹے تم کو خطا کار ٹھیرا کر بری الذمہ ہو جائیں گے۔ تم نے جو کچھ بھی اپنے معبُودوں کو قرار دے رکھا ہے، بطورِ خود ہی قرار دے رکھا ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تم سے یہ نہ کہا تھا کہ ہمیں یہ کچھ مانو، اور اس طرح ہماری نذر و نیاز کیا کرو، اور ہم خدا کے ہاں تمھاری سفارش کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ ایسا کوئی قول کسی فرشتے یا کسی بزرگ کی طرف سے نہ یہاں تمھارے پاس موجود ہے، نہ قیامت میں تم اسے ثابت کر سکو گے، بلکہ وہ سب کے سب خود تمھاری آنکھوں کے سامنے ان باتوں کی تردید کریں گے اور تم اپنے کانوں سے ان کی تردید سن لو گے۔

وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾ ع

ع ۲ ۱۱/۱۷

اور جو بھی تم میں سے ظلم[28] کرے، اُسے ہم سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

اے محمدؐ! تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے، وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔[29] دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دُوسرے کے لیے آزمایش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔[30] کیا تم صبر کرتے ہو؟[31] تمھارا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔[32] ع

**۲۸ —** یہاں ظلم سے مراد حقیقت اور صداقت پر ظلم ہے، یعنی کفر و شرک۔ سِیاق وسَباق خود ہی ظاہر کر رہا ہے کہ نبی کو نہ ماننے والے اور خدا کے بجائے دوسروں کو معبُود بنا بیٹھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے ''ظلم'' کے مرتکب قرار دیے جا رہے ہیں۔

**۲۹ —** یہ جواب ہے کفارِ مکہ کی اُس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفارِ مکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاؑ سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اُٹھا رہے ہو؟ پہلے کون سا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟ اور تو اور، خود عیسٰی بن مریم علیہ السلام، جن کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے (اور جن کا مجسمہ کفارِ مکہ نے بھی کعبہ میں رکھ چھوڑا تھا) انجیلوں کے اپنے بیان کے مطابق کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔

**۳۰ —** یعنی رسول اور اہلِ ایمان کے لیے منکرین آزمایش ہیں اور منکرین کے لیے رسول اور اہلِ ایمان۔ منکرین نے ظلم وستم اور جاہلانہ عداوت کی جو بھٹی گرم کر رکھی ہے، وہی تو وہ ذریعہ ہے جس سے ثابت ہوگا کہ رسول اور اس کے صادق الایمان پیرو کھرا سونا ہیں۔ کھوٹ جس میں بھی ہوگی، وہ اس بھٹی سے بخیریت نہ گزر سکے گا، اور اس طرح خالص اہلِ ایمان کا ایک چیدہ گروہ چھَٹ کر نکل آئے گا جس کے مقابلے میں پھر دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکے گی۔ یہ بھٹی گرم نہ ہو تو ہر طرح کے کھوٹے اور کھرے آدمی نبی کے گرد جمع ہو جائیں گے، اور دین کی ابتدا ہی ایک خام جماعت سے ہوگی۔ دوسری طرف منکرین کے لیے بھی رسول اور اصحابِ رسول ایک سخت آزمایش ہیں۔ ایک عام انسان کا اپنی ہی برادری کے درمیان سے یکایک نبی بنا کر اُٹھا دیا جانا، اُس کے پاس کوئی فوج فرّا اور مال و دولت نہ ہونا، اس کے ساتھ کلامِ الٰہی اور پاکیزہ سیرت کے سوا کوئی عجُوبہ چیز نہ ہونا،

الجزء ۱۹

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں ”کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟[۳۳] یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں۔“[۳۴] بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں[۳۵] اور حد سے گزر گئے یہ اپنی سرکشی میں۔

اُس کے ابتدائی پیروؤں میں زیادہ تر غریبوں، غلاموں اور نوعمر لوگوں کا شامل ہونا اور اللہ تعالیٰ کا اِن چند مٹھی بھر انسانوں کو گویا بھیڑیوں کے درمیان بے سہارا چھوڑ دینا، یہی وہ چھلنی ہے جو غلط قسم کے آدمیوں کو دین کی طرف آنے سے روکتی ہے، اور صرف ایسے ہی لوگوں کو چھان چھان کر آگے گزارتی ہے جو حق کو پہچاننے والے اور راستی کو ماننے والے ہوں۔ یہ چھلنی اگر نہ لگائی جاتی اور رسول بڑی شان وشوکت کے ساتھ آ کر تختِ فرماں روائی پر جلوہ گر ہوتا، خزانوں کے منہ اس کے ماننے والوں کے لیے کھول دیے جاتے، اور سب سے پہلے بڑے بڑے رئیس آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے، تو آخر کون سا دنیا پرست اور بندۂ غرض انسان اتنا احمق ہوسکتا تھا کہ اس پر ایمان لانے والوں میں شامل نہ ہو جاتا۔ اس صورت میں تو راستی پسند لوگ سب سے پیچھے رہ جاتے اور دنیا کے طالب بازی لے جاتے۔

**۳۱**۔ یعنی اس مَصلَحت کو سمجھ لینے کے بعد کیا اب تم کو صبر آ گیا کہ آزمائش کی یہ حالت اُس مقصدِ خیر کے لیے نہایت ضروری ہے جس کے لیے تم کام کر رہے ہو؟ کیا اب تم وہ چوٹیں کھانے پر راضی ہو جو اس آزمائش کے دَور میں لگنی ناگزیر ہیں؟

**۳۲**۔ اس کے دو معنیٰ ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تمھارا رب جو کچھ کر رہا ہے، کچھ دیکھ کر ہی کر رہا ہے، اس کی نگری اندھیر نگری نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس خلوص اور راست بازی کے ساتھ اس کٹھن خدمت کو تم انجام دے رہے ہو، وہ بھی تمھارے رب کی نگاہ میں ہے، اور تمھاری مساعیِ خیر کا مقابلہ جن زیادتیوں اور بے ایمانیوں سے کیا جا رہا ہے، وہ بھی اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا پورا اطمینان رکھو کہ نہ تم اپنی خدمات کی قدر سے محروم رہو گے اور نہ وہ اپنی زیادتیوں کے وبال سے بچے رہ جائیں گے۔

**۳۳**۔ یعنی اگر واقعی خدا کا ارادہ یہ ہے کہ ہم تک اپنا پیغام پہنچائے، تو ایک نبی کو واسطہ بنا کر صرف اُس کے پاس فرشتہ بھیج دینا کافی نہیں ہے، ہر شخص کے پاس ایک فرشتہ آنا چاہیے جو اسے بتائے کہ تیرا رب تجھے یہ ہدایت دیتا ہے۔ یا فرشتوں کا ایک وفد مجمع عام میں ہم سب کے سامنے آجائے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ سورۂ انعام میں بھی ان کے اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے: وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ ”جب کوئی آیت ان کے سامنے پیش ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ ہمیں وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کا کیا انتظام کرے۔“ (آیت ۱۲۴)

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ

جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ ہوگا،[۳۶] چیخ اٹھیں گے کہ پناہ، بخدا! اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے۔[۳۷] بس وہی لوگ جو جنّت کے مستحق ہیں اُس دن اچھی جگہ ٹھیریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے۔[۳۸] آسمان کو چیرتا ہُوا ایک بادل اُس روز نمودار ہوگا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اُتار دیے جائیں گے۔ اُس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمٰن کی ہوگی۔[۳۹]

۳۴- یعنی اللہ میاں خود تشریف لے آئیں اور فرمائیں کہ بندو! میری تم سے یہ التماس ہے۔

۳۵- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”بڑی چیز سمجھ لیا اپنی دانست میں انھوں نے اپنے آپ کو“۔

۳۶- یہی مضمون سورۂ انعام، آیت ۸ اور سورۂ حِجر، آیات ۷-۸ اور آیات ۵۱ تا ۶۴ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۹۰ تا ۹۵ میں بھی کفار کے بہت سے عجیب وغریب مطالبات کے ساتھ اِس کا ذکر کر کے جواب دیا گیا ہے۔

۳۷- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۲۵-۲۶۔

۳۸- یعنی میدانِ حشر میں جنت کے مستحق لوگوں کے ساتھ مجرمین سے مختلف معاملہ ہوگا۔ وہ عزت کے ساتھ بٹھائے جائیں گے اور روزِ حشر کی سخت دوپہر گزارنے کے لیے اُن کو آرام کی جگہ دی جائے گی۔ اُس دن کی ساری سختیاں مجرموں کے لیے ہوں گی نہ کہ نیکوکاروں کے لیے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، حضورؐ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ اِنّہٗ لیخفف علی المؤمن حتی یکون اخف علیہ من صلوۃ مکتوبۃ یصلیھا فی الدنیا۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کا عظیم الشان اور خوفناک دن ایک مومن کے لیے بہت ہلکا کر دیا جائے گا، حتّٰی کہ اتنا ہلکا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے۔“ (مُسندِ احمد بروایتِ ابی سعید خُدریؓ)

۳۹- یعنی وہ ساری مجازی بادشاہیاں اور ریاستیں ختم ہو جائیں گی جو دنیا میں انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہاں صرف ایک بادشاہی باقی رہ جائے گی اور وہ وہی اللہ کی بادشاہی ہے جو اس کائنات کا حقیقی فرمانروا ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہُوا ہے: يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ”وہ

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى

اور وہ منکرین کے لیے بڑا سخت دن ہوگا۔ ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی! کاش میں نے فُلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اُس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی، شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"[40] اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک[41] بنا لیا تھا۔"
اے محمدؐ! ہم نے تو اِسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے[42] اور تمھارے لیے تمھارا

دن جب کہ یہ سب لوگ بے نقاب ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چُھپی ہوئی نہ ہوگی۔ پوچھا جائے گا: آج بادشاہی کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب آئے گا: اکیلے اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔" (آیت ١٦) حدیث میں اس مضمون کو اور زیادہ کھول دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک ہاتھ میں آسمانوں اور دوسرے ہاتھ میں زمین کو لے کر فرمائے گا: انا الملك، انا الديان، اين ملوك الارض؟ اين الجبارون ؟ اين المتكبرون؟ "میں ہوں بادشاہ، میں ہوں فرمانروا، اب کہاں ہیں وہ زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں وہ جبار؟ کہاں ہیں وہ متکبر لوگ؟" (یہ روایت مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، اور ابوداؤد میں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے)۔

۴٠ — ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کافر ہی کے قول کا ایک حصہ ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ اس دوسری صورت میں مناسب ترجمہ یہ ہوگا: "اور شیطان تو ہے ہی انسان کو عین وقت پر دغا دینے والا"۔

۴١ — اصل میں لفظ مَهْجُوْرًا استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنیٰ ہیں۔ اگر اسے هَجْر سے مُشتَق مانا جائے تو معنیٰ ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا، نہ اسے قبول کیا اور نہ اس سے کوئی اثر لیا۔ اور اگر هُجْر سے مُشتَق مانا جائے تو اس کے دو معنیٰ ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ انھوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اسے اپنے ہذیان اور اپنی بکواس کا ہدف بنا لیا اور اس پر طرح طرح کی باتیں چھانٹتے رہے۔

بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۛ كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا ﴿٣٢﴾ وَ

رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔[۴۳]

منکرین کہتے ہیں: "اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟"[۴۴] ــــ ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمھارے ذہن نشین کرتے رہیں[۴۵] اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے)

۴۲ – یعنی آج جو دشمنی تمھارے ساتھ کی جا رہی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب کوئی نبی حق اور راستی کی دعوت دینے اُٹھا تو وقت کے سارے جرائم پیشہ لوگ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ مضمون سورۂ اَنعام آیات ۱۱۲ – ۱۱۳ میں بھی گزر چکا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دشمن بنایا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانونِ فطرت یہی کچھ ہے، لہٰذا ہماری اس مَشِیَّت پر صبر کرو، اور قانونِ فطرت کے تحت جن حالات سے دو چار ہونا ناگزیر ہے، ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔ اس بات کی اُمید نہ رکھو کہ اِدھر تم نے حق پیش کیا اور اُدھر ایک دنیا کی دنیا اُسے قبول کرنے کے لیے اُمنڈ آئے گی، اور سارے غلط کار اپنی غلط کاریوں سے تائب ہو کر اسے ہاتھوں ہاتھ لینے لگیں گے۔

۴۳ – رہنمائی سے مراد صرف علمِ حق عطا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ تحریکِ اسلامی کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے، اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لیے بر وقت صحیح تدبیریں سُجھانا بھی ہے۔ اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کُھلیں، ہر ایک پر اہلِ حق کی تائید میں کُمک پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہلِ حق کو حُجَّتِ بالغہ عطا کرتا ہے۔ اَخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہلِ حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے۔ تنظیم کا مقابلہ ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل پھاڑتا اور اہلِ حق کے دل جوڑتا ہے۔ انسانی طاقت کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص اور گروہوں کو لا لا کر اہلِ حق کی جمعیت بڑھاتا ہے۔ مادّی وسائل کی ضرورت ہو تو وہی اہلِ حق کے تھوڑے مال و اسباب میں وہ برکت دیتا ہے کہ اہلِ باطل کے وسائل کی فراوانی ان کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹٹّی ثابت ہوتی ہے۔ غرض کوئی پہلو مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہلِ حق کے لیے اللہ کافی نہ ہو اور انھیں کسی دوسرے سہارے کی حاجت ہو، بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمان و اعتماد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں، بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑائیں۔

یہ بات نگاہ میں رہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصّہ نہ ہوتا تو پہلا حصّہ انتہائی دل شکن تھا۔ اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے

والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بُوجھ کر تیرے سُپرد ایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دنیا بھر کے کتّے اور بھیڑیے تجھے لپٹ جائیں گے۔ لیکن اس اطلاع کی ساری خوفناکی یہ حرفِ تسلی سُن کر دور ہو جاتی ہے کہ اس جاں گُسِل کش مکش کے میدان میں اتار کر ہم نے تجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں۔ ایمان دل میں ہو تو اس سے بڑھ کر ہمت دلانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خداوندِ عالَم آپ ہماری مدد اور رہنمائی کا ذمہ لے رہا ہے۔ اس کے بعد تو صرف ایک کم اعتقاد بزدل ہی میدان میں آگے بڑھنے سے ہچکچا سکتا ہے۔

۴۴ – یہ کفارِ مکہ کا بڑا دل پسند اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دُہراتے تھے، اور قرآن میں بھی اس کو متعدّد مقامات پر نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل حواشی ۱۰۱ تا ۱۰۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۱۹) اُن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر، یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں میں سے نقل کر کر کے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے، بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو پوری کتاب اکٹھی ایک وقت میں کیوں نہیں آ جاتی۔ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

۴۵ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اس کے ذریعے سے ہم تمھارا دل مضبوط کرتے رہیں"، یا "تمھاری ہمت بندھاتے رہیں"۔ الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں اور دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ اس طرح ایک ہی فقرے میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کر دی گئی ہیں:

(۱) وہ لفظ بلفظ حافظے میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبی کے ذریعے سے اَن پڑھ قوم میں زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اس کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جائے تو ہوش پراگندہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور روح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے، بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتّب کر کے بیک وقت دے دیے گئے ہوں۔

(۴) تحریکِ اسلامی کے دَوران میں، جب کہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے، بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر عمر بھر کے لیے دنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اسے

لَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ اَلَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلٰى وُجُوهِهِمْ إِلٰى جَهَنَّمَ ۙ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٣٤﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ أَخَاهُ هٰرُونَ وَزِيرًا ﴿٣٥﴾

کہ جب کبھی وہ تمھارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمھیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی[۴۶] ـــــ جو لوگ اَوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں، ان کا مَوقِف بہت بُرا اور ان کی راہ حد درجے غلط ہے۔[۴۷] ع

ہم نے موسیٰؑ کو کتاب[۴۸] دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو مددگار کے طور پر لگایا اور

شرفِ باریابی ومخاطبت عطا فرما کر اس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

۴۶ـ یہ نُزولِ قرآن میں تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت ہے۔ قرآنِ مجید کی شانِ نُزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ''ہدایت'' کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبی کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہی ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نُزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان واسلام اور اطاعت وتقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی وقائد بنا کر اُٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمے لیا ہے، تو دوسری طرف یہ کام بھی اپنے ہی ذمے رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہ یا اُلجھن پیش کریں، اُسے وہ صاف کر دے۔ اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنیٰ پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح وتفسیر کر دے۔ ان مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں، ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے، اور یہ ایک کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق وفلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے معرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّل لحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے، یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع وضرورت نازل ہوتی رہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۳ تا ۲۵)

۴۷ـ یعنی جو لوگ سیدھی بات کو اُلٹی طرح سوچتے ہیں اور اُلٹے نتائج نکالتے ہیں، ان کی عقل اَوندھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کی حقّانیت پر دلالت کرنے والی حقیقتوں کو اس کے بُطلان پر دلیل قرار دے رہے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ اَوندھے منہ جہنّم کی طرف گھسیٹے جائیں گے۔

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ ﴿۳۶﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚۖ ﴿۳۷﴾ وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا

اُن سے کہا کہ جاؤ اُس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جُھٹلا[۴۹] دیا ہے۔ آخر کار اُن لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حال قومِ نوحؑ کا ہوا جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب[۵۰] کی۔ ہم نے اُن کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا، اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیّا کر رکھا ہے[۵۱]۔ اِسی طرح عاد اور ثمود اور اصحابُ الرسّ[۵۲] اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت

۴۸ – یہاں کتاب سے مراد غالباً وہ کتاب نہیں جو توراۃ کے نام سے معروف ہے اور مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی، بلکہ اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جو نبوت کے منصب پر مامور ہونے کے وقت سے لے کر خُروج تک حضرت موسیٰؑ کو دی جاتی رہیں۔ ان میں وہ خطبے بھی شامل ہیں جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں دیے، اور وہ ہدایات بھی شامل ہیں جو فرعون کے خلاف جِدّو جُہد کے دوران میں آپ کو دی جاتی رہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اِن چیزوں کا ذکر ہے، مگر اغلب یہ ہے کہ یہ چیزیں توراۃ میں شامل نہیں کی گئیں۔ توراۃ کا آغاز اُن احکامِ عشر سے ہوتا ہے جو خُروج کے بعد طورِ سینا پر سنگین کتبوں کی شکل میں آپ کو دیے گئے تھے۔

۴۹ – یعنی اُن آیات کو جو حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو پہنچی تھیں، اور جن کی تبلیغ بعد میں ایک مدت تک بنی اسرائیل کے صلحا کرتے رہے۔

۵۰ – چونکہ انھوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ بشر کبھی رسول بن کر آ سکتا ہے، اس لیے ان کی تکذیب تنہا حضرت نوحؑ کی تکذیب ہی نہ تھی بلکہ بجائے خود منصبِ نبوت کی تکذیب تھی۔

۵۱ – یعنی آخرت کا عذاب۔

۵۲ – اصحاب الرّسّ کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ تھے۔ مفسرین نے مختلف رِوایات بیان کی ہیں مگر ان میں کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنویں میں پھینک کر یا لٹکا کر مار ا تھا۔ رَس عَرَبی زبان میں پُرانے کنویں یا اندھے کنویں کو کہتے ہیں۔

تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ

---

کر دیا۔ اور اُس بستی پر تو اِن کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی[۵۳]۔ کیا اِنھوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہو گا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے[۵۴]۔

یہ لوگ جب تمھیں دیکھتے ہیں تو تمھارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ (کہتے ہیں:) ”کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبُودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے[۵۵]۔“ اچھا، وہ وقت دُور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر اِنھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دُور نکل گیا تھا۔

کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو[۵۶]؟ کیا تم ایسے شخص کو

---

۵۳ – یعنی قومِ لوط کی بستی۔ بدترین بارش سے مراد پتھروں کی بارش ہے، جس کا ذکر کئی جگہ قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اہلِ حجاز کے قافلے فلسطین و شام جاتے ہوئے اس علاقے سے گزرتے تھے اور نہ صرف تباہی کے آثار دیکھتے تھے بلکہ آس پاس کے باشندوں سے قومِ لُوط کی عبرت ناک داستانیں بھی سنتے رہتے تھے۔

۵۴ – یعنی چونکہ یہ آخرت کے قائل نہیں ہیں، اس لیے اِن آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ انھوں نے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیا، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کے قائل کی نگاہ اور اس کے منکر کی نگاہ میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک تماشا دیکھتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تاریخ مرتّب کرتا ہے۔ دوسرا انھی چیزوں سے اَخلاقی سبق لیتا ہے اور زندگی سے ماورا حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

۵۵ – کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اُڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک آنحضرتؐ نے اپنی حیثیت سے بہت اونچا دعویٰ کر دیا تھا۔ دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے دلائل کی قوت اور آپؐ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ

وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاۗءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ

راہِ راست پر لانے کا ذمّہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سُنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔[۵۷] ع

تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سُورج کو اُس پر دلیل[۵۸] بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اُٹھتا جاتا ہے) ہم اس سایے کو

---

اگر ہم تعصّب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اکھاڑ چکا ہوتا۔ یہ متضاد باتیں خود بتا رہی ہیں کہ اسلامی تحریک نے ان لوگوں کو کس قدر بَوکھلا دیا تھا۔ کھسیانے ہو کر مذاق بھی اُڑاتے تھے تو احساسِ کمتری بلا ارادہ ان کی زبان سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جن سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ دلوں میں وہ اس طاقت سے کس قدر مرعوب ہیں۔

**۵۶** – خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد اس کی بندگی کرنا ہے، اور یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی شرک ہے جیسا بُت کو پوجنا یا کسی مخلوق کو معبود بنانا۔ حضرت ابواُمامہؓ کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما تحت ظل السمآء من الٰہ یعبد من دون اللّٰہ تعالٰی اعظم عنداللّٰہ عزّوجل من ھوی یتبع، ''اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے معبُود بھی پوجے جا رہے ہیں ان میں اللہ کے نزدیک بدترین معبود وہ خواہشِ نفس ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔'' (طَبَرانی) مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الکہف، حاشیہ ۵۰۔

جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہو اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہو کہ اس کے لیے صحیح راہ کون سی ہے اور غلط کون سی، وہ اگر کسی قسم کے شرک یا کفر میں مبتلا بھی ہو تو اس کو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے، اور یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ راہِ راست اختیار کرنے کا فیصلہ کر لے گا تو اس پر ثابت قدم رہے گا۔ لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شُتُرِ بے مہار ہے۔ اُسے تو اس کی خواہشات جدھر جدھر لے جائیں گی، وہ ان کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔ اس کو سرے سے یہ فکر ہی نہیں ہے کہ صحیح و غلط اور حق و باطل میں تمیز کرے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرے۔ پھر بھلا کون اسے سمجھا کر راستی کا قائل کر سکتا ہے۔ اور بالفرض اگر وہ بات مان بھی لے تو اسے کسی ضابطۂ اَخلاق کا پابند بنا دینا تو کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

**۵۷** – یعنی جس طرح بھیڑ بکریوں کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ ہانکنے والا انھیں چراگاہ کی طرف لے جا رہا ہے یا بُوچڑ خانے کی طرف۔ وہ بس آنکھیں بند کر کے ہانکنے والے کے اشاروں پر چلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح یہ عوام الناس بھی اپنے شیطانِ نفس اور اپنے گمراہ کُن لیڈروں کے اشاروں پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں کچھ نہیں جانتے کہ وہ انھیں فلاح کی طرف ہانک رہے ہیں یا

اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا

رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔[۵۹]

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے لباس[۶۰]، اور نیند کو سکونِ موت،

تباہی و بربادی کی طرف۔ اس حد تک تو ان کی حالت بھیڑ بکریوں کے مشابہ ہے۔ لیکن بھیڑ بکریوں کو خدا نے عقل و شُعور سے نہیں نوازا ہے۔ وہ اگر چرواہے اور قَسائی میں امتیاز نہیں کرتیں تو کچھ عیب نہیں۔ البتہ حیف ہے ان انسانوں پر جو خدا سے عقل و شُعور کی نعمتیں پا کر بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں کی سی غفلت و بے شعوری میں مبتلا کرلیں۔

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس تقریر کا منشا تبلیغ کو لاحاصل قرار دینا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ باتیں اس لیے فرمائی جا رہی ہیں کہ لوگوں کو سمجھانے کی فضول کوشش چھوڑ دیں۔ نہیں، اس تقریر کے اصل مُخاطَب سامعین ہی ہیں، اگرچہ رُوئے سُخَن بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ دراصل سنانا ان کو مقصود ہے کہ غافلو! یہ کس حال میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا خدا نے تمھیں سمجھ بُوجھ اس لیے دی تھی کہ دنیا میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو؟

**۵۸-** یہاں لفظ ''دلیل'' ٹھیک اسی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے جس میں انگریزی لفظ (pilot) استعمال ہوتا ہے۔ مَلّاحوں کی اصطلاح میں ''دلیل'' اس شخص کو کہتے ہیں جو کشتیوں کو راستہ بتاتا ہُوا چلے۔ سایے پر سورج کو دلیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ سایے کا پھیلنا اور سکڑنا سورج کے عُروج و زوال اور طُلوع و غروب کا تابع ہے۔

سایے سے مراد روشنی اور تاریکی کے بین بین وہ درمیانی حالت ہے جو صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے ہوتی ہے اور دن بھر مکانوں میں، دیواروں کی اوٹ میں اور درختوں کے نیچے رہتی ہے۔

**۵۹-** اپنی طرف سمیٹنے سے مراد غائب اور فنا کرنا ہے، کیونکہ ہر چیز جو فنا ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف پلٹتی ہے۔ ہر شے اسی کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف جاتی ہے۔

اس آیت کے دو رُخ ہیں: ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ظاہر۔ کے اعتبار سے یہ غفلت میں پڑے ہوئے مشرکین کو بتا رہی ہے کہ اگر تم دنیا میں جانوروں کی طرح نہ جیتے اور کچھ عقل و ہوش کی آنکھوں سے کام لیتے، تو یہی سایہ جس کا تم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہو، تمھیں یہ سبق دینے کے لیے کافی تھا کہ نبی جس توحید کی تعلیم تمھیں دے رہا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ تمھاری ساری زندگی اسی سایے کے مَدّ و جزر سے وابستہ ہے۔ اَبدی سایہ ہو جائے تو زمین پر کوئی جان دار مخلوق، بلکہ نباتات تک باقی نہ رہ سکے، کیونکہ سورج کی روشنی و حرارت ہی پر ان سب کی زندگی موقوف ہے۔ سایہ بالکل نہ رہے تب بھی زندگی محال ہے، کیونکہ ہر وقت سورج کے سامنے رہنے اور اس کی شعاعوں سے کوئی پناہ نہ پا سکنے کی صورت میں نہ جان دار زیادہ دیر تک باقی رہ سکتے ہیں نہ نباتات، بلکہ پانی تک کی خیر نہیں۔ دھوپ اور سایے میں یک لخت تغیُّرات ہوتے رہیں تب بھی زمین کی مخلوقات اِن جھٹکوں کو زیادہ دیر تک نہیں سہار سکتی۔ مگر ایک صانع حکیم اور قادرِ مُطلَق ہے جس نے زمین اور سورج کے درمیان ایسی مناسبت قائم کر رکھی ہے جو دائماً ایک لگے بندھے طریقے سے

وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ

اور دن کو جی اُٹھنے کا وقت[61] بنایا۔

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر آسمان سے پاک[62] پانی نازل کرتا ہے، تاکہ ایک مُردہ علاقے کو اس کے ذریعے سے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے[63]۔ اس کرشمے کو ہم بار بار ان کے سامنے

آہستہ آہستہ سایہ ڈالتی اور بڑھاتی گھٹاتی ہے اور بتدریج دھوپ نکالتی اور چڑھاتی اتارتی رہتی ہے۔ یہ حکیمانہ نظام نہ اندھی فطرت کے ہاتھوں خود بخود قائم ہو سکتا تھا اور نہ بہت سے بااختیار خدا اِسے قائم کر کے یوں ایک مسلسل باقاعدگی کے ساتھ چلا سکتے تھے۔

مگر ان ظاہری الفاظ کے بین السُّطور سے ایک اور لطیف اشارہ بھی جھلک رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کفر و شرک کی جَہالت کا یہ سایہ جو اس وقت چھایا ہوا ہے، کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ آفتابِ ہدایت، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں طلوع ہو چکا ہے۔ بظاہر سایہ دور دور تک پھیلا نظر آتا ہے، مگر جوں جوں یہ آفتاب چڑھے گا، سایہ سمٹتا چلا جائے گا۔ البتہ ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کا قانون کبھی یک لخت تغیُّرات نہیں لاتا۔ مادّی دنیا میں جس طرح سورج آہستہ آہستہ ہی چڑھتا اور سایہ آہستہ آہستہ ہی سکڑتا ہے، اسی طرح فکر و اَخلاق کی دنیا میں بھی آفتاب ہدایت کا عُروج اور سایۂ ضلالت کا زوال آہستہ آہستہ ہی ہو گا۔

۶۰ – یعنی ڈھانکنے اور چھپانے والی چیز۔

۶۱ – اس آیت کے تین رخ ہیں۔ ایک رخ سے یہ توحید پر اِستِدلال کر رہی ہے۔ دوسرے رُخ سے یہ روز مرّہ کے انسانی تَجرُبے و مشاہدے سے زندگی بعدِ موت کے امکان کی دلیل فراہم کر رہی ہے۔ اور تیسرے رخ سے یہ ایک لطیف انداز میں بشارت دے رہی ہے کہ جاہلیّت کی رات ختم ہو چکی، اب علم و شُعور اور ہدایت و معرفت کا روزِ روشن نمودار ہو گیا ہے اور ناگزیر ہے کہ نیند کے ماتے دیر یا سویر بیدار ہوں۔ البتہ جن کے لیے رات کی نیند موت کی نیند تھی، وہ نہ جاگیں گے، اور اُن کا نہ جاگنا خود انھی کے لیے زندگی سے محرومی ہے، دن کا کاروبار ان کی وجہ سے بند نہ ہو جائے گا۔

۶۲ – یعنی ایسا پانی جو ہر طرح کی گندگیوں سے بھی پاک ہوتا ہے اور ہر طرح کے زہریلے مادّوں اور جراثیم سے بھی پاک۔ جس کی بدولت نجاستیں دُھلتی ہیں اور انسان، حیوان، نباتات، سب کو زندگی بخشنے والا جوہرِ خالص بہم پہنچتا ہے۔

۶۳ – اس آیت کے بھی وہی تین رخ ہیں جو اُوپر والی آیت کے تھے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی ہیں اور آخرت کے

بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

لاتے ہیں[۶۴] تاکہ وہ کچھ سبق لیں، مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رَوِیَّہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔[۶۵]

دلائل بھی۔ اور اِن دونوں مضمونوں کے ساتھ اس میں یہ لطیف مضمون بھی پوشیدہ ہے کہ جاہلیت کا دَور حقیقت میں خشک سالی اور قحط کا دَور تھا جس میں انسانیت کی زمین بنجر ہو کر رہ گئی تھی۔ اب یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ نبوت کا ابرِ رحمت لے آیا جو علمِ وحی کا خالص آبِ حیات برسا رہا ہے، سب نہیں تو بہت سے بندگانِ خدا تو اس سے فیض یاب ہوں گے ہی۔

۶۴ – اصل الفاظ ہیں: لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ۔ اس کے تین معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ بارش کے اِس مضمون کو ہم نے بار بار قرآن میں بیان کر کے حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم بار بار گرمی و خشکی کے، موسمی ہواؤں اور گھٹاؤں کے، اور برسات اور اُس سے رونما ہونے والی رونقِ حیات کے کرشمے ان کو دکھاتے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم بارش کو گردش دیتے رہتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ ہر جگہ یکساں بارش نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کہیں بالکل خشک سالی ہوتی ہے، کبھی کہیں کم بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں مناسب بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں طوفان اور سیلاب کی نوبت آ جاتی ہے، اور ان سب حالتوں کے بے شمار مختلف نتائج ان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔

۶۵ – اگر پہلے رخ (یعنی توحید کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو محض بارش کے انتظام ہی میں اللہ کے وجود اور اس کی صفات اور اس کے واحد ربّ العالمین ہونے پر دلالت کرنے والی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ تنہا وہی ان کو پیغمبر کی تعلیمِ توحید کے برحق ہونے کا اطمینان دلا سکتی ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ ہم بار بار اس مضمون کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اور باوجود اس کے کہ دنیا میں پانی کی تقسیم کے یہ کرشمے نت نئے انداز سے پے در پے ان کی نگاہوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ ظالم کوئی سبق نہیں لیتے۔ نہ حق وصداقت کو مان کر دیتے ہیں، نہ عقل و فکر کی اُن نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں جو ہم نے ان کو دی ہیں، اور نہ اس احسان کے لیے شکر گزار ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ خود نہیں سمجھ رہے تھے، اسے سمجھانے کے لیے قرآن میں بار بار کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسرے رُخ (یعنی آخرت کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال اِن کے سامنے گرمی و خشکی سے بے شمار مخلوقات پر موت طاری ہونے اور پھر برسات کی برکت سے مردہ نباتات و حشرات کے جی اُٹھنے کا ڈراما ہوتا رہتا ہے، مگر سب کچھ دیکھ کر بھی یہ بے وقوف زندگی بعدِ موت کو ناممکن ہی کہتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار انھیں اس صریح نشانِ حقیقت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، مگر کفر و انکار کا جمود ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا، نعمتِ عقل و بینائی کا کفران ہے کہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا، اور احسانِ تذکیر و تعلیم کی ناشکری ہے کہ برابر ہوئے چلی جاتی ہے۔

اگر تیسرے رُخ (یعنی خشک سالی سے جاہلیّت کی اور بارانِ رحمت سے وحی و نبوت کی تشبیہ) کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے دَوران میں بار بار یہ منظر سامنے آتا رہا ہے کہ جب کبھی دنیا نبی اور کتابِ الٰہی کے فیض سے محروم ہوئی، انسانیت بنجر ہو گئی اور فکر و اَخلاق کی زمین میں خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ اُگا۔ اور جب کبھی وحی و رسالت

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝۵۱ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝۵۳

---

اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک نذیر اُٹھا کھڑا کرتے[۶۶]۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہادِ کبیر[۶۷] کرو۔

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے[۶۸]۔

---

کا آبِ حیات اس سرزمین کو بہم پہنچ گیا، گلشنِ انسانیت لہلہا اُٹھا۔ جہالت و جاہلیّت کی جگہ علم نے لی۔ ظلم وطُغیان کی جگہ انصاف قائم ہوا۔ فِسق و فُجور کی جگہ اخلاقی فضائل کے پھول کھلے۔ جس گوشے میں جتنا بھی اس کا فیض پہنچا، شر کم ہُوا اور خیر میں اضافہ ہُوا۔ انبیاؑ کی آمد ہمیشہ ایک خوش گوار اور فائدہ بخش فکری و اَخلاقی انقلاب ہی کی موجب ہوئی ہے، کبھی اس سے بُرے نتائج رونما نہیں ہوئے۔ اور انبیاؑ کی ہدایت سے محروم یا منحرف ہو کر ہمیشہ انسانیت نے نقصان ہی اُٹھایا ہے، کبھی اس سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ یہ منظر تاریخ بھی بار بار دکھاتی ہے اور قرآن بھی اس کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے، مگر لوگ پھر بھی سبق نہیں لیتے۔ ایک مُجرَّب حقیقت ہے جس کی صداقت پر ہزار ہا برس کے انسانی تجرِبے کی مہر ثبت ہو چکی ہے، مگر اس کا انکار کیا جا رہا ہے۔ اور آج خدا نے نبی اور کتاب کی نعمت سے جس بستی کو نوازا ہے، وہ اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے اُلٹی ناشکری کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

۶۶ – یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا، چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے، مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک ہی نبی مبعوث کر دیا۔ جس طرح ایک سورج سارے جہان کے لیے کافی ہو رہا ہے، اُسی طرح یہ اکیلا آفتابِ ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے۔

۶۷ – جہادِ کبیر کے تین معنیٰ ہیں: ایک، انتہائی کوشش، جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جِدّ و جُہد، جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جِدّ و جُہد، جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں، اُس پر اپنی طاقت بھی لگا دے، اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے، اور جان و مال کا بھی، اور توپ و تُفنگ کا بھی۔

وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا‌ ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيۡرًا ﴿۵۴﴾ وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُهُمۡ وَلَا يَضُرُّهُمۡ‌ ؕ وَكَانَ

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔[۶۹] تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔

اس خدا کو چھوڑ کر لوگ اُن کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، اور اُوپر سے مزید

۶۸ – یہ کیفیت ہر اُس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مَقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں، جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیّدی علی رئیس (کاتبِ رومی) اپنی کتاب مرأۃ الممالک میں، جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیجِ فارس کے اندر ایسے ہی ایک مَقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے مَیں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیجِ فارس کے انھی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظَہران کے پاس کنویں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔ بَحرَین کے قریب بھی سمندر کی تہ میں آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے لوگ کچھ مدت پہلے تک پینے کا پانی حاصل کرتے رہے ہیں۔

یہ تو ہے آیت کا ظاہری مضمون، جو اللہ کی قدرت کے ایک کرشمے سے اُس کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے پر اِستِدلال کر رہا ہے۔ مگر اس کے بین السُّطور سے بھی ایک لطیف اشارہ ایک دوسرے مضمون کی طرف نکلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سمندر خواہ کتنا ہی تلخ و شور ہو جائے، اللہ جب چاہے اس کی تہ سے ایک جماعتِ صالحہ کا چشمۂ شیریں نکال سکتا ہے، اور سمندر کے آبِ تلخ کی موجیں خواہ کتنا ہی زور مار لیں وہ اُس چشمے کو ہڑپ کر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

۶۹ – یعنی بجائے خود یہی کرشمہ کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنا کھڑی کرتا ہے، مگر اس پر مزید کرشمہ یہ ہے کہ اس نے انسان کا بھی ایک نمونہ نہیں بلکہ دو الگ نمونے (عورت اور مرد) بنائے جو انسانیت میں یکساں مگر جسمانی و نفسانی خُصوصیات میں نہایت مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی وجہ سے باہم مخالف و متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہیں۔ پھر ان جوڑوں کو ملا کر وہ عجیب توازُن کے ساتھ (جس میں کسی دوسرے کی تدبیر کا ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے) دنیا میں مرد بھی پیدا کر رہا ہے اور عورتیں بھی، جن سے ایک سلسلۂ تعلقات بیٹوں اور پوتوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں، اور ایک دوسرا سلسلۂ تعلقات بیٹیوں اور نواسیوں کا چلتا ہے، جو دوسرے گھروں کی بہوئیں بن کر جاتی ہیں۔ اس طرح خاندان سے خاندان جُڑ کر پورے پورے مُلک ایک نسل اور ایک تمدّن سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہُوا ہے۔[۷۰]

اے محمدؐ! تم کو تو ہم نے بس ایک مُبَشِّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔[۷۱] اِن سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔"[۷۱ الف]

یہاں بھی ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ اس سارے کارخانۂ حیات میں جو حکمت کام کر رہی ہے، اس کا اندازِ کار ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں اختلاف، اور پھر مختلفین کے جوڑ سے ہی سارے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس اختلاف سے تم دوچار ہو، اس پر گھبراؤ نہیں۔ یہ بھی ایک نتیجہ خیز چیز ہے۔

۷۰ – یعنی اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے احکام وقوانین کو نافذ کرنے کے لیے جو کوشش بھی کہیں ہو رہی ہو، کافر کی ہمدردیاں اس کوشش کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گی جو اسے نیچا دکھانے کے درپے ہوں۔ اسی طرح اللہ کی فرماں برداری و اطاعت سے نہیں بلکہ اس کی نافرمانی ہی سے کافر کی ساری دلچسپیاں وابستہ ہوں گی۔ نافرمانی کا کام جو جہاں بھی کر رہا ہو، کافر اگر عملاً اس کا شریک نہ ہو سکے گا تو کم از کم زندہ باد کا نعرہ ہی مار دے گا، تاکہ خدا کے باغیوں کی ہمت افزائی ہو۔ بخلاف اس کے اگر کوئی فرماں برداری کا کام کر رہا ہو تو کافر اس کی مزاحمت میں ذرا دریغ نہ کرے گا۔ خود مزاحمت نہ کر سکتا ہو تو اس کی ہمت شکنی کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہے کر گزرے گا، چاہے وہ ناک بھوں چڑھانے کی حد تک ہی سہی۔ نافرمانی کی ہر خبر اس کے لیے مژدۂ جاں فزا ہوگی، اور فرماں برداری کی ہر اطلاع اسے تیر بن کر لگے گی۔

۷۱ – یعنی تمھارا کام نہ کسی ایمان لانے والے کو جزا دینا ہے، نہ کسی انکار کرنے والے کو سزا دینا۔ تم کسی کو ایمان کی طرف کھینچ لانے اور انکار سے زبردستی روک دینے پر مامور نہیں کیے گئے ہو۔ تمھاری ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو راہِ راست قبول کرے اسے انجام نیک کی بشارت دے دو، اور جو اپنی بدراہی پر جما رہے اس کو اللہ کی پکڑ سے ڈرا دو۔

اس طرح کے ارشادات قرآنِ مجید میں جہاں بھی آئے ہیں، ان کا اصل رُوئے سُخَن کفار کی طرف ہے، اور مقصد دراصل ان کو یہ بتانا ہے کہ نبی ایک بے غرض مصلح ہے جو خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے خدا کا پیغام پہنچاتا ہے اور انھیں اُن کے انجام کا نیک و بد بتا دیتا ہے۔ وہ تمھیں زبردستی تو اس پیغام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ اس پر بگڑنے اور لڑنے پر تُل جاتے ہو۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، اسے کچھ نہ دے دو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا نقصان کرو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ پیغام پہنچا کر سُبکدوش ہو چکا، اب تمھارا معاملہ ہم سے ہے ـــــ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بسا اوقات لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملے میں بھی نبی کا کام بس خدا کا پیغام پہنچا دینے اور انجامِ نیک کا مُژدہ سنا دینے

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ﴿٥٨﴾ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ الرَّحْمَٰنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا ﴿٥٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴿٦٠﴾

اے محمدؐ! اُس خدا پر بھروسا رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔ وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی (کائنات کے تختِ سلطنت) "عرش" پر جلوہ فرما ہوا[72]۔ رحمٰن، اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو۔

اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: "رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں[73]؟" یہ دعوت ان کی نفرت میں اُلٹا اور اضافہ کر دیتی ہے[74]۔ ع

تک محدود ہے۔ حالانکہ قرآن جگہ جگہ اور بار بار تصریح کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نبی صرف مبشر ہی نہیں ہے بلکہ معلم اور مزکّی اور نمونۂ عمل بھی ہے، حاکم اور قاضی اور امیرِ مُطاع بھی ہے، اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر فرمان ان کے حق میں قانون کا حکم رکھتا ہے، جس کے آگے اُن کو دل کی پوری رضا مندی سے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ لہٰذا سخت غلطی کرتا ہے وہ شخص جو مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ اور وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا، اور اسی مضمون کی دوسری آیات کو نبی اور اہلِ ایمان کے باہمی تعلق پر چسپاں کرتا ہے۔

۷۱ الف۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۰۔

۷۲۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر جلوہ گر ہونے کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۴۱-۴۲۔ یونس، حاشیہ ۴۔ ہود، حاشیہ ۷۔

زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا مضمون متشابہات کے قبیل سے ہے، جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن سے مراد ایک دَور ہو۔ اور ممکن ہے کہ اس سے مراد وقت کی اتنی ہی مقدار ہو جس پر ہم دنیا میں لفظ "دن" کا اِطلاق کرتے ہیں۔ (مفصل تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۷۳۔ یہ بات دراصل وہ محض کافرانہ شوخی اور سراسر ہٹ دھرمی کی بنا پر کہتے تھے، جس طرح فرعون نے

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ

---

بڑا متبرّک ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے[۷۵] اور اس میں ایک چراغ[۷۶] اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہے[۷۷]۔

رحمٰن کے (اصلی) بندے[۷۸] وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[۷۹] اور جاہل ان کے منہ آئیں تو

---

حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا: وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ''ربّ العالمین کیا ہوتا ہے؟'' حالانکہ نہ کفارِ مکہ خدائے رحمٰن سے بے خبر تھے اور نہ فرعون ہی اللہ ربّ العالمین سے ناواقف تھا۔ بعض مفسّرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ''رحمٰن'' کا اسمِ مبارک شائع نہ تھا، اس لیے انھوں نے یہ اعتراض کیا۔ لیکن آیت کا اندازِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ اعتراض ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ طُغیانِ جاہلیّت کی بنا پر تھا، ورنہ اس پر گرفت کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ نرمی کے ساتھ انھیں سمجھا دیتا کہ یہ بھی ہمارا ہی ایک نام ہے، اس پر کان نہ کھڑے کرو۔ علاوہ بریں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ عرب میں اللہ تعالیٰ کے لیے قدیم زمانے سے رحمٰن کا لفظ معروف و مستعمل تھا۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵۔ سبا، حاشیہ ۳۵۔

۷۴ – اس جگہ سجدۂ تلاوت مشروع ہے اور اس پر تمام اہلِ علم متفق ہیں۔ ہر قاری اور سامع کو اس مقام پر کرنا چاہیے۔ نیز یہ بھی مسنون ہے کہ آدمی جب اس آیت کو سنے تو جواب میں کہے: زَادَنَا اللّٰهُ خُضُوْعًا مَّا زَادَ لِلْاَعْدَآءِ نُفُوْرًا، ''اللہ کرے ہمارا خضوع اتنا ہی بڑھے جتنا دشمنوں کا نُفور بڑھتا ہے۔''

۷۵ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔

۷۶ – یعنی سورج، جیسا کہ سورۂ نوح میں بتصریح فرمایا: وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (آیت ۱۶)

۷۷ – یہ دو مراتب ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے الگ اور اپنے مزاج کے اعتبار سے لازم و ملزوم ہیں۔ گردشِ لیل و نہار کے نظام پر غور کرنے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اس سے توحید کا درس لے اور اگر خدا سے غفلت میں پڑا ہوا تھا تو چونک جائے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی رُبوبیّت کا احساس کر کے سرِ نیاز جھکا دے اور سراپا اِمتنان بن جائے۔

۷۸ – یعنی جس رحمٰن کو سجدہ کرنے کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے اور تم اس سے انحراف کر رہے ہو، اس کے پیدائشی بندے تو سب ہی ہیں، مگر اس کے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو شعوری طور پر بندگی اختیار کر کے یہ اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سجدہ جس کی تمھیں دعوت دی جا رہی ہے، اُس کے نتائج یہ ہیں جو اس کی بندگی قبول کرنے والوں کی زندگی

قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾

کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام[80]۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں[81]۔

میں نظر آتے ہیں، اور اس سے انکار کے نتائج وہ ہیں جو تم لوگوں کی زندگی میں عیاں ہیں۔ اس مقام پر اصل مقصود سیرت و اخلاق کے دو نمونوں کا تقابُل ہے۔ ایک وہ نمونہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں میں پیدا ہو رہا تھا، اور دوسرا وہ جو جاہلیت پر جمے ہوئے لوگوں میں ہر طرف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس تقابُل کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ صرف پہلے نمونے کی نمایاں خُصوصیّات کو سامنے رکھ دیا، اور دوسرے نمونے کو ہر دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن پر چھوڑ دیا کہ وہ آپ ہی مقابل کی تصویر کو دیکھے اور آپ ہی دونوں کا موازنہ کر لے۔ اُس کے بیان کی حاجت نہ تھی، کیونکہ وہ گرد و پیش سارے معاشرے میں موجود تھا۔

۷۹ – یعنی تکبُّر کے ساتھ اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جبّاروں اور مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا زور جتانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ ''نرم چال'' سے مراد ضعیفانہ اور مریضانہ چال نہیں ہے، اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریاکار آدمی اپنے انکسار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنُّع سے اختیار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اِس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف اُتر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق رِوایات میں آیا ہے کہ انھوں نے ایک جوان آدمی کو مَریَل چال چلتے دیکھا تو روک کر پوچھا: کیا تم بیمار ہو؟ اس نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے دُرّہ اٹھا کر اسے دھمکایا اور بولے: قوت کے ساتھ چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے، نہ کہ وہ جو بناوٹ سے منکسرانہ بنائی گئی ہو، یا جس سے خواہ مخواہ کی مسکنت اور ضعیفی ٹپکتی ہو۔

مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تأمُّل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے اندازِ رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اوّلین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیّار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمَعاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند متکبّر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے انسانوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمٰن کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے، اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۳۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۳۳)

۸۰ – جاہل سے مراد اَن پڑھ یا بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت پر اُتر آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمٰن کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور اسی طرح

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝۶۵ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝۶۶ وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝۶۷ وَالَّذِيْنَ

جو دُعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! جہنّم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔"[۸۲] جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بُخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔[۸۳] جو

کی ہر بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے، بلکہ جو ان کے ساتھ یہ رَوِیّہ اختیار کرتا ہے، وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۫ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝ (القصص، آیت ۵۵) "اور جب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں، کہتے ہیں: بھائی! ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، سلام ہے تم کو، ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگتے۔" (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حواشی ۷۲-۷۸)

۸۱- یعنی وہ اُن کے دن کی زندگی تھی اور یہ ان کی راتوں کی زندگی ہے۔ ان کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں، نہ ناچ گانے میں، نہ لَہو ولَعب میں، نہ گپوں اور افسانہ گوئیوں میں، اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے اِن معروف مشاغل کے برعکس یہ اِس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حُضور کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے دعا و عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سجدہ میں فرمایا: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا "ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں۔" (آیت ۱۶) اور سورۂ ذاریات میں فرمایا: كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ "یہ اہلِ جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سَحَر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔" (آیات ۱۷-۱۸) اور سورۂ زُمَر میں ارشاد ہوا: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ "کیا اس شخص کا انجام کسی مشرک جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرماں بردار ہو، رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو، اور اپنے رب کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہو؟" (آیت ۹)

۸۲- یعنی یہ عبادت ان میں کوئی غرور پیدا نہیں کرتی۔ انھیں اس بات کا کوئی زَعم نہیں ہوتا کہ ہم تو اللہ کے پیارے اور اس کے چہیتے ہیں، بھلا آگ ہمیں کہاں چھو سکتی ہے۔ بلکہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود وہ اِس خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے عمل کی کوتاہیاں ہم کو بتلائے عذاب نہ کر دیں۔ وہ اپنے تقویٰ کے زور سے جنت جیت لینے کا پِندار نہیں رکھتے،

لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ

اللہ کے سوا کسی اور معبُود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں[۸۴] ــــ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اُس کو مکرّر

بلکہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے عذاب سے بچ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے بھی ان کا اعتماد اپنے عمل پر نہیں بلکہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

۸۳ - یعنی نہ تو ان کا حال یہ ہے کہ عیاشی، اور قمار بازی، اور شراب نوشی، اور یار باشی، اور میلوں ٹھیلوں، اور شادی بیاہ میں بے دریغ روپیا خرچ کریں اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی شان دکھانے کے لیے غذا، مکان، لباس اور تزئین و آرایش پر دولت لٹائیں۔ اور نہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک زر پرست آدمی کی طرح پیسا جوڑ جوڑ کر رکھیں، نہ خود کھائیں، نہ بال بچوں کی ضروریات اپنی استطاعت کے مطابق پوری کریں، اور نہ کسی راہِ خیر میں خوش دلی کے ساتھ کچھ دیں۔ عرب میں یہ دونوں قسم کے نمونے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو خوب دل کھول کر خرچ کرتے تھے، مگر ان کے ہر خرچ کا مقصود یا تو ذاتی عیش و تَنَعُّم تھا، یا برادری میں ناک اونچی رکھنا اور اپنی فیّاضی و دولت مندی کے ڈنکے بجوانا۔ دوسری طرف وہ بخیل تھے جن کی کنجوسی مشہور تھی۔ اعتدال کی رَوِش بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی تھی، اور اِن کم لوگوں میں اُس وقت سب سے زیادہ نمایاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تھے۔

اس موقع پر یہ جان لینا چاہیے کہ اِسراف کیا چیز ہے اور بُخل کیا چیز۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اِسراف تین چیزوں کا نام ہے: ایک، ناجائز کاموں میں دولت صَرف کرنا، خواہ وہ ایک پیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے، جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوُز کر جانا، خواہ اِس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرے، یا اس لحاظ سے کہ آدمی کو جو دولت اس کی ضرورت سے بہت زیادہ مل گئی ہو، اسے وہ اپنے ہی عیش اور ٹھاٹ باٹ میں صَرف کرتا چلا جائے۔ تیسرے، نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا، مگر اللہ کے لیے نہیں بلکہ ریا اور نمایش کے لیے۔ اس کے برعکس بُخل کا اِطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے: ایک یہ کہ آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی مَقدِرَت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اس کے ہاتھ سے پیسا نہ نکلے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اسلام کی راہ ہے، جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ من فقه الرجل قصده فی معیشته، ”اپنی معیشت میں توسُّط اختیار کرنا آدمی کے فقیہ (دانا) ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔“ (احمد و طبَرانی، بروایتِ ابی الدَّرْدَاءؓ)

۸۴ - یعنی وہ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جن میں اہلِ عرب کثرت سے مبتلا ہیں۔ ایک شرک باللہ، دوسرے قتلِ ناحق، تیسرے زِنا۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے پوچھا گیا: سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ ”یہ کہ تو کسی کو اللہ کا

مدِّمقابل اور ہمسر ٹھیرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے۔" پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: ان تقتل ولدك خشیة ان یطعَمَ معك، "یہ کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔" پوچھا گیا: پھر؟ فرمایا: ان تزانی حلیلة جارك، "یہ کہ تو اپنے ہمسایے کی بیوی سے زنا کرے۔" (بخاری، مسلم، ترمذی، نَسائی، احمد) اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں، لیکن عرب کی سوسائٹی پر اُس وقت سب سے زیادہ تسلّط انھی تین گناہوں کا تھا، اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں یہ چند لوگ ہیں جو اِن برائیوں سے بچ گئے ہیں۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین کے نزدیک تو شرک سے پرہیز کرنا ایک بہت بڑا عیب تھا، پھر اِسے مسلمانوں کی ایک خوبی کی حیثیت سے اُن کے سامنے پیش کرنے کی کون سی معقول وجہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصّب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپری سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری اُتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں رچی ہوئی موجود تھی، جس کو اُبھارنے کے لیے اُوپر کی سطح کو بس ذرا زور سے کُھرچ دینے کی ضرورت تھی۔ جاہلیّت کی تاریخ کے متعدِّد واقعات اِن دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً اَبرَہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ بُت نہیں ٹال سکتے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی تباہی پر ہم عصر شعرا نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اِس واقعے کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اِس میں اُن کے معبُودوں کا کوئی داخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکینِ عرب کے سامنے آیا تھا کہ اَبرَہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہلِ طائف نے اِس اندیشے سے کہ یہ کہیں اُن کے معبُود "لات" کے مندر کو بھی نہ گرا دے، اپنی خدمات کعبے کو منہدم کرنے کے لیے اس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بَدرَقے اس کے ساتھ کر دیے، تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس کے لشکر کو بخیریت مکہ تک پہنچا دیں۔ اس واقعے کی تلخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور سالہا سال تک وہ اُس شخص کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے جو طائف کے بَدرَقے کا سردار تھا۔ علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور خُصوصاً مناسک حج کو دینِ ابراہیمی ہی کے اجزا قرار دیتے تھے، اور یہ بھی مانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ خالص خدا پرست تھے، بُتوں کی پرستش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی رِوایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بُت پرستی اُن کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بُت کب، کہاں سے، کون لایا۔ اپنے معبُودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آ جاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذُوالخَلَصَہ نامی بُت کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلوائی۔ جواب نکلا: یہ کام نہ کیا جائے۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ

عذاب دیا جائے گا[۸۵] اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلّت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو۔[۸۶] ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے[۸۷] بدل دے گا

اس پر عرب طیش میں آ گیا۔ کہنے لگا:

لو كنت يا ذا الخلص الموتورا مثلي وكان شيخك المقبورا

لم تنه عن قتل العداة زورا

یعنی اے ذُوالخَلَصَہ! اگر میری جگہ تُو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔ ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلّہ اپنے معبُود سَعْد نامی کے آستانے پر لے گئے، تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا تڑنگا بُت تھا جس پر قربانیوں کا خون لتھڑا ہُوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح تِتَّر بِتَّر ہوتے دیکھ کر غصّے میں آ گیا۔ بُت پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ ''خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رہے سہے اونٹ بھی بھگا دیے۔'' متعدِّد بت ایسے تھے جن کی اصلیّت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے۔ مثلاً اَساف اور نائلہ جن کے مجسّمے صفا اور مَروہ پر رکھے ہوئے تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنھوں نے خانۂ کعبہ میں زِنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبُودوں کی ہو، ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دلوں میں نہیں ہوسکتی۔ ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر و منزلت تو دلوں میں موجود تھی، مگر ایک طرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا، اور دوسری طرف قریش کے پروہت اُس کے خلاف تعصُّبات بھڑکاتے رہتے تھے، کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آ جائے گا۔ ان سہاروں پر جو مذہبِ شرک قائم تھا، وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بے تکلّف کہا کہ تمھارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے، ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہے مشرکین تیار نہ ہوں، مگر دلوں میں وہ اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔

**۸۵** – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ عذاب کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے گا، بلکہ پے در پے

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۷۰ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝۷۱ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا

اور وہ بڑا غفور ؍ رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے [88] ۔۔۔ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں [89] بنتے اور کسی لغو

جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کفر یا شرک یا دہریّت والحاد کے ساتھ قتل اور زنا اور دوسری معصیتوں کا بوجھ لیے ہوئے جائے گا، اُس کو بغاوت کی سزا الگ ملے گی اور ایک ایک جرم کی سزا الگ الگ۔ اس کا ہر چھوٹا بڑا قصور حساب میں آئے گا۔ کوئی ایک خطا بھی معاف نہ ہوگی۔ قتل کی سزا ایک نہیں ہوگی بلکہ ہر فعلِ قتل کی الگ سزا اس کو بھگتنی ہوگی۔ زنا کی سزا بھی ایک نہیں ہوگی بلکہ جتنی بار وہ اس جرم کا مرتکب ہوا ہے، اس کی جداگانہ سزا پائے گا۔ اور یہی حال دوسرے تمام جرائم اور معاصی کے معاملے میں بھی ہوگا۔

۸۶ – یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ یہی عام معافی (general amnesty) کا اعلان تھا جس نے اُس بگڑے ہوئے معاشرے کے لاکھوں افراد کو سہارا دے کر مستقل بگاڑ سے بچالیا۔ اِسی نے ان کو اُمید کی روشنی دکھائی اور اصلاحِ حال پر آمادہ کیا۔ ورنہ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو، ان کی سزا سے اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، تو یہ انھیں مایوس کر کے ہمیشہ کے لیے بدی کے بھنور میں پھنسا دیتا اور کبھی ان کی اصلاح نہ ہوسکتی۔ مجرم انسان کو صرف معافی کی امید ہی جرم کے چکر سے نکال سکتی ہے۔ مایوس ہو کر وہ ابلیس بن جاتا ہے۔

توبہ کی اس نعمت نے عرب کے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا، اس کا اندازہ اُن بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو جسے ابنِ جَریر اور طَبرَانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہُرَیرہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مسجدِ نبویؐ سے عشا کی نماز پڑھ کر پلٹا تو دیکھا کہ ایک عورت میرے دروازے پر کھڑی ہے۔ میں اس کو سلام کر کے اپنے حُجرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے نوافل پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھا: کیا چاہتی ہے؟ وہ کہنے لگی: میں آپ سے ایک سوال کرنے آئی ہوں۔ مجھ سے زِنا کا ارتکاب ہوا۔ ناجائز حمل ہُوا۔ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اُسے مار ڈالا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ معاف ہونے کی بھی کوئی صورت ہے؟ میں نے کہا: ہرگز نہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ آہیں بھرتی ہوئی واپس چلی گئی، اور کہنے لگی: ’’افسوس! یہ حُسن آگ کے لیے پیدا ہوا تھا۔‘‘ صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ کر جب میں فارغ ہوا تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کا قصہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: بڑا غلط جواب دیا ابو ہریرہؓ تم نے، کیا یہ آیت قرآن میں تم نے نہیں پڑھی: وَالَّذِيْنَ

لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ ...... اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سن کر میں نکلا اور اس عورت کو تلاش کرنا شروع کیا۔ رات کو عشا ہی کے وقت وہ ملی۔ میں نے اسے بشارت دی اور بتایا کہ سرکار رسالت مآبؐ نے تیرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ وہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی: شکر ہے اُس خدائے پاک کا جس نے میرے لیے معافی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے گناہ سے توبہ کی اور اپنی لونڈی کو اس کے بیٹے سمیت آزاد کر دیا۔ اِس سے ملتا جُلتا واقعہ احادیث میں ایک بڈھے کا آیا ہے جس نے آ کر حضورؐ سے عرض کیا تھا کہ یا رسولؐ اللہ! ساری زندگی گناہوں میں گزری ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا ارتکاب نہ کر چکا ہوں۔ اپنے گناہ تمام رُوئے زمین کے باشندوں پر بھی تقسیم کر دوں تو سب کو لے ڈوبیں۔ کیا اب بھی میری معافی کی کوئی صورت ہے؟ فرمایا: کیا تو نے اسلام قبول کرلیا ہے؟ اس نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ فرمایا: جا، اللہ معاف کرنے والا اور تیری برائیوں کو بھلائی سے بدل دینے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: میرے سارے جرم اور قصور؟ فرمایا: ہاں، تیرے سارے جرم اور قصور۔ (ابنِ کثیر، بحوالہ ابنِ ابی حاتم)

۸۷ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جب وہ توبہ کرلیں گے تو کفر کی زندگی میں جو برے افعال وہ پہلے کیا کرتے تھے، ان کی جگہ اب طاعت اور ایمان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیک افعال کرنے لگیں گے اور تمام برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ دوسرے یہ کہ توبہ کے نتیجے میں صرف اتنا ہی نہ ہوگا کہ ان کے نامۂ اعمال سے وہ تمام قُصور کاٹ دیے جائیں گے جو انھوں نے کفر و گناہ کی زندگی میں کیے تھے، بلکہ ان کی جگہ ہر ایک کے نامۂ اعمال میں یہ نیکی لکھ دی جائے گی کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے بغاوت اور نافرمانی کو چھوڑ کر طاعت و فرماں برداری اختیار کرلی۔ پھر جتنی بار بھی وہ اپنی سابقہ زندگی کے برے اعمال کو یاد کر کے نادم ہوا ہوگا اور اس نے اپنے خدا سے اِستِغفار کیا ہوگا، اس کے حساب میں اتنی ہی نیکیاں لکھ دی جائیں گی، کیونکہ خطا پر شرمسار ہونا اور معافی مانگنا بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس طرح اس کے نامۂ اعمال میں تمام پچھلی برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی اور اس کا انجام صرف سزا سے بچ جانے تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ وہ الٹا انعامات سے سرفراز ہوگا۔

۸۸ – یعنی فطرت کے اعتبار سے بھی بندے کا اصلی مَرجَع اسی کی بارگاہ ہے، اور اَخلاقی حیثیت سے بھی وہی ایک بارگاہ ہے جس کی طرف اسے پلٹنا چاہیے، اور نتیجے کے اعتبار سے بھی اس بارگاہ کی طرف پلٹنا مفید ہے، ورنہ کوئی دوسری جگہ ایسی نہیں ہے جدھر رُجوع کر کے وہ سزا سے بچ سکے یا ثواب پا سکے۔ علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ پلٹ کر ایک ایسی بارگاہ کی طرف جاتا ہے جو واقعی ہے ہی پلٹنے کے قابل جگہ، بہترین بارگاہ، جہاں سے تمام بھلائیاں ملتی ہیں، جہاں سے قصوروں پر شرمسار ہونے والے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ معافی اور انعام سے نوازے جاتے ہیں، جہاں معافی مانگنے والے کے جرم نہیں گِنے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے توبہ کر کے اپنی اصلاح کتنی کرلی، جہاں بندے کو وہ آقا ملتا ہے جو انتقام پر خار کھائے نہیں بیٹھا ہے، بلکہ اپنے ہر شرمسار غلام کے لیے دامنِ رحمت کھولے ہوئے ہے۔

بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ

---

چیز پر اُن کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں[90]۔ جنھیں اگر اُن کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ[91] جاتے۔ جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک[92] دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام[93] بنا" ـــــ یہ ہیں وہ لوگ جو

---

۸۹- اس کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے اور کسی ایسی چیز کو واقعہ اور حقیقت قرار نہیں دیتے جس کے واقعہ اور حقیقت ہونے کا انھیں علم نہ ہو، یا جس کے خلافِ واقعہ و حقیقت ہونے کا انھیں اطمینان ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مُشاہَدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے، اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس دوسرے مطلب کے اعتبار سے "جھوٹ" کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنٰی ہے۔ انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا ہے، لذّت یا خوشنمائی یا ظاہری فائدے کے اُس جھوٹے مُلَمَّع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مُلَمَّع اتر جائے تو ہر بدی سراسر کھوٹ ہی کھوٹ ہے جس پر انسان کبھی نہیں ریجھ سکتا۔ لٰہذا ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی اس لحاظ سے جھوٹ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی چمک دمک کی وجہ ہی سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے۔ مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، اس لیے وہ اِس کھوٹ کو ہر روپ میں پہچان جاتا ہے، خواہ وہ کیسے ہی دلفریب دلائل، یا نظر فریب آرٹ، یا سماعت فریب خوش آوازیوں کا جامہ پہن کر آئے۔

۹۰- لَغْو کا لفظ اُس "جھوٹ" پر بھی حاوی ہے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، اور اس کے ساتھ تمام فضول، لایعنی اور بے فائدہ باتیں اور کام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اللہ کے صالح بندوں کی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ جان بُوجھ کر اس طرح کی چیزیں دیکھنے یا سننے یا ان میں حصّہ لینے کے لیے نہیں جاتے، اور اگر کبھی ان کے راستے میں ایسی کوئی چیز آ جائے تو ایک نگاہِ غلط انداز تک ڈالے بغیر اُس پر سے اِس طرح گزر جاتے ہیں جیسے ایک نفیس مزاج آدمی گندگی کے ڈھیر سے گزر جاتا ہے۔ غلاظت اور تعفُّن سے دلچسپی ایک بد ذوق اور پلید آدمی تو لے سکتا ہے، مگر ایک خوش ذوق اور مہذب انسان مجبوری کے بغیر اس کے پاس سے بھی گزرنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ بدبو سے مستفید ہونے کے لیے ایک سانس بھی وہاں لے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم،

يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾

اپنے صبر[۹۴] کا پھل منزل بلند کی شکل میں[۹۵] پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے اُن کا استقبال ہو گا۔

المومنون حاشیہ ۴)

**۹۱** – اصل میں الفاظ ہیں: لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ’’وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے۔‘‘ لیکن یہاں ’’گرنے‘‘ کا لفظ اپنے لُغوی معنٰی کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں: ’’جہاد کا حکم سن کر بیٹھے رہ گئے۔‘‘ اس میں بیٹھنے کا لفظ اپنے لُغوی معنٰی میں نہیں بلکہ جہاد کے لیے حرکت نہ کرنے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ٹس سے مَس نہ ہوں، بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایت اُن آیات میں آئی ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں، جس چیز کو فرض قرار دیا گیا ہو اُسے بجالاتے ہیں، جس چیز کی مَذمّت بیان کی گئی ہو اُس سے رک جاتے ہیں، اور جس عذاب سے ڈرایا گیا ہو اُس کے تصوُّر سے کانپ اُٹھتے ہیں۔

**۹۲** – یعنی اُن کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دے، اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر، کیونکہ ایک مومن کو بیوی بچوں کے حسن و جمال اور عیش و آرام سے نہیں بلکہ ان کی نیک خصالی سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہو سکتی کہ جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ پیارے ہیں، انھیں دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے دیکھے۔ ایسی صورت میں تو بیوی کا حسن اور بچوں کی جوانی و لیاقت اس کے لیے اور بھی زیادہ سوہانِ روح ہو گی، کیونکہ وہ ہر وقت اس رنج میں مبتلا رہے گا کہ یہ سب اپنی اِن خوبیوں کے باوجود اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں۔

یہاں خاص طور پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں، وہ وقت وہ تھا جب کہ مکے کے مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے محبُوب ترین رشتہ دار کفر و جاہلیّت میں مبتلا نہ ہوں۔ کوئی مرد ایمان لے آیا تھا تو اس کی بیوی ابھی کافر تھی۔ کوئی عورت ایمان لے آئی تھی تو اس کا شوہر ابھی کافر تھا۔ کوئی نوجوان ایمان لے آیا تھا تو اس کے ماں باپ اور بھائی بہن، سب کے سب کفر میں مبتلا تھے۔ اور کوئی باپ ایمان لے آیا تھا تو اس کے اپنے جوان جوان بچے کفر پر قائم تھے۔ اس حالت میں ہر مسلمان ایک شدید روحانی اذیت میں مبتلا تھا اور اس کے دل سے وہ دعا نکلتی تھی جس کی بہترین ترجمانی اس آیت میں کی گئی ہے۔ ’’آنکھوں کی ٹھنڈک‘‘ نے اِس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے کہ اپنے پیاروں کو کفر و جاہلیت میں مبتلا دیکھ کر ایک آدمی کو ایسی اذیّت ہو رہی ہے جیسے اس کی آنکھیں آشوبِ چشم سے اُبل آئی ہوں اور کھٹک سے سُوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ اِس سلسلۂ کلام میں ان کی اس کیفیت کو دراصل یہ بتانے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس دین پر ایمان لائے ہیں، پورے خلوص کے ساتھ لائے ہیں۔ ان کی حالت اُن لوگوں کی سی نہیں ہے جن کے خاندان کے

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّىۡ لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ ۚ فَقَدۡ كَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ يَكُوۡنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

اے محمدؐ! لوگوں سے کہو: "میرے رب کو تمھاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اُس کو نہ پکارو[96]۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے، عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھُڑانی محال ہو گی۔" ع

---

لوگ مختلف مذہبوں اور پارٹیوں میں شامل رہتے ہیں اور سب مطمئن رہتے ہیں کہ چلو، ہر بینک میں ہمارا کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔

۹۳ – یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھ جائیں، بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں، محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت و حشمت میں نہیں بلکہ نیکی و پرہیز گاری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہمارے زمانے میں کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اِس آیت کو بھی امامت کی امیدواری اور ریاست کی طلب کے لیے دلیلِ جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ! متقی لوگوں کو ہماری رعیت اور ہم کو ان کا حکمراں بنا دے۔" اس سُخن فہمی کی داد "اُمیدواروں" کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔

۹۴ – صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دینِ حق کو قائم اور سر بلند کرنے کی جِدّوجُہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے عَلَی الرَّغم فرض کو بجا لانا، حرام سے پرہیز کرنا اور حُدود اللہ پر قائم رہنا۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ غَرَض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رَوِیّے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

۹۵ – اصل میں لفظ غُرْفَة استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ بلند و بالا عمارت کے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "بالاخانہ" کیا جاتا ہے، جس سے آدمی کے ذہن میں ایک دو منزلہ کوٹھے کی سی تصویر آ جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، حتّٰی کہ ہندوستان کا روضۂ تاج اور امریکا کے "فلک شگاف" (sky-scrapers) تک جنت کے اُن محلات کی محض ایک بھونڈی سی نقل ہیں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولادِ آدم کے لاشُعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔

۹۶- یعنی اگر تم اللہ سے دعائیں نہ مانگو، اور اس کی عبادت نہ کرو، اور اپنی حاجات کے لیے اس کو مدد کے لیے نہ پکارو، تو پھر تمھارا کوئی وزن بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ پرِ کاہ کے برابر بھی تمھاری پروا کرے۔ محض مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں۔ تم سے اللہ کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ تم بندگی نہ کرو گے تو اس کا کوئی کام رُکا رہ جائے گا۔ اس کی نگاہِ التفات کو جو چیز تمھاری طرف مائل کرتی ہے، وہ تمھارا اُس کی طرف ہاتھ پھیلانا اور اس سے دعائیں مانگنا ہی ہے۔ یہ کام نہ کرو گے تو کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیے جاؤ گے۔

---

# تفہیم القرآن

## الشُّعرآء

(٢٦)

# الشُّعَرَآء

## نام

آیت ۲۲۴ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے ماخوذ ہے۔

## زمانۂ نُزُول

مضمون اور اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول مکے کا دَورِ متوسط ہے۔ ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر واقعہ، اور اس کے بعد الشعرآء۔ (روح المعانی، جلد ۱۹، صفحہ ۶۴) اور سورۂ طٰہٰ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

## موضوع اور مَباحِث

تقریر کا پَس منظر یہ ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تذکیر کا مقابلہ پیہم جُحود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر ہمیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو۔ کبھی آپؐ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپؐ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اُڑا دینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپؐ کے مشن کا استخفاف کرتے کہ اِن کے پیرو یا تو چند نادان نوجوان ہیں، یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طَبَقات کے لوگ، حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشرافِ قوم اور شُیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غَلَطی اور توحید و مَعاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھکے جاتے تھے، مگر وہ ہٹ دھرمی کی نت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی چیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوہانِ رُوح بنی ہوئی تھی اور اس غم میں آپؐ کی جان گھلی جاتی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم اِن کے پیچھے اپنی جان کیوں گُھلاتے ہو؟ اِن کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے، کسی ایسی نشانی کے طالب ہیں جو زبردستی ان کی گردنیں جھکا دے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آ جائے گی تو انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات اِنھیں سمجھائی جا رہی تھی، وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد دسویں رُکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ طالبِ حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنھیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے ہیں، نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاءؑ کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آ کر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں، جنھوں نے

اُسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفارِ مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں: ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر صاحبِ عقل آدمی تحقیق کرسکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے، وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قومِ نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قومِ لوط اور اصحاب الأیکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی حُجّتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے۔ اور آخرکار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاؑ کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اَخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حجت کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسری بات جو بار بار دُہرائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا زبردست، قادر و توانا بھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رُکوع میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں۔ اِس قرآن کو دیکھو جو تمھاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جِن کا کلام ہوسکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا تمھیں کاہن نظر آتا ہے؟ کیا محمدؐ اور ان کے اصحاب تمھیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مَشرب ہُوا کرتے ہیں؟ ضدّم ضدّا کی بات دوسری ہے، مگر اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظُلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجام دیکھ کر رہو گے۔

---

المنزل (۵)

۲۲۷ آیاتها

## سُورَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ

۱۱ رکوعاتها

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳﴾ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِيۡنَ ﴿۴﴾ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهُ

---

ط-س-م- یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔[۱]

اے محمدؐ! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔[۲] ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ اِن کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں[۳]۔ اِن لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے

---

۱- یعنی یہ آیات، جو اس سورہ میں پیش کی جا رہی ہیں، اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدّعا صاف صاف کھول کر بیان کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر یا سُن کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی طرف بلاتی ہے، کس چیز سے روکتی ہے، کسے حق کہتی ہے اور کسے باطل قرار دیتی ہے۔ ماننا یا نہ ماننا الگ بات ہے، مگر کوئی شخص یہ بہانہ کبھی نہیں بنا سکتا کہ اس کتاب کی تعلیم اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ اس سے یہ معلوم ہی نہ کر سکا کہ وہ اُس کو کیا چیز چھوڑنے اور کیا اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

قرآن کو الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ کہنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے مضامین، اس کے پیش کردہ حقائق، اور اس کے حالاتِ نزول، سب کے سب صاف صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ خداوندِ عالَم ہی کی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ہر فقرہ جو اس کتاب میں آیا ہے، ایک نشانی اور ایک معجزہ (آیت) ہے۔ کوئی شخص عقل و خرد سے کام لے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کرنے کے لیے کسی اور نشانی کی حاجت نہیں، کتابِ مبین کی یہی آیات (نشانیاں) اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ مختصر تمہیدی فقرہ اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے اُس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو آگے اس سورہ میں بیان ہوا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگتے تھے، تاکہ اس نشانی کو دیکھ کر انھیں

اطمینان ہو کہ واقعی آپؐ یہ پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر حقیقت میں کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتابِ مبین کی یہ آیات موجود ہیں۔ اسی طرح کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ آپ شاعر یا کاہن ہیں۔ فرمایا گیا کہ یہ کتاب کوئی چیستاں اور مُعمّا تو نہیں ہے۔ صاف صاف کھول کر اپنی تعلیم پیش کر رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسی شاعر یا کاہن کی ہو سکتی ہے؟

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کا ذکر قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ''شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔'' (آیت ۶) اور سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ''ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمھاری جان نہ گُھلے۔'' (آیت ۸) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دَور میں اپنی قوم کی گمراہی و ضلالت، اس کی اَخلاقی پستی، اس کی ہٹ دھرمی، اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کا رنگ دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم برسوں اپنے شب و روز کس دل گداز و جاں گُسِل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔ بَخع کے اصل معنیٰ پوری طرح ذبح کر ڈالنے کے ہیں۔ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے لُغوی معنیٰ یہ ہوئے کہ تم اپنے آپ کو قتل کیے دے رہے ہو۔

۳- یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و طاعت کی رَوِش اختیار کرنے پر مجبُور کر دے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و خِرَدْ سے کام لے کر اُن آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتابِ الٰہی میں پیش کی گئی ہیں، جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاعلیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بُوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترکِ باطل اور اتباعِ حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط، جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جا سکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رُجحانات رکھ دیے ہیں، فُجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے، نبوت اور وحی اور دعوتِ خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسبِ حال صلاحیتیں دے کر اِس امتحان کے مَقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و طاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائے

مُعْرِضِيْنَ ۝۵ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶

منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب کہ یہ جُھٹلا چکے ہیں، عنقریب اِن کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اُڑاتے رہے ہیں[۴]۔

جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبُور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبُور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اُسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدایشی فرماں بردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدّد مواقع پر قرآنِ مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ’’اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟‘‘ (یُونُس آیت ۹۹) اور وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ ’’اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمّت بنا سکتا تھا۔ وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا۔‘‘ (ہود، آیت ۱۱۸ - ۱۱۹) مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حواشی ۱۰۱ - ۱۰۲۔ ہود، حاشیہ ۱۱۶۔

۴ - یعنی جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقولیت کے ساتھ ان کو سمجھانے اور راہِ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے، اس کا مقابلہ بے رخی و بے التفاتی سے کریں، ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انھیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف وہ بے رخی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکذیب پر، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اُڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجامِ بد انھیں دکھا دیا جائے۔ یہ انجامِ بد اِس شکل میں بھی انھیں دکھایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاحمتوں کے باوجود غالب آ جائے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ اِس کی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان پر ایک عذابِ الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اِس شکل میں بھی ان کے سامنے آ سکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخر کار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انھوں نے اپنا تمام سرمایۂ زندگانی کھپا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیا علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اُڑاتے رہے۔ اس انجامِ بد کے سامنے آنے کی چونکہ

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الۡاَرۡضِ كَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ۝۷ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ‌ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝۸ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝۹ ع

اور کیا انھوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے،[۵] مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔[۶] ع

بہت سی شکلیں ہیں اور مختلف لوگوں کے سامنے وہ مختلف صورتوں سے آسکتا ہے اور آتا رہا ہے، اسی لیے آیت میں نَبَا کے بجائے اَنۡبَاء بصیغۂ جمع فرمایا گیا، یعنی جس چیز کا یہ مذاق اُڑا رہے ہیں، اس کی حقیقت آخرکار بہت سی مختلف شکلوں میں انھیں معلوم ہوگی۔

۵- یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اِس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحیدِ الٰہ) انبیا علیہم السلام پیش کرتے ہیں، وہ صحیح ہے، یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرینِ خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادّوں اور قوتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اُگ رہی ہیں، پھر ان کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے۔ یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی، اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصّب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

۶- یعنی اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزا دینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے۔ مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے،

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿ؕ۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ

اِنھیں اُس وقت کا قصہ سُناؤ جب کہ تمھارے رب نے موسیٰؑ کو پکارا[7]: "ظالم قوم کے پاس جا ــــ فرعون کی قوم کے پاس[8] ــــ کیا وہ نہیں ڈرتے[9]؟" اُس نے عرض کیا: "اے میرے رب! مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جُھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گُھٹتا ہے

سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیے جاتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

۷ ــ اُوپر کی مختصر تمہیدی تقریر کے بعد اب تاریخی بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کی ابتدا حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے قصّے سے کی گئی ہے۔ اس سے خاص طور پر جو سبق دینا مقصود ہے، وہ یہ کہ:

اوّلاً: حضرت موسیٰؑ کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ اُن حالات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ سخت تھے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ درپیش تھا۔ حضرت موسیٰؑ ایک غلام قوم کے فرد تھے جو فرعون اور اس کی قوم سے بری طرح دبی ہوئی تھی، بخلاف اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک فرد تھے اور آپؐ کا خاندان قریش کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بالکل برابر کی پوزیشن رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے خود اس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی اور ایک قتل کے الزام میں دس برس روپوش رہنے کے بعد انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اسی بادشاہ کے دربار میں جا کھڑے ہوں جس کے ہاں سے وہ جان بچا کر فرار ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کسی نازک صورتِ حال سے سابقہ نہ تھا۔ پھر فرعون کی سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت و رسلطنت تھی۔ قریش کی طاقت کو اس کی طاقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخر کار اُن سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ جس کی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہو، اس کا مقابلہ کر کے کوئی جیت نہیں سکتا۔ جب فرعون کی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کچھ پیش نہ گئی تو تم بیچارے کیا ہستی ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں بازی جیت لے جاؤ گے۔

ثانیاً: جو نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے فرعون کو دکھائی گئیں، اس سے زیادہ کھلی نشانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں فرعون ہی کے چیلنج پر علی الاعلان جادوگروں سے مقابلہ کرا کے یہ ثابت بھی کر دیا گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام دکھا رہے ہیں، وہ جادو نہیں ہے۔ فنِ سحر کے جو ماہرین

وَ لَا يَنۡطَلِقُ لِسَانِىۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰى هٰرُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمۡ عَلَىَّ

اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارونؑ کی طرف رسالت بھیجیں[10]۔ اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جُرم کا

فرعون کی اپنی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور اُس کے اپنے بُلائے ہوئے تھے، انھوں نے خود یہ تصدیق کر دی کہ حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی کا اژدہا بن جانا ایک حقیقی تغیُّر ہے اور یہ صرف خدائی معجزے سے ہوسکتا ہے، جادوگری کے ذریعے سے ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ ساحروں نے ایمان لاکر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس امر میں کسی شک کی گنجایش بھی باقی نہ چھوڑی کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ نشانی واقعی معجزہ ہے، جادوگری نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی جو لوگ ہٹ دھرمی میں مبتلا تھے، انھوں نے نبی کی صداقت تسلیم کر کے نہ دی۔ اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمھارا ایمان لانا درحقیقت کوئی حِسّی معجزہ اور مادّی نشان دیکھنے پر موقوف ہے۔ تَعَصُّب، حَمِیَّتِ جاہلیہ، اور مفاد پرستی سے آدمی پاک ہو اور کُھلے دل سے حق اور باطل کا فرق سمجھ کر غلط بات کو چھوڑنے اور صحیح بات قبول کرنے کے لیے کوئی شخص تیار ہو تو اس کے لیے وہی نشانیاں کافی ہیں جو اِس کتاب میں اور اس کے لانے والے کی زندگی میں اور خدا کی وسیع کائنات میں ہر آنکھوں والا ہر وقت دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ ایک ہٹ دھرم آدمی، جسے حق کی جستجو ہی نہ ہو اور اغراضِ نفسانی کی بندگی میں مبتلا ہو کر جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ کسی ایسی صداقت کو قبول نہ کرے گا جس سے اس کی اغراض پر ضرب لگتی ہو، وہ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے گا، خواہ زمین اور آسمان ہی اس کے سامنے کیوں نہ اُلٹ دیے جائیں۔

ثالثاً: اس ہٹ دھرمی کا جو انجام فرعون نے دیکھا، وہ کوئی ایسا انجام تو نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ بے تاب ہوں۔ اپنی آنکھوں سے خدائی طاقت کے نشانات دیکھ لینے کے بعد جو نہیں مانتے، وہ پھر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کیا تم لوگ اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس کا مزا چکھنا ہی پسند کرتے ہو؟

تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۱۰۳ تا ۱۳۷۔ یونُس، ۷۵ تا ۹۲۔ بنی اسرائیل، ۱۰۱ تا ۱۰۴۔ جلد سوم، طٰہٰ، ۹ تا ۷۹۔

۸- یہ اندازِ بیان قومِ فرعون کے انتہائی ظلم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعارف ہی ''ظالم قوم'' کے لقب سے کرایا گیا ہے۔ گویا اس کا اصل نام ظالم قوم ہے اور قومِ فرعون اس کا ترجمہ و تفسیر۔

۹- یعنی اے موسیٰ! دیکھو کیسی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مختارِ مُطلَق سمجھتے ہوئے دنیا میں ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور اس بات سے بے خوف ہیں کہ اُوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان سے باز پُرس کرنے والا ہے۔

ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا

الزام بھی ہے، اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں[11] گے۔'' فرمایا: ''ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ

**۱۰**۔ سورۂ طٰہٰ، رکوع ۲، اور سورۂ قصص، رکوع ۴ میں اس کی جو تفصیل آئی ہے، اسے ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اوّل تو اتنے بڑے مشن پر تنہا جاتے ہوئے گھبراتے تھے (''میرا سینہ گُھٹتا ہے'' کے الفاظ اسی کی نشان دہی کرتے ہیں)، دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت ہارونؑ کو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے نبی بنا کر بھیجا جائے، کیونکہ وہ زیادہ زبان آور ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو وہ ان کی تائید و تصدیق کر کے ان کی پشت مضبوط کریں گے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً حضرت موسیٰؑ کی درخواست یہی رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارونؑ کو اس منصب پر مامور کیا جائے، اور بعد میں جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ مرضیِ الٰہی آپ ہی کو مامور کرنے کی ہے تو پھر یہ درخواست کی ہو کہ انھیں آپ کا وزیر اور مددگار بنایا جائے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ ان کو وزیر بنانے کی درخواست نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ''آپ ہارونؑ کی طرف رسالت بھیجیں۔'' اور سورۂ طٰہٰ میں وہ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۙ هٰرُوْنَ اَخِي ۙ ''میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر مقرر فرما دیجیے، میرے بھائی ہارون کو۔'' نیز سورۂ قصص میں وہ یہ عرض کرتے ہیں کہ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ''میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہیں، لہٰذا آپ انھیں مددگار کے طور پر میرے ساتھ بھیجیے، تاکہ وہ میری تصدیق کریں۔'' اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ مؤخر الذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں، اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰؑ سے اِس سورہ میں نقل ہوئی ہے۔

بائبل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قومِ فرعون کی تکذیب کا خوف اور اپنی زبان کے کُند ہونے کا عذر پیش کر کے یہ منصب قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا: ''اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں، کسی اور کے ہاتھ سے، جسے تو چاہے، یہ پیغام بھیج۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے بطورِ خود حضرت ہارونؑ کو ان کے لیے مددگار مقرر فرما کر انھیں اس بات پر راضی کیا کہ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس جائیں۔ (خروج، باب ۴۔ آیات ۱ تا ۱۷) مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۹۔

**۱۱**۔ یہ اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جو سورۂ قصص، رُکوع ۲ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قومِ فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ اس واقعے کی اطلاع قومِ فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں، تو وہ ملک چھوڑ کر مَدْیَن کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشی کے بعد یکایک انھیں یہ

بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

---

ہماری نشانیاں [۱۲] لے کر، ہم تمھارے ساتھ سب کچھ سُنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: ہم کو ربّ العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے د [۱۳] ے۔''

فرعون نے کہا: ''کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچّہ سا نہیں پا [۱۴] لا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے، اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا، [۱۵] تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔''

موسیٰ نے جواب دیا: ''اُس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر [۱۶] دیا تھا۔

---

حکم دیا گیا کہ تم پیغامِ رسالت لے کر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمھارے خلاف قتل کا مُقدّمہ پہلے سے موجود ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سنانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا۔

۱۲ – نشانیوں سے مراد عصا اور ید بیضا کے معجزے ہیں جن کے عطا کیے جانے کی تفصیل سورۂ الاعراف رُکوع ۱۳ – ۱۴، طٰہٰ رکوع ۱، سورۂ نمل رکوع ۱، اور سورۂ قصص رکوع ۴ میں بیان ہوئی ہے۔

۱۳ – حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی دعوت کے دو جز تھے: ایک، فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، جو تمام انبیا علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود رہا ہے۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو فرعون کے بندِ غلامی سے نکالنا، جو مخصوص طور پر انھی دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآنِ مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جز کا ذکر کیا گیا ہے (مثلاً سورۂ نازعات میں)، اور کسی جگہ صرف دوسرے جُز کا۔

۱۴ – اس سے ایک اشارہ اس خیال کی تائید میں نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون نہ تھا جس کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی، بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔ اگر یہ وہی فرعون ہوتا تو کہتا کہ میں نے تجھے پالا تھا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہاں تُو رہا ہے اور ہم نے تیری پرورش کی ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو:

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ أَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

---

پھر میں تمھارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا[۱۷] اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ رہا تیرا احسان جو تُو نے مجھ پر جتایا ہے، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔[۱۸]"

فرعون نے کہا:[۱۹] "اور یہ ربّ العالمین کیا ہوتا ہے؟[۲۰]"

موسیٰؑ نے جواب دیا: "آسمانوں اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو۔[۲۱]"

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا: "سُنتے ہو؟"

---

تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۵-۹۳)

۱۵- اشارہ ہے اسی واقعۂ قتل کی طرف جو حضرت موسیٰؑ سے سرزد ہو گیا تھا۔

۱۶- اصل الفاظ ہیں: وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ "میں اُس وقت ضلالت میں تھا" یا "میں نے اس وقت یہ کام ضلالت کی حالت میں کیا تھا"۔ یہ لفظِ ضلالت لازماً "گمراہی" کا ہی ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ عَرَبی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطا، نِسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے یہاں ضلالت بمعنیٰ خطا یا نادانستگی ہی لینا زیادہ صحیح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ایک اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھ کر صرف ایک گھونسا مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ گھونسے سے بالعموم آدمی مرتا نہیں ہے، نہ قتل کی نیت سے گھونسا مارا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے وہ شخص مر گیا۔ اس لیے صحیح صورتِ واقعہ یہی ہے کہ یہ قتل عمد نہیں بلکہ قتلِ خطا تھا۔ قتل ہوا ضرور، مگر بالارادہ قتل کی نیت سے نہیں ہوا، نہ کوئی ایسا آلہ یا ذریعہ استعمال کیا گیا جو قتل کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے یا جس سے قتل واقع ہونے کی

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ

موسیٰؑ نے کہا: ”تمھارا رب بھی اور تمھارے اُن آبا و اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔“[۲۲]

فرعون نے (حاضرین سے) کہا: ”تمھارے یہ رسول صاحب جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“

موسیٰؑ نے کہا: ”مشرق و مغرب اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے، سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔“[۲۳]

فرعون نے کہا: ”اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی اُن لوگوں میں شامل

توقع کی جا سکتی ہے۔

۱۷- یعنی علم و دانش اور پروانۂ نبوت۔ حکم کے معنیٰ حکمت و دانش کے بھی ہیں، اور اس سندِ اقتدار (authority) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو عطا کی جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ اختیار کے ساتھ بولتا ہے۔

۱۸- یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا۔ تیرے ہی ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا؟ اس لیے اس پرورش کا احسان جتانا تجھے زیب نہیں دیتا۔

۱۹- بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کر کے فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ یہ بات آپ سے آپ ظاہر ہے کہ نبی نے ضرور وہ پیغام پہنچا دیا ہوگا جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اسے چھوڑ کر اب وہ گفتگو نقل کی جاتی ہے جو اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون اور موسیٰؑ کے درمیان ہوئی۔

۲۰- یہ اُس کا سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِس قول پر تھا کہ میں ربّ العالمین (تمام جہان والوں کے

مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾

کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔"[24]
موسیٰؑ نے کہا: " اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟"[25]

مالک و آقا اور فرماں روا) کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس پیغام کی نوعیت صریح طور پر سیاسی تھی۔ اس کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ حضرت موسیٰؑ جس کی نمایندگی کے مُدّعی ہیں، وہ سارے جہان والوں پر حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون کو اپنا تابع قرار دے کر اس کے دائرۂ حکومت و اقتدار میں ایک بالاتر فرمانروا کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مداخلت کر رہا ہے بلکہ اس کے نام یہ فرمان بھیج رہا ہے کہ تو اپنی رعایا کے ایک حصے کو میرے نامزد کردہ نمایندے کے حوالے کر دے، تاکہ وہ اسے تیری سلطنت سے نکال کر لے جائے۔ اس پر فرعون پوچھتا ہے کہ یہ سارے جہان والوں کا مالک و فرمانروا ہے کون جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کے ہاتھوں یہ حکم بھیج رہا ہے۔

۲۱ - یعنی میں زمین پر بسنے والے کسی مخلوق اور فانی مُدّعیِ مُلوکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک و فرمانروا ہے تو تمھیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہونی چاہیے کہ سارے جہاں والوں کا رب کون ہے۔

۲۲ - حضرت موسیٰؑ کا یہ خطاب فرعون کے درباریوں سے تھا جن سے فرعون نے کہا تھا کہ "سنتے ہو۔" حضرت موسیٰؑ نے اُن سے فرمایا کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے، اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں۔ تمھارا یہ فرعون جو آج تمھارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا، اور کل تمھارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں۔ میں صرف اُس رب کی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں جو آج بھی تمھارا اور اِس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمھارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں، ان سب کا رب بھی تھا۔

۲۳ - یعنی مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارا فرعون ہے جو زمین کے ایک ذرا سے رقبے پر بادشاہ بن بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مصر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو فرماں روائی اُسی کی مانتا ہوں اور اسی کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

۲۴ - اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی "معبُود" کا تصوُّر صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا۔ یعنی یہ کہ اُسے بس پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے

قَالَ فَأْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ

فرعون نے کہا: ''اچھا تو لے آ اگر تو سچّا ہے۔''[۲۶]

(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک

استمداد و استعانت کے لیے دعائیں مانگیں۔ لیکن کسی معبُود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملاتِ دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امرونہی کو قانونِ برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کردی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختارِ مُطلَق ہیں، کسی معبود کو ہماری سیاست اور ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہیوں سے انبیاعلیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ اُنھوں نے اِن سے خداوندِ عالَم کی حاکمیت و بالا دستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے، اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیتِ مُطلَقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انھوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھیرایا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے۔ اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ ربّ العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر صرف اسی معنیٰ میں توحید فی العبادت کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضب ناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دینِ آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰؑ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پنڈتوں سے مناظرہ کرلو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا، وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ربّ العالمین کے نمایندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکمِ برتر کا پیغامبر آ کر اس سے اطاعتِ امر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس معنیٰ میں وہ اپنے اُوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکمِ برتر مانے۔ اسی لیے اس نے پہلے ''ربّ العالمین'' کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبُودیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس ربّ العالمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف صاف دھمکی دے دی کہ ملکِ مصر میں تم نے میرے اقتدارِ اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام بھی لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ ع

صریح اژدہا تھا۔[۲۷] پھر اُس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔[۲۸] ع

**۲۵** – یعنی کیا تو اُس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جب کہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اُس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العالمین، رب السماوات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے؟

**۲۶** – حضرت موسیٰؑ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا۔ وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ کے الٰہ الآلہہ ہونے کو مانتا تھا اور اُنھی کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اُس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اسی کا بھیجا ہوا ہوں۔ اور اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالکِ کائنات ہونے ہی میں اسے کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ نشانی کی بات تو اسی صورت میں درمیان میں آ سکتی تھی جب کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا قادرِ مُطلَق ہونا تو مسلّم ہو، اور بحث اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰؑ اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

**۲۷** – قرآنِ مجید میں کسی جگہ اس کے لیے حَيَّةٌ (سانپ)، اور کسی جگہ جَآنٌّ (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اُسے ثُعۡبَانٌ (اژدہا) کہا جا رہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازیؒ اس طرح کرتے ہیں کہ حَيَّةٌ عَرَبی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور ثُعۡبَانٌ کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ جسامت کے اعتبار سے وہ اژدہے کی طرح تھا۔ اور جَآنٌّ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ اس کی پُھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔

**۲۸** – بعض مفسرین نے یہودی رِوایات سے مُتأثّر ہو کر بَيۡضَآءُ کے معنیٰ "سفید" کیے ہیں، اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بغل سے نکالتے ہی بھلا چنگا ہاتھ برص کے مریض کی طرح سفید ہو گیا۔ لیکن ابن جَرِیر، ابن کثیر، زَمَخشَری، رازی، ابو السعود، عِمَادی، آلُوسی اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں بَيۡضَآءُ بمعنیٰ روشن اور چمک دار ہے۔ جونہی کہ حضرت موسیٰؑ نے بغل سے ہاتھ نکالا، یکایک سارا ماحول جگمگا اُٹھا اور یوں محسوس ہوا جیسے سورج نکل آیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، طٰہٰ، حاشیہ ۱۳)

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿٣٦﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿٣٧﴾

---

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا: " یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادُو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دے۔[29] اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو؟[30]"

انھوں نے کہا: " اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔"

---

**۲۹**۔ دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یا تو ایک لحہ پہلے وہ اپنی رعیت کے ایک فرد کو برسرِ دربار رسالت کی باتیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتے دیکھ کر پاگل قرار دے رہا تھا (کیونکہ اس کے نزدیک ایک غلام قوم کے فرد کا اس جیسے باجَبرُوت بادشاہ کے حُضور ایسی جسارت کرنا پاگل پن کے سوا اور کچھ نہ ہوسکتا تھا)، اور اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود مانا تو جیل میں سڑا سڑا کر مار دوں گا، یا اب ان نشانیوں کو دیکھتے ہی اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسے اپنی بادشاہی اور اپنا ملک چھننے کا خطرہ لاحق ہوگیا، اور بدحواسی میں اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں بھرے دربار میں اپنے نوکروں کے سامنے کیسی بے تکی باتیں کر رہا ہوں۔ بنی اسرائیل جیسی دبی ہوئی قوم کے دو افراد وقت کے سب سے بڑے طاقت ور بادشاہ کے سامنے کھڑے تھے۔ کوئی لاؤ لشکر ان کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی جان ان کی قوم میں نہ تھی۔ کسی بغاوت کا نام ونشان تک ملک کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ اس حالت میں صرف ایک لاٹھی کا اژدہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتے دیکھ کر یکایک اس کا چیخ اٹھنا کہ یہ دو بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دیں گے اور پورے حکمران طبقے کو اقتدار سے بے دخل کر دیں گے، آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا، مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہُوا، کوئی ملک فتح نہیں ہُوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادوگر تو اس کے اپنے ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے۔ مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کر کے انعام لینے سے بڑھ کر ان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ سلطنت تو کجا، وہ بیچارے تو سلطنت کے کسی پولیس کانسٹیبل کو بھی چیلنج کرنے کی

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

---

چنانچہ ایک روز مقرر وقت[۳۱] پر جادُوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا: ''تم اجتماع میں چلو گے؟[۳۲] شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔[۳۳]''

جب جادوگر میدان میں آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: ''ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟[۳۴]''

---

ہمّت نہ کر سکتے تھے۔

**۳۰**– یہ فقرہ فرعون کی مزید بدحواسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کہاں تو وہ الٰہ بنا ہُوا تھا اور یہ سب اس کے بندے تھے۔ کہاں اب الٰہ صاحب مارے خوف کے بندوں سے پوچھ رہے ہیں کہ تمھارا حکم کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری عقل تو اب کچھ کام نہیں کرتی، تم بتاؤ کہ اس خطرے کا مقابلہ میں کیسے کروں۔

**۳۱**– سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ اس مقابلے کے لیے قبطیوں کی قومی عید کا دن (یَوْمُ الزِّیْنَۃِ) مقرر کیا گیا تھا، تاکہ ملک کے گوشے گوشے سے میلوں ٹھیلوں کی خاطر آنے والے سب لوگ یہ عظیم الشان ''دنگل'' دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں، اور اس کے لیے وقت بھی دن چڑھے کا طے ہوا تھا، تاکہ روزِ روشن میں سب کی آنکھوں کے سامنے فریقین کی طاقت کا مظاہرہ ہو اور روشنی کی کمی کے باعث کوئی شک وشبہ پیدا ہونے کی گنجایش نہ رہے۔

**۳۲**– یعنی صرف اعلان و اشتہار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آدمی اس غرض کے لیے چھوڑے گئے کہ لوگوں کو اُکسا اُکسا کر یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے لائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھرے دربار میں جو معجزات حضرت موسیٰؑ نے دکھائے تھے، ان کی خبر عام لوگوں میں پھیل چکی تھی اور فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس سے ملک کے باشندے متأثّر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور خود دیکھ لیں کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہمارے ملک کا ہر جادُوگر یہ کمال دکھا سکتا ہے۔

**۳۳**– یہ فقرہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جن حاضرینِ دربار نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھا تھا اور باہر جن لوگوں تک اس کی معتبر خبریں پہنچی تھیں، ان کے عقیدے اپنے دینِ آبائی پر سے متزلزل ہوئے جا رہے تھے، اور اب ان کے دین کا دارومدار بس اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادُوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

اس نے کہا: ”ہاں، اور تم تو اس وقت مُقرّبین میں شامل ہو جاؤ گے۔“[۳۵]

موسیٰؑ نے کہا: ”پھینکو جو تمھیں پھینکنا ہے۔“

انھوں نے فوراً اپنی رسّیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے: ”فرعون کے اقبال سے

نے کیا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کُن مقابلہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے پھرتے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو ہم موسیٰؑ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے، ورنہ ہمارے دین وایمان کی خیر نہیں ہے۔

۳۴- یہ تھے وہ حامیانِ دینِ مشرکین جو موسیٰ علیہ السلام کے حملے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے اس فیصلہ کُن مقابلے کے وقت اِن پاکیزہ جذبات کے ساتھ آئے تھے کہ ہم نے پالا مار لیا تو سرکار سے کچھ انعام مل جائے گا۔

۳۵- اور یہ تھا وہ بڑے سے بڑا اجر جو اِن خادمانِ دین وملّت کو بادشاہِ وقت کے ہاں سے مل سکتا تھا۔ یعنی روپیا پَیسا ہی نہیں ملے گا، دربار میں کرسی بھی نصیب ہو جائے گی۔ اس طرح فرعون اور اس کے ساحروں نے پہلے ہی مرحلے پر نبی اور جادُوگر کا عظیم اَخلاقی فرق خود کھول کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ حوصلہ تھا کہ بنی اسرائیل جیسی پِسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں دَرّانہ آ کھڑا ہوتا ہے اور دھڑلّے کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اللہ ربّ العالَمین کا بھیجا ہوا ہوں، بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر۔ فرعون سے دُوبدُو بحث کرنے میں وہ ادنیٰ سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کو وہ پرِکاہ کے برابر بھی وَقعت نہیں دیتا۔ دوسری طرف یہ کم حوصلگی ہے کہ اسی فرعون کے ہاں باپ دادا کے دین کو بچانے کی خدمت پر بلائے جا رہے ہیں، پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار! کچھ انعام تو مل جائے گا نا؟ اور جواب میں یہ سُن کر پھُولے نہیں سماتے کہ پَیسا بھی ملے گا اور قربِ شاہی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو مقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جادُوگروں کی کیا ہستی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص بے حیائی کی ساری حدوں کو نہ پھاند جائے وہ نبی کو جادوگر کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

اِنَّا لَنَحۡنُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلۡقٰى مُوۡسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلۡقَفُ مَا يَاۡفِكُوۡنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ لَاُقَطِّعَنَّ

ہم ہی غالب رہیں[۳٦] گے۔" پھر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اُٹھے کہ "مان گئے ہم ربّ العالمین کو ـــــ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے ربّ[۳۷] کو۔"

فرعون نے کہا: "تم موسیٰؑ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمھارا بڑا ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے[۳۸]۔ اچھا، ابھی تمھیں معلوم ہُوا جاتا ہے، میں تمھارے

۳٦- یہاں یہ ذکر چھوڑ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی جب جادُوگروں نے اپنی رسیّاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو یکایک وہ بہت سے سانپوں کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کی طرف لپکتی نظر آئیں۔ اس کی تفصیل قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہو چکی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِيۡمٍ ○ "جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینکے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا، سب کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا، اور بڑا بھاری جادو بنا لائے۔" سورۂ طٰہٰ میں اس وقت کا نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ○ فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ○ "یکایک ان کے سِحر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑی چلی آ رہی ہیں، اِس سے موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر سے گئے۔"

۳۷- یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں ان کی طرف سے محض شکست کا اعتراف نہیں تھا کہ کوئی شخص یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا کہ ایک بڑے جادوگر نے چھوٹے جادُوگروں کو نیچا دکھا دیا، بلکہ ان کا سجدے میں گر کر اللہ ربّ العالمین پر ایمان لے آنا گویا برسرِعام ہزارہا باشندگانِ مصر کے سامنے اس بات کا اقرار و اعلان تھا کہ موسیٰؑ جو کچھ لائے ہیں یہ ہمارے فن کی چیز ہی نہیں ہے، یہ کام تو صرف اللہ ربّ العالمین ہی کی قدرت سے ہوسکتا ہے۔

۳۸- یہاں چونکہ سلسلۂ کلام کی مناسبت سے صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی

اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ

ع ۱۸ ۳ ۷

ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سُولی چڑھادوں گا۔[۳۹]"

انھوں نے جواب دیا "کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا، کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔[۴۰]" ع

ہم[۴۱] نے موسٰیؑ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ،

---

کس طرح ایک صریح معجزہ دیکھ کر، اور اس کے معجزہ ہونے پر خود جادُوگروں کی شہادت سن کر بھی اسے جادُو کہے جاتا ہے، اس لیے فرعون کا صرف اتنا ہی فقرہ نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن سورۂ اَعراف میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ فرعون نے بازی ہرتی دیکھ کر فوراً ہی ایک سیاسی سازش کا افسانہ گھڑ لیا۔ اس نے کہا: اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ "یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے مل کر اس دار السّلطنت میں تیار کی ہے، تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔" اس طرح فرعون نے عوام الناس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جادوگروں کا یہ ایمان معجزے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ملّی بھگت ہے، یہاں آنے سے پہلے ان کے اور موسٰیؑ کے درمیان معاملہ طے ہو گیا تھا کہ یوں وہ موسٰیؑ کے مقابلے میں آ کر شکست کھائیں گے، اور نتیجے میں جو سیاسی انقلاب ہو گا، اس کے مزے وہ اور یہ مل کر لُوٹیں گے۔

۳۹۔ یہ خوف ناک دھمکی فرعون نے اپنے اِس "نظریے" کو کامیاب کرنے کے لیے دی تھی کہ جادُوگر دراصل موسٰی علیہ السلام کے ساتھ سازش کر کے آئے ہیں۔ اُس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ اس طرح یہ لوگ جان بچانے کے لیے سازش کا اعتراف کر لیں گے اور وہ ڈرامائی اثر کافور ہو جائے گا جو شکست کھاتے ہی اُن کے سجدے میں گر کر ایمان لے آنے سے اُن ہزارہا ناظرین پر مُترتّب ہوا تھا جو خود اس کی دعوت پر یہ فیصلہ کُن مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جنھیں خود اس کے بھیجے ہوئے لوگوں نے یہ خیال دلایا تھا کہ مصری قوم کا دین و ایمان بس ان جادُوگروں کے سہارے لٹک رہا ہے، یہ کامیاب ہوں تو قوم اپنے دینِ آبائی پر قائم رہ سکے گی، ورنہ موسٰیؑ کی دعوت کا سیلاب اُسے اور اس کے ساتھ فرعون کی سلطنت کو بھی بہالے جائے گا۔

۴۰ - یعنی ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا تو بہر حال ایک نہ ایک دن ضرور ہے۔ اب اگر تُو قتل کر دے گا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ وہ دن جو کبھی آنا تھا، آج آ جائے گا۔ اس صورت میں ڈرنے کا کیا سوال؟ ہمیں تو اُلٹی مغفرت اور خطا بخشی کی اُمید ہے، کیونکہ آج اِس جگہ حقیقت کُھلتے ہی ہم نے مان لینے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کی اور اس پورے مجمع میں سب سے پہلے پیش قدمی کر کے ہم ایمان لے آئے۔

جادوگروں کے اس جواب نے دو باتیں تمام اُس خلقت کے سامنے واضح کر دیں جسے فرعون نے ڈھنڈورے پِیٹ پِیٹ کر جمع کیا تھا۔

اوّل یہ کہ فرعون نہایت جھوٹا، ہٹ دھرم اور مکّار ہے۔ جو مقابلہ اُس نے خود فیصلے کے لیے کرایا تھا، اُس میں موسیٰ علیہ السلام کی کھلی کھلی فتح کو سیدھی طرح مان لینے کے بجائے اب اس نے فوراً ایک جھوٹی سازش کا افسانہ گھڑ لیا اور قتل و تعذیب کی دھمکی دے کر زبردستی اس کا اقرار کرانے کی کوشش کی۔ اس افسانے میں ذرہ برابر بھی کوئی صداقت ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ جادُوگر ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سولی پر چڑھ جانے کے لیے یوں تیار ہو جاتے۔ ایسی کسی سازش سے اگر کوئی سلطنت مل جانے کا لالچ تھا تو اب اس کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہی، کیونکہ سلطنت کے مزے تو جو لُوٹے گا سو لُوٹے گا، ان غریبوں کے حصے میں تو صرف کٹ کٹ کر جان دینا ہی رہ گیا ہے۔ اس ہولناک خطرے کو انگیز کر کے بھی ان جادُوگروں کا اپنے ایمان پر قائم رہنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ سازش کا الزام سراسر جھوٹا ہے اور سچّی بات یہی ہے کہ جادُوگر اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے ٹھیک ٹھیک جان گئے ہیں کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے دکھایا ہے وہ ہرگز جادو نہیں ہے، بلکہ واقعی اللہ ربّ العالمین ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

دوسری بات جو اس وقت ملک کے گوشے گوشے سے سمٹ کر آئے ہوئے ہزارہا آدمیوں کے سامنے کھل کر آ گئی، وہ یہ تھی کہ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتے ہی ان جادُوگروں میں کیسا زبردست اَخلاقی انقلاب واقع ہو گیا۔ کہاں تو ان کی پستیِ ذہن و فکر کا یہ حال تھا کہ دینِ آبائی کی نصرت کے لیے آئے تھے اور فرعون کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انعام مانگ رہے تھے، اور کہاں اب آن کی آن میں ان کی بلندیِ ہمّت و عزم اس درجے کو پہنچ گئی کہ وہی فرعون ان کی نگاہ میں ہیچ ہو گیا، اس کی بادشاہی کی ساری طاقت کو انھوں نے ٹھوکر مار دی اور اپنے ایمان کی خاطر وہ موت اور بدترین جسمانی تعذیب تک برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر مصریوں کے دینِ شرک کی تذلیل اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ حق کی مؤثر تبلیغ اس نازک نفسیاتی موقع پر شاید ہی کوئی اور ہو سکتی تھی۔

۴۱ - اُوپر کے واقعات کے بعد ہجرت کا ذکر شروع ہو جانے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے بعد بس فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل سمیت مصر سے نکل جانے کے احکام دے دیے گئے۔ دراصل یہاں کئی سال کی تاریخ بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے، جسے سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۵-۱۶، اور سورۂ یُونس، رکوع ۹ میں

اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔[۴۲]" اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیے (اور کہلا بھیجا) کہ "یہ کچھ مُٹھی بھر لوگ ہیں، اور انھوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے، اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنّا رہنا ہے۔[۴۳]"

بیان کیا جا چکا ہے، اور جس کا ایک حصّہ آگے سورۂ مومن، رکوع ۲-۵ اور الزُّخرُف، رکوع ۵ میں آ رہا ہے۔ یہاں چونکہ سلسلۂ کلام کی مناسبت سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس فرعون نے صریح نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود یہ ہٹ دھرمی دکھائی تھی اس کا انجام آخر کار کیا ہوا، اور جس دعوت کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت تھی وہ کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوئی، اس لیے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کش مکش کے ابتدائی مرحلے کا ذکر کرنے کے بعد اب قصّہ مختصر کر کے اس کا آخری منظر دکھایا جا رہا ہے۔

۴۲- واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ مجتمع نہ تھی، بلکہ ملک کے تمام شہروں اور بستیوں میں بٹی ہوئی تھی اور خُصوصیّت کے ساتھ منف (Mamphis) سے رَعْمَسِیس تک اس علاقے میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی جسے جُشَن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ (مُلاحَظہ ہو: "نقشۂ خُروجِ بنی اسرائیل"، تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۷۶) لہٰذا حضرت موسیٰؑ کو جب حکم دیا گیا ہوگا کہ اب تمھیں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا ہے تو انھوں نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں میں ہِدایات بھیج دی ہوں گی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ہجرت کے لیے تیار ہو جائیں، اور ایک خاص رات مقرر کر دی ہوگی کہ اس رات ہر بستی کے مہاجرین نکل کھڑے ہوں۔ یہ ارشاد کہ "تمھارا پیچھا کیا جائے گا" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہجرت کے لیے رات کو نکلنے کی ہدایت کیوں کی گئی تھی۔ یعنی قبل اِس کے کہ فرعون لشکر لے کر تمھارے تعاقب میں نکلے، تم راتوں رات اپنا راستہ اس حد تک طے کر لو کہ اس سے بہت آگے نکل چکے ہو۔

۴۳- یہ باتیں فرعون کی اُس چُھپی ہوئی خوف زدگی کو ظاہر کرتی ہیں جس پر وہ بے خوفی کا نمایشی پردہ ڈال رہا تھا۔ ایک طرف وہ جگہ جگہ سے فوجیں بھی فوری امداد کے لیے بُلا رہا تھا، جو اس بات کی کھلی علامت تھی کہ اسے بنی اسرائیل سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو چھپانا بھی چاہتا تھا کہ مدت ہائے دراز کی دبی اور پِسی ہوئی قوم، جو انتہائی ذلّت کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی، اس سے فرعون جیسا قاہر فرمانروا کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہے، حتّٰی کہ اسے فوری امداد کے لیے فوجیں طلب کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ اس لیے وہ اپنا

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ

اِس طرح ہم انھیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔[۴۴] یہ تو ہُوا اُن کے ساتھ، اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔[۴۵]

صبح ہوتے ہی یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا

پیغام اس انداز میں بھیجتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل بیچارے چیز ہی کیا ہیں، کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں جو ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، لیکن انھوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ہمیں ان پر غصّہ آ گیا ہے اس لیے ہم انھیں سزا دینا چاہتے ہیں، اور فوجیں ہم کسی خوف کی وجہ سے جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف ایک احتیاطی کارروائی ہے، ہماری دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی بعید سے بعید بھی امکانی خطرہ ہو تو ہم بروقت اس کی سرکوبی کرنے کے لیے تیار رہیں۔

۴۴ — یعنی فرعون نے تو یہ کام اپنے نزدیک بڑی عقل مندی کا کیا تھا کہ دُور دُور سے فوجیں طلب کر کے بنی اسرائیل کو دُنیا سے مٹا دینے کا سامان کیا، لیکن خدائی تدبیر نے اُس کی چال اس پر یوں اُلٹ دی کہ دولتِ فرعونیہ کے بڑے بڑے ستون اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اُس جگہ جا پہنچے جہاں انھیں اور ان کے سارے لاؤ لشکر کو ایک ساتھ غرق ہونا تھا۔ اگر وہ بنی اسرائیل کا پیچھا نہ کرتے تو نتیجہ صرف اتنا ہی ہوتا کہ ایک قوم ملک چھوڑ کر نکل جاتی۔ اس سے بڑھ کر ان کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور وہ حسبِ سابق اپنے عیش کدوں میں بیٹھے زندگی کے مزے لُوٹتے رہتے۔ لیکن انھوں نے کمال درجے کی ہوشیاری دکھانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کو بخیریت نہ گزر جانے دیں، بلکہ ان کے مہاجر قافلوں پر یک بارگی حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے ان کا قلع قمع کر دیں۔ اس غرض کے لیے ان کے شہزادے اور بڑے بڑے سردار اور اعیانِ سلطنت خود بادشاہِ ذی جاہ سمیت اپنے محلوں سے نکل آئے، اور اِسی دانائی نے یہ دُہرا نتیجہ دکھایا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل بھی گئے اور مصر کی ظالم فرعونی سلطنت کا مکھن نذرِ دریا بھی ہو گیا۔

۴۵ — بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے، انھی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کے معنیٰ لازماً یہ ہونے چاہییں کہ فرعون کے غرق ہو جانے پر بنی اسرائیل پھر مصر واپس پہنچ گئے ہوں اور آلِ فرعون کی دولت وحشمت ان کے قبضے میں آ گئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآنِ مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اِس آیت کا یہ مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔ سورۂ بَقَرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ اَعراف اور سورۂ طٰہٰ میں جو حالات

قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ ۚ﴿۶۳﴾ وَاَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِيۡنَ ۚ﴿۶۴﴾ وَاَنۡجَيۡنَا

تو موسٰیؑ کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسٰیؑ نے کہا: ”ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔“[46] ہم نے موسٰیؑ کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ ”مار اپنا عصا سمندر پر۔“ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔[47] اُسی جگہ ہم دُوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔[48] موسٰیؑ اور

بیان کیے گئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے، اور پھر حضرت داؤد کے زمانے (۱۰۱۳-۹۷۳ ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے، وہ سب اُس علاقے میں پیش آئے جو آج جزیرہ نمائے سینا، شمالی عرب، شرقِ اُردُن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ اور چشمے اور خزانے اور محلّات بنی اسرائیل کو بخش دیے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور اُمَرا نکالے گئے تھے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آلِ فرعون کو اِن نعمتوں سے محروم کیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرما دیں، یعنی وہ فلسطین کی سرزمین میں باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ قیام گاہوں کے مالک ہوئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورۂ اعراف کی یہ آیت کرتی ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ○ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ (آیات ۱۳۶-۱۳۷) ”تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور ان کے بجائے ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔“ یہ برکتوں سے مالا مال سرزمین کا استعارہ قرآنِ مجید میں عُموماً فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے، اور کسی علاقے کا نام لیے بغیر جب اُس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِىْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا: وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ○ اور وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ۔ اسی طرح سورۂ سبا میں بھی الْقُرَى الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا کے الفاظ سرزمینِ شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔

مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾ ع

اُن سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، ہم نے بچا لیا، اور دُوسروں کو غرق کر دیا۔

اس واقعے میں ایک نشانی ہے[۴۹]، مگر اِن لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

۴۶ – یعنی مجھے اس آفت سے بچنے کی راہ بتائے گا۔

۴۷ – اصل الفاظ ہیں: كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ - طود عربی زبان میں کہتے ہی بڑے پہاڑ کو ہیں۔ لِسان العرب میں ہے: الطود، الجبل العظیم۔ اس کے لیے پھر عظیم کی صفت لانے کے معنٰی یہ ہوئے کہ پانی دونوں طرف بہت اُونچے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ سمندر حضرت موسیٰؑ کے عصا مارنے سے پھٹا تھا، اور یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصود فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا، تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا کی ضرب لگنے پر پانی نہایت بلند پہاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا اور اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس میں سے گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پورا لشکر ان کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانونِ فطرت کے تحت جو طوفانی ہوائیں چلتی ہیں، وہ خواہ کیسی ہی تند و تیز ہوں، ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پہاڑوں کی طرح اتنی دیر تک کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر مزید سورۂ طٰہٰ کا یہ بیان ہے کہ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ ''ان کے لیے سمندر میں سوکھا راستہ بنا دے۔'' اس کے معنٰی یہ ہیں کہ سمندر پر عصا مارنے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ بیچ میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی کیچڑ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ اس کے ساتھ سورۂ دُخان، آیت ۲۴ کے یہ الفاظ بھی قابلِ غور ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی کہ سمندر پار کر لینے کے بعد ''اُس کو اِسی حال پر رہنے دے، لشکرِ فرعون یہاں غرق ہونے والا ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اگر دوسرے ساحل پر پہنچ کر سمندر پر عصا مار دیتے تو دونوں طرف کھڑا ہُوا پانی پھر مل جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا، تاکہ لشکرِ فرعون اس راستے میں اتر آئے اور پھر پانی دونوں طرف سے آ کر اسے غرق کر دے۔ یہ صریحاً ایک معجزے کا بیان ہے اور اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقعے کی تعبیر عام قوانینِ فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳)

۴۸ – یعنی فرعون اور اس کے لشکر کو۔

۴۹ – یعنی قریش کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ہٹ دھرم لوگ کھلے کھلے معجزات دیکھ کر بھی کس طرح ایمان لانے

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ

اور اِنھیں ابراہیمؑ کا قصّہ سُناؤ[50] جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پُوچھا تھا کہ "یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟[51]" انھوں نے جواب دیا: "کچھ بُت ہیں جن کی ہم پُوجا کرتے ہیں اور انھی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔[52]" اس نے پوچھا: "کیا یہ تمھاری سُنتے ہیں جب تم انھیں

سے انکار ہی کیے جاتے ہیں، اور پھر اس ہٹ دھرمی کا انجام کیسا دردناک ہوتا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کے تمام سرداروں اور ہزارہا لشکریوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوئی تھی کہ سالہا سال تک جو نشانیاں ان کو دکھائی جاتی رہیں، ان کو تو وہ نظرانداز کرتے ہی رہے تھے، آخر میں عین غرق ہونے کے وقت بھی ان کو یہ نہ سوجھا کہ سمندر اس قافلے کے لیے پھٹ گیا ہے، پانی پہاڑوں کی طرح دونوں طرف کھڑا ہے اور بیچ میں سوکھی سڑک سی بنی ہوئی ہے۔ یہ صریح علامتیں دیکھ کر بھی ان کو عقل نہ آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خدائی طاقت کام کر رہی ہے اور وہ اس طاقت سے لڑنے جا رہے ہیں۔ ہوش ان کو آیا بھی تو اس وقت جب پانی نے دونوں طرف سے ان کو دبوچ لیا تھا اور وہ خدا کے غضب میں گھر چکے تھے۔ اس وقت فرعون چیخ اٹھا کہ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝ (یُونس، آیت ۹۰)

دوسری طرف اہلِ ایمان کے لیے بھی اس میں یہ نشانی ہے کہ ظلم اور اس کی طاقتیں خواہ بظاہر کیسی ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہوں، آخرکار اللہ تعالیٰ کی مدد سے حق کا یوں بول بالا ہوتا ہے اور باطل اس طرح سرنگوں ہو کر رہتا ہے۔

**۵۰ –** یہاں حضرت ابراہیمؑ کی حیاتِ طیّبہ کے اُس دَور کا قصّہ بیان ہوا ہے جب کہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کش مکش شروع ہوئی تھی۔ اس دَور کی تاریخ کے مختلف گوشے قرآنِ مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر بیان ہوئے ہیں: البقرہ، رکوع ۳۵۔ الانعام، رکوع ۹۔ مریم، رکوع ۳۔ الانبیاء، رکوع ۵۔ الصّافّات، رکوع ۳۔ الممتحنہ، رکوع ۱۔

سیرتِ ابراہیمی کے اس دَور کی تاریخ خاص طور پر جس وجہ سے قرآنِ مجید بار بار سامنے لاتا ہے، وہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ بالعُموم اور قریش بالخصوص اپنے آپ کو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے اور کہتے تھے اور یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ مِلّتِ ابراہیمی ہی ان کا مذہب ہے۔ مشرکینِ عرب کے علاوہ نصاریٰ اور یہود کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ ان کے دین کے پیشوا ہیں۔ اس پر قرآنِ مجید جگہ جگہ ان لوگوں کو مُتنبّہ کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام

تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ

پکارتے ہو؟ یا یہ تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔[۵۳]'' اس پر ابراہیمؑ نے کہا: ''کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) اُن چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمھارے پچھلے باپ دادا

جو دین لے کر آئے تھے وہ یہی خالص اسلام تھا جسے نبیِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس سے آج تم لوگ برسرِ پیکار ہو۔ وہ مشرک نہ تھے بلکہ ان کی ساری لڑائی شرک ہی کے خلاف تھی، اور اسی لڑائی کی بدولت انھیں اپنے باپ، خاندان، قوم، وطن سب کو چھوڑ کر شام و فلسطین اور حجاز میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح وہ یہودی و نصرانی بھی نہ تھے بلکہ یہودیت و نصرانیت تو ان کے صدیوں بعد وجود میں آئیں۔ اس تاریخی اِستِدلال کا کوئی جواب نہ مشرکین کے پاس تھا نہ یہود و نصاریٰ کے پاس، کیونکہ مشرکین کو بھی یہ تسلیم تھا کہ عرب میں بُتوں کی پرستش حضرت ابراہیمؑ کے کئی صدی بعد شروع ہوئی تھی، اور یہود و نصاریٰ بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدایش سے بہت پہلے تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جن مخصوص عقائد اور اعمال پر یہ لوگ اپنے دین کا مدار رکھتے ہیں، وہ اُس دینِ قدیم کے اجزا نہیں ہیں جو ابتدا سے چلا آ رہا تھا، اور صحیح دین وہی ہے جو ان آمیزشوں سے پاک ہو کر خالص خدا پرستی پر مبنی ہو۔ اسی بنیاد پر قرآن کہتا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (آلِ عمران، آیات ۶۷-۶۸)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلمِ یکسو تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہ تھا۔ درحقیقت حضرت ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق انھی لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کے طریقے کی پیروی کی، (اور اب یہ حق) اس نبیؐ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو (پہنچتا ہے)۔

۵۱ – حضرت ابراہیمؑ کے اس سوال کا مدّعا یہ معلوم کرنا نہ تھا کہ وہ کن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ ان بتوں کو تو وہ خود بھی دیکھ رہے تھے جن کی پرستش وہاں ہوتی تھی۔ ان کا مدّعا دراصل ان لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ ان معبُودوں کی حقیقت کیا ہے جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اسی سوال کو سورۂ انبیاء میں بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے: ''یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟''

۵۲ – یہ جواب بھی محض یہ خبر دینے کے لیے نہ تھا کہ ہم بُتوں کی پوجا کرتے ہیں، کیونکہ سائل و مسئول

الۡاَقۡدَمُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیۡ

بجا لاتے رہے[54]؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں[55]، بجز ایک ربّ العالمین[56] کے، جس نے

دونوں کے سامنے یہ امرِ واقعہ عیاں تھا۔ اس جواب کی اصل روح اپنے عقیدے پر ان کا ثبات اور اطمینان تھا۔ گویا دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہاں، ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بُت ہیں جن کی ہم پوجا کر رہے ہیں، مگر ہمارا دین وایمان یہی ہے کہ ہم ان کی پرستش اور خدمت میں لگے رہیں۔

۵۳ - یعنی ہماری اس عبادت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ہماری مناجاتیں اور دعائیں اور فریادیں سنتے ہیں یا ہمیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں، اس لیے ہم نے ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے، بلکہ اصل وجہ اس عبادت کی یہ ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طرح انھوں نے خود یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے مذہب کے لیے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آخر تم نئی بات ہمیں کیا بتانے چلے ہو؟ کیا ہم خود نہیں دیکھتے کہ یہ لکڑی اور پتھر کی مورتیں ہیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ لکڑیاں سُنا نہیں کرتیں اور پتھر کسی کا کام بنانے یا بگاڑنے کے لیے نہیں اُٹھا کرتے؟ مگر یہ ہمارے بزرگ جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ ان کی پوجا کرتے چلے آ رہے ہیں تو کیا وہ سب تمھارے نزدیک بے وقوف تھے؟ ضرور کوئی وجہ ہوگی کہ وہ ان بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے رہے۔ لہٰذا ہم بھی ان کے اعتماد پر یہ کام کر رہے ہیں۔

۵۴ - یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے؟ کیا نسل پر نسل یونہی آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجا لا رہے ہیں، ان کے اندر واقعی خدائی کی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں، اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟

۵۵ - یعنی میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش کروں گا تو میری دُنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت کو محض بے نفع اور بے ضرر ہی نہیں سمجھتا بلکہ اُلٹا نقصان دہ سمجھتا ہوں، اس لیے میرے نزدیک تو ان کو پوجنا دشمن کو پوجنا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے اس قول میں اُس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورۂ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا لَهُمۡ عِزًّا ۙ كَلَّا ؕ سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ وَيَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا ۠ (آیات ۸۱-۸۲) ''انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جب کہ وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور اُلٹے ان کے مخالف ہوں گے۔'' یعنی قیامت کے روز وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، نہ ہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

یہاں حکمتِ تبلیغ کا بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمھارے دشمن ہیں، بلکہ

خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ﴿۷۸﴾ وَ الَّذِیۡ ہُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِیۡۤ

مجھے پیدا کیا[۵۷]، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے[۵۸]۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے

یہ فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کہتے کہ یہ تمھارے دشمن ہیں، تو مُخاطَب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہوگئے۔ بخلاف اس کے جب انھوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں، تو اس سے مخاطَب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہوگیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور بُرے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ اس طریقے سے حضرت ابراہیمؑ نے گویا ہر انسان کے اُس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بُوجھ کر کبھی اپنا بُرا نہیں چاہتا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ و دانستہ مَیں اپنی بدخواہی نہیں کرسکتا، لٰہذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں۔ اس کے بعد مخاطَب فطرتاً یہ سوچنے پر مجبُور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو۔

۵٦ — یعنی تمام اُن معبُودوں میں سے، جن کی دنیا میں بندگی و پرستش کی جاتی ہے، صرف ایک اللہ رب العالمین ہے جس کی بندگی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے، اور جس کی عبادت میرے نزدیک ایک دشمن کی نہیں بلکہ اپنے اصل مُربّی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ چند فقروں میں وہ وُجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر صرف اللہ ربّ العالمین ہی عبادت کا مستحق ہے، اور اس طرح اپنے مخاطَبوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمھارے پاس تو معبُودانِ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معقول وجہ بجز تقلیدِ آبائی کے نہیں ہے جسے تم بیان کرسکو، مگر میرے پاس صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کے لیے نہایت معقول وجوہ موجود ہیں جن سے تم بھی انکار نہیں کرسکتے۔

۵۷ — یہ اوّلین وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ اور صرف ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ مخاطَب بھی اس حقیقت کو جانتے اور مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے، اور انھیں یہ بھی تسلیم تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ حتّٰی کہ اپنے معبُودوں کے بارے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالقِ کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل یہ تھی کہ میں صرف اُس کی عبادت کو صحیح و برحق سمجھتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ دوسری کوئی ہستی میری عبادت کی کیسے مستحق ہوسکتی ہے

اَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لِىۡ خَطِيۡٓـئَتِىۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبۡ لِىۡ حُكۡمًا وَّ

میں اُمید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔[59]" (اس کے بعد ابراہیمؑ نے دُعا کی:) "اے میرے رب! مجھے حکم عطا[60] کر۔ اور

جب کہ میرے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ مخلوق کو اپنے خالق کی بندگی تو کرنی ہی چاہیے، لیکن غیر خالق کی بندگی وہ کیوں کرے؟

۵۸ - یہ دوسری وجہ ہے اللہ اور اکیلے اللہ ہی کے مستحق عبادت ہونے کی۔ اگر اس نے انسان کو بس پیدا ہی کر کے چھوڑ دیا ہوتا اور آگے اس کی خبر گیری سے وہ بالکل بے تعلق رہتا، تب بھی کوئی معقول وجہ اس امر کی ہوسکتی تھی کہ انسان اس کے علاوہ کسی دوسری طرف بھی سہارے ڈھونڈنے کے لیے رُجوع کرتا۔ لیکن اس نے تو پیدا کرنے کے ساتھ رہنمائی، پرورش، نگہداشت، حفاظت اور حاجت روائی کا ذمّہ بھی خود ہی لے لیا ہے۔ جس لمحے انسان دُنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت ایک طرف اس کی ماں کے سینے میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کوئی اَن دیکھی طاقت اسے دودھ چوسنے اور حلق سے اُتارنے کا طریقہ سکھا دیتی ہے۔ پھر اس تربیت و رہنمائی کا سلسلہ اوّل روزِ پیدائش سے شروع ہو کر موت کی آخری ساعت تک برابر جاری رہتا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو اپنے وجود اور نشو ونما اور بقا و ارتقا کے لیے جس جس نوعیت کے سروسامان کی حاجت پیش آتی ہے، وہ سب اس کے پیدا کرنے والے نے زمین سے لے کر آسمان تک ہر طرف مہیا کر دیا ہے۔ اس سروسامان سے فائدہ اٹھانے اور کام لینے کے لیے جن جن طاقتوں اور قابلیتوں کی اس کو حاجت پیش آتی ہے، وہ سب بھی اس کی ذات میں ودیعت کر دی ہیں۔ اور ہر شعبۂ حیات میں جس جس طرح کی رہنمائی اس کو درکار ہوتی ہے، اس کا بھی پورا انتظام اس نے کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انسانی وجود کی حفاظت کے لیے اور اس کو آفات سے، بیماریوں سے، مہلک جراثیم سے، اور زہریلے اثرات سے بچانے کے لیے خود اس کے جسم میں اتنے زبردست انتظامات کیے ہیں کہ انسان کا علم ابھی تک ان کا پورا احاطہ بھی نہیں کر سکا ہے۔ اگر یہ قدرتی انتظامات موجود نہ ہوتے تو ایک معمولی کانٹا چبھ جانا بھی انسان کے لیے مہلک ثابت ہوتا اور اپنے علاج کے لیے آدمی کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکتی۔ خالق کی یہ ہمہ گیر رحمت و رُبوبیت جب ہر آن ہر پہلو سے انسان کی دست گیری کر رہی ہے تو اس سے بڑی حماقت و جہالت اور کیا ہوسکتی ہے، اور اس سے بڑھ کر احسان فراموشی بھی اور کون سی ہوسکتی ہے کہ انسان اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کے آگے سرِ نیاز جھکائے اور حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے کسی اور کا دامن تھامے۔

۵۹ - یہ تیسری وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت دُرست نہیں ہوسکتی۔ انسان کا معاملہ اپنے خدا کے ساتھ صرف اس دُنیا اور اس کی زندگی تک محدود نہیں ہے کہ وجود کی سرحد میں قدم رکھنے سے

اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾

مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا[61]۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچّی ناموری[62] عطا کر۔

شروع ہو کر موت کی آخری ہچکی پر وہ ختم ہو جائے، بلکہ اس کے بعد اس کا انجام بھی سراسر خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی خدا جو اس کو وجود میں لایا ہے، آخر کار اسے اِس دُنیا سے واپس بلا لیتا ہے، اور کوئی طاقت دُنیا میں ایسی نہیں ہے جو انسان کی اس واپسی کو روک سکے۔ آج تک کسی دوا، یا طبیب، یا دیوی دیوتا کی مداخلت اُس ہاتھ کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے جو انسان کو یہاں سے نکال لے جاتا ہے، حتّٰی کہ وہ بہت سے انسان بھی، جنھیں معبُود بنا کر انسانوں نے پوج ڈالا ہے، خود اپنی موت کو نہیں ٹال سکے ہیں۔ صرف خدا ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس شخص کو کب اِس جہان سے واپس طلب کرنا ہے، اور جس وقت جس کی طلبی بھی اس کے ہاں سے آجاتی ہے، اُسے چار و ناچار جانا ہی پڑتا ہے۔ پھر وہی خدا ہے جو اکیلا اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کب ان تمام انسانوں کو، جو دُنیا میں پیدا ہوئے تھے، دوبارہ وجود میں لائے اور ان سے ان کی حیاتِ دُنیا کا محاسبہ کرے۔ اُس وقت بھی کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ بعث بعد الموت سے کسی کو بچا سکے یا خود بچ سکے۔ ہر ایک کو اس کے حکم پر اُٹھنا ہی ہوگا اور اس کی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ پھر وہی اکیلا خدا اس عدالت کا قاضی و حاکم ہوگا۔ کوئی دوسرا اس کے اختیارات میں ذرّہ برابر بھی شریک نہ ہوگا۔ سزا دینا یا معاف کرنا بالکل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ جسے وہ سزا دینا چاہے اس کو بخشوا لے جائے، یا جسے وہ بخشنا چاہے اسے سزا دلوا سکے۔ دُنیا میں جن کو بخشوا لینے کا مختار سمجھا جاتا ہے، وہ خود اپنی بخشش کے لیے بھی اسی کے فضل و کرم کی آس لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان حقائق کی موجودگی میں جو شخص خدا کے سوا کسی کی بندگی کرتا ہے، وہ اپنی بدانجامی کا خود سامان کرتا ہے۔ دُنیا سے لے کر آخرت تک آدمی کی ساری قسمت تو ہو خدا کے اختیار میں، اور اسی قسمت کے بناؤ کی خاطر آدمی رُجوع کرے اُن کی طرف جن کے اختیار میں کچھ نہیں ہے! اس سے بڑھ کر شامتِ اعمال اور کیا ہوسکتی ہے۔

۶۰ - ''حکم'' سے مراد ''نبوت'' یہاں دُرست نہیں ہے، کیونکہ جس وقت کی یہ دُعا ہے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ دُعا اس سے پہلے کی بھی ہو تو نبوت کسی کی طلب پر اسے عطا نہیں کی جاتی، بلکہ وہ ایک وہبی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اس لیے یہاں حکم سے مراد علم، حکمت، فہمِ صحیح اور قوتِ فیصلہ ہی لینا دُرست ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی یہ دُعا قریب قریب اسی معنیٰ میں ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے کہ اَرِنَا الْاَشْیَآءَ کَمَا ھِیَ یعنی ہم کو اس قابل بنا کہ ہم ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھیں جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، اور ہر معاملے میں وہی رائے قائم کریں جیسی کہ اس کی حقیقت کے لحاظ سے قائم کی جانی چاہیے۔

۶۱ - یعنی دُنیا میں مجھے صالح سوسائٹی دے اور آخرت میں میرا حشر صالحوں کے ساتھ کر۔ جہاں تک

وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ

اور مجھے جنّتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے[۶۳] اور مجھے اُس دن رُسوا نہ کر جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔[۶۴] جب کہ

آخرت کا تعلق ہے، صالح لوگوں کے ساتھ کسی کا حشر ہونا اور اس کا نجات پانا گویا ہم معنٰی ہیں، اس لیے یہ تو ہر اُس انسان کی دُعا ہونی ہی چاہیے جو حیات بعد الموت اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن دنیا میں بھی ایک پاکیزہ روح کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بد اَخلاق فاسق و فاجر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی مصیبت سے نجات دے اور اس کو نیک لوگوں کے ساتھ ملائے۔ معاشرے کا بگاڑ جہاں چاروں طرف محیط ہو، وہاں ایک آدمی کے لیے صرف یہی چیز ہمہ وقت اذیت کی موجب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گردوپیش گندگی ہی گندگی پھیلی ہوئی دیکھتا ہے، بلکہ اس کے لیے خود پاکیزہ رہنا اور اپنے آپ کو گندگی کی چھینٹوں سے بچا کر رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک صالح آدمی اس وقت تک بے چین ہی رہتا ہے جب تک یا تو اس کا اپنا معاشرہ پاکیزہ نہ ہو جائے، یا پھر اس سے نکل کر وہ کوئی دوسری ایسی سوسائٹی نہ پالے جو حق و صداقت کے اُصولوں پر چلنے والی ہو۔

۶۲ – یعنی بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں۔ میں دُنیا سے وہ کام کر کے نہ جاؤں کہ نسلِ انسانی میرے بعد میرا شمار اُن ظالموں میں کرے جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دُنیا کو بگاڑ کر چلے گئے، بلکہ مجھ سے وہ کارنامے انجام پائیں جن کی بدولت رہتی دُنیا تک میری زندگی خلقِ خدا کے لیے روشنی کا مینار بنی رہے اور مجھے انسانیت کے محسنوں میں شمار کیا جائے۔ یہ محض شہرت و ناموری کی دُعا نہیں ہے بلکہ سچّی شہرت اور حقیقی ناموری کی دُعا ہے جو لازماً ٹھوس خدمات اور بیش قیمت کارناموں ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اس چیز کا حاصل ہونا اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے: دُنیا میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی نسلوں کو بری مثالوں کے مقابلے میں ایک نیک مثال ملتی ہے، جس سے وہ بھلائی کا سبق حاصل کرتی ہیں اور ہر سعید روح کو راہِ راست پر چلنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی چھوڑی ہوئی نیک مثال سے قیامت تک جتنے لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہوئی ہو، ان کا ثواب اس شخص کو بھی ملے گا اور قیامت کے روز اس کے اپنے اعمال کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خدا کی یہ گواہی بھی اس کے حق میں موجود ہوگی کہ وہ دنیا میں بھلائی کے چشمے رواں کر کے آیا ہے جن سے نسل پر نسل سیراب ہوتی رہی ہے۔

۶۳ – بعض مفسرین نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعائے مغفرت کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ مغفرت بہرحال اسلام کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے آں جناب کا اپنے والد کی مغفرت کے لیے دعا کرنا گویا اس بات کی دُعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اس کے متعلق مختلف مقامات پر جو تصریحات ملتی ہیں، وہ اس

لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۹۰﴾ وَ بُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ لِلۡغٰوِیۡنَ ﴿۹۱﴾ وَ قِیۡلَ لَہُمۡ

نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لیے ہوئے اللہ کے حُضور حاضر ہو۔[۶۵]''

——— (اُس[۶۶] روز) جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی، اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے[۶۷] گی اور ان سے پوچھا جائے گا

توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے ظلم سے تنگ آ کر جب گھر سے نکلنے لگے تو انھوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا: سَلٰمٌ عَلَیۡکَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا ○ (مریم، آیت ۴۷) ''آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش کی دُعا کروں گا، وہ میرے اُوپر نہایت مہربان ہے۔'' اسی وعدے کی بنا پر انھوں نے یہ دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لیے کی بلکہ ایک دوسرے مقام پر بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے کی: رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ (ابراہیم، آیت ۴۱) لیکن بعد میں انھیں خود یہ احساس ہو گیا کہ ایک دشمنِ حق، چاہے وہ ایک مومن کا باپ ہی کیوں نہ ہو، دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔ وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ وَّعَدَہَاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنۡہُ ؕ (التوبہ، آیت ۱۱۴) ''ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا۔ مگر جب یہ بات اس پر کھل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اظہارِ بیزاری کر دیا۔''

۶۴ – یعنی قیامت کے روز یہ رسوائی مجھے نہ دکھا کہ میدانِ حشر میں تمام اوّلین و آخرین کے سامنے ابراہیمؑ کا باپ سزا پا رہا ہو اور ابراہیمؑ کھڑا دیکھ رہا ہو۔

۶۵ – ان دو فقروں کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا کا حصّہ ہیں یا انھیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اگر پہلی بات مانی جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کے لیے یہ دُعا کرتے وقت خود بھی ان حقائق کا احساس رکھتے تھے۔ اور دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی دُعا پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے کام اگر کوئی چیز آ سکتی ہے تو وہ مال اور اولاد نہیں بلکہ صرف قلبِ سلیم ہے، ایسا دل جو کفر و شرک و نافرمانی اور فِسق و فُجور سے پاک ہو۔ مال اور اولاد بھی قلبِ سلیم ہی کے ساتھ نافع ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔ مال صرف اس صورت میں وہاں مفید ہوگا جب کہ آدمی نے دُنیا میں ایمان و اخلاص کے ساتھ اسے اللہ کی راہ میں صَرف کیا ہو، ورنہ کروڑ پتی اور ارب پتی آدمی بھی وہاں کنگال ہوگا۔ اولاد بھی صرف اسی حالت میں وہاں کام

اَیْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِیْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَ جُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَ هُمْ فِیْهَا یَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿٩٨﴾ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِیْنَ ﴿١٠٠﴾

---

کہ ”اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمھاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟“ پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ، اور ابلیس کے لشکر، سب کے سب اس میں اُوپر تلے دھکیل دیے جائیں[٦٨] گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبُودوں سے) کہیں گے کہ ”خدا کی قسم! ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو ربّ العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا[٦٩]۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے[٧٠]

---

آسکے گی جب کہ آدمی نے دُنیا میں اسے اپنی حد تک ایمان اور حسنِ عمل کی تعلیم دی ہو، ورنہ بیٹا اگر نبی بھی ہو تو وہ باپ سزا پانے سے نہیں بچ سکتا جس کا اپنا خاتمہ کفر و معصیت پر ہوا ہو اور اولاد کی نیکی میں جس کا اپنا کوئی حصّہ نہ ہو۔

٦٦ – یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کا جُز نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس کا مضمون صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔

٦٧ – یعنی ایک طرف متقی لوگ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ کیسی نعمتوں سے لبریز جگہ ہے جہاں اللہ کے فضل سے ہم جانے والے ہیں۔ اور دوسری طرف گمراہ لوگ ابھی میدانِ حشر ہی میں ہوں گے کہ ان کے سامنے اُس جہنّم کا ہولناک منظر پیش کر دیا جائے گا جس میں انھیں جانا ہے۔

٦٨ – اصل میں لفظ فَكُبْكِبُوْا فرمایا گیا ہے، جس میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک یہ کہ ایک کے اُوپر ایک دھکیل دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ قعرِ جہنّم تک لڑھکتے چلے جائیں گے۔

٦٩ – یہ پیروؤں اور معتقدوں کی طرف سے اُن لوگوں کی تواضع ہو رہی ہو گی جنھیں یہی لوگ دُنیا میں بزرگ، پیشوا اور رہنما مانتے رہے تھے، جن کے ہاتھ پاؤں چومے جاتے تھے، جن کے قول و عمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزرانی جاتی تھیں۔ آخرت میں جا کر جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ

وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور نہ کوئی جگری دوست[۷۱]۔ کاش! ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں[۷۲]" ـــــ

آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھیرائیں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ عالَمِ آخرت کا یہ عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے، تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دُنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا:

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ (آیت ۳۸)

ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اب انھیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔ رب فرمائے گا: سب ہی کے لیے دُہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔

سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد ہُوا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ (آیت ۲۹)

اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے پروردگار! اُن جِنّوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لا جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، تاکہ ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں اور وہ پست و ذلیل ہو کر رہیں۔

یہی مضمون سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (آیات ۶۷-۶۸)

اور وہ کہیں گے: اے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہم کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔

۷۰ – یعنی جنھیں ہم دُنیا میں سِفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا پار ہے، ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کے لیے زبان کھولنے والا نہیں ہے۔

۷۱ – یعنی کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ہمارا غم خوار اور ہمارے لیے کُڑھنے والا ہو، چاہے ہم کو چھڑا نہ سکے

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ ع كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ﹰالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ ۚ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ ۙ

ع ۵ ۳۲ ۹

یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے[۷۳]، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

قومِ[۷۴] نوحؑ نے رسولوں کو جھٹلایا[۷۵]۔ یاد کرو جب کہ اُن کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا تھا: "کیا تم ڈرتے نہیں ہو[۷۶]؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۷۷]،

مگر کم از کم اسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی ہی ہو۔ قرآنِ مجید یہ بتاتا ہے کہ آخرت میں دوستیاں صرف اہلِ ایمان ہی کی باقی رہ جائیں گی۔ رہے گمراہ لوگ، تو وہ دُنیا میں چاہے کیسے ہی جگری دوست رہے ہوں، وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں گے، ایک دوسرے کو مجرم ٹھیرائیں گے اور اپنی بربادی کا ذمّہ دار قرار دے کر ہر ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے کی کوشش کرے گا۔ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴿ (الزُّخرُف، آیت ۶۷) "دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر متقین (کی دوستیاں قائم رہیں گی)۔"

۷۲ – اس تمنا کا جواب بھی قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام، آیت ۲۸) "اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا ہے۔" رہا یہ سوال کہ انھیں واپسی کا موقع کیوں نہ دیا جائے گا، اس کے وجوہ پر مفصّل بحث ہم سورۂ مؤمنون، حواشی ۹۰ تا ۹۲ میں کر چکے ہیں۔

۷۳ – حضرت ابراہیمؑ کے اس قصّے میں نشانی کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ مشرکینِ عرب اور بالخصوص قریش کے لوگ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے ہیں، مگر دوسری طرف اُسی شرک میں مبتلا ہیں جس کے خلاف جِدّوجُہد کرتے اُن کی عمر بیت گئی تھی، اور ان کے لائے ہوئے دین کی دعوت آج جو نبی پیش کر رہا ہے، اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تو شرک کے دشمن اور دعوتِ توحید کے عَلَم بردار تھے، تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ حضرتِ ممدوح مشرک نہ تھے، مگر پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو۔ دوسرا پہلو اس قصّے میں نشانی کا یہ ہے کہ قومِ ابراہیم

دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ واسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہوا۔ قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار مُعَذَّب قوموں ہی میں کیا گیا ہے: اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ (التوبہ، آیت ۷۰)

۷۴۔ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳۔ الانبیاء، آیات ۷۶-۷۷۔ المومنون، آیات ۲۳ تا ۳۰۔ الفرقان، آیت ۳۷۔ اس کے علاوہ قصۂ نوح علیہ السلام کی تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی پیشِ نظر رہیں: العنکبوت، آیات ۱۴-۱۵۔ الصّافّات آیات ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، آیات ۹-۱۵، سورۂ نوح مکمل۔

۷۵۔ اگرچہ انھوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا، لیکن چونکہ رسول کی تکذیب درحقیقت اُس دعوت اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لے کر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس لیے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کردے، وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے۔ یہ ایک بڑی اہم اُصولی حقیقت ہے جسے قرآن میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ وہ لوگ بھی کافر ٹھیرائے گئے ہیں جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہوں، باقی تمام انبیاؑ کو مانتے ہوں۔ اس لیے کہ جو شخص اصل پیغامِ رسالت کا ماننے والا ہے، وہ تو لازماً ہر رسول کو مانے گا۔ مگر جو شخص کسی رسول کا انکار کرتا ہے وہ اگر دوسرے رسولوں کو مانتا بھی ہے تو کسی عصبیت یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر مانتا ہے، نفسِ پیغامِ رسالت کو نہیں مانتا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اسے مان لے اور وہی دوسرا پیش کرے تو یہ اس کا انکار کردے۔

۷۶۔ دوسرے مقامات پر حضرت نوحؑ کا اپنی قوم سے ابتدائی خطاب ان الفاظ میں آیا ہے: اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (المومنون، آیت ۲۳) ”اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے، تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟“ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ (نوح، آیت ۳) ”اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“ اس لیے یہاں حضرت نوحؑ کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف نہیں بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہوگئے؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس باغیانہ روش کا انجام کیا ہوگا؟

دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رَوِیّے کی بدانجامی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہِ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہوجاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾ؕ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ؕ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ؕ

لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔[78] میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔[79] پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو۔[80]"

۷۷ – اس کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر یا کم و بیش کر کے بیان نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راست باز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تمھیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں، اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دُنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔

۷۸ – یعنی میرے رسولِ امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مُطاعوں کی اطاعت چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو اور جو احکام میں تمھیں دیتا ہوں اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو، کیونکہ میں خداوندِ عالَم کی مرضی کا نمایندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہے وہ اس کی صداقت تسلیم کر لیں اور اسے رسولِ برحق مان لیں۔ بلکہ اس کو خدا کا سچّا رسول مانتے ہی آپ سے آپ یہ بھی لازم آ جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑ کر صرف اسی کے لائے ہوئے قانون کا اتباع کیا جائے۔ رسول کو رسول نہ ماننا، یا رسول مان کر اس کی اطاعت نہ کرنا، دونوں صورتیں دراصل خدا سے بغاوت کی ہم معنیٰ ہیں، اور دونوں کا نتیجہ خدا کے غضب میں گرفتار ہونا ہے۔ اسی لیے ایمان اور اطاعت کے مطالبے سے پہلے "اللہ سے ڈرو" کا تنبیہی فقرہ ارشاد فرمایا گیا، تاکہ ہر مخاطَب اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ رسول کی رسالت تسلیم نہ کرنے یا اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

۷۹ – یہ اپنی صداقت پر حضرت نوحؑ کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ دعوائے نبوت سے پہلے میری ساری زندگی تمھارے درمیان گزری ہے اور آج تک تم مجھے ایک امین آدمی کی حیثیت سے جانتے رہے ہو۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں، تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو، یا جس کے حُصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقے سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوتِ حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں

صَرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھا رہا ہوں، تو تمھیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، ایمان داری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلقِ خدا کی فلاح دیکھتا ہوں، وہی پیش کر رہا ہوں، کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔

یہ دونوں دلیلیں اُن اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآنِ مجید نے بار بار انبیا علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کَسَوٹی قرار دیتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو شخص ایک معاشرے میں برسوں زندگی بسر کر چکا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ ہر معاملے میں اسے سچا اور راست باز آدمی پایا ہو، اس کے متعلق کوئی غیر متعصب آدمی مشکل ہی سے یہ شک کر سکتا ہے کہ وہ یکایک خدا کے نام سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر اُتر آئے گا کہ اسے نبی نہ بنایا گیا ہو اور وہ کہے کہ خدا نے مجھے نبی بنایا ہے۔ پھر دوسری اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسا سفید جھوٹ کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تو نہیں گھڑا کرتا۔ لامحالہ کوئی نفسانی غرض ہی اس فریب کاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنی اغراض کے لیے اس طرح کی فریب کاری کرتا ہے تو اِخفا کی تمام کوششوں کے باوجود اس کے آثار نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ اسے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں، جن کے گھناؤنے پہلو گرد و پیش کے معاشرے میں چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ اور مزید برآں وہ اپنی پیری کی دکان چمکا کر کچھ نہ کچھ اپنا بھلا کرتا نظر آتا ہے۔ نذرانے وصول کیے جاتے ہیں، لنگر جاری ہوتے ہیں، جائدادیں بنتی ہیں، زیور گھڑے جاتے ہیں، اور فقیری کا آستانہ دیکھتے دیکھتے شاہی دربار بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے برعکس نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی ذاتی زندگی ایسے فضائلِ اَخلاق سے لبریز نظر آئے کہ اس میں کہیں ڈھونڈے سے بھی کسی فریب کارانہ ہتھکنڈے کا نشان نہ مل سکے، اور اس کام سے کوئی ذاتی فائدہ اُٹھانا تو درکنار، وہ اپنا سب کچھ اِسی خدمتِ بے مزد کی نذر کر دے، وہاں جھوٹ کا شبہ کرنا کسی معقول انسان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ کوئی شخص جو عقل بھی رکھتا ہو اور بے انصاف بھی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آخر ایک اچھا بھلا آدمی، جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، کیوں بلاوجہ ایک جھوٹا دعویٰ لے کر اُٹھے، جب کہ اسے کوئی فائدہ اس جھوٹ سے نہ ہو، بلکہ وہ اُلٹا اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی ساری قوتیں اور محنتیں اس کام میں کھپا رہا ہو اور بدلے میں دنیا بھر کی دشمنی مول لے رہا ہو۔ ذاتی مفاد کی قربانی آدمی کے مخلص ہونے کی سب سے زیادہ نمایاں دلیل ہوتی ہے۔ یہ قربانی کرتے جس کو سالوں بیت جائیں، اسے بدنیت یا خودغرض سمجھنا خود اس شخص کی اپنی بدنیتی کا ثبوت ہوتا ہے جو ایسے آدمی پر یہ الزام لگائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۰)

۸۰۔ اس فقرے کی تکرار بے وجہ نہیں ہے۔ پہلے یہ ایک اور مناسبت سے فرمایا گیا تھا اور یہاں ایک دوسری مناسبت سے اس کو دُہرایا گیا ہے۔ اُوپر اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ سے فَاتَّقُوا اللّٰهَ کے فقرے کی مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، جس کی صفتِ امانت سے تم لوگ خود بھی واقف ہو، اُسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ سے اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے بغیر محض اصلاحِ خلق کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ؕ قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ۚ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ۚ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ

انھوں نے جواب دیا: ”کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے[81]؟“ نوحؑ نے کہا: ”میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں، ان کا حساب تو میرے رب کے ذمّے ہے، کاش! تم کچھ شعور سے کام[82] لو۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں اُن کو میں

کام کر رہا ہے، اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اس بات کو اتنا زور دے کر بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قوم کے سردار حضرت نوحؑ کی مخلصانہ دعوتِ حق میں کیڑے ڈالنے کے لیے ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ شخص دراصل یہ ساری دوڑ دھوپ اپنی بڑائی کے لیے کر رہا ہے: يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ (المومنون، آیت ۲۴) ”یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔“

۸۱ - یہ لوگ جنھوں نے حضرت نوحؑ کو دعوتِ حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شُیوخ اور اشراف تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصّے کے سلسلے میں بیان ہُوا ہے: فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔ (ہُود، آیت ۲۷) ”اُس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمھاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بُوجھے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اَراذِل ہیں، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے طبقے کے بااثر اور خوش حال لوگ، تو وہ ان کی مخالفت پر کمربستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ حضرت نوحؑ کے خلاف پیش کرتے تھے، ان میں سے ایک اِستِدلال یہ تھا کہ اگر نوحؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اُمَرا، علما، مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن اُن میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بُوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ اِن بے شعور اور کمین لوگوں کے زُمرے میں شامل ہو جائیں؟

بعینہٖ یہی بات قریش کے کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ اِن کے پیرو یا تو غلام اور غریب

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾

النصف

دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف مُتنَبِّہ کر دینے والا آدمی ہوں۔[۸۳]" انھوں نے کہا: "اے نوحؑ! اگر تُو باز نہ آیا تو پِھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا۔[۸۴]" نوح نے دُعا کی "اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھُٹلا دیا۔[۸۵]

لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معزّزین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابوسُفیان نے ہِرَقل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ تَبِعَهٗ مِنَّا الضُّعَفَآءُ وَ الْمَسٰكِيْن (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے)۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں، کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا ردّ کر دینا صاف طور پر یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفّارِ مکہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا، وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ (الزُّخرُف، آیت ۳۱) "وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔"

۸۲— یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، اُن کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں، یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بُوجھ سے عاری ہوتے ہیں، اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی، نہ ان کا اعتقاد لائقِ اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔ حضرت نوحؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آ کر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے، میرا اور تمھارا کام نہیں ہے۔

۸۳— یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے اُونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زُمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے

کہ اے نوحؑ! کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اَراذِل اور سفہا میں شمار کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں؟ حضرت نوح علیہ السلام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں، اور جو میری بات مانتے ہیں انھیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے، اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے، اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں، اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں "کمین" ہوں تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ اِن آیات کے نُزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان چل رہا تھا، اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔ کفارِ مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلالؓ اور عمّارؓ اور صُہَیبؓ جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف اِدھر کا رُخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دوٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبّروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیے جا سکتے:

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰىۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰىؕ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰىؕ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰىۙ وَ هُوَ يَخْشٰىۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰىۚ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗۘ
(عبس، آیات ۵ تا ۱۲)

اے محمدؐ! جس نے بے نیازی برتی، تم اس کے پیچھے پڑتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے۔ اور جو تمھارے پاس دَوڑا آتا ہے اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے، تم اس سے بے رخی برتتے ہو؟ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ

نہ دُور پھینکو ان لوگوں کو جو شب و روز اپنے ربّ کو پکارتے ہیں محض اُس کی خوشنودی کی خاطر۔ ان کا کوئی حساب تمھارے ذمّہ نہیں، اور تمھارا کوئی حساب ان کے ذمّہ نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انھیں دُور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ ہم نے

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات[۸۶] دے۔"

بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ (الانعام، آیت ۵۲-۵۳) تو اس طرح اِن لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ کہیں: "کیا ہمارے درمیان بس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا؟" ہاں، کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا؟

۸۴- اصل الفاظ ہیں لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ اِس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی، جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے ان الفاظ کے یہ دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔

۸۵- یعنی آخری اور قطعی طور پر جھٹلا دیا ہے جس کے بعد اب کسی تصدیق و ایمان کی اُمید باقی نہیں رہی۔ ظاہرِ کلام سے کوئی شخص اس شبہے میں نہ پڑے کہ بس پیغمبر اور سردارانِ قوم کے درمیان اوپر کی گفتگو ہوئی اور ان کی طرف سے پہلی ہی تکذیب کے بعد پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حضور رپورٹ پیش کر دی کہ یہ میری نبوت نہیں مانتے، اب آپ میرے اور ان کے مقدّمے کا فیصلہ فرما دیں۔ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل کش مکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کش مکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک مُمتد رہا ہے۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ (آیت ۱۴) حضرت نوحؑ نے اس زمانے میں پشت در پشت اُن کے اجتماعی طرزِ عمل کو دیکھ کر نہ صرف یہ اندازہ فرما لیا کہ ان کے اندر قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آیندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایمان دار آدمیوں کے اُٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○ (نوح، آیت ۲۷) "اے رب! اگر تو نے انھیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، فاجر اور سخت منکرِ حق ہوگا۔" خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علمِ کامل و شامل کی بنا پر فرمایا: لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (ہود، آیت ۳۶) "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔"

۸۶- یعنی صرف یہی فیصلہ نہ کر دے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون، بلکہ وہ فیصلہ اس شکل میں نافذ فرما کہ باطل پرست تباہ کر دیے جائیں اور حق پرست بچا لیے جائیں۔ یہ الفاظ کہ "مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو بچا لے"

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا بَعۡدُ الۡبٰقِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۲﴾ كَذَّبَتۡ عَادُ ۨالۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ هُوۡدٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

ع ۱۸ / ۱۰

آخر کار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا[۸۷]۔ اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا[۸۸]۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہُود نے ان سے کہا تھا[۸۹]: ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو

---

خود بخود اپنے اندر یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں پر عذاب نازل کر اور انھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دے۔

۸۷ – ”بھری ہوئی کشتی“ سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی ایمان لانے والے انسانوں اور تمام جانوروں سے بھر گئی تھی، جن کا ایک ایک جوڑا ساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ ہود، آیت ۴۰۔

۸۸ – تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۶۵ تا ۷۲۔ ہود، ۵۰ تا ۶۰۔ مزید برآں اس قصے کی تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی نگاہ میں رہیں: حٰمٓ السجدہ، آیات ۱۳-۱۶۔ الاحقاف، ۲۱-۲۶۔ الذاریات، ۴۱-۴۵۔ القمر، ۱۸-۲۲۔ الحاقّہ، ۴-۸۔ الفجر، ۶-۸۔

۸۹ – حضرت ہودؑ کی اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے متعلق وہ معلومات ہماری نگاہ میں رہیں جو قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر ہمیں بہم پہنچائی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ:

قومِ نوحؑ کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عُروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی:

| | |
|---|---|
| وَ اذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ (الاعراف:۶۹) | یاد کرو (اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ) نوحؑ کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔ |

وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔ یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو،[۹۰]

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے:

وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ (الاعراف: ۶۹) اور تمھیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔

اپنے دَور میں یہ بے نظیر قوم تھی۔ کوئی دوسری قوم اس کی ٹکّر کی نہ تھی:

الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۙ (الفجر: ۸) جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

اس کا تمدّن بڑا شان دار تھا، اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خُصوصیّت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دُنیا میں مشہور تھی:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ (الفجر: ۶-۷) تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عادِ اِرَم کے ساتھ؟

اس مادّی ترقی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبر بنا دیا تھا اور انھیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ (حٰمٓ السجدہ: ۱۵) رہے عاد، تو انھوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا:

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ○ (ہود: ۵۹) اور انھوں نے ہر جبار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ (الاعراف: ۷۰) انھوں نے (ہودؑ سے) کہا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

اِن خُصوصیّات کو نظر میں رکھنے سے حضرت ہود علیہ السلام کی یہ تقریرِ دعوت اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

۹۰- یعنی محض اپنی عظمت و خوش حالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسی عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے ہو جن کا

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْۤ اَمَدَّكُمْ

اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے[91]۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو[92]۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمھیں دیا ہے

کوئی مَصرَف نہیں، جن کی کوئی حاجت نہیں، جن کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہیں کہ وہ بس تمھاری دولت وشوکت کی نمود کے لیے ایک نشانی کے طور پر کھڑی رہیں۔

۹۱ — یعنی تمھاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں، مگر ان کو شان دار، مُزَیَّن اور مستحکم بنانے میں تم اس طرح اپنی دولت، محنت اور قابلیتیں صَرف کرتے ہو جیسے دُنیا میں ہمیشہ رہنے کا سامان کر رہے ہو، جیسے تمھاری زندگی کا مقصد بس یہیں کے عیش کا اہتمام کرنا ہے اور اس کے ماورا کوئی چیز نہیں ہے جس کی تمھیں فکر ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ بلاضرورت یا ضرورت سے زیادہ شان دار عمارتیں بنانا کوئی منفرد فعل نہیں ہے جس کا ظُہور کسی قوم میں اس طرح ہو سکتا ہو کہ اس کی اور سب چیزیں تو ٹھیک ہوں اور بس یہی ایک کام وہ غلط کرتی ہو۔ یہ صورتِ حال تو ایک قوم میں رُونما ہی اُس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف اس میں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کے اندر نفس پرستی و مادّہ پرستی کی شدّت بڑھتے بڑھتے جُنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ حالت جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا سارا ہی نظامِ تمدّن فاسد ہو جاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی تعمیرات پر جو گرفت کی، اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ ان کے نزدیک صرف یہ عمارتیں ہی بجائے خود قابلِ اعتراض تھیں، بلکہ دراصل وہ بحیثیتِ مجموعی ان کے فسادِ تمدُّن وتہذیب پر گرفت کر رہے تھے، اور ان عمارتوں کا ذکر انھوں نے اس حیثیت سے کیا تھا کہ سارے ملک میں ہر طرف یہ بڑے بڑے پھوڑے اس فساد کی نمایاں ترین علامت کے طور پر اُبھرے نظر آتے تھے۔

۹۲ — یعنی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں تو تم اس قدر غُلُوّ کر گئے ہو کہ رہنے کے لیے تم کو مکان نہیں محل اور قصر درکار ہیں، اور ان سے بھی جب تمھاری تسکین نہیں ہوتی تو بلاضرورت عالی شان عمارتیں بنا ڈالتے ہو، جن کا کوئی مصرف اظہارِ قوت وثروت کے سوا نہیں ہے۔ لیکن تمھارا معیارِ انسانیت اتنا گرا ہوا ہے کہ کمزوروں کے لیے تمھارے دلوں میں کوئی رحم نہیں، غریبوں کے لیے تمھاری سرزمین میں کوئی انصاف نہیں، گرد وپیش کی ضعیف قومیں ہوں یا خود اپنے ملک کے پست طبقات، سب تمھارے جبر وظلم کی چکی میں پِس رہے ہیں اور کوئی تمھاری چیرہ دستیوں سے بچا نہیں رہ گیا ہے۔

بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً‌ ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۴۰﴾ ع ۸

جو تم جانتے ہو۔ تمھیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔" انھوں نے جواب دیا: "تُو نصیحت کر یا نہ کر، ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں[۹۳]۔ اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔" آخرکار انھوں نے اُسے جُھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا[۹۴]۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

۹۳ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، یہ آج کوئی نئی چیز نہیں ہے، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ان کا دین تھا، یہی ان کا تمدّن تھا اور ایسے ہی ان کے اَخلاق اور معاملات تھے۔ کون سی آفت اُن پر ٹوٹ پڑی تھی کہ اب ہم اس کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ کریں۔ اس طرزِ زندگی میں کوئی خرابی ہوتی تو پہلے ہی وہ عذاب آ چکا ہوتا جس سے تم ڈراتے ہو۔ دوسرے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو باتیں تم کر رہے ہو، ایسی ہی باتیں پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں بگھارنے والے کرتے رہے ہیں، مگر دُنیا کی گاڑی جس طرح چل رہی تھی اسی طرح چلے جا رہی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی باتیں نہ ماننے کا یہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوا کہ یہ گاڑی کسی صدمے سے دوچار ہو کر اُلٹ گئی ہوتی۔

۹۴ – اس قوم کے ہلاک ہونے کی جو تفصیل قرآنِ مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچانک زور کی آندھی اُٹھی۔ یہ لوگ دُور سے اس کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھ کر سمجھے کہ گھٹا چھائی ہے۔ خوشیاں منانے لگے کہ اب خوب بارش ہوگی۔ مگر وہ تھا خدا کا عذاب۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس نے

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ أَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَا

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۹۵] یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا: "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔[۹۶] لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے

ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالَم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی گرمی و خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ طوفان اس وقت تک نہ تھما جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک مُتنفّس ختم نہ ہو گیا۔ بس اِن کی بستیوں کے کھنڈر رہی ان کے انجام کی داستان سنانے کے لیے کھڑے رہ گئے۔ اور آج کھنڈر بھی باقی نہیں ہیں۔ اَحقاف کا پورا علاقہ ایک خوف ناک ریگستان بن چکا ہے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ۲۵)

**۹۵** – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود، ۶۱-۶۸۔ الحِجر، ۸۰-۸۴۔ بنی اسرائیل، ۵۹۔ مزید تفصیلات کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مَقامات بھی پیشِ نظر رہیں: النمل، ۴۵-۵۳۔ الذاریات، ۴۳-۴۵۔ القمر، ۲۳-۳۱۔ الحاقّہ، ۴-۵۔ الفجر، ۹۔ الشّمس، ۱۱۔

اس قوم کے متعلق قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی، جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف، آیت ۷۴) مگر اس کی تمدُّنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیّت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنٹا کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بُت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اُونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا۔ اُونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ إِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ٥ "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، اس کو ہم نہیں مان سکتے۔"

اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾

دیے جاؤ گے؟[97] اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رَس بھرے ہیں؟[98] تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو۔[99] اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۹۶ – حضرت صالحؑ کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآنِ مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے: قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود، آیت ۶۲) ’’انھوں نے کہا: اے صالحؑ! اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔‘‘

۹۷ – یعنی کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ تمھارا یہ عیش دائمی اور اَبدی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی ان نعمتوں کا حساب نہ لیا جائے گا اور کبھی ان اعمال کی باز پُرس نہ ہوگی جن کا تم ارتکاب کر رہے ہو؟

۹۸ – اصل میں لفظ هَضِيْمٌ استعمال ہُوا ہے، جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لدکر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

۹۹ – جس طرح عاد کے تمدّن کی نمایاں ترین خُصوصیّت یہ تھی کہ وہ اُونچے اُونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدّن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیّت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے، اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ، ’’وہ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں۔‘‘ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے: تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا۔ (الاعراف، آیت ۷۴) اور ان تعمیرات کی غرض وغایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت وقوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمایش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدّن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھُپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف اُمرا اور اہلِ ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمایشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنھیں ۱۹۵۹ء کے دسمبر میں، میں نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے صفحات میں ان کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینۂ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العُلاء (جسے

وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ ٱلْمُسَحَّرِينَ ﴿١٥٣﴾ مَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ

اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے[۱۰۰]۔" انھوں نے جواب دیا: "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے[۱۰۱]۔ تو ہم جیسے ایک انسان

عہدِ نبویؐ میں وادی القُریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانبِ شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مَقامی باشندے الحِجر اور مدائنِ صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العُلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر الحِجر کے گردو پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنویں ہیں۔ انھی میں سے ایک کنویں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ رِوایت چلی آ رہی ہے کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی اُسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے (اس کی تصویر بھی مقابل کے صفحات میں دی جا رہی ہے)۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العُلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کِھیل کِھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انھیں سطحِ زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اِسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العُلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اُردُن کے حُدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلۂ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ثمود کی جو عمارتیں ہم نے الحِجر میں دیکھی تھیں، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلیجِ عَقَبہ کے کنارے مَدیَن کے مقام پر، اور اُردُن کی ریاست میں پیٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیّت کے ساتھ پیٹرا میں ثمود کی عمارات اور نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اُن کی تراش خراش اور طرزِ تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے (ان کے الگ الگ نمونوں کی تصویریں بھی ہم نے مقابل کے صفحات میں دی ہیں)۔ انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے الحِجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انھیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کران کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نَبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبلِ مسیح میں اسے عُروج پر پہنچایا، اور پھر ایلورا میں (جس کے غار پیٹرا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١۵٤﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ

کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچّا ہے۔[١٠٢]" صالحؑ نے کہا: "یہ اُونٹنی ہے۔[١٠٣] ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔[١٠٤] اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک

**١٠٠** – یعنی اپنے ان اُمرا و رؤسا اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمھارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ مُسرف لوگ ہیں، اَخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شُترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے، اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمھارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو، اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اُٹھا ہوں ــــــ یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدّنی و اَخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

**١٠١** – "سحر زدہ"، یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا تو کسی جِنّ کے اثر سے لاحق ہوتا تھا، یا جادو کے اثر سے۔ اس لیے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے، اس کو یا تو "مجنون" کہتے تھے یا مسحور اور مسحَّر۔

**١٠٢** – یعنی بظاہر تو ہم میں اور تجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ ہم تجھے خدا کا فرستادہ مان لیں۔ لیکن اگر تو اپنے مامور من اللہ اور مُرسَل مِنْ جانبِ اللہ ہونے کے دعوے میں سچّا ہے تو کوئی ایسا محسوس معجزہ پیش کر جس سے ہمیں یقین آ جائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

**١٠٣** – معجزے کے مطالبے پر اُونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اُونٹنی نہ تھی جیسی ہر عرب کے پاس وہاں پائی جاتی تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خِلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ اگر حضرت صالحؑ اس مطالبے کے جواب میں یونہی کسی اونٹنی کو پکڑ کے کھڑا کر دیتے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوتی جس کی کسی پیغمبر تو درکنار، ایک عام معقول آدمی سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یہاں تو صرف سیاقِ کلام ہی کے اقتضا سے سمجھ میں آتی ہے، لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس اُونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ سورۂ اَعراف

عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾

بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا۔" مگر انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں[105] اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے۔

اور سورۂ ہود میں فرمایا گیا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً "یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے نشانی کے طور پر ہے۔" اور سورۂ بنی اسرائیل میں اس سے بھی زیادہ پُرزور الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ○ (آیت ۵۹)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔ اور ہم ثمود کے سامنے آنکھوں دیکھتے اونٹنی لے آئے، پھر بھی انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔ نشانیاں تو ہم خوف دلانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں (تماشا دکھانے کے لیے تو نہیں بھیجتے)۔

اس پر مزید وہ چیلنج ہے جو اُونٹنی کو میدان میں لے آنے کے بعد اس کافر قوم کو دیا گیا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ صرف ایک معجزہ ہی پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جا سکتا تھا۔

۱۰۴ – یعنی ایک دن تنہا یہ اونٹنی تمھارے کنوؤں اور چشموں سے پانی پیے گی اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور پییں گے۔ خبردار! اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، قبیلہ قبیلے سے لڑ جاتا تھا اور جان جوکھوں کی بازی لگا کر کسی کنویں یا چشمے سے پانی لینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سرزمین میں کسی شخص کا اُٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اکیلی اُونٹنی پانی پیے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور صرف دوسرے دن ہی پانی لے سکیں گے، یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ دراصل پوری قوم کو لڑائی کا چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر کوئی آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا اور کوئی قوم یہ بات اُس وقت تک نہ سُن سکتی تھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیر زن اور تیرانداز موجود ہیں جو مقابلے پر اُٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن حضرت صالحؑ نے بغیر کسی لاؤ لشکر کے تنہا اُٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دیا، اور قوم نے نہ صرف یہ کہ اس کو کان لٹکا کر سنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اس کی تعمیل بھی کرتی رہی۔

سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ "یہ اللہ کی اُونٹنی تمھارے لیے نشانی کے طور پر ہے، چھوڑ دو اسے کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، ہرگز اسے بُرے ارادے سے نہ چھونا۔" یعنی چیلنج صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ہر دوسرے روز اکیلی یہ اونٹنی دن بھر سارے علاقے کے پانی کی اجارہ دار رہے گی، بلکہ اس پر مزید یہ چیلنج بھی تھا کہ یہ تمھارے

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۶۰﴾ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ ۚ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۶۲﴾ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ ۚ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ

ع ٨ ١٩ ١٢

عذاب نے انھیں آلیا۔[106]

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

لُوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔[107] یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لُوطؑ نے ان سے کہا تھا: ''کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو

کھیتوں اور باغوں اور نخلستانوں اور چراگاہوں میں دندناتی پھرے گی، جہاں چاہے گی جائے گی، جو کچھ چاہے گی کھائے گی، خبردار! جو کسی نے اسے چھیڑا۔

۱۰۵- یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انھوں نے حضرت صالحؑ سے یہ چیلنج سنا، اسی وقت وہ اُونٹنی پر پِل پڑے اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ اُونٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی، لوگ اس پر دلوں میں اَونٹتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ سورۂ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ''جب کہ اُٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی۔'' اور سورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے: فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ''انھوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی، آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمے لے کر اُٹھا اور اس نے کوچیں کاٹ ڈالیں۔''

۱۰۶- قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ جب اُونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا: تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ''تین دن اپنے گھروں میں مزے کرلو۔'' (ہود، آیت ۶۵) اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح

إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱٦۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱٦۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱٦٦﴾

ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مَردوں کے پاس جاتے ہو[۱۰۸] اور تمھاری بیویوں میں تمھارے رب نے تمھارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟[۱۰۹] بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔[۱۱۰]"

کُچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انھیں اس آفت سے بچا سکے، نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ○ (القمر، آیت ۳۱) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ○ (اعراف، آیت ۷۸) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ○ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (الحِجر، آیات ۸۳-۸۴)

۱۰۷ - تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، ۷۴ تا ۸۳۔ الحِجر، ۵۷ تا ۷۷۔ الانبیاء، ۷۱ تا ۷۵۔ النمل، ۵۴ تا ۵۸۔ العنکبوت، ۲۸-۳۵۔ الصّافّات، ۱۳۳ تا ۱۳۸۔ القمر، ۳۳ تا ۳۹۔

۱۰۸ - اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہشِ نفس پوری کرو، حالانکہ دُنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دُنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے، بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔ اس دوسرے مفہوم کی صراحت سورۂ اَعراف اور سورۂ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ "کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟"

۱۰۹ - اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدا نے پیدا کی تھیں، انھیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کو اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدا نے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا، اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔ اس دوسرے مطلب میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ ظالم لوگ اپنی عورتوں سے بھی خلافِ وضعِ فطری فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔ بعید نہیں کہ وہ یہ حرکت خاندانی منصوبہ بندی کی خاطر کرتے ہوں۔

۱۱۰ - یعنی تمھارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے۔ تمھاری زندگی کا تو سارا انجار ہی حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے اس عام بگاڑ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ (النمل، آیت ۵۴) "کیا تمھارا یہ حال ہو گیا ہے کہ کھلّم کھلّا دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے فُحش کام

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾

انھوں نے کہا: ”اے لوطؑ! اگر تُو اِن باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں، اُن میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔“[111] اس نے کہا: ”تمھارے کرتوتوں پر جو لوگ کُڑھ رہے ہیں میں اُن میں شامل ہوں۔ اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے۔“[112] آخرکار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا، بجز ایک بُڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔[113] پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا

کرتے ہو؟“ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (العنکبوت، آیت ۲۹) ”کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ مَردوں سے مُباشرت کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں عَلانیہ بُرے کام کرتے ہو؟“ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حاشیہ ۳۹)

۱۱۱- یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے، یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے، وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تُو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہو گا۔ سورۂ اعراف اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوطؑ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿﴾ ”لوطؑ اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ اِن ”صالحین“ کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔“

۱۱۲- اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمالِ بد کے بُرے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس بدکردار بستی میں جو اَخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوت کہیں ہماری آل اولاد کو نہ لگ جائے، اہلِ ایمان کی اپنی نسلیں کہیں اس بگڑے ہوئے ماحول سے متاثّر نہ ہو جائیں، اس لیے اے پروردگار! ہمیں اِس ہر وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

۱۱۳- اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے۔ سورۂ تحریم میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا۔ (آیت ۱۰) ”یہ دونوں عورتیں

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ‌ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۷۵﴾ ع ۹ ۱۲ ۱۳

اور اُن پر برسائی ایک برسات، بڑی ہی بُری بارش تھی جو اُن ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔[114] یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انھوں نے ان کے ساتھ خیانت کی۔" یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر جب اللہ تعالیٰ نے قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت لوطؑ کو حکم دیا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں، تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرما دی کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاؤ۔ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ ‌ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا (آیت ۸۱) "پس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جا، اُس پر وہی کچھ گزرنی ہے جو ان لوگوں پر گزرنی ہے۔"

۱۱۴ – اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ جب رات کے پچھلے پہر اپنے بال بچوں کو لے کر نکل گئے تو صبح پو پھٹتے ہی یکایک ایک زور کا دھماکا ہوا (فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ۙ)، ایک ہولناک زلزلے نے ان کی بستیوں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا (جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا)، ایک زبردست آتش فشانی اِنفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے (وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ)، اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھراؤ کیا گیا (اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا)۔

بائبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے، اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

بُحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتا دیتی ہے کہ یہ کسی زمانے میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سیکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوش حالی کا دَور ۲۳۰۰ قبلِ مسیح سے ۱۹۰۰ قبلِ مسیح تک

رہا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائبل میں ''سِدّیم کی وادی'' کہا گیا ہے، جس کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ ''وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سَدُوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے ملک کی مانند خوب سیراب تھی۔'' (پیدایش، باب ۱۳، آیت ۱۰) موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بُحَیرۂ مُردار کے اندر غرق ہے، اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانے میں بحیرۂ مُردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔ شرقِ اُردُن کے موجودہ شہر الکَرَک کے سامنے مغرب کی جانب اس بُحَیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما ''اللِّسان'' پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصّہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ملحقہ نقشے میں ہم نے آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے)، پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادیِ سِدّیم تھی جس میں قومِ لوطؑ کے بڑے بڑے شہر سَدُوم، عمورہ، اَدْمہ، ضبوئیم اور ضُغَر واقع تھے۔ دو ہزار برس قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بُحَیرۂ مردار کا پانی اس کے اُوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصّہ ہے، مگر رومی عہد میں یہ اتنا اُتھلا تھا کہ لوگ اللِّسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اِس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات ڈوبی ہوئی ہیں۔

شمال
دریائے اردن
اریحا
بیت المقدس
خربت قُمران
بحیرۂ مُردار (بحرِلوط)
فلسطین
شرقِ اُردُن
حبرون
بنی نُعیم
اللسان
الکرک
مُؤتہ
الصافی
0 10 20 کلومیٹر

قومِ لوط کا علاقہ

بائبل اور قدیم یونانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں جگہ جگہ نَفط (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے، اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیرِ زمین پٹرول اور گیسوں کا پتا چلتا ہے۔

كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡــَٔیۡكَةِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۶﴾ۚۖ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَیۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾ۚ

اصحابُ الایکہ نے رسُولوں کو جُھٹلایا[115]۔ یاد کرو جب کہ شعیبؑ نے ان سے کہا تھا: "کیا تم ڈرتے نہیں؟

طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اُٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اُڑ گیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیمؑ جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اُٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے۔ (پیدائش، باب ۱۹، آیت ۲۸)

**۱۱۵** — اصحاب الأیکہ کا مختصر ذکر سورۂ الحِجر، آیت ۷۸ - ۸۴ میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مَدیَن اور اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں، اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورۂ اَعراف میں حضرت شعیبؑ کو اہلِ مَدیَن کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا)، اور یہاں اصحاب الایکہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ (جب کہ ان سے شعیب نے کہا)، "ان کے بھائی" (اَخُوْھُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں، کیونکہ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحابِ مَدیَن کے بیان ہوئے ہیں، وہی یہاں اصحاب الایکہ کے بیان ہو رہے ہیں، حضرت شعیبؑ کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے، اور آخرکار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قَطُورا کے بطن سے تھی، وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قَطُورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحابِ مَدیَن کہلایا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۷۸﴾ۙ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۷۹﴾ۚ وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۰﴾ؕ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ

میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو

جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ قُلزُم اور خلیج عَقَبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مَدیَن تھا، جس کی جائے وقوع ابوالفدا نے خلیج عَقَبہ کے مغربی کنارے اَیلَہ (موجودہ عَقَبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطورا، جن میں بنی دِدان (Dedanites) نسبتاً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں تیماء اور تبوک اور العُلاء کے درمیان آباد ہوئے، اور ان کا صدر مقام تبوک تھا، جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔ (یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں لفظِ ''ایکہ'' کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہلِ تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے۔ بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گُھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا، اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اَخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ بَعلِ فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو اُن کے اندر بھی انھوں نے شرک اور زِنا کاری کی وبا پھیلا دی۔ (گنتی، باب ۲۵، آیت ۱-۵، باب ۳۱، آیت ۱۶-۱۷) پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی اُن دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فَارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انھوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خَراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے، اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انھوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآنِ مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ''یہ دونوں (قومِ لوط اور اصحاب الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے۔'' اور ان کی رہزنی کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ ''اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو۔'' یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝۱۸۱ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝۱۸۲ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۱۸۳ وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۸۴ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝۱۸۵ وَ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۱۸۶ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۸۷ قَالَ رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸۸ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۸۹

---

اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اُس ذات کا خوف کرو جس نے تمھیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔"
انھوں نے کہا: "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔"
شعیبؑ نے کہا: "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔"[116] انھوں نے اسے جھٹلا دیا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا،[117] اور وہ بڑے ہی خوف ناک دن کا عذاب تھا۔

---

حضرت شعیبؑ اور اہلِ مَدیَن کے قصے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۵-۹۳۔ ہود، ۸۴-۹۵۔ العنکبوت، ۳۶-۳۷۔

۱۱۶ - یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے، اور وہ تمھارے کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمھیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرما دے گا۔ اصحاب الایکہ کے اس مطالبے اور حضرت شعیبؑ کے اس جواب میں کفارِ قریش کے لیے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مطالبے کرتے تھے: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا "یا پھر گرا دے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔" (بنی اسرائیل، آیت ۹۲) اس لیے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اُس کا جو جواب انھیں ملا، وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمھاری طلب کا جواب بھی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۹۲﴾ ؕ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ

ع ۱۰ ۱۶ ۱۳

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ع

یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے[۱۱۸][۱۱۹]۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار رُوح[۱۲۰]

۱۱۷– اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآنِ مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک بارانِ عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ مَدیَن کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔ یہ، جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے، چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور اُن پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○ اور وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۙ)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش دُرست نہیں ہے۔ بعض مفسّرین نے عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابنِ جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثك من العلماء ما عذاب یوم الظلة فکذبه، ”علما میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظُّلّہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو۔“

۱۱۸– تاریخی بیان ختم کر کے اب سلسلۂ کلام اُسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورت کا آغاز فرمایا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر پلٹ کر پہلے رُکوع کو دیکھ لینا چاہیے۔

۱۱۹– یعنی یہ ”کتابِ مبین“ جس کی آیات یہاں سنائی جا رہی ہیں، اور یہ ”ذکر“ جس سے لوگ منہ موڑ رہے ہیں، کسی انسان کی من گھڑت چیز نہیں ہے، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف نہیں کر لیا ہے، بلکہ یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ ہے۔

۱۲۰– مراد ہیں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ دوسری جگہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ – (البقرہ، آیت ۹۷) ”کہہ دے کہ جو کوئی دشمن ہے جبریلؑ کا، تو اسے معلوم ہو کہ اُسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔“ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے

الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً

اُتری ہے، تاکہ تو اُن لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) مُتنبِّہ کرنے والے ہیں، صاف صاف عربی زبان میں[۱۲۱]۔ اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے[۱۲۲]۔ کیا ان (اہلِ مکّہ) کے لیے یہ کوئی نشانی

روحِ امین (امانت دار روح) کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ربّ العالمین کی طرف سے اس تنزیل کو لے کر کوئی مادّی طاقت نہیں آئی ہے، جس کے اندر تغیّر و تبدُّل کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خالص روح ہے بلا شائبۂ مادّیت، اور وہ پوری طرح امین ہے، خدا کا پیغام، جیسا اس کے سُپرد کیا جاتا ہے، ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ بڑھانا، یا گھٹا دینا، یا بطورِ خود کچھ تصنیف کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

**۱۲۱**– اس فقرے کا تعلق ''امانت دار روح اتری ہے'' سے بھی ہو سکتا ہے اور ''مُتنبِّہ کرنے والے ہیں'' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ امانت دار روح اسے صاف صاف عربی زبان میں لائی ہے، اور دوسری صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن انبیاؑ میں شامل ہوں جنھیں عربی زبان میں خلقِ خدا کو مُتنبِّہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا، یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام۔ دونوں صورتوں میں مقصودِ کلام ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ ربّ العالمین کی طرف سے یہ تعلیم کسی مُردہ یا جنّاتی زبان میں نہیں آئی ہے، نہ اس میں کوئی مُعمّے یا چیستان کی سی گنجلک زبان استعمال کی گئی ہے، بلکہ یہ ایسی صاف اور فصیح عربی زبان میں ہے، جس کا مفہوم و مدّعا ہر عرب اور ہر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہو، بے تکلُّف سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے منہ موڑ رہے ہیں ان کے لیے یہ عذر کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس تعلیم کو سمجھ نہیں سکے ہیں، بلکہ ان کے اعراض و انکار کی وجہ صُرف یہ ہے کہ یہ اُسی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں فرعونِ مصر اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ نوحؑ اور قومِ لوطؑ اور عاد و ثمود اور اصحاب الاَیکہ مبتلا تھے۔

**۱۲۲**– یعنی یہی ذکر اور یہی تنزیل اور یہی الٰہی تعلیم سابق کُتُبِ آسمانی میں بھی موجود ہے۔ یہی خدائے واحد کی بندگی کا بلاوا، یہی آخرت کی زندگی کا عقیدہ، یہی انبیاؑ کی پیروی کا طریقہ اُن سب میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ سب کتابیں جو خدا کی طرف سے آئی ہیں، شرک کی مذمّت ہی کرتی ہیں، مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کو چھوڑ کر اُسی برحق نظریۂ حیات کی طرف دعوت دیتی ہیں جس کی بنیاد خدا کے حضور انسان کی جواب دہی کے تصور پر ہے، اور انسان سے یہی مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اُن الٰہی احکام کی پیروی اختیار کرے جو انبیا علیہم السلام لائے ہیں۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نرالی نہیں جو دُنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ تم وہ بات کر رہے ہو جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

یہ آیت مِن جملہ ان دلائل کے ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اِس قدیم رائے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص عربی میں قرآن پڑھنے کی قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ بنائے اِستِدلال علّامہ ابوبکر جَصّاص کے الفاظ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرما رہا ہے کہ یہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں وہ عربی الفاظ کے ساتھ نہ تھا۔ لہٰذا کسی دوسری زبان میں اس کے مضامین کو نقل کر دینا اسے قرآن ہونے سے خارج نہیں کر دیتا۔ (احکام القرآن، جلد سوم، صفحہ ۴۲۹) لیکن اس اِستِدلال کی کمزوری بالکل ظاہر ہے۔ قرآنِ مجید ہو یا کوئی دوسری آسمانی کتاب، کسی کے نُزول کی کیفیت بھی یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف معانی نبی کے دل پر القا کر دیے ہوں اور نبی نے پھر انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ بلکہ ہر کتاب جس زبان میں بھی آئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معنیٰ اور لفظ، دونوں کے ساتھ آئی ہے۔ اس لیے قرآن کی تعلیم جن پچھلی کتابوں میں تھی، انسانی الفاظ میں نہیں، خدائی الفاظ ہی میں تھی، اور ان میں سے کسی کے ترجمے کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اصل کا قائم مقام ٹھیرایا جا سکے۔ رہا قرآن، تو اس کے متعلق بار بار بصراحت فرمایا گیا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف، آیت ۲) وَ كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا (الرعد، آیت ۳۷) قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ (الزمر، آیت ۲۸) اور خود اسی آیتِ زیرِ بحث سے پہلے متصلاً فرمایا جا چکا ہے کہ روح الامین اسے زبانِ عربی میں لے کر اترا ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی ترجمہ جو کسی انسان نے دوسری زبان میں کیا ہو، وہ بھی قرآن ہی ہوگا اور اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے قائم مقام ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِستِدلال کی اس کمزوری کو بعد میں خود امامِ ممدوح نے بھی محسوس فرما لیا تھا، چنانچہ معتبر رِوایات سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے اس مسئلے میں اپنی رائے سے رُجوع کر کے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے قبول کر لی تھی، یعنی یہ کہ جو شخص عربی زبان میں قراءت پر قادر نہ ہو، وہ اُس وقت تک نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے جب تک اس کی زبان عربی الفاظ کے تلفظ کے قابل نہ ہو جائے، لیکن جو شخص عربی میں قرآن پڑھ سکتا ہو، وہ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبَین نے یہ رعایت دراصل اُن عجمی نومسلموں کے لیے تجویز کی تھی جو اسلام قبول کرتے ہی فوراً عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکتے تھے۔ اور اس میں بنائے استدلال یہ نہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ بھی قرآن ہے، بلکہ ان کا اِستِدلال یہ تھا کہ جس طرح اشارے سے رُکوع وسُجود کرنا اُس شخص کے لیے جائز ہے جو رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو، اسی طرح غیر عربی میں نماز پڑھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو عربی تلفظ پر قادر نہ ہو۔ اور علیٰ ہذا القیاس، جس طرح عجز رفع ہو جانے کے بعد اشارے سے رکوع وسجود کرنے والے کی نماز نہ ہوگی، اسی طرح قرآن کے تلفظ پر قادر ہو جانے کے بعد ترجمہ پڑھنے والے کی نماز بھی نہ ہوگی۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے مُلاحَظہ ہو: مَبْسُوط سَرَخْسی جلد اوّل، صفحہ ۳۷۔ فتح القدیر وشرح عنایہ علی الہدایہ، جلد ۱، صفحہ ۱۹۰-۲۰۱)

اَنۡ يَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَؕ ﴿١٩٧﴾ وَلَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰى بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِيۡنَۙ ﴿١٩٨﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَؕ ﴿١٩٩﴾ كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِىۡ قُلُوۡبِ

نہیں ہے کہ اِسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟[123] (لیکن اِن کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سُناتا تب بھی یہ مان کر نہ دیتے۔[124] اِسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں

**۱۲۳** – یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآنِ مجید میں دی گئی ہے، وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کُتُبِ آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہلِ مکہ خود علمِ کتاب سے ناآشنا سہی، بنی اسرائیل کے اہلِ علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا اور نرالا ''ذکر'' نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمدؐ بن عبداللہ نے لاکر تمھارے سامنے رکھ دیا ہو، بلکہ ہزار ہا برس سے خدا کے نبی یہی ذکر پے در پے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العالمین کی طرف سے ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل کی تھیں؟

سیرت ابنِ ہِشام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے زمانۂ نزول سے قریب ہی یہ واقعہ پیش آ چکا تھا کہ حَبَش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دعوت سُن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجدِ حرام میں کفّارِ قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ان کو قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپؐ کے رسولِ برحق ہونے کی تصدیق کر کے آپؐ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضورؐ کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل قریش کے چند لوگوں کے ساتھ ان سے ملا اور انھیں سخت ملامت کی۔ اس نے کہا: ''تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ نامرادو! تمھارے ہاں کے لوگوں نے تو تمھیں اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر تم ابھی اس سے ملے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے۔'' وہ شریف لوگ ابوجہل کی اس زجر و توبیخ پر اُلجھنے کے بجائے سلام کر کے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے، آپ اپنے دین کے مختار ہیں اور ہم اپنے دین کے مختار، ہمیں جس چیز میں اپنی خیر نظر آئی، اسے ہم نے اختیار کر لیا۔ (جلد دوم، صفحہ ۳۲) اسی واقعے کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے کہ اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِهٖ هُمۡ بِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ ○ وَاِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلِهٖ مُسۡلِمِيۡنَ ○ ...... وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَـكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ لَا نَبۡتَغِى الۡجٰهِلِيۡنَ ○ (آیات ۵۲-۵۵)'' جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ

گزارا ہے۔[۱۲۵] وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔[۱۲۶] پھر جب وہ بے خبری

دی تھی، وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ انھیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے...... اور جب انھوں نے بیہودہ باتیں سنیں تو اُلجھنے سے پرہیز کیا اور بولے: ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ پسند نہیں کرتے (کہ چار باتیں تم ہمیں سناؤ تو چار ہم تمھیں سنائیں)۔''

۱۲۴ – یعنی اب انھی کی قوم کا ایک آدمی انھیں عربیِ مبین میں یہ کلام پڑھ کر سنا رہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر ادا ہونے میں آخر معجزے کی کیا بات ہے کہ ہم اسے خدا کا کلام مان لیں۔ لیکن اگر یہی فصیح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر عرب پر بطورِ معجزہ نازل کر دیا جاتا اور وہ ان کے سامنے آ کر نہایت صحیح عربی لہجے میں اسے پڑھتا تو یہ ایمان نہ لانے کے لیے دوسرا بہانہ تراشتے، اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی جِنّ آ گیا ہے جو عجمی کی زبان سے عربی بولتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حواشی ۵۴ تا ۵۸) اصل چیز یہ ہے کہ جو شخص حق پسند ہوتا ہے، وہ اُس بات پر غور کرتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جا رہی ہو، اور ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ یہ معقول بات ہے یا نہیں۔ اور جو شخص ہٹ دھرم ہوتا ہے اور نہ ماننے کا ارادہ کر لیتا ہے، وہ اصل مضمون پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اسے رد کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اس کے سامنے بات خواہ کسی طریقے سے پیش کی جائے، وہ بہر حال اسے جھٹلانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لے گا۔ کفارِ قریش کی اس ہٹ دھرمی کا پردہ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ فاش کیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ تم ایمان لانے کے لیے معجزہ دکھانے کی شرط آخر کس منہ سے لگاتے ہو، تم تو وہ لوگ ہو کہ تمھیں خواہ کوئی چیز دکھا دی جائے، تم اُسے جھٹلانے کے لیے کوئی بہانہ نکال لو گے، کیونکہ دراصل تمھیں حق بات مان کر نہیں دینی ہے: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿﴾ (الانعام، آیت ۷) ''اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا، وہ کہتے کہ یہ تو کُھلا جادو ہے۔'' وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿﴾ (الحجر، آیات ۱۴-۱۵) ''اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

۱۲۵ – یعنی یہ اہلِ حق کے دلوں کی طرح تسکینِ روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوۡلُوۡا هَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَ ؕ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَ ۙ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ ۙ﴿۲۰۶﴾ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُمَتَّعُوۡنَ ؕ﴿۲۰۷﴾ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۖ﴿۲۰۸﴾ ذِكۡرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۲۰۹﴾ ع

میں ان پر آپڑتا ہے اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ "کیا اب ہمیں کچھ مُہلت مل سکتی ہے؟"[۱۲۷]

تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انھیں برسوں تک عیش کرنے کی مُہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آجائے جس سے انھیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ زیست جو ان کو ملا ہُوا ہے ان کے کس کام آئے گا؟[۱۲۸]

(دیکھو!) ہم نے کبھی کسی بستی کو اِس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے خبردار کرنے والے حقِّ نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے۔ اور ہم ظالم نہ تھے۔[۱۲۹]

۱۲۶ – ویسا ہی عذاب جیسا وہ قومیں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورہ میں گزرا ہے۔

۱۲۷ – یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ہی مجرموں کو یقین آیا کرتا ہے کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ اُس وقت وہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل مل کر کہتے ہیں کہ کاش! اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

۱۲۸ – اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی مچانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ جیسی چَین کی بنسری آج تک ہم بجاتے رہے ہیں، اسی طرح ہمیشہ بجاتے رہیں گے۔ اسی اعتماد پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو اور ہم تمھیں جھٹلا کر عذابِ الٰہی کے مستحق ہو رہے ہیں تو لو ہم نے تمھیں جھٹلا دیا، اب لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے: اچھا، اگر بالفرض ان کا یہ بھروسا صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انھیں دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے جس کی توقع پر یہ پھول رہے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و ثمود یا قوم لوط اور اصحاب الایکہ کی سی کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے، یا اور کچھ نہیں تو موت ہی کی

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ

اِس (کتابِ مُبین) کو شیاطین لے کر نہیں اُترے ہیں[۱۳۰]، نہ یہ کام ان کو سجتا ہے[۱۳۱]، اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں[۱۳۲]۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دُور رکھے گئے ہیں[۱۳۳]۔ پس اے محمدؐ! اللہ کے ساتھ کسی دُوسرے معبُود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں

آخری گھڑی آن پہنچی جس سے بہر حال کسی کو مفر نہیں، تو اس وقت عیشِ دنیا کے یہ چند سال آخر ان کے لیے کیا مفید ثابت ہوں گے؟

**۱۲۹** – یعنی جب انھوں نے خبر دار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اُس وقت ہوتا جب کہ ہلاک کرنے سے پہلے انھیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔

**۱۳۰** – پہلے اس معاملے کا مثبت پہلو ارشاد ہُوا تھا کہ یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ ہے اور اسے روح الامین لے کر اترا ہے۔ اب اس کا منفی پہلو بیان کیا جا رہا ہے کہ اسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں، جیسا کہ حق کے دشمنوں کا الزام ہے۔ کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی، اس میں سب سے بڑی مشکل انھیں یہ پیش آ رہی تھی کہ اُس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آ رہا تھا اور دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بات تو ان کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کُن مسئلہ ان کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اِس گھبراہٹ میں جو الزامات انھوں نے عوام میں پھیلائے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین اِلقا کرتے ہیں۔ اس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کے پاس اس بات کو جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہوسکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان، اور شیطانی اِلقا کی تردید آخر کوئی کرے گا تو کیسے۔

**۱۳۱** – یعنی یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے بھی تو نہیں ہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں، جو قرآن میں بیان ہو رہی ہیں، شیاطین کی طرف سے بھی ہوسکتی ہیں؟ کیا تمھاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں، وہ تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعے سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بت پرستی سے روکا ہو؟

الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ

شامل ہو جاؤ گے۔[۱۳۴] اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ،[۱۳۵] اور ایمان لانے والوں میں سے

آخرت کی باز پُرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بد اخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راست بازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ ان کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انھیں بُرائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جُوئے میں کون سا داؤں مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فلاں شخص کا اونٹ کس نے چُرایا ہے؟ یہ مسائل اور معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور برائیوں کے اِستیصال کی کب سے فکر لاحق ہوگئی؟

۱۳۲ — یعنی شیاطین اگر کرنا چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلّم اور حقیقی مزکّی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی اگر یہ روپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چھُپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمّازی نہ کر دیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت لازماً اُس شخص کی زندگی میں بھی اور اُس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین اِلقا کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔ پھر تعلیم کی بلندی و پاکیزگی پر مزید وہ فصاحت و بلاغت اور وہ علم حقائق ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن میں بار بار یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ انسان اور جن مل کر بھی چاہیں تو اس کتاب کے مانند کوئی چیز تصنیف کر کے نہیں لا سکتے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل، آیت ۸۸) قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (یونس، آیت ۳۸)

۱۳۳ — یعنی اس قرآن کے القا میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سُن گُن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو بتا سکیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فُلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّافّات، حواشی ۵ تا ۷، اور سورہ جن، آیات ۸-۹-۲۷)

۱۳۴ — اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا کوئی خطرہ تھا اور اس بنا پر آپؐ کو دھمکا کر اس سے روکا گیا۔ دراصل اس سے مقصود کفار و مشرکین کو مُتنبّہ کرنا ہے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں

جو تعلیم پیش کی جا رہی ہے، یہ چونکہ خالص حق ہے فرماں روائے کائنات کی طرف سے، اور اس میں شیطانی آلایشوں کا ذرّہ برابر بھی دخل نہیں ہے، اس لیے یہاں حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ رُو رعایت کا کوئی کام نہیں۔ خدا کو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق میں کوئی عزیز و محبُوب ہو سکتا ہے تو وہ اس کا رسولِ پاک ہے۔ لیکن بالفرض اگر وہ بھی بندگی کی راہ سے بال برابر ہٹ جائے اور خدائے واحد کے سوا کسی اور کو معبود کی حیثیت سے پکار بیٹھے، تو پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ اس معاملے میں جب خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تو اور کون ہے جو خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک ٹھیرانے کے بعد یہ امید کر سکتا ہو کہ خود بچ نکلے گا یا کسی کے بچانے سے بچ جائے گا۔

**۱۳۵**- یعنی خدا کے اس بے لاگ دین میں جس طرح نبی کی ذات کے لیے کوئی رعایت نہیں، اسی طرح نبی کے خاندان اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی کسی رعایت کی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے، اس کے اوصاف (merits) کے لحاظ سے ہے۔ کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بدعملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں، مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں۔ اس لیے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف مُتنَبِّہ کر دو۔ اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آسکے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر رِوایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نُزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا بنی عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیة عمة رسول اللّٰه، یا فاطمة بنت محمد، انقذوا انفسکم من النار، فانی لا املك لکم من اللّٰه شیئًا، سلونی من مالی ما شئتم " اے بنی عبدالمُطَّلِب! اے عباس! اے صَفِیَّہ رسول اللہ کی پھوپھی! اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔" پھر آپؐ نے صبح سویرے صَفا کے سب سے اونچے مَقام پر کھڑے ہو کر پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو! اے بنی کَعب بن لُؤَیّ! اے بنی مُرَّہ! اے آلِ قُصَیّ! اے بنی عَبدِ مَناف! اے بنی عبدِ شمس! اے بنی ہاشم! اے آلِ عبدالمُطَّلِب!۔ اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپؐ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتا چل جاتا، وہ اِسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے، اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: "لوگو! اگر میں تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے، تو تم میری بات سچ مانو گے؟"

اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

جو لوگ تمھاری پیروی اختیار کریں، ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ، لیکن اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بَری الذّمّہ ہوں۔[۱۳۶]

سب نے کہا: ”ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔“ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اُٹھائے ہوئے آؤ۔ اُس وقت تم پکارو گے: ”یا محمدؐ!“ مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمھاری طرف سے منہ پھیرلوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمھارے ساتھ ہر طرح کی صلۂ رحمی کروں گا۔“ (اس مضمون کی متعدّد روایات بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ترمذی، نَسائی اور تفسیر ابنِ جَریر میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زُہَیرؓ بن عَمرو اور حضرت قَبیصہؓ بن مخارق سے مروی ہیں)۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا حکم آیا اور حضورؐ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی۔ دراصل اس میں جو اُصول واضح کیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہرِ قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے، نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو مُتنبّہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا، ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے، نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے، تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے۔ اِسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر عامل رہے۔ فتحِ مکہ کے روز جب آپؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اعلان کیا کہ کل ربا فی الجاهلية موضوع تحت قدمی هاتین واوّل ما اضعه ربا العباس۔ ” زمانہ جاہلیت کا ہر سود جو لوگوں کے ذمے تھا، میرے اِن قدموں تلے روند ڈالا گیا۔ اور سب سے پہلے جس سود کو میں ساقط کرتا ہوں، وہ میرے چچا عباسؓ کا ہے۔“ (واضح رہے کہ سُود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے حضرت عباسؓ سود پر روپیا چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سُود اُس وقت لوگوں کے ذمّے وصول طلب تھا)۔ ایک مرتبہ چوری کے جرم میں قریش کی ایک عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپؐ نے حکم دیا۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے اس کے حق میں سفارش کی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ”خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“

**۱۳۶** – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تمھارے رشتہ داروں میں سے جو لوگ ایمان لا کر

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴿٢١٩﴾ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ

اور اس زبردست اور رحیم پر توکّل کرو[137] جو تمھیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اُٹھتے ہو،[138] اور سجدہ گزار لوگوں میں تمھاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔[139] وہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔

لوگو! کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جَعْل ساز بدکار پر

---

تمھاری پیروی اختیار کریں، ان کے ساتھ نرمی اور مُلاطفت اور تواضُع کا رَوِیّہ اختیار کرو، اور جو تمھاری بات نہ مانیں، ان سے اعلانِ براءت کر دو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف اُن رشتہ داروں سے متعلق نہ ہو جنھیں مُتَنَبِّہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ سب کے لیے عام ہو۔ یعنی جو بھی ایمان لا کر تمھارا اتباع کرے اس کے ساتھ تواضع برتو، اور جو بھی تمھاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کر دو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذّمہ ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت قریش اور آس پاس کے اہلِ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے، مگر انھوں نے عملاً آپؐ کی پیروی اختیار نہ کی تھی، بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مل جُل کر اُسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ماننے والوں کو اُن اہلِ ایمان سے الگ قرار دیا جنھوں نے حضورؐ کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپؐ کا اتباع بھی اختیار کر لیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اِسی مؤخر الذکر گروہ کے لیے تھا۔ باقی رہے وہ لوگ جو حضورؐ کی فرمانبرداری سے منہ موڑے ہوئے تھے، جن میں آپؐ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے اور آپؐ کا انکار کر دینے والے بھی، ان کے متعلق حضورؐ کو ہدایت کی گئی کہ ان سے بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود بھگتو گے، تمھیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمھارے کسی فعل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

١٣٧ – یعنی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پروا نہ کرو اور اُس ذات کے بھروسے پر اپنا کام کیے چلے جاؤ جو زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ اُس کا زبردست ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جس کی پشت پر اس کی تائید ہو، اُسے دنیا میں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ اور اُس کا رحیم ہونا اس اطمینان کے لیے کافی ہے کہ جو شخص اس کی خاطر اعلائے کَلِمۃُ الحق کے کام میں جان لڑائے گا، اس کی کوششوں کو وہ کبھی رائگاں نہ جانے دے گا۔

١٣٨ – اُٹھنے سے مراد راتوں کو نماز کے لیے اُٹھنا بھی ہوسکتا ہے اور فریضۂ رسالت ادا کرنے کے لیے اُٹھنا بھی۔

اَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ

اُترا کرتے ہیں[140]۔ سُنی سُنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں[141]۔ رہے شُعَرا، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں[142]۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو

**۱۳۹**۔ اس سے کئی معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آپؐ جب نمازِ باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ اُٹھتے اور بیٹھتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں، اُس وقت اللہ تعالیٰ آپؐ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے جب راتوں کو اُٹھ کر آپؐ اپنے ساتھیوں کو (جن کے لیے ''سجدہ گزار'' کا لفظ امتیازی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے) دیکھتے پھرتے ہیں کہ وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں، اس وقت آپؐ اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس تمام دوڑ دھوپ اور تگ و دَو سے واقف ہے جو آپؐ اپنے سجدہ گزار ساتھیوں کی معیت میں اُس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کر رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ سجدہ گزار لوگوں کے گروہ میں آپؐ کے تمام تصرُّفات اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آپؐ کس طرح ان کی تربیت کر رہے ہیں، کیسا کچھ ان کا تزکیہ آپؐ نے کیا ہے اور کس طرح مِسِ خام کو کُندن بنا کر رکھ دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کی اِن صفات کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا گیا ہے، اس کا تعلق اُوپر کے مضمون سے بھی ہے اور آگے کے مضمون سے بھی۔ اُوپر کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ آپؐ حقیقت میں اللہ کی رحمت اور اس کی زبردست تائید کے مستحق ہیں، اس لیے کہ اللہ کوئی اندھا بہرا معبُود نہیں ہے، دیکھنے اور سننے والا فرماں روا ہے، اس کی راہ میں آپؐ کی دوڑ دھوپ اور اپنے سجدہ گزار ساتھیوں میں آپؐ کی سرگرمیاں، سب کچھ اس کی نگاہ میں ہیں۔ بعد کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی یہ کچھ ہو جیسی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور جس کے ساتھیوں کی صفات وہ کچھ ہوں جیسی کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، اس کے متعلق کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر شیاطین اترتے ہیں یا وہ شاعر ہے۔ شیطان جن کاہنوں پر اُترتے ہیں اور شعرا اور ان کے ساتھ لگے رہنے والوں کے جیسے کچھ رنگ ڈھنگ ہیں، وہ آخر کس سے پوشیدہ ہیں۔ تمھارے اپنے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے ہی جاتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھوں والا ایمان داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی زندگی میں اور شاعروں اور کاہنوں کی زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ اب یہ کیسی ڈھٹائی ہے کہ اِن خدا کے بندوں پر کھلّم کھلّا کہانت اور شاعری کی پھبتی کسی جاتی ہے اور کسی کو اس پر شرم بھی نہیں آتی۔

**۱۴۰**۔ مراد ہیں کاہن، جوتشی، فال گیر، رَمّال، اور ''عامل'' قسم کے لوگ جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں۔ گول مول لچھے دار باتیں بنا کر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں، یا سیانے بن کر جنّوں اور روحوں اور مؤکّلوں کے ذریعے سے لوگوں کی بگڑی بنانے کا کاروبار کرتے ہیں۔

۱۴۱ - اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ شیاطین کچھ سن گن لے کر اپنے اولیا پر اِلقا کرتے ہیں اور اس میں تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ بہت سا جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے لَپاٹیے کاہن شیاطین سے کچھ باتیں سُن لیتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ ملا کر لوگوں کے کانوں میں پھونکتے پھرتے ہیں۔ اس کی تشریح ایک حدیث میں بھی آئی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہؓ سے رِوایَت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کچھ نہیں ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! بعض اوقات تو وہ ٹھیک بات بتا دیتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: وہ ٹھیک بات جو ہوتی ہے اسے کبھی کبھار جِنّ لے اُڑتے ہیں اور جا کر اپنے دوست کے کان میں پھونک دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ جھوٹ کی بہت سی آمیزش کر کے ایک داستان بنا لیتا ہے۔

۱۴۲ - یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اَخلاق، عادات و خصائل اور اُفتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمھیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کُھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حُقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجے کی دیانت و امانت ہے۔ اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اِن لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زن بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سُخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہَزل بکا جا رہا ہے یا مَسخَرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہَجو اُڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹ کے ٹھٹ لگتے ہیں، اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں، ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رَو میں بہنے والے، اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہوسکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان

اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ

کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں[۱۴۳] اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں[۱۴۴] ـــــ بجز اُن لوگوں کے جو

نکل کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گرد جمع ہونے والے اُسی قبیل کے لوگ ہیں جیسے شعرا اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

۱۴۳ - یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صَرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا توسَنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے، اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے، جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صِدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں، اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سِفلی جذبات کا تَرشُّح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا، اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثَّریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انھیں ذرا تأمُّل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبّا لگانے اور اس کی عزّت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادّہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اَخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہَزل، قصیدہ اور ہَجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعرا کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو، اس کے دماغ میں آخر یہ بے تکی بات کیسے اُتر سکتی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تُلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے، اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مَقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسین، آیت ۶۹) ''ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے، نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے۔'' اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، وہ سب اسے جانتے تھے۔ معتبر رِوایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یاد نہ تھا۔ دَورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے، یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا:

کفی بالاسلام والشیب للمرء ناھیا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! اصل مصرع یوں ہے:

كفى الشيب والاسلام للمرء ناهيا

ایک مرتبہ عباسؓ بن مرداس سُلَمی سے آپؐ نے پوچھا: کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نهبي ونهب العبيد وبين الاقرع وعيينة

انھوں نے عرض کیا: آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے: بين عُيَيْنَةَ والاقرع۔

آپؐ نے فرمایا: معنیٰ میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: شعر سے بڑھ کر آپؐ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے: یا رسولؐ اللہ! یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپؐ فرماتے کہ ''بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔''

جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی، وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے، یا نسلی فخر وغرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں، اور مشرکانہ خُرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان يمتلئ جوف احدكم قيحا خير له من ان يمتلئ شعرًا۔ ''تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔'' تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی، آپؐ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان من الشعر لحكمة۔ ''بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔'' اُمَیَّہ بن ابی الصَّلْت کا کلام سن کر آپؐ نے فرمایا: اٰمن شعره وكفر قلبه۔ ''اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے۔'' ایک مرتبہ ایک صحابی نے سَو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپؐ کو سنائے اور آپؐ فرماتے گئے: ھیہ ''اور سناؤ۔''

۱۴۴ – یہ شاعروں کی ایک اور خُصوصیّت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپؐ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپؐ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپؐ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپؐ کے گردوپیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس شعرا کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں، اور کرنے کی اور۔ سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا۔ مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت وخودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص وطمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ ع

ع ۱۱ / ۳۲ / ۱۵

ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا[۱۴۵] ــــــ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔[۱۴۶] ع

**۱۴۵**۔ یہاں شعرا کی اُس عام مَذَمّت سے، جو اوپر بیان ہوئی، اُن شعرا کو مُستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خُصوصیّات کے حامل ہیں:

اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتابوں کو سچّے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اَخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی، اور اپنے کلام میں بھی۔ یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رِندی و ہوس ناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہیں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اُس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہَجو نہ کریں، نہ ذاتی یا نسلی وقومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گِھگیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیاز مندانہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اسی کے متعلق رِوایات میں آتا ہے کہ کفار و مشرکین کے شاعر، اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الزامات کا جو طوفان اُٹھاتے اور نفرت وعداوت کا جو زہر پھیلاتے تھے، اس کا جواب دینے کے لیے حضورؐ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ کَعبؓ بن مالک سے آپؐ نے فرمایا: **اهجهم فوالذی نفسی بیده لهو اشد علیهم من النبل**۔ ”ان کی

ہَجو کہو، کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمھارا شعران کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔''
حضرت حَسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اھجھم وجبریل معك، اور قل و روح القدس معك، ''ان کی خبرلو اور جبریل تمھارے ساتھ ہے۔'' ''کہو اور روح القدس تمھارے ساتھ ہے۔'' آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان المؤمن یجاھد بسیفہ ولسانہ ''مومن تلوار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی۔''

۱۴۶- ظلم کرنے والوں سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے سراسر ہٹ دھرمی کی راہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شاعری اور کہانت اور ساحری اور جُنون کی تہمتیں لگاتے پھرتے تھے، تاکہ ناواقف لوگ آپؐ کی دعوت سے بدگمان ہوں اور آپؐ کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دیں۔

# تفہیم القرآن

## النمل

(۲۷)

# النمل

**نام** دوسرے رُکوع کی چوتھی آیت میں وَادِ النَّمْلِ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ سورت جس میں النمل کا قصّہ مذکور ہے۔ یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔

**زمانہ نُزُول** مضمون اور اندازِ بیان مکہ کے دورِ متوسّط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس کی تائید رِوایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابنِ عباسؓ اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ ”پہلے سورۂ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص۔“

**موضوع اور مَباحِث** یہ سورت دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغازِ سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔ اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورت کے اختتام تک۔

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنھیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر مان لینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت و اتباع کا رَوِیَّہ اختیار کریں۔ لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے، وہ انکارِ آخرت ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمّہ دار، بندۂ نفس اور فریفتۂ حیاتِ دنیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اَخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں:

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قومِ ثمود اور سرکشانِ قومِ لوط کا ہے، جن کی سیرت فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجتاً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے اُن لوگوں کے دشمن ہو گئے جنھوں نے ان کو خیر و صلاح کی طرف بلایا۔ انھوں نے اپنی اُن بدکاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گِھناؤنا پن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انھیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے تک بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمانؑ کا ہے، جن کو خدا نے دولت، حکومت اور شوکت و حشمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حُضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انھیں احساس تھا کہ انھیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے جو تاریخِ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غُرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کرسکتا ہے، وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں درجے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اُس سے بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہوسکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہوگیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی، کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلّط نہ تھا۔ خدا کے حضور جواب دِہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

دوسرے خطبے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہور حقائق کی طرف اشارے کر کے کفارِ مکّہ سے پے درپے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اُس شرک کی شہادت دے رہے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اُس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اس قرآن میں تمھیں دی جا رہی ہے؟ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سُن کر بھی کچھ نہیں سنتے، وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے لیے زندگی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ کیونکہ جب ان کے نزدیک آخرکار سب کچھ مٹی ہو جانا ہے، اور حیاتِ دُنیا کی اس ساری تگ و دَو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے، تو آدمی کے لیے پھر حق اور باطل سب یکساں ہیں۔ اُس کے لیے اِس سوال میں سرے سے کوئی اہمیّت ہی نہیں رہتی کہ اُس کا نظامِ حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یاس نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہیں تو انھیں دعوت دینا بے کار ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مقصود سونے والوں کو جھنجوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے درپے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں، اس سے غفلت برتنے کے نتائج پر مُتنَبِّہ کریں، اور انھیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اُس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثّر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمھارے اپنے لیے نافع اور اسے ردّ کرنا تمھارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کروگے جن کے سامنے آجانے کے بعد مانے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا۔ اُس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

آیاتہا ۹۳ سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ

ط۔س۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبین[1] کی، ہدایت اور بشارت[2] اُن ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[3]، اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر

۱ – ''کتابِ مُّبِیۡن'' کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بالکل واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر ہے۔ جو کوئی اسے آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا کلام نہیں ہے۔

۲ – یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ ''ہدایت کرنے والی'' اور ''بشارت دینے والی'' کہنے کے بجائے انھیں بجائے خود ''ہدایت'' اور ''بشارت'' کہا گیا، جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے۔ جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کے بجائے مجسّم سخاوت اور حسین کہنے کے بجائے از سرتا پا حُسن کہیں۔

۳ – یعنی قرآنِ مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف اُنھی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام نیک کی خوش خبری بھی صرف انھی لوگوں کو دیتی ہیں جن میں دو خصوصیات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ ایمان لائیں۔ اور ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرلیں، خدائے واحد کو اپنا ایک ہی الٰہ اور ربّ مان لیں، قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کرلیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیِ برحق مان کر اپنا پیشوا بنالیں، اور یہ عقیدہ بھی اختیار کرلیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں ہم کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزائے اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ اِن چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لیے آمادہ ہوں۔ اور اس آمادگی کی اوّلین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کر دیں گے، انھی کو قرآن کی آیات دُنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی، اس راستے کے ہر مرحلے میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سمجھائیں گی، اس کے ہر موڑ پر انھیں غلط راہوں کی طرف جانے سے بچائیں گی، اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راست روی کے نتائج دُنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں، آخر کار ابدی اور دائمی فلاح اِسی کی بدولت انھیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔

يُوْقِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۴ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ

پُورا یقین رکھتے ہیں[4]۔ حقیقت یہ ہے کہ جولوگ آخرت کو نہیں مانتے، ان کے لیے ہم نے اُن کے کرتُوتوں کو خوش نُما بنادیا ہے، اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں[5]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بُری سزا ہے[6] اور

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک معلّم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے واقعی اس کی شاگردی قبول کر لے اور پھر اس کی ہِدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مریض کر سکتا ہے جو اسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور پرہیز وغیرہ کے معاملے میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اسی صورت میں معلّم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائجِ مطلوبہ حاصل ہوں گے۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ اَخلاق کی پاکیزگی اختیار کریں۔ لیکن قرآنِ مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد وہ زکوٰۃ ادا کرنا ہے جو نماز کے ساتھ اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ علاوہ بریں زکوٰۃ کے لیے اِيْتَاءَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو زکوٰۃِ مال ادا کرنے کے معنی متعین کر دیتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں پاکیزگی اختیار کرنے کے لیے تَزَكّٰی کا لفظ بولا جاتا ہے، نہ کہ ایتائے زکوٰۃ۔ دراصل یہاں جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت واتباع کا رَوِیّہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے، اور اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ وہ پہلی علامت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آدمی نے واقعی اطاعت قبول کر لی ہے۔ یہ علامت جہاں غائب ہوئی، وہاں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی سرکش ہے، حاکم کو حاکم چاہے اس نے مان لیا ہو، مگر حکم کی پیروی کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

۴ – اگرچہ آخرت کا عقیدہ ایمانیات میں شامل ہے، اور اس بنا پر ''ایمان لانے والوں'' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو توحید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیات کے ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں، ان کے لیے اِس قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیارِ خیر وشر صرف اُنھی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اِس دُنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت و ہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اُخروی کو سود و زِیاں اور نفع ونقصان کا معیار قرار دے کر خیر وشر کا تعیُّن کرتی ہو۔ ایسے لوگ اوّل تو انبیا علیہم السلام کی تعلیم پر کان ہی نہیں دھرتے، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو بھی جائیں تو آخرت کا یقین نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ایمان واسلام کے راستے پر ایک قدم چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس راہ میں پہلی ہی آزمایش جب پیش آئے گی، جہاں دُنیوی

فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝۵ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ

آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اے محمدؐ!) بلاشبہ تم یہ قرآن

فائدے اور اُخروی نقصان کے تقاضے انھیں دو مختلف سَمتوں میں کھینچیں گے تو وہ بے تکلّف دنیا کے فائدے کی طرف کھنچ جائیں گے اور آخرت کے نقصان کی ذرّہ برابر پروا نہ کریں گے، خواہ زبان سے وہ ایمان کے کتنے ہی دعوے کرتے رہیں۔

۵ – یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی فطری مَنْطِق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی وعمل کے نتائج کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھے گا، جب وہ کسی ایسی عدالت کا قائل نہ ہوگا جہاں انسان کے پورے کارنامۂ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حُسن وقُبح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جانے والا ہو، اور جب وہ موت کے بعد کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہوگا جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر وقیمت کے مطابق ٹھیک ٹھیک جزا وسزا دی جانے والی ہو، تو لازماً اس کے اندر ایک مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر نَشْوونَما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بداخلاقی کی ساری بحثیں سراسر بے معنٰی نظر آئیں گی۔ جو کچھ اُسے اِس دنیا میں لذت وعیش اور مادّی ترقی وخوش حالی اور قوت واقتدار تک ہم کنار کرے، وہی اس کے نزدیک بھلائی ہوگی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی طرزِ زندگی اور نظامِ اخلاق ہو۔ اس کو حقیقت اور صداقت سے دراصل کوئی غرض ہی نہ ہوگی۔ اس کی اصل مطلوب صرف حیاتِ دنیا کی زینتیں اور کامرانیاں ہوں گی، جن کے حصول کی فکر اسے ہر وادی میں لیے بھٹکتی پھرے گی۔ اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا، اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا، اور اُلٹا اُن لوگوں کو بے وقوف سمجھے گا جو اُس کی طرح دنیا طلبی میں منہمک نہیں ہیں اور اخلاق و بداخلاقی سے بے نیاز ہوکر ہر کام کرگزرنے میں بے باک نہیں ہیں۔

کسی کے اعمالِ بد کو اس کے لیے خوش نما بنا دینے کا یہ فعل قرآنِ مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہُوا، یہ ہوتی ہے کہ جو شخص یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، اسے فطرتاً زندگی کا یہی ہنجار خوش آیند محسوس ہوتا ہے۔ اور جب یہ فعل شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اختیار کرنے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی جنت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش برخوردار! بہت اچھے جارہے ہو۔

۶ – اس بُری سزا کی صورت، وقت اور جگہ کا تعیُّن نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس دنیا میں بھی مختلف افراد، گروہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عین موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالمِ برزخ میں بھی اس سے آدمی دوچار ہوتا ہے،

لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۞ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۞

ایک حکیم وعلیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔[7]

(انھیں اُس وقت کا قصّہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا[8] کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں، یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں، تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو۔"

---

اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا جو پھر کہیں جا کر ختم نہ ہو گا۔

۷ – یعنی یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جا رہی ہیں، اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس ورائے پر مبنی ہیں، بلکہ انھیں ایک حکیم وعلیم ذات اِلقا کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی وحال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدابیر اختیار کرتی ہے۔

۸ – یہ اُس وقت کا قصّہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مَدیَن میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر کوئی ٹھکانا تلاش کرنے جا رہے تھے۔ مَدیَن کا علاقہ خلیجِ عَقَبہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے سواحل پر واقع تھا۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۱۵) وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اُس مَقام پر پہنچے جو اَب کوہِ سینا اور جبلِ موسیٰؑ کہلاتا ہے اور نزولِ قرآن کے زمانے میں طُور کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

یہاں جو قصّہ بیان کیا جا رہا ہے، اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورۂ طٰہٰ (رکوع ۱) میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

۹ – فَحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انھیں کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کون سی بستی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کدھر کدھر راستے جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے جن سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو کم از کم میں کچھ انگارے ہی لے آؤں گا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل کر سکو۔

یہ مَقام جہاں حضرت موسیٰؑ نے جھاڑی میں آگ لگی ہوئی دیکھی تھی، کوہِ طُور کے دامن میں سطحِ سمندر سے تقریباً ۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں رومی سلطنت کے پہلے عیسائی بادشاہ قُسطَنطین نے ۳۶۵ء کے لگ بھگ

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹

وہاں جو پہنچا تو ندا آئی[10] کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اِس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ، سب جہان والوں کا پروردگار[11]۔ اے موسیٰؑ! یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔

زمانے میں ٹھیک اُس مقام پر ایک کنیسہ تعمیر کرا دیا تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے دو سو برس بعد قیصر جسٹینین نے یہاں ایک دیر (Monastery) تعمیر کرایا جس کے اندر قُسطَنطِین کے بنائے ہوئے کنیسہ کو بھی شامل کرلیا۔ یہ دَیر اور کنیسہ دونوں آج تک موجود ہیں اور یونانی کلیسا (Greek Orthodox Church) کے راہبوں کا ان پر قبضہ ہے۔ میں نے جنوری ۱۹۶۰ء میں اس مقام کی زیارت کی ہے۔ مقابل کے صفحے پر اس مقام کی کچھ تصاویر مُلاحظہ ہوں۔

۱۰- سورۂ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ۔ اس سے جو صورتِ معاملہ سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اُٹھ رہا تھا، اور اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جس پر سے یکایک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔

یہ ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو غارِ حرا کی تنہائی میں یکایک ایک فرشتہ آیا اور اس نے اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص سفر کرتا ہُوا ایک جگہ ٹھیرا ہے، دُور سے آگ دیکھ کر راستہ پوچھنے یا انگارا چننے کی غرض سے آتا ہے اور یکلخت اللہ رب العالمین کی ہر قیاس وگمان سے بالا ذات اس سے مخاطب ہو جاتی ہے۔ ان مواقع پر درحقیقت ایک ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیا علیہم السلام کے نفس میں بھی موجود ہوتی ہے جس کی بنا پر انھیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی جِنّ یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ اُن کے حواس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوندِ عالَم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہم کلام ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: النجم، حاشیہ ۱۰)

۱۱- اس موقع پر "سبحان اللہ" ارشاد فرمانے سے دراصل حضرت موسیٰؑ کو اس بات پر مُتَنَبِّہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجے تنزیہ کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ ربّ العالمین اس درخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نورِ مُطلَق تمھاری بینائی کے حُدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدودیتوں سے پاک اور مُنزّہ ہوتے ہوئے وہ بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔

وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ

اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی۔" جُونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بَل کھا رہی ہے[۱۲] تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ "اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ میرے حُضور رسول ڈرا نہیں کرتے[۱۳]، اِلّا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو[۱۴]۔ پھر اگر بُرائی کے بعد اُس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں[۱۵]۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان

۱۲ – سورۂ اَعراف اور سورۂ شعراء میں اس کے لیے ثُعبان (اژدہے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور یہاں اسے "جانّ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اژدہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہُوم کو سورۂ طٰہٰ میں حَيَّةٌ تَسْعٰى (دوڑتے ہوئے سانپ) کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۱۳ – یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصبِ عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اس لیے خواہ کیسا ہی کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آئے، رسول کو بے خوف اور مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس کے لیے وہ کسی طرح ضرر رساں نہ ہو گا۔

۱۴ – یہ اِستثنا متصل بھی ہوسکتا ہے اور منقطع بھی۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خوف کی معقول وجہ اگر ہوسکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے، جب تک کہ آدمی قصوروار نہ ہو۔

۱۵ – یعنی قصور کرنے والا بھی اگر توبہ کر کے اپنے رَوِیّے کی اصلاح کرلے اور بُرے عمل کے بجائے نیک عمل کرنے لگے تو میرے ہاں اس کے لیے عفوو درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نادانستگی میں ایک قِبطی کو قتل کر کے مصر سے نکلے تھے۔ یہ ایک قصور تھا جس کی طرف لطیف اشارہ فرما دیا گیا۔ پھر جس وقت یہ قصور اچانک بلا ارادہ ان سے سرزد ہوا تھا، اس کے بعد فوراً ہی انھوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی کہ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ۔ (اے پروردگار! میں اپنے

جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

میں تو ڈالو۔ چمکتا ہُوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے[16])، وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔"

مگر جب ہماری کُھلی کُھلی نشانیاں اُن لوگوں کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کُھلا جادُو ہے۔ انھوں نے سراسر ظلم اور غُرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا، حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے[17]۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ ع

نفس پر ظلم کر گزرا، مجھے معاف فرما دے!) اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انھیں معاف بھی فرما دیا تھا، فَغَفَرَ لَهٗ (القصص، آیت ۱۶)، اب یہاں اُسی معافی کی بشارت انھیں دی گئی ہے۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰؑ! میرے حضور تمھارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمھارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اِس وقت میں نے تمھیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دے کر میں تمھیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

۱۶ — سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نو نشانیاں (تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ) عطا فرمائی تھیں۔ اور سورۂ اعراف میں ان کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے: (۱) لاٹھی جو اژدہا بن جاتی تھی۔ (۲) ہاتھ جو بغل سے سورج کی طرح چمکتا ہُوا نکلتا تھا۔ (۳) جادُوگروں کو برسرِ عام شکست دینا۔ (۴) حضرت موسیٰؑ کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط۔ (۵) طوفان۔ (۶) ٹڈّی دَل۔ (۷) تمام غلّے کے ذخیروں میں سُرسُریاں اور انسان وحیوان سب میں جوئیں۔ (۸) مینڈکوں کا طوفان۔ (۹) اور خون۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الزُّخرُف، حاشیہ ۴۳)

۱۷ — قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بَلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰؑ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلوا دو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تُل جاتا تھا۔ (الاعراف، آیت ۱۳۴۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ

(دُوسری طرف) ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم عطا کیا[18] اور اُنھوں نے کہا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔[19] اور داؤدؑ کا وارث سلیمانؑ[20] ہوا۔

الزُّخرُف، آیت ۴۹-۵۰) بائبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ (خُروج، باب ۸ تا ۱۰) اور ویسے بھی یہ بات کسی طرح تصوُّر میں نہ آسکتی تھی کہ ایک پورے ملک پر قحط اور طوفان اور ٹڈّی دَلوں کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سُرسُریوں کے بے شمار لشکروں کا اُمنڈ آنا کسی جادو کا کرشمہ ہوسکتا ہے۔ یہ ایسے کُھلے ہوئے معجزے تھے جن کو دیکھ کر ایک بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ پیغمبر کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کے کہنے پر ان کا دُور ہوجانا صرف اللہ ربّ العالمین ہی کے تصرُّف کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "تو خوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مالکِ زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں۔" (بنی اسرائیل، آیت ۱۰۲) لیکن جس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے جان بُوجھ کر ان کا انکار کیا، وہ یہ تھی کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں، حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے؟" (المومنون، آیت ۴۷)

۱۸ - یعنی حقیقت کا علم۔ اِس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عَطِیّہ ہے، اور اُس پر تصرُّف کرنے کے جو اختیارات بھی ان کو بخشے گئے ہیں، انھیں اللہ ہی کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے، اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انھیں مالکِ حقیقی کے حضور جواب دِہی کرنی ہے۔ یہ علم اُس جَہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اُس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی، اس کا نمونہ اُوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔ بادشاہی، دولت، حَشمت، طاقت، دونوں طرف یکساں ہے۔ فرعون کو بھی یہ ملی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بھی۔ لیکن جَہالت اور علم کے فرق نے ان کے درمیان کتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا۔

۱۹ - یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ ہماری کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مُملکت کی فرمانروائی کے لیے منتخب فرمایا۔

۲۰ - وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوئی بھی ہو تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ حضرت داؤدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اُس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جاسکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لا نورث ما ترکنا صدقة، "ہم انبیاؑ کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا

وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ

اور اس نے کہا: ”لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں[21] اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں،[22] بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔“ سلیمانؑ کے لیے جِنّ اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے[23] اور

وہ صدقہ ہے۔“ (بخاری، کتاب فرض الخمس) اور ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین۔ ”نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا، جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقرا اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔“ (مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابوبکر صدیقؓ، حدیث ٦٠ و ٧٨)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عِبرانی نام سولومون تھا جو ”سلیم“ کا ہم معنیٰ ہے۔ ٩٦۵ قبلِ مسیح میں حضرت داؤدؑ کے جانشین ہوئے اور ٩٢٦ ق م تک تقریباً ۴٠ سال فرماں روا رہے۔ (ان کے حالات کی تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ٧۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ٧۴-٧۵) ان کے حُدودِ سلطنت کے متعلق ہمارے مفسّرین نے بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ وہ انھیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمراں بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف موجودہ فلسطین وشرقِ اُردُن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصّہ بھی اس میں شامل تھا۔ (مُلاحظہ ہو: نقشۂ مُلکِ سلیمان، تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ٨٩۵)

**٢١** – بائبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی رِوایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ١١، ص ۴٣٩)

**٢٢** – یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اس بات کو لفظی معنوں میں لینا دُرست نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے۔ یہ بات حضرت سلیمانؑ نے فخریہ نہیں فرمائی تھی، بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی عطا و بخشش کا شکریہ ادا کرنا مقصود تھا۔

**٢٣** – بائبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جِنّ حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھے اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تَلمُود اور رِبّیوں کی روایات میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ١١، صفحہ ۴۴٠) موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جِنّ اور طَیر سے مراد جِنّات اور پرندے نہیں ہیں، بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں مختلف کام کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جِنّ سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنھیں حضرت سلیمانؑ نے مسخّر کیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے۔ اور طَیر سے مراد گھوڑسواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ لیکن یہ قرآنِ مجید میں بے جا تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جِنّ، اِنس اور طَیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے، اور تینوں پر الف ل تعریفِ جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ اَلْجِنّ اور اَلطَّیْر،

فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰىٓ اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

---

وہ پُورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کُوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ”اے چیونٹیو! اپنے بِلوں میں گُھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمھیں کُچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔“[۲۴]

---

الْاِنس میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرّہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجِنّ بول کر انسانوں کا کوئی گروہ، یا محض الطَّیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے، اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنیٰ سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادت کام کی وجہ سے جنّ، یا کسی عورت کو اس کے حُسن کی وجہ سے پری، اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اب جنّ کے معنیٰ طاقت ور آدمی اور پری کے معنیٰ حسین عورت، اور پرندے کے معنیٰ تیز رفتار انسان ہی کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنیٰ تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی، اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنیٰ چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اُسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اُسی وقت لے سکتے ہیں جب کہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ یہاں آخر کون سا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لُغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؟ بلکہ آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے، وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف معنیٰ پر صریح دلالت کر رہا ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی اَخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنیٰ پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے، حالانکہ دراصل قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔

۲۴ - اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسّرین نے تاویل کے خرّاد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملۃ کے معنیٰ ایک چیونٹی کے نہیں بلکہ یہ ایک قبیلے کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”جب حضرت سلیمانؑ وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اے قبیلۂ نمل کے لوگو......“۔ لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض وادی النمل کو اُس وادی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ

رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔ اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کَلْب، اَسَد وغیرہ۔ لیکن کوئی عرب قبیلۂ کَلْب کے کسی فرد کے متعلق قَالَ کَلْب (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلۂ اَسَد کے کسی شخص کے متعلق قَالَ اَسَدٌ (ایک شیر نے کہا) ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لیے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قَالَتْ نَمْلَةٌ (ایک چیونٹی یہ بولی) قطعاً عربی محاورہ واستعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ ''اے نملیو! اپنے گھروں میں گُھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو'' بالکل بے معنٰی ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کُچلا کرتا۔ اگر وہ اُن پر حملے کی نیّت سے آیا ہو تو اُن کا اپنے گھروں میں گُھس جانا لاحاصل ہے۔ حملہ آور اُن کے گھروں میں گُھس کر انھیں اور زیادہ اچھی طرح کُچلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہُوا گزر رہا ہو تو اس کے لیے بس راستہ صاف چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں آ کر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کچل ڈالیں۔ لہٰذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ ''اے نملیو! بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو، تاکہ سلیمان کے لشکر تمھیں تباہ نہ کر دیں۔'' اور حملے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں وہ کہتا کہ ''اے نملیو! راستے سے ہٹ جاؤ، تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمانؑ کے لشکروں کی جھپیٹ میں نہ آ جائے۔''

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمونِ عبارت کے اعتبار سے ہے۔ رہی یہ بات کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا، اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کے لیے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے، انھوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قَتَادَہ اور مُقاتِل کہتے ہیں کہ واد بارض الشامِ کثیر النمل ''وہ ایک وادی ہے سرزمینِ شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں۔'' لیکن تاریخ وجغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اس وادی میں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ بھی رہتا تھا۔ یہ صرف ایک من گھڑت ہے جو اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لیے وضع کر لی گئی ہے۔

بنی اسرائیل کی رِوایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے، مگر اس کا آخری حصّہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت سلیمانؑ کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جب ایک وادی سے گزر رہے تھے جس میں چیونٹیاں بہت تھیں تو انھوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ ''اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، ورنہ سلیمانؑ کے لشکر تمھیں کچل ڈالیں گے۔'' اس پر حضرت سلیمانؑ نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبّر کا اظہار کیا اور جواب میں اس چیونٹی نے ان سے کہا کہ تمھاری حقیقت کیا ہے، ایک حقیر بُوند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔ یہ سن کر حضرت سلیمانؑ شرمندہ ہو گئے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۴۰) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کس طرح بنی اسرائیل کی غلط رِوایات کی تصحیح کرتا ہے اور ان گندگیوں کو صاف کرتا ہے جو انھوں نے خود اپنے پیغمبروں کی

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

سلیمانؑ اس کی بات پر مُسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا —— ”اے میرے رب! مجھے قابو میں[۲۵] رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عملِ صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر[۲۶]۔“

سیرتوں پر ڈال دی تھیں۔ اِن روایات کے متعلق مغربی مُستَشرِقین بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے سب کچھ ان سے سرقہ کر لیا ہے۔

عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بِلوں میں گُھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کی بات کیسے سُن لی، تو جس شخص کے حواس کلامِ وحی جیسی لطیف چیز کا اِدراک کر سکتے ہوں، اس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (crude) چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

**۲۵ –** اصل الفاظ ہیں: رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ۔ وزع کے اصل معنیٰ عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (مجھے روک کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں) ہمارے نزدیک دراصل یہ معنیٰ دیتا ہے کہ اے میرے رب! جو عظیم الشان قوتیں اور قابلیتیں تو نے مجھے دی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ اگر میں ذرا سی غفلت میں بھی مبتلا ہو جاؤں تو حدِّ بندگی سے خارج ہو کر اپنی کبریائی کے خَبط میں نہ معلوم کہاں سے کہاں نکل جاؤں۔ اس لیے اے میرے پروردگار! تو مجھے قابو میں رکھ، تاکہ میں کافرِ نعمت بننے کے بجائے شکرِ نعمت پر قائم رہوں۔

**۲۶ –** صالح بندوں میں داخل کرنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ آخرت میں میرا انجام صالح بندوں کے ساتھ ہو اور میں ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے کہ آدمی جب عملِ صالح کرے گا تو صالح تو وہ آپ سے آپ ہو گا ہی، البتہ آخرت میں کسی کا جنت میں داخل ہونا محض اس کے عملِ صالح کے بل بُوتے پر نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لن یدخل احدکم الجنۃ عملہ ”تم میں سے کسی کو بھی محض اس کا عمل جنت میں نہیں پہنچا دے گا۔“ عرض کیا گیا کہ ولا انت یا رسول اللہ ”کیا حضورؐ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے؟“

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾

(ایک اور موقع پر) سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ[۲۷] لیا اور کہا: ”کیا بات ہے کہ مَیں فُلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا، یا ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی[۲۸] ہو گی۔“

فرمایا: ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ تعالٰی برحمتہ۔ ”ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے بل بُوتے پر جنت میں نہ چلا جاؤں گا جب تک اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نہ ڈھانک لے۔“

حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا اس موقع پر بالکل بے محل ہو جاتی ہے اگر النَّمْلُ سے مراد انسانوں کا کوئی قبیلہ لے لیا جائے اور نملۃ کے معنی قبیلۂ نمل کے ایک فرد کے لے لیے جائیں۔ ایک بادشاہ کے لشکرِ جرار سے ڈر کر کسی انسانی قبیلے کے ایک فرد کا اپنے قبیلے کو خطرے سے خبردار کرنا آخر کون سی ایسی غیر معمولی بات ہے کہ وہ جلیل القدر بادشاہ اس پر خدا سے یہ دعا کرنے لگے۔ البتہ ایک شخص کو اتنی زبردست قوت ادراک حاصل ہونا کہ وہ دُور سے ایک چیونٹی کی آواز بھی سُن لے اور اس کا مطلب سمجھ جائے، ضرور ایسی بات ہے جس سے آدمی کے غرورِ نفس میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اِسی صورت میں حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا برمحل ہو سکتی ہے۔

۲۷ – یعنی اُن پرندوں کا جن کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جنّ اور اِنس کی طرح ان کے لشکر بھی حضرت سلیمانؑ کے عساکر میں شامل تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان سے خبر رسانی، شکار اور اسی طرح کے دوسرے کام لیتے ہوں۔

۲۸ – موجودہ زمانے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہُدہُد سے مراد وہ پرندہ نہیں ہے جو عربی اور اُردو زبان میں اس نام سے معروف ہے، بلکہ یہ ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت سلیمانؑ کی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس دعوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ تاریخ میں کہیں ہُدہُد نام کا کوئی شخص اِن حضرات کو سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے افسروں کی فہرست میں مل گیا ہے، بلکہ یہ عمارت صرف اس اِستدلال پر کھڑی کی گئی ہے کہ جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام رکھنے کا رواج تمام زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی تھا۔ نیز یہ کہ آگے اس ہُدہُد کا جو کام بیان کیا گیا ہے اور حضرت سلیمانؑ سے اس کی گفتگو کا جو ذکر ہے، وہ ان کے نزدیک صرف ایک انسان ہی کر سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کے سِیاقِ کلام کو آدمی دیکھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی تحریف، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر اس کی تغلیط ہے۔ آخر قرآن کو انسان کی عقل و خرد سے کیا دشمنی ہے کہ وہ کہنا تو یہ چاہتا ہو کہ حضرت سلیمانؑ کے رسالے

یا پلٹن یا محکمۂ خبر رسانی کا ایک آدمی غائب تھا جسے انھوں نے تلاش کیا اور اس نے حاضر ہو کر یہ خبر دی اور اسے حضرتِ موصوف نے اِس خدمت پر بھیجا، لیکن اسے وہ مسلسل ایسی چیستان کی زبان میں بیان کرے کہ پڑھنے والا اوّل سے لے کر آخر تک اسے پرندہ ہی سمجھنے پر مجبور ہو۔ اس سلسلے میں ذرا قرآنِ مجید کے بیان کی ترتیب مُلاحظہ فرمائیے:

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس فضل پر اظہارِ اِمتنان کیا کہ ''ہمیں مَنْطِقُ الطَّیر کا علم دیا گیا ہے۔'' اس فقرے میں اوّل تو طَیر کا لفظ مُطلَق ہے جسے ہر عرب اور عربی دان پرندے ہی کے معنیٰ میں لے گا۔ کیونکہ کوئی قرینہ اس کے استعارہ و مجاز ہونے پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے، اگر طَیر سے مراد پرند نہیں بلکہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو تو اس کے لیے مَنْطِق (بولی) کے بجائے لُغت یا لِسان (یعنی زبان) کا لفظ زیادہ صحیح ہوتا۔ اور پھر کسی شخص کا کسی دوسرے انسانی گروہ کی زبان جاننا کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے کہ وہ خاص طور پر اس کا ذکر کرے۔ آج ہمارے درمیان ہزارہا آدمی بہت سی غیر زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ یہ آخر کون سا بڑا کمال ہے جسے اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی عَطِیّہ قرار دیا جا سکے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس فضل پر اظہار امتنان کیا کہ ''ہمیں مَنطِق الطیر کا علم دیا اوّل تو جِنّ اور اِنس اور طَیر، تین معروف اسمائے جنس استعمال ہوئے ہیں، جو تین مختلف اور معلوم اجناس کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ پھر انھیں مُطْلَق استعمال کیا گیا ہے اور کوئی قرینہ ان میں سے کسی کے استعارہ و مجاز یا تشبیہ ہونے کا موجود نہیں ہے، جس سے ایک آدمی لغت کے معروف معنوں کے سوا کسی اور معنیٰ میں انھیں لے۔ پھر اِنس کا لفظ جنّ اور طَیر کے درمیان آیا ہے جو یہ معنیٰ لینے میں صریحاً مانع ہے کہ جنّ اور طَیر دراصل اِنس ہی کی جنس کے دو گروہ تھے۔ یہ معنیٰ مراد ہوتے تو اَلْجِنِّ وَالطَّیْرِ مِنَ الْاِنْسِ کہا جاتا، نہ کہ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ طَیر کا جائزہ لے رہے تھے اور ہُدہُد کو غائب دیکھ کر انھوں نے یہ بات فرمائی۔ اگر یہ طَیر انسان تھے اور ہُدہُد بھی کسی آدمی کا نام ہی تھا تو کم از کم کوئی لفظ تو ایسا کہہ دیا جاتا کہ بے چارہ پڑھنے والا اس کو جانور نہ سمجھ بیٹھتا۔ گروہ کا نام پرندہ اور اس کے ایک فرد کا نام ہُدہُد، پھر بھی ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم آپ سے آپ اسے انسان سمجھ لیں گے۔

پھر حضرت سلیمانؑ فرماتے ہیں کہ ہُدہُد یا تو اپنے غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بیان کرے ورنہ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذَبح کر دوں گا۔ انسان کو قتل کیا جاتا ہے، پھانسی دی جاتی ہے، سزائے موت دی جاتی ہے، ذبح کون کرتا ہے؟ کوئی بڑا ہی سنگدل اور بے درد آدمی جوشِ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو تو شاید کسی آدمی کو ذبح بھی کر دے، مگر کیا پیغمبر سے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اپنی فوج کے ایک آدمی کو محض غیر حاضر (deserter) ہونے کے جرم میں ذبح کر دینے کا اعلان کرے گا، اور اللہ میاں سے یہ حُسنِ ظن رکھیں کہ وہ ایسی سنگین بات کا ذکر کر کے اس پر مذمّت کا ایک لفظ بھی نہ فرمائیں گے؟

کچھ دُور آگے چل کر ابھی آپ دیکھیں گے کہ حضرت سلیمانؑ اسی ہُدہُد کو ملکۂ سبا کے نام خط دے کر بھیجتے ہیں

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اُس نے آ کر کہا: ”میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سَبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں[29]۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے۔ اُس کو ہر طرح کا سرو سامان بخشا گیا ہے اور اُس کا تخت بڑا

اور فرماتے ہیں کہ اسے ان کی طرف ڈال دے یا پھینک دے (اَلْقِهْ اِلَیْهِمْ)۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت پرندے کو تو دی جاسکتی ہے لیکن کسی آدمی کو سفیر یا ایلچی یا قاصد بنا کر بھیجنے کی صورت میں یہ انتہائی غیر موزوں ہے۔ کسی کی عقل ہی خبط ہو گئی ہو تو وہ مان لے گا کہ ایک ملک کا بادشاہ دوسرے ملک کی ملکہ کے نام خط دے کر اپنے سفیر کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج سکتا ہے کہ اسے لے جا کر اس کے آگے ڈال دے، یا اس کی طرف پھینک دے۔ کیا تہذیب و شائستگی کے اُس ابتدائی مرتبے سے بھی حضرت سلیمانؑ کو گرا ہُوا فرض کر لیا جائے جس کا لحاظ ہم جیسے معمولی لوگ بھی اپنے کسی ہمسایے کے پاس اپنے ملازم کو بھیجتے ہوئے ملحوظ رکھتے ہیں؟ کیا کوئی شریف آدمی اپنے ملازم سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ خط لے جا کر فلاں صاحب کے آگے پھینک آ؟

یہ تمام قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں ہُدہُد کا مفہُوم وہی ہے جو ازرُوئے لُغت اس لفظ کا مفہوم ہے، یعنی یہ کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک پرندہ تھا۔ اب اگر کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ایک ہُدہُد وہ باتیں کر سکتا ہے جو قرآن اس کی طرف منسوب کر رہا ہے تو اسے صاف صاف کہنا چاہیے کہ میں قرآن کی اس بات کو نہیں مانتا۔ اپنے عَدمِ ایمان کو اس پردے میں چھپانا کہ قرآن کے صاف اور صریح الفاظ میں اپنے من مانے معنیٰ بھرے جائیں، گھٹیا درجے کی منافقت ہے۔

**۲۹** - سَبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مآرِب، موجودہ یمن کے دارالسلطنت صَنعاء سے ۵۵ میل بجانبِ شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانۂ عروج مَعِین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ۱۱۵ ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حِمیَر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حَضرَموت، اور افریقا میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ مشرقی افریقا، ہندوستان، مشرقِ بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی، وہ زیادہ تر انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانے میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مال دار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوش حالی کا

عَظِيْمٌ ۝٢٣ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝٢٤ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ[30] کرتی ہے"۔۔۔۔شیطان[31] نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نُما بنا دیے[32] اور انھیں شاہراہ سے روک دیا، اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اُس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا

بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظامِ آب پاشی قائم کر رکھا تھا، جس سے اُن کا پورا علاقہ جنت بنا ہُوا تھا۔ اُن کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مورخین نے بھی کیا ہے اور سورۂ سبا کے دوسرے رُکوع میں قرآنِ مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہُدہُد کا یہ بیان کہ "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں" یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ حضرت سلیمانؑ سَبا سے بالکل ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ فلسطین و شام کے جس فرمانروا کی سلطنت بحرِ احمر کے شمالی کنارے (خلیجِ عَقَبہ) تک پہنچی ہوئی تھی، وہ اسی بحرِ احمر کے جنوبی کنارے (یمن) کی ایک ایسی قوم سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا جو بین الاقوامی تجارت کے ایک اہم حصّے پر قابض تھی۔ علاوہ ازیں زَبور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے بھی پہلے اُن کے والد ماجد حضرت داؤدؑ سَبا سے واقف تھے۔ اُن کی دُعا کے یہ الفاظ زَبور میں ہمیں ملتے ہیں:

"اے خدا! بادشاہ (یعنی خود حضرت داؤدؑ) کو اپنے احکام اور شاہزادے (یعنی حضرت سلیمانؑ) کو اپنی صداقت عطا فرما......ترسیس اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے۔ سبا اور شیبا (یعنی سبا کی یمنی اور حبشی شاخوں) کے بادشاہ ہدیے لائیں گے۔" (۷۲: ۱ و ۱۰)

اس لیے ہُدہُد کے قول کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ سبا کے مرکز میں جو چشم دید حالات میں دیکھ کر آیا ہوں، وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچے ہیں۔

**۳۰**۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اس زمانے میں آفتاب پرستی کے مذہب کی پیرو تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابنِ اسحاق علمائے انساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورثِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبدِ شمس (بندۂ آفتاب یا سورج کا پرستار) اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ ہُدہُد جب حضرت سلیمانؑ کا خط لے کر پہنچا تو ملکۂ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں وہ خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا۔

السجدۃ ۸

وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة

ہے[۳۳] اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔[۳۴] اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرشِ عظیم کا مالک ہے۔[۳۵]

**۳۱۔** اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر پیراگراف تک کی عبارت ہُدہُد کے کلام کا جز نہیں ہے بلکہ ''سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے'' پر اس کی بات ختم ہوگئی اور اس کے بعد اب یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بطورِ اضافہ ہے۔ اس قیاس کو جو چیز تقویت دیتی ہے، وہ یہ فقرہ ہے: وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ''اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔'' ان الفاظ سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ متکلم ہُدہُد اور مخاطَب حضرت سلیمانؑ اور ان کے اہلِ دربار نہیں ہیں، بلکہ متکلّم اللہ تعالیٰ اور مخاطَب مشرکینِ مکہ ہیں، جن کو نصیحت کرنے ہی کے لیے یہ قصّہ سنایا جا رہا ہے۔ مفسرین میں سے علّامۂ آلُوسی، صاحبِ روح المعانی بھی اسی قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

**۳۲۔** یعنی دُنیا کی دولت کمانے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ شان دار بنانے کے جس کام میں وہ منہمک تھے، شیطان نے اُن کو سُجھا دیا کہ بس یہی عقل وفکر کا ایک مَصرَف اور قُوائے ذہنی وجسمانی کا ایک استعمال ہے، اس سے زیادہ کسی چیز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے کہ تم خواہ مخواہ اِس فکر میں پڑو کہ اس ظاہرِ حیاتِ دُنیا کے پیچھے حقیقتِ واقعیہ کیا ہے اور تمھارے مذہب، اَخلاق، تہذیب اور نظامِ حیات کی بنیادیں اُس حقیقت سے مطابقت رکھتی ہیں یا سراسر اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ شیطان نے ان کو مطمئن کر دیا کہ جب تم دنیا میں دولت اور طاقت اور شان وشوکت کے لحاظ سے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو تو پھر تمھیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہمارے یہ عقائد اور فلسفے اور نظریّے ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ان کے ٹھیک ہونے کی تو یہی ایک دلیل کافی ہے کہ تم مزے سے دولت کما رہے ہو اور عیش اُڑا رہے ہو۔

**۳۳۔** یعنی جو ہر آن اُن چیزوں کو ظہور میں لا رہا ہے جو پیدایش سے پہلے نہ معلوم کہاں کہاں پوشیدہ تھیں۔ زمین کے پیٹ سے ہر آن بے شمار نباتات نکال رہا ہے اور طرح طرح کے مَعدِنیات خارج کر رہا ہے۔ عالم بالا کی فضاؤں سے وہ وہ چیزیں سامنے لا رہا ہے جن کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان کا وہم وگمان بھی ان تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

**۳۴۔** یعنی اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے لیے ظاہر اور مخفی سب یکساں ہیں۔ اس پر سب کچھ عیاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بطورِ نمونہ بیان کرنے سے مقصود دراصل یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اگر وہ لوگ شیطان کے دھوکے میں نہ آتے تو یہ سیدھا راستہ انھیں صاف نظر آ سکتا تھا کہ آفتاب نامی ایک دہکتا ہُوا کُرہ، جو بے چارہ خود اپنے وجود کا ہوش بھی نہیں رکھتا، کسی عبادت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستی اس کا استحقاق رکھتی ہے جو علیم وخبیر ہے

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۲۷ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ۝۲۸

سلیمانؑ نے کہا: ”ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِّعمل ظاہر کرتے ہیں۔[۳۶]“

اور جس کی قدرت ہر لحظہ نئے نئے کرشمے ظہور میں لا رہی ہے۔

**۳۵**– اِس مَقام پر سجدہ واجب ہے۔ یہ قرآن کے اُن مَقامات میں سے ہے جہاں سجدۂ تلاوت واجب ہونے پر فقہا کا اتفاق ہے۔ یہاں سجدہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو آفتاب پرستوں سے جدا کرے اور اپنے عمل سے اس بات کا اقرار و اظہار کرے کہ وہ آفتاب کو نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مسجود و معبُود مانتا ہے۔

**۳۶**– یہاں پہنچ کر ہُدہُد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیّت کے مدّعی حضرات نے جس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں ایک پرندے کا اِس قوتِ مشاہَدہ، قوتِ تمیز اور قوتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مُلک پر گزرے اور یہ جان لے کہ یہ قومِ سبا کا ملک ہے، اس ملک کا نظامِ حکومت یہ ہے، اس کی فرمانروا فُلاں عورت ہے، اس کا مذہب آفتاب پرستی ہے، اس کو خدائے واحد کا پرستار ہونا چاہیے تھا مگر یہ گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے یہ سارے مشاہَدات وہ آکر اس وضاحت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ سے بیان کر دے۔ اِنھی وُجوہ سے کھلے کھلے ملاحدہ قرآن پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کَلِیْلَہ دِمْنَہ کی سی باتیں کرتا ہے، اور قرآن کی عقلی تفسیریں کرنے والے اس کے الفاظ کو ان کے صریح معنیٰ سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرتِ ہُدہُد تو سرے سے کوئی پرندے تھے ہی نہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے حضرات کے پاس آخر وہ کیا سائنٹفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیّت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور اِن کی مختلف اَنواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو وہ معلومات سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اُس نہایت ناکافی مشاہَدے سے اخذ کردہ نتائج ہیں جو محض سرسری طور پر حیوانات کی زندگی اور ان کے برتاؤ کا کیا گیا ہے۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعے سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سوچتے اور سمجھتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت مُشاہَدہ مختلف انواعِ حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے، اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتا چلا ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع

ع ۲ ۷

ملکہ بولی: ”اے اہلِ دربار! میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ ”میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔[۳۷]“ ع

---

اب اگر اللہ تعالیٰ، جو اِن حیوانات کا خالق ہے، ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی مَنطِق سمجھنے اور ان سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہُدہُد اس قابل ہو گیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کر کے آتا اور پیغمبر کو ان کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اِس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور بہت سے قیاسات پر نظرِ ثانی کریں، یہ کیا عقل مندی ہے کہ ہم اپنے اس ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

۳۷- یعنی خط کی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ وہ عجیب غیر معمولی طریقے سے آیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی سفارت اسے لا کر دیتی، ایک پرندے نے اسے لا کر مجھ پر ٹپکا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ فلسطین و شام کے عظیم فرمانروا سلیمانؑ کی جانب سے ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، حالانکہ دنیا میں کہیں کسی سلطنت کے مراسلوں میں یہ طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر سب دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف خدائے بزرگ و برتر کے نام پر خط لکھنا بھی ہماری دنیا میں ایک غیر معمولی بات ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر اس کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ اس میں بالکل صاف صاف ہم کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ ہم سرکشی چھوڑ کر اطاعت اختیار کر لیں اور تابعِ فرمان بن کر یا مسلمان ہو کر سلیمانؑ کے آگے حاضر ہو جائیں۔

”مسلم“ ہو کر حاضر ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ مطیع بن کر حاضر ہو جاؤ۔ دوسرے یہ کہ دینِ اسلام قبول کر کے حاضر ہو جاؤ۔ پہلا مفہُوم حضرت سلیمانؑ کی شانِ فرماں روائی سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا مفہُوم ان کی شانِ پیغمبری سے۔ غالباً یہ جامع لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خط میں یہ دونوں مقاصد شامل تھے۔ اسلام کی طرف سے خود مختار قوموں اور حکومتوں کو ہمیشہ یہی دعوت دی گئی ہے کہ یا تو دینِ حق قبول کرو اور ہمارے ساتھ نظامِ اسلامی میں برابر کے حصّہ دار بن جاؤ، یا پھر اپنی سیاسی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اسلامی نظام کی ماتحتی قبول کرو اور سیدھے ہاتھ سے جِزیہ دو۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ‌ ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّاُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّالۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فَانۡظُرِىۡ مَاذَا تَاۡمُرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً‌ ۚ وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّىۡ مُرۡسِلَةٌ اِلَيۡهِمۡ بِهَدِيَّةٍ

(خط سُنا کر) ملکہ نے کہا: ”اے سردارانِ قوم! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہیں کرتی ہوں۔[۳۸]“ انھوں نے جواب دیا: ”ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔“ ملکہ نے کہا کہ ”بادشاہ جب کسی مُلک میں گُھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزّت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔[۳۹] یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔[۴۰] میں اِن لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں،

۳۸- اصل الفاظ ہیں: حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ، جب تک کہ تم حاضر نہ ہو، یا تم گواہ نہ ہو۔ یعنی اہم معاملات میں فیصلہ کرتے وقت تم لوگوں کی موجودگی میرے نزدیک ضروری ہے، اور یہ بھی کہ جو فیصلہ مَیں کروں، اس کے صحیح ہونے کی تم شہادت دو۔ اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ قومِ سبا میں بادشاہی نظام تو تھا مگر وہ اِستبدادی نظام نہ تھا، بلکہ فرماں روائے وقت معاملات کے فیصلے اَعیانِ سلطنت کے مشورے سے کرتا تھا۔

۳۹- اس ایک فقرے میں امپیریلزم اور اس کے اثرات و نتائج پر مکمل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کی غَرَض ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کیے ہیں، ان سے وہ خود مُتمتّع ہوں اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں سر اُٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی خوش حالی اور طاقت اور عزّت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں، اس کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دَم داعیہ ہوتا ہے انھیں کچل کر رکھ دیتے ہیں، اس کے افراد میں غلامی، خوشامد، ایک دوسرے کی کاٹ، ایک دوسرے کی جاسوسی، فاتح کی نقالی، اپنی تہذیب کی تحقیر، فاتح تہذیب کی تعظیم اور ایسے ہی دوسرے کمینہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں، اور انھیں بتدریج اس بات کا خوگر بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی کسی مقدس سے مقدس چیز کو بھی بیچ دینے میں تأمّل نہ کریں اور اُجرت پر ہر ذلیل سے ذلیل خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ؗ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا

پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔"

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا: "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمھیں دیا ہے[۴۱]۔ تمھارا ہدیہ تمھی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر!) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں[۴۲] گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انھیں ایسی ذلّت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔"

سلیمانؑ[۴۳] نے کہا: "اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے

---

۴۰ – اس فقرے میں دو برابر کے احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ ملکۂ سبا ہی کا قول ہو اور اس نے اپنے پچھلے قول پر بطورِ تاکید اس کا اضافہ کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہو جو مَلِکہ کے قول کی تائید کے لیے جملۂ معترضہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۴۱ – اس جملے سے مقصود اظہارِ فخر و تکبر نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ مجھے تمھارا مال مطلوب نہیں ہے بلکہ تمھارا ایمان مطلوب ہے۔ یا پھر کم سے کم جو چیز میں چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم ایک صالح نظام کے تابع ہو جاؤ۔ اگر تم ان دونوں باتوں میں سے کسی کے لیے راضی نہیں ہو تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ مال و دولت کی رشوت لے کر تمھیں اس شرک اور اس فاسد نظامِ زندگی کے معاملے میں آزاد چھوڑ دوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے کہ میں تمھارے مال کا لالچ کروں۔

۴۲ – پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جو کلام پر غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یعنی پوری بات یوں ہے کہ: اَے سفیر! یہ ہدیہ واپس لے جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف، انھیں یا تو ہماری

قَبۡلَ اَنۡ يَّاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفۡرِيۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِيۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِكَ‌ ۚ وَاِنِّىۡ عَلَيۡهِ لَقَوِىٌّ اَمِيۡنٌ ﴿۳۹﴾

قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں[۴۴]؟" جنّوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا: "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں[۴۵]۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار

پہلی بات ماننی پڑے گی کہ مسلم ہو کر ہمارے پاس حاضر ہو جائیں، ورنہ ہم ان پر لشکر لے کر آئیں گے۔

۴۳ – بیچ میں یہ قصّہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ سفارت ملکہ کا ہدیہ واپس لے کر پہنچی اور جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ ملکہ نے اس سے حضرت سلیمانؑ کے جو حالات سنے، ان کی بنا پر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ان کی ملاقات کے لیے بیت المَقدِس جائے۔ چنانچہ وہ خَدم وحَشم اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ سَبا سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور اس نے دربارِ سلیمانی میں اطلاع بھیج دی کہ میں آپ کی دعوت خود آپ کی زبان سے سننے اور بالمُشافِہَہ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہو رہی ہوں۔ اِن تفصیلات کو چھوڑ کر اب اُس وقت کا قصّہ بیان کیا جا رہا ہے جب ملکہ بیت المَقدِس کے قریب پہنچ گئی تھی اور ایک دو ہی دن میں حاضر ہونے والی تھی۔

۴۴ – یعنی وہی تخت جس کے متعلق ہُدہُد نے بتایا تھا کہ "اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔" بعض مفسرین نے غضب کیا ہے کہ مَلِکہ کے آنے سے پہلے اس کا تخت منگوانے کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر ملکہ مسلمان ہوگئی تو پھر اس کے مال پر اس کی مرضی کے بغیر قبضہ کر لینا حرام ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے اس کے آنے سے پہلے تخت منگا لینے کی جلدی کی، کیونکہ اس وقت ملکہ کا مال مباح تھا۔ استغفر اللہ! ایک نبی کی نیت کے متعلق یہ تصور بڑا ہی عجیب ہے۔ آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ اور اس کے درباریوں کو ایک معجزہ بھی دکھانا چاہتے تھے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ ربّ العالمین اپنے انبیا کو کیسی غیر معمولی قدرتیں عطا فرماتا ہے، اور اسے یقین آ جائے کہ حضرت سلیمانؑ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے بھی کچھ زیادہ غضب بعض جدید مفسرین نے کیا ہے۔ وہ آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "تم میں سے کون ہے جو ملکہ کے لیے ایک تخت مجھے لا دے۔" حالانکہ قرآن یاتینی بعرش لھا نہیں بلکہ بِعَرۡشِهَا کہہ رہا ہے، جس کے معنیٰ "اس کا تخت" ہیں نہ کہ "اس کے لیے ایک تخت"۔ یہ بات صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ قرآن کے اس بیان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے کہ حضرت سلیمانؑ اس ملکہ ہی کا تخت یمن سے بیت المَقدِس اُٹھوا منگانا چاہتے تھے اور وہ بھی اسی طرح کہ ملکہ کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ آ جائے۔

۴۵ – اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو جنّ تھے، وہ آیا موجودہ زمانے کے بعض عقل پرست مفسرین کی تاویلوں کے مطابق بنی نوعِ انسان میں سے تھے، یا عُرفِ عام کے مطابق اُسی پوشیدہ مخلوق میں سے جو جنّ کے نام سے معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار کی نِشَست زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے کی

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنۡ فَضۡلِ

ہوں[46]۔“ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا: ”میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں[47]۔“ جُونہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اُٹھا: ”یہ میرے رب کا فضل

ہوگی، اور بیت المَقدِس سے سبا کے پایۂ تخت مآرِب کا فاصلہ پرندے کی اُڑان کے لحاظ سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا۔ اتنے فاصلے سے ایک ملکہ کا عظیم الشان تخت اتنی کم مدّت میں اُٹھا لانا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا تھا، خواہ وہ عَمالِقہ میں سے کتنا ہی موٹا تازہ آدمی کیوں نہ ہو۔ یہ کام تو آج کل کا جٹ طیارہ بھی انجام دینے پر قادر نہیں ہے۔ مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے کہ تخت کہیں جنگل میں رکھا ہو اور اسے اُٹھا لایا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تخت ایک ملکہ کے محل میں تھا جس پر یقیناً پہرے دار متعین ہوں گے اور وہ ملکہ کی غیر موجودگی میں ضرور محفوظ جگہ رکھا گیا ہوگا۔ انسان جا کر اٹھا لانا چاہتا تو اس کے ساتھ ایک چھاپا مار دستہ ہونا چاہیے تھا کہ لڑ بھڑ کر اسے پہرے داروں سے چھین لائے۔ یہ سب کچھ آخر دربار برخاست ہونے سے پہلے کیسے ہوسکتا تھا۔ اس چیز کا تصور اگر کیا جاسکتا ہے تو ایک حقیقی جِنّ ہی کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔

۴۶ — یعنی آپ مجھ پر یہ بھروسا کرسکتے ہیں کہ مَیں اسے خود اُڑا نہ لے جاؤں گا، یا اس میں سے کوئی قیمتی چیز نہ چُرا لوں گا۔

۴۷ — اس شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کون تھا، اور اس کے پاس وہ کس خاص قسم کا علم تھا، اور اس کتاب سے کون سی کتاب مراد ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ ان اُمور کی کوئی وضاحت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیثِ صحیح میں۔ مفسرین میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ کوئی انسان تھا۔ پھر اُس انسان کی شخصیت کے تعیُّن میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہے۔ کوئی آصَف بن بَرخیاہ (Asaf-B-Barchiah) کا نام لیتا ہے جو یہودی ربّیوں کی رِوایات کے مطابق رئیس الرِّجال (Prince of Men) تھے، کوئی کہتا ہے کہ وہ حضرت خَضِرؑ تھے، کوئی کسی اَور کا نام لیتا ہے، اور امام رازیؒ کو اصرار ہے کہ وہ خود حضرت سلیمانؑ تھے، لیکن ان میں سے کسی کا بھی کوئی قابلِ اعتماد ماخذ نہیں ہے، اور امام رازیؒ کی بات تو قرآن کے سِیاق وسَباق سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح کتاب کے بارے میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور کوئی کتابِ شریعت مراد لیتا ہے۔ لیکن یہ سب محض قیاسات ہیں۔ اور ایسے ہی قیاسات اُس علم کے بارے میں بھی بلا دلیل وثبوت قائم کر لیے گئے ہیں جو کتاب سے اس شخص کو حاصل تھا۔ ہم صرف اُتنی ہی بات جانتے اور مانتے ہیں جتنی قرآن میں فرمائی گئی ہے، یا جو اس کے الفاظ سے مُترشّح ہوتی ہے۔ وہ شخص بہرحال جِنّ کی نوع میں سے نہ تھا،

رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝٤٠ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ

ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں۔[48] اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔[49]"

سلیمانؑ نے کہا:[50] "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں

اور بعید نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہو۔ اس کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا اور وہ اللہ کی کسی کتاب (اَلْکِتٰب) سے ماخوذ تھا۔ جنّ اپنے وجود کی طاقت سے اس تخت کو چند گھنٹوں میں اُٹھا لانے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ یہ شخص علم کی طاقت سے اس کو ایک لحظے میں اُٹھا لایا۔

۴۸ – قرآن مجید کا اندازِ بیان اس معاملے میں بالکل صاف ہے کہ اُس دیوہیکل جنّ کے دعوے کی طرح اِس شخص کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نہ رہا بلکہ فی الواقع جس وقت اس نے دعویٰ کیا، اسی وقت ایک ہی لحظے میں وہ تخت حضرت سلیمانؑ کے سامنے رکھا نظر آیا۔ ذرا اِن الفاظ پر غور کیجیے:

"اس شخص نے کہا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لے آتا ہوں۔ جونہی کہ سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس رکھا دیکھا۔"

جو شخص بھی واقعے کے عجیب و غریب ہونے کا تصور ذہن سے نکال کر بجائے خود اس عبارت کو پڑھے گا، وہ اس سے یہی مفہوم لے گا کہ اس شخص کے یہ کہتے ہی دوسرے لمحے میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس کا اس نے دعویٰ کیا تھا۔ اس سیدھی سی بات کو خواہ مخواہ تاویل کے خرّاد پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر تخت کو دیکھتے ہی حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں" اسی صورت میں برمحل ہو سکتا ہے جب کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو۔ ورنہ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ ان کا ایک ہوشیار ملازم ملکہ کے لیے جلدی سے ایک تخت بنا لایا یا بنوا لایا، تو ظاہر ہے کہ یہ ایسی کوئی نادر بات نہ ہو سکتی تھی کہ اس پر حضرت سلیمانؑ بے اختیار هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ پکار اُٹھتے اور ان کو یہ خطرہ لاحق ہو جاتا کہ اتنے جلدی مہمانِ عزیز کے لیے تخت تیار ہو جانے سے کہیں مَیں شاکرِ نعمت بننے کے بجائے کافرِ نعمت نہ بن جاؤں۔ آخر اتنی سی بات پر کسی مومن فرماں روا کو اتنا غرور اور کبرِ نفس لاحق ہو جانے کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے، خُصوصاً جب کہ وہ ایک معمولی مومن نہ ہو بلکہ اللہ کا نبی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکتے کس طرح اُٹھ کر آ گیا، تو اس کا مختصر

اَتَهۡتَدِيۡۤ اَمۡ تَكُوۡنُ مِنَ الَّذِيۡنَ لَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتۡ

وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔"[51] ملکہ جب حاضر ہوئی

جواب یہ ہے کہ زمان ومکان اور مادّہ وحرکت کے جو تصوّرات ہم نے اپنے تجربات ومشاہدات کی بنا پر قائم کیے ہیں، ان کے جملہ حُدود صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حُدود سے محدود ہے۔ اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار، سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیّاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے۔ جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آگئی ہے، اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکۂ سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔ آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المَقدِس لے بھی گیا اور واپس بھی لے آیا۔

۴۹ – یعنی وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی خدائی میں کسی کی شکر گزاری سے نہ ذرّہ برابر کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری واحسان فراموشی سے یک سرِمُو کوئی کمی آتی ہے۔ وہ آپ اپنے ہی بل بُوتے پر خدائی کر رہا ہے، بندوں کے ماننے یا نہ ماننے پر اس کی خدائی منحصر نہیں ہے۔ یہی بات قرآنِ مجید میں ایک جگہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نقل کی گئی ہے کہ اِنۡ تَكۡفُرُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝ "اگر تم اور ساری دنیا والے مل کر بھی کفر کریں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔" (ابراہیم، آیت ۸) اور یہی مضمون اس حدیثِ قُدسی کا ہے جو صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے کہ:

يقول الله تعالىٰ يا عبادى لو انّ اوّلكم واٰخركم و انسكم وجنكم كانوا على اتقى قلب رجل منكم ما زاد ذٰلك فى ملكى شيئا ۔ يا عبادى لو ان اولكم واٰخركم وانسكم وجنكم كانوا علىٰ افجر قلب رجل منكم ما نقص ذٰلك فى ملكى شيئا۔ يا عبادى انما هى اعمالكم احصيها لكم ثم اوفيكم اياها۔ فمن وجد خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذٰلك فلا يلومن الا نفسه ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک تم سب اِنس اور جنّ اپنے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہ ہو جائے گا۔ اے میرے بندو! اگر اوّل سے آخر تک تم سب اِنس اور جنّ اپنے سب سے زیادہ بدکار شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو میری بادشاہی میں اس سے کوئی کمی نہ ہو جائے گی۔ اے میرے بندو! یہ تمھارے اپنے اعمال ہی ہیں جن کا میں تمھارے حساب میں شمار کرتا ہوں، پھر ان کی پوری پوری جزا تمھیں دیتا ہوں۔ پس جسے کوئی بھلائی نصیب ہو اسے چاہیے کہ اللہ کا شکر ادا کرے، اور جسے کچھ اور نصیب ہو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

۵۰ – بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ ملکہ کیسے بیت المَقدِس پہنچی اور کس طرح اس کا استقبال ہُوا۔ اسے چھوڑ کر اب اُس وقت کا حال بیان کیا جا رہا ہے جب وہ حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کے لیے ان کے محل میں پہنچ گئی۔

قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا

تو اس سے کہا گیا: ''کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟'' وہ کہنے لگی: ''یہ تو گویا وہی ہے[۵۲]۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سرِ اطاعت جھکا دیا تھا (یا ہم مسلم ہو چکے تھے)[۵۳]۔'' اُس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ اُن معبودوں کی عبادت تھی جنھیں وہ اللہ کے سوا پُوجتی تھی، کیونکہ وہ

---

**۵۱** – ذو معنیٰ فقرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ یکایک اپنے ملک سے اتنی دُور اپنا تخت موجود پا کر یہ سمجھ جاتی ہے یا نہیں کہ یہ اسی کا تخت اُٹھا لایا گیا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ وہ اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر ہدایت پاتی ہے یا اپنی گمراہی پر قائم رہتی ہے۔

اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اس تخت پر قبضہ کرنے کی نیت رکھتے تھے۔ یہاں وہ خود اس مقصد کا اظہار فرما رہے ہیں کہ انھوں نے یہ کام ملکہ کی ہدایت کے لیے کیا تھا۔

**۵۲** – اس سے ان لوگوں کے خیالات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جنھوں نے صورتِ واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ گویا حضرت سلیمانؑ اپنی مہمان ملکہ کے لیے ایک تخت بنوانا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انھوں نے ٹینڈر طلب کیے، ایک ہٹے کٹے کاریگر نے کچھ زیادہ مدّت میں تخت بنا دینے کی پیش کش کی، مگر ایک دوسرے ماہر اُستاد نے کہا: میں تُرت پُھرت بنائے دیتا ہوں۔ اس سارے نقشے کا تار و پود اس بات سے بکھر جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خود ملکہ ہی کا تخت لانے کے لیے فرمایا تھا (اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا)، اور اس کی آمد پر اپنے ملازموں کو اسی کا تخت انجان طریقے سے اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا تھا (نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا)، پھر جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے (اَهٰكَذَا عَرْشُكِ) اور اس نے کہا: گویا یہ وہی ہے (كَاَنَّهٗ هُوَ)۔ اس صاف بیان کی موجودگی میں اُن لاطائل تاویلات کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک رہے تو بعد کا فقرہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

**۵۳** – یعنی یہ معجزہ دیکھنے سے پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے جو اوصاف اور حالات ہمیں معلوم ہو چکے تھے، ان کی بنا پر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، محض ایک سلطنت کے فرمانروا نہیں ہیں۔ تخت کو دیکھنے اور ''گویا یہ وہی ہے'' کہنے کے بعد اس فقرے کا اضافہ کرنے میں آخر کیا معنویت باقی رہ جاتی ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کے لیے ایک تخت بنوا کر رکھ دیا تھا؟ بالفرض اگر وہ تخت ملکہ کے تخت سے مشابہ ہی تیار کرا لیا گیا ہو تب بھی اس میں آخر وہ کیا کمال ہو سکتا تھا کہ ایک آفتاب پرست ملکہ اسے دیکھ کر یہ بول اُٹھتی کہ

كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ

ایک کافر قوم سے تھی۔[۵۴]

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اُترنے کے لیے اس نے اپنے پائینچے اُٹھالیے سلیمانؑ نے کہا: "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔"[۵۵] اس پر وہ پکار اُٹھی: "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ

اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ "ہم کو پہلے ہی علم نصیب ہو گیا تھا اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔"

۵۴ - یہ فقرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ یعنی اس میں ضد اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ وہ اس وقت تک صرف اس لیے کافر تھی کہ کافر قوم میں پیدا ہوئی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس کو جس چیز کے آگے سجدہ ریز ہونے کی عادت پڑی ہوئی تھی، بس وہی اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ سے سابقہ پیش آنے پر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس رکاوٹ کے ہٹ جانے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔

۵۵ - یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمانؑ کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت ہدیوں کو رد کرنا تھا، جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمانؑ کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوتِ حق کا علم ہُوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے، اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ "ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔" چوتھی چیز اس عظیم الشان تخت کا آناً فاناً مآرب سے بیت المَقدِس پہنچ جانا تھا، جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش و تَنَعُّم رکھتا ہے اور ایسے شان دار محل میں رہتا ہے، وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے، کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے، اور اس کی زندگی فریفتگانِ حیاتِ دُنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اُٹھنے پر مجبُور کر دیا جو آگے اس کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا

ع ۳ ۱۴ ۱۸

اللہ ربّ العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔[۵۶]"؏

اور[۵۷] ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی

۵۶ – حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سَبا کا یہ قصّہ بائبل کے عہدِ عتیق و جدید اور رِوایاتِ یہود، سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ عہدِ عتیق میں اس قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

"اور جب سَبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تا کہ مشکل سوالوں سے اُسے آزمائے۔ اور وہ بہت بڑی جلَو کے ساتھ یروشلم میں آئی...... جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اُس نے اُن سب باتوں کے بارے میں، جو اُس کے دل میں تھیں، اُس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اُس کے سب سوالوں کا جواب دیا...... اور جب سَبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اُس محل کو جو اس نے بنایا تھا، اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نِشَست، اور اس کے خادموں کی حاضر باشی، اور ان کی پوشاک، اور اس کے ساقیوں، اور اس سیڑھی کو، جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچّی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تَو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آکر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا۔ اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا، کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اُس شہرت سے، جو میں نے سنی، بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حُضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو، جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا ہے...... اور اُس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قِنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے، اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے...... اور سلیمان بادشاہ نے سَبا کی ملکہ کو سب کچھ، جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اُس نے مانگا، دیا...... پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لَوٹ گئی۔" (۱-سلاطین ۱۰: ۱ – ۱۳۔ اسی سے ملتا جُلتا مضمون ۲-تواریخ ۹: ۱ – ۱۲ میں بھی ہے)۔

عہدِ جدید میں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکۂ سَبا کے متعلق منقول ہوا ہے:

"دکّھن کی ملکہ عدالت کے دن اِس زمانے کے لوگوں کے ساتھ اُٹھ کر اِن کو مجرم ٹھیرائے گی، کیونکہ وہ دُنیا کے کنارے سے سلیمانؑ کی حکمت سننے کو آئی، اور دیکھو، یہاں وہ ہے جو سلیمانؑ سے بھی بڑا ہے۔" (متّی ۱۲: ۴۲۔ لُوقا ۱۱: ۳۱)

اللّٰہَ فَاِذَا ھُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ

کرو، تو یکایک وہ دو مُتخاصِم فریق بن گئے[58]۔ صالحؑ نے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے

یہودی ربّیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سَبا کا قصّہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جُلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آ کر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعے سے خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اُس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزرا کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اُترنے کے لیے پائینچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہُوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اُٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکۂ سَبا کے ساتھ، معاذ اللہ، زِنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابِل کا بادشاہ بُختِ نَصَّر پیدا ہُوا جس نے بیت المَقدِس کو تباہ کیا۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، صفحہ ۴۴۳) اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علما کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۳۹-۴۴۱) اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائبل انھیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ، احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا، اور جو خدا کے سوا دوسرے معبُودوں کی طرف مائل ہو گیا۔ (۱-سلاطین، ۱۱:۱-۱۱) ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا، اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

۵۷- تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود، ۶۱ تا ۶۸۔ الشعراء، ۱۴۱ تا ۱۵۹۔ القمر، ۲۳ تا ۳۲۔ الشّمس، ۱۱-۱۵۔

۵۸- یعنی جونہی کہ حضرت صالحؑ کی دعوت کا آغاز ہوا، ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا۔ اور اس تفرِقے کے ساتھ ہی ان کے درمیان کش مکش شروع ہو گئی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ ''اس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے، انھوں نے

قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۗ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾

پہلے بُرائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟[۵۹] کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے؟" انھوں نے کہا: "ہم نے تو تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔[۶۰]" صالحؑ نے جواب دیا: "تمھارے نیک و بدشگون کا سرِ رشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمایش ہو رہی ہے۔[۶۱]"

ان لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، جو اُن میں سے ایمان لائے تھے، کہا: کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لے کر وہ بھیجے گئے ہیں۔ ان متکبّرین نے کہا: جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، اس کے ہم کافر ہیں۔" (الاعراف، آیات ۷۵-۷۶) یاد رہے کہ ٹھیک یہی صورتِ حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت کے ساتھ مکے میں بھی پیدا ہوئی تھی کہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں گروہوں میں کش مکش شروع ہوگئی۔ اس لیے یہ قصّہ آپ سے آپ اُن حالات پر چسپاں ہو رہا تھا جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

۵۹ - یعنی اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی کرتے ہو؟ دوسرے مَقام پر قوم صالح کے سرداروں کا یہ قول نقل ہو چکا ہے کہ یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ "اے صالح! لے آ وہ عذاب ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی رسولوں میں سے ہے۔" (الاعراف، آیت ۷۷)

۶۰ - ان کے اس قول کا ایک مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ تحریک ہمارے لیے سخت منحوس ثابت ہوئی ہے، جب سے تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے دینِ آبائی کے خلاف یہ بغاوت شروع کی ہے، ہم پر آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے، کیونکہ ہمارے معبُود ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس معنٰی کے لحاظ سے یہ قول اکثر اُن مشرک قوموں کے اقوال سے مشابہ ہے جو اپنے انبیا کو منحوس قرار دیتی تھیں۔ چنانچہ سورۂ یٰسین میں ایک قوم کا ذکر آتا ہے کہ اس نے اپنے انبیاؑ سے کہا: اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ "ہم نے تم کو منحوس پایا ہے۔" (آیت ۱۸) یہی بات فرعون کی قوم حضرت موسیٰؑ کے متعلق کہتی تھی: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ "جب ان پر کوئی اچھا وقت آتا تو کہتے کہ ہمارے لیے یہی ہے، اور جب کوئی مصیبت آ جاتی تو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کو اس کا ذمہ دار ٹھیراتے۔" (الاعراف، آیت ۱۳۱) قریب قریب ایسی ہی باتیں مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہی جاتی تھیں۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ

اُس شہر میں نو جتھے دار تھے[۶۲] جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انھوں نے آپس میں کہا: "خدا کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی[۶۳] سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں[۶۴]۔" یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی

دوسرا مطلب اس قول کا یہ ہے کہ تمھارے آتے ہی ہماری قوم میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پہلے ہم ایک قوم تھے جو ایک دین پر مجتمع تھی۔ تم ایسے سبز قدم آئے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا اور بیٹا باپ سے کٹ گیا۔ اس طرح قوم کے اندر ایک نئی قوم اُٹھ کھڑی ہونے کا انجام ہمیں اچھا نظر نہیں آتا۔ یہی وہ الزام تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپؐ کے خلاف بار بار پیش کرتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کا آغاز ہوتے ہی سردارانِ قریش کا جو وفد ابوطالب کے پاس گیا تھا، اس نے یہی کہا تھا کہ "اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کردو جس نے تمھارے دین اور تمھارے باپ دادا کے دین کی مخالفت کی ہے اور تمھاری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور ساری قوم کو بے وقوف قرار دیا ہے۔" (ابنِ ہِشام، جلد اوّل، ص ۲۸۵) حج کے موقع پر جب کفارِ مکہ کو اندیشہ ہوا کہ باہر کے زائرین آکر کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متأثر نہ ہو جائیں تو انھوں نے باہم مشورہ کرنے کے بعد یہی طے کیا کہ قبائلِ عرب سے کہا جائے: "یہ شخص جادوگر ہے، اس کے جادو کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بیٹا باپ سے، بھائی بھائی سے، بیوی شوہر سے، اور آدمی اپنے سارے خاندان سے کٹ جاتا ہے۔" (ابنِ ہِشام، ص ۲۸۹)

۶۱ – یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم نے سمجھ رکھی ہے۔ اصل معاملہ جسے اب تک تم نہیں سمجھے ہو، یہ ہے کہ میرے آنے سے تمھارا امتحان شروع ہوگیا ہے۔ جب تک میں نہ آیا تھا، تم اپنی جہالت میں ایک ڈگر پر چلے جارہے تھے۔ حق اور باطل کا کوئی کھلا امتیاز سامنے نہ تھا۔ کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کا کوئی معیار نہ تھا۔ بدتر سے بدتر لوگ اُونچے ہورہے تھے، اور اچھی سے اچھی صلاحیتوں کے لوگ خاک میں ملے جارہے تھے۔ مگر اب ایک کسوٹی آگئی ہے جس پر تم سب جانچے اور پرکھے جاؤ گے۔ اب بیچ میدان میں ایک ترازو رکھ دیا گیا ہے جو ہر ایک کو اس کے وزن کے لحاظ سے تولے گا۔ اب حق اور باطل آمنے سامنے موجود ہیں۔ جو حق کو قبول کرے گا وہ بھاری اُترے گا، خواہ آج تک اس کی کوڑی بھر بھی قیمت نہ رہی ہو۔ اور جو باطل پر جمے گا اس کا وزن رَتی بھر بھی نہ رہے گا، چاہے وہ آج تک امیر الامرا ہی بنا رہا ہو۔

لَا يَشْعُرُوْنَ ۝٥٠ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٥١ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

انھیں خبر نہ تھی[65]۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہُوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ اُن کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے، اس میں ایک نشانِ عبرت ہے

اب فیصلہ اس پر نہیں ہوگا کہ کون کس خاندان کا ہے، اور کس کے ذرائع و وسائل کتنے ہیں، اور کون کتنا زور رکھتا ہے، بلکہ اس پر ہوگا کہ کون سیدھی طرح صداقت کو قبول کرتا ہے اور کون جھوٹ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیتا ہے۔

۶۲ – یعنی ۹ سردارانِ قبائل جن میں سے ہر ایک اپنے ساتھ ایک بڑا جتھا رکھتا تھا۔

۶۳ – یعنی حضرت صالح علیہ السلام کے قبیلے کے سردار سے، جس کو قدیم قبائلی رسم و رواج کے مطابق ان کے خون کے دعوے کا حق پہنچتا تھا۔ یہ وہی پوزیشن تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپؐ کے چچا ابو طالب کو حاصل تھی۔ کفارِ قریش بھی اِسی اندیشے سے ہاتھ روکتے تھے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں گے تو بنی ہاشم کے سردار ابو طالب اپنے قبیلے کی طرف سے خون کا دعویٰ لے کر اُٹھیں گے۔

۶۴ – یہ بعینہٖ اُسی نوعیت کی سازش تھی جیسی مکے کے قبائلی سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سوچتے رہتے تھے، اور بالآخر یہی سازش انھوں نے ہجرت کے موقع پر حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے کی۔ یعنی یہ کہ سب قبیلوں کے لوگ مل کر آپؐ پر حملہ کریں، تاکہ بنی ہاشم کسی ایک قبیلے کو ملزم نہ ٹھیرا سکیں اور سب قبیلوں سے بیک وقت لڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

۶۵ – یعنی قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں شب خون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا، اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اُونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب انھوں نے اُونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انھیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا (فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝)۔ اس پر شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ صالحؑ کا عذابِ موعود تو آئے چاہے نہ آئے، ہم لگے ہاتھوں اُونٹنی کے ساتھ اس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انھوں نے شب خون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہوگی جس رات عذاب آنا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا، خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ

اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں[۶۶]۔ اور بچا لیا ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔

اور لُوطؑ[۶۷] کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا: "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟[۶۸] کیا تمھارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو[۶۹]۔" مگر اُس کی قوم کا جواب

۶۶ – یعنی جاہلوں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ حضرت صالحؑ اور ان کی اُونٹنی کے معاملے سے اُس زلزلے کا کوئی تعلق نہیں ہے جو قومِ ثمود پر آیا، یہ چیزیں تو اپنے طبیعی اسباب سے آیا کرتی ہیں، اِن کے آنے یا نہ آنے میں اس چیز کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا کہ کون اس علاقے میں نیکوکار تھا اور کون بدکار، اور کس نے کس پر ظلم کیا تھا اور کس نے رحم کھایا تھا، یہ محض واعظانہ ڈھکوسلے ہیں کہ فُلاں شہر یا فُلاں علاقہ فِسق و فُجور سے بھر گیا تھا اس لیے اس پر سیلاب آ گیا، یا زلزلے نے اس کی بستیاں اُلٹ دیں، یا کسی اور بلائے ناگہانی نے اسے تلپَٹ کر ڈالا۔ لیکن جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی اندھا بہرا خدا اِس کائنات پر حکومت نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک حکیم و دانا ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے۔ اس کے فیصلے طبیعی اسباب کے غلام نہیں ہیں بلکہ طبیعی اسباب اس کے ارادے کے غلام ہیں۔ اس کے ہاں قوموں کو گرانے اور اٹھانے کے فیصلے اندھا دھند نہیں کیے جاتے بلکہ حکمت اور عدل کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اور ایک قانونِ مُکافات بھی اس کی کتابِ آئین میں شامل ہے، جس کی رُو سے اَخلاقی بنیادوں پر اس دُنیا میں بھی ظالم کیفرِ کردار کو پہنچائے جاتے ہیں۔ ان حقیقتوں سے جو لوگ باخبر ہیں وہ اُس زلزلے کو اسبابِ طبیعی کا نتیجہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ وہ اسے اپنے حق میں تنبیہ کا کوڑا سمجھیں گے۔ وہ اس سے عبرت حاصل کریں گے۔ وہ اُن اَخلاقی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن کی بنا پر خالق نے اپنی پیدا کی ہوئی ایک پھلتی پھولتی قوم کو غارت کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے رَوِیّے کو اُس راہ سے ہٹائیں گے جو اس کا غضب لانے والی ہے اور اس راہ پر ڈالیں گے جو اس کی رحمت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔

۶۷ – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، ۷۴ تا ۸۳۔ الحِجر، ۵۷ تا ۷۷۔ الانبیاء، ۷۱ تا ۷۵۔ الشعراء، ۱۶۰ تا ۱۷۴۔ العنکبوت، ۲۸ تا ۳۵۔ الصّافّات، ۱۳۳ تا ۱۳۸۔ القمر، ۳۳ تا ۳۹۔

قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ‌ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ قَدَّرۡنٰهَا مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۵۸﴾ ع

ع ۱۴ / ۱۹

---

اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا: ”نکال دو لُوطؑ کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔“ آخر کار ہم نے بچا لیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو، بجز اُس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا، اور برسائی اُن لوگوں پر ایک برسات، بہت ہی بُری برسات تھی وہ اُن لوگوں کے حق میں جو مُتنبّہ کیے جا چکے تھے۔ ع

---

۶۸ – اس ارشاد کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تم اِس فعل کے فحش اور کارِ بد ہونے سے ناواقف نہیں ہو، بلکہ جانتے بوجھتے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہو کہ مرد کی خواہشِ نفس کے لیے مرد نہیں پیدا کیا گیا بلکہ عورت پیدا کی گئی ہے، اور مرد و عورت کا فرق بھی ایسا نہیں ہے کہ تمھاری آنکھوں کو نظر نہ آتا ہو، مگر تم کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ جیتی مکھی نگلتے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم عَلانِیَہ یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جب کہ دیکھنے والی آنکھیں تمھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، جیسا کہ آگے سورۂ عنکبوت میں آ رہا ہے: وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ ”اور تم اپنی مجلسوں میں برا کام کرتے ہو۔“ (آیت ۲۹)

۶۹ – جَہالت کا لفظ یہاں حماقت اور سفاہت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اُردو زبان میں بھی ہم گالی گلوچ اور بے ہودہ حرکات کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ جہالت پر اُتر آیا ہے۔ اسی معنیٰ میں یہ لفظ عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے: وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ۝ (الفرقان، آیت ۶۳) لیکن اگر اس لفظ کو بے علمی ہی کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اپنی ان حرکات کے بُرے انجام کو نہیں جانتے۔ تم یہ تو جانتے ہو کہ یہ ایک لذتِ نفس ہے جو تم حاصل کر رہے ہو۔ مگر تمھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس انتہائی مجرمانہ اور گِھناؤنی لذت چشی کا کیسا سخت خمیازہ تمھیں عنقریب بھگتنا پڑے گا۔ خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم ہو کہ انجام سے بے خبر اپنے اس گندے کھیل میں منہمک ہو۔

۷۰ – یعنی پہلے ہی حضرت لُوطؑ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، کیونکہ اسے اپنی قوم کے ساتھ ہی تباہ ہونا ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۵۹﴾ ؕ

(اے نبیؐ!)[۷۱] کہو: حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے اُن بندوں پر جنھیں اس نے برگزیدہ کیا۔

(اِن سے پُوچھو:)[۷۲] اللہ بہتر ہے یا وہ معبُود جنھیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟

**۷۱ –** یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے اور یہ فقرہ اس کی تمہید ہے۔ اس تمہید سے یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تقریر کا آغاز کس طرح کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والے لوگ ہمیشہ سے اپنی تقریریں اللہ کی حمد اور اس کے نیک بندوں پر سلام سے شروع کرتے رہے ہیں۔ مگر اب اُسے مُلّائیت سمجھا جانے لگا ہے اور موجودہ زمانے کے مسلمان مقررین اس سے کلام کی ابتدا کرنے کا تصور تک اپنے ذہن میں نہیں رکھتے، یا پھر اس میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

**۷۲ –** بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبُودانِ باطل۔ حقیقت کے اعتبار سے تو معبُودانِ باطل میں سرے سے کسی خیر کا سوال ہی نہیں ہے کہ اللہ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رہے مشرکین، تو وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ اللہ کا اور اُن کے معبُودوں کا کوئی مقابلہ ہے۔ لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لیے رکھا گیا کہ وہ اپنی غَلَطی پر مُتنَبِّہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا میں کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے نزدیک اس میں کسی بھلائی یا فائدے کا خیال نہ رکھتا ہو۔ اب اگر یہ مشرک لوگ اللہ کی عبادت کے بجائے ان معبُودوں کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے، تو یہ اس کے بغیر بالکل بے معنٰی تھا کہ ان معبُودوں میں کوئی خیر ہو۔ اسی بنا پر ان کے سامنے صاف الفاظ میں یہ سوال رکھا گیا کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا تمھارے یہ معبُود؟ کیونکہ اس دوٹوک سوال کا سامنا کرنے کی ان میں ہمّت نہ تھی۔ ان میں سے کوئی کٹّے سے کٹّا مشرک بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ ہمارے معبُود بہتر ہیں۔ اور یہ مان لینے کے بعد کہ اللہ بہتر ہے، ان کے پورے دین کی بنیاد ڈھے جاتی تھی، اس لیے کہ پھر یہ بات سراسر نامعقول قرار پاتی تھی کہ بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اس طرح قرآن نے تقریر کے پہلے ہی فقرے میں مخالفین کو بے بس کر دیا۔ اس کے بعد اب پے در پے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک ایک کرشمے کی طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس کے ہیں؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ دوسرے آخر کیا ہیں کہ انھیں تم نے معبُود بنا رکھا ہے۔

رِوایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت فرماتے تو فوراً اس کے جواب میں فرماتے:

الجزء ۲۰

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے وہ خوش نُما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمھارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (اِن کاموں میں شریک) ہے؟[۷۳] (نہیں)،

بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى وَ اَجَلُّ وَ اَكْرَمُ، ”نہیں، بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔“

۷۳۔ مشرکوں میں سے کوئی بھی اس سوال کا یہ جواب نہ دے سکتا تھا کہ یہ کام اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ان میں شریک ہے۔ قرآنِ مجید دوسرے مقامات پر کفارِ مکہ اور مشرکینِ عرب کے متعلق کہتا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ ”اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اُس زبردست، علم والے نے ہی ان کو پیدا کیا ہے۔“ (الزُّخرُف، آیت ۹) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ”اور اگر ان سے پوچھو کہ خود انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔“ (الزُّخرُف، آیت ۸۷) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ ”اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔“ (العنکبوت، آیت ۶۳) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ...... وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ ”ان سے پوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون جان دار کو بے جان میں سے اور بے جان کو جان دار میں سے نکالتا ہے؟ کون اس نظامِ عالَم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔“ (یونُس، آیت ۳۱) عرب کے مشرکین ہی نہیں، دُنیا بھر کے مشرکین بالعُموم یہی مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اور نظامِ کائنات کا مدبّر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کے اس سوال کا یہ جواب اُن میں سے کوئی شخص ہٹ دھرمی کی بنا پر برائے بحث بھی نہ دے سکتا تھا کہ ہمارے معبُود خدا کے ساتھ اِن کاموں میں شریک ہیں، کیونکہ اگر وہ ایسا کہتا تو اس کی اپنی ہی قوم کے ہزار ہا آدمی اس کو جھٹلا دیتے اور صاف کہتے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریّوں کی دہریّت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اِسی پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اُگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝٦٠ۭ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ

بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار[74] بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے[75]؟

کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر ٹھیک وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اُٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشو ونما نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے، کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانش مندانہ تدبیر اور غالب قدرت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزار ہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رُونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی، جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو، اسے ایک امرِ اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔

۷۴ – زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کُرَۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مُطلَق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کُرہ فضائے بسیط میں معلّق ہے، کسی چیز پر ٹِکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آ جانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں، تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کُرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چُھپتا ہے، جس سے رات اور دن کا اختلاف رُونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی، کیونکہ ایک رُخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی اور دوسرے رُخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کُرے پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف رَدّا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوف ناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب، جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۟ؕ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔

کون ہے جو بے قرار کی دُعا سنتا ہے جب کہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے[۷۶]؟ اور (کون ہے جو) تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے[۷۷]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام

بادل اُٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے، اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کُرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سروسامان مفقود ہوتا ہے، وہاں کی زمین کسی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اِس کُرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام اُن اشیا کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لیے اس کُرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو ہوا اور پانی، دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی یہاں دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بہت بڑھ جاتا، بخاراتِ آبی کا اُٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو سکتیں، سردی زیادہ ہوتی، زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے، بلکہ کششِ ثِقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لیے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں، اس کُرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو سورج سے اس کو حرارت کم ملتی، سردی بہت زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے، اور مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا۔ اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جُل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان اُمور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے

اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔

اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے[۷۸] اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری لے کر بھیجتا ہے[۷۹]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟

کو بنانے اور رُوبعمل لانے میں کسی دیوی دیوتا، یا جِنّ، یا نبی و ولی، یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔

۷۵ — یعنی میٹھے اور کھاری پانی کے ذخیرے، جو اسی زمین پر موجود ہیں، مگر باہم خَلط مَلط نہیں ہوتے۔ زیرِ زمین پانی کی سوتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لے کر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور ان کی دھار سمندر کے پانی سے اس طرح الگ ہوتی ہے کہ بحری مسافر اس میں سے پینے کے لیے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ الفرقان، حاشیہ ۶۸)

۷۶ — مشرکینِ عرب خود اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ مصیبت کو ٹالنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید جگہ جگہ انھیں یاد دلاتا ہے کہ جب تم پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو تم خدا ہی سے فریاد کرتے ہو، مگر جب وہ وقت ٹل جاتا ہے تو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہو۔ (تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۹-۴۱۔ جلد دوم، یونُس، آیات ۲۱-۲۲، حاشیہ ۳۱۔ النحل، حاشیہ ۴۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۴) اور یہ بات صرف مشرکینِ عرب ہی تک محدود نہیں ہے۔ دُنیا بھر کے مشرکین کا بالعموم یہی حال ہے۔ حتّٰی کہ روس کے منکرینِ خدا جنھوں نے خدا پرستی کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے، اُن پر بھی جب گزشتہ جنگِ عظیم میں جرمن فوجوں کا نرغہ سخت ہو گیا تو انھیں خدا کو پکارنے کی ضرورت محسوس ہو گئی تھی۔

۷۷ — اس کے دو معنٰی ہیں: ایک یہ کہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم اُٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو زمین میں تصرُّف اور فرمانروائی کے اختیارات عطا کرتا ہے۔

۷۸ — یعنی جس نے ستاروں کے ذریعے سے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ تدبیروں میں سے ایک ہے کہ اس نے بحری اور برّی سفروں میں انسان کی رہنمائی کے لیے وہ ذرائع پیدا کر دیے ہیں جن سے وہ اپنی سَمتِ سفر اور منزلِ مقصود کی طرف اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ دن کے وقت زمین کی مختلف علامتیں اور آفتاب کے طُلوع و غُروب کی سَمتیں اس کی مدد کرتی ہیں اور تاریک راتوں میں تارے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احسانات میں شمار کیا گیا ہے:

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔
اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے[80]؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے[81]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصّہ دار) ہے؟ کہو کہ

---

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ (آیت ۱۶)

۷۹ - رحمت سے مراد ہے بارش، جس کے آنے سے پہلے ہوائیں اس کی آمد آمد کی خبر دے دیتی ہیں۔

۸۰ - یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے، اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دُور تک اُترتا جاتا ہے، اتنے ہی وجودِ الٰہ اور وحدتِ الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھیے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اِس وقت تک مسلَّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادّے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہوسکتی۔ حیات کی پیدایش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں، ان سب کا ٹھیک تناسُب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (law of chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجَرِبی طریقے پر سائنس کے معملوں (laboratories) میں بے جان مادّے سے جان دار مادّہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے، وہ صرف وہ مادّہ ہے جسے اصطلاح میں D.N.A کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادّہ ہے جو زندہ خَلیّوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ حیات تو ضرور ہے مگر خود جان دار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے۔ زندگی محض ایک مجرّد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار مُتنوِّع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک رُوئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتا چلا ہے۔ یہ لاکھوں انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیّات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہّ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوُّع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں

کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیّات کا ڈھانچا توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیّات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ مُتحجّرات (fossils) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے، اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خُنثیٰ مُشکّل کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدّت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق الباریٔ المصوِّر ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں مُتنوّع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اِعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسُل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسُل (genetics) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خُصوصیات کی حامل ہو، اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں مُمیّز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسُل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیّے (cell) کے ایک حصّے میں ہوتا ہے، جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خُردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینیر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشو و نما کو حتماً اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانے سے آج تک جتنے پودے بھی دُنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انھوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رُونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جَو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصوُّر وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے، جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اُسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالُد و تناسُل کے اس خُردبینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصّے میں لیے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عُضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پُرپیچ عملیات (progresses) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخمِ تناسُل اُسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے دُرست طریقے پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبّر اور ایک حیّ و قیّوم کی طالب ہے جو ایک لحظے کے لیے بھی اِن کارخانوں کی نگرانی و رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق

هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔[۸۲]

اِن سے کہو: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔[۸۳] اور وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔[۸۴]

یہ گمان کرسکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ، یا جنّ، یا نبی، یا ولی ذرّہ برابر بھی کوئی حصّہ رکھتا ہے۔ اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اِس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جا رہا ہے۔

۸۱ – رزق دینے کا معاملہ بھی اُتنا سادہ نہیں ہے جتنا سرسری طور پر ان مختصر سے الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص محسوس کرتا ہے۔ اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات کی اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں، اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے اور ہر ایک کی دسترس کے اِس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے۔ پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جُل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ گرمی، روشنی، ہوا، پانی اور زمین کے مختلف الاقسام مادّوں کے درمیان اگر ٹھیک تناسُب کے ساتھ تعاون نہ ہو تو غذا کا ایک ذرّہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ کون شخص تصوّر کرسکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبّر کی تدبیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر یونہی اتفاقاً ہوسکتا تھا؟ اور کون اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ خیال کرسکتا ہے کہ اس انتظام میں کسی جِنّ، یا فرشتے، یا کسی بزرگ کی روح کا کوئی دخل ہے؟

۸۲ – یعنی یا تو اس بات پر دلیل لاؤ کہ ان کاموں میں واقعی کوئی اور بھی شریک ہے، یا نہیں تو پھر کسی معقول دلیل سے یہی بات سمجھا دو کہ یہ سارے کام تو ہوں صرف ایک اللہ کے، مگر بندگی و عبادت کا حق پہنچے اُس کے سوا کسی اور کو، یا اس کے ساتھ کسی اور کو بھی۔

۸۳ – اُوپر تخلیق، تدبیر اور رَزّاقی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اِلٰہِ واحد (یعنی اکیلے خدا اور اکیلے مستحقِ عبادت) ہونے پر اِستدلال کیا گیا تھا۔ اب خدائی کی ایک اور اہم صفت، یعنی علم کے لحاظ سے بتایا جا رہا ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ لاشریک ہے۔ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا جِن یا انبیا اور اولیا یا دوسرے انسان اور غیر انسان، سب کا علم محدود ہے۔ سب سے کچھ نہ کچھ پوشیدہ ہے۔ سب کچھ جاننے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، جس سے اس کائنات کی کوئی چیز اور کوئی بات پوشیدہ نہیں، جو ماضی و حال اور مستقبل سب کو جانتا ہے۔

غیب کے معنیٰ مخفی، پوشیدہ اور مستور کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو معلوم نہ ہو، جس تک

ذرائعِ معلومات کی رسائی نہ ہو۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بحیثیتِ مجموعی پوری نوعِ انسانی کے علم میں نہ کبھی تھیں، نہ آج ہیں، نہ آیندہ کبھی آئیں گی۔ ایسا ہی معاملہ جِنّوں اور فرشتوں اور دوسری مخلوقات کا ہے کہ بعض چیزیں ان میں سے کسی سے مخفی اور کسی کو معلوم ہیں، اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ان سب سے مخفی ہیں اور کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ تمام اقسام کے غیب صرف ایک ذات پر روشن ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز غیب نہیں، سب شہادت ہی شہادت ہے۔

اس حقیقت کو بیان کرنے میں سوال کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو اوپر تخلیق و تدبیرِ کائنات اور رَزّاقی کے بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن صفات کے آثار تو بالکل نمایاں ہیں جنھیں ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور ان کے بارے میں کفار و مشرکین تک یہ مانتے تھے اور مانتے ہیں کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اس لیے وہاں طرزِ اِستدلال یہ تھا کہ جب یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں اور کوئی ان میں اس کا شریک نہیں ہے، تو پھر خدائی میں تم نے دوسروں کو کیسے شریک بنا لیا اور عبادت کے مستحق وہ کس بنا پر ہو گئے؟ لیکن علم کی صفت اپنے کوئی محسوس آثار نہیں رکھتی جن کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ یہ معاملہ صرف غور و فکر ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس لیے اس کو سوال کے بجائے دعوے کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ہر صاحبِ عقل کا کام ہے کہ وہ اپنی جگہ اس امر پر غور کرے کہ فی الحقیقت کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب ہو؟ یعنی تمام اُن احوال اور اشیا اور حقائق کا جاننے والا ہو جو کائنات میں کبھی تھیں، یا اب ہیں، یا آیندہ ہوں گی۔ اور اگر کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا تو پھر کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ جو لوگ پوری طرح حقائق اور احوال سے واقف ہی نہیں ہیں، ان میں سے کوئی بندوں کا فریاد رس اور حاجت رَوا اور مشکل کشا ہو سکے؟

اُلوہیّت اور علمِ غیب کے درمیان ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں بھی خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے، اُس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا انسان کا ذہن اِس حقیقت سے بالکل بدیہی طور پر آگاہ ہے کہ قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا، دعاؤں کا سننا، حاجتیں پوری کرنا اور ہر طالبِ امداد کی مدد کو پہنچنا صرف اُسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو سب کچھ جانتی ہو اور جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ ہو۔ اِسی بنا پر تو انسان جس کو بھی خدائی اختیارات کا حامل سمجھتا ہے اُسے لازماً عالم الغیب بھی سمجھتا ہے، کیونکہ اس کی عقل بلا ریب شہادت دیتی ہے کہ علم اور اختیارات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ خالق اور مدبِّر اور مجیب الدعوات اور رازق خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، جیسا کہ اُوپر کی آیات میں ثابت کیا گیا ہے، تو آپ سے آپ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم الغیب بھی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ آخر کون اپنے ہوش و حواس میں یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی فرشتے یا جِنّ یا نبی یا ولی کو، یا کسی مخلوق کو بھی یہ معلوم ہوگا کہ سمندر میں، اور ہوا میں، اور زمین کی تہوں میں، اور سطحِ زمین کے اُوپر کس کس قسم کے کتنے جانور کہاں کہاں ہیں؟ اور عالَمِ بالا کے بے حدّ و حساب سیّاروں کی ٹھیک تعداد کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک میں کس کس طرح کی مخلوقات موجود ہیں؟ اور ان مخلوقات کا ایک ایک فرد کہاں ہے اور کیا اس کی ضروریات ہیں؟

یہ سب کچھ اللہ کو تو لازماً معلوم ہونا چاہیے، کیونکہ اس نے انھیں پیدا کیا ہے، اور اسی کو ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کے حالات کی نگہبانی کرنی ہے، اور وہی ان کے رزق کا انتظام کرنے والا ہے لیکن دوسرا کوئی اپنے محدود وجود میں یہ وسیع و محیط علم رکھ کیسے سکتا ہے، اور اس کا کیا تعلق اِس کارِ خلّاقی و رزّاقی سے ہے کہ وہ اِن چیزوں کو جانے؟

پھر یہ صفت قابلِ تجزیہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بندہ مثلاً صرف زمین کی حد تک، اور زمین میں بھی صرف انسانوں کی حد تک عالم الغیب ہو۔ یہ اُسی طرح قابلِ تجزیہ نہیں ہے جس طرح خدا کی خلّاقی و رزّاقی اور قیّومی و پروردگاری قابلِ تجزیہ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انسان دُنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور قیامت تک پیدا ہوں گے، رحم مادر میں استقرار کے وقت سے آخری ساعتِ حیات تک ان سب کے تمام حالات و کیفیات کو جاننا آخر کس بندے کا کام ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیسے اور کیوں اس کو جانے گا؟ کیا وہ اِس بے حد و حساب خلقت کا خالق ہے؟ کیا اس نے ان کے باپوں کے نطفے میں ان کے جرثومے کو وجود بخشا تھا؟ کیا اس نے ان کی ماؤں کے رحم میں ان کی صورت گری کی تھی؟ کیا اس نے ان کی زندہ ولادت کا انتظام کیا تھا؟ کیا اس نے ان میں سے ایک ایک شخص کی قسمت بنائی تھی؟ کیا وہ ان کی موت اور حیات، ان کی صحّت اور مرض، ان کی خوش حالی اور بدحالی، اور ان کے عُروج اور زوال کے فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہے؟ اور آخر یہ کام کب سے اس کے ذمے ہُوا؟ اس کی اپنی ولادت سے پہلے یا اس کے بعد؟ اور صرف انسانوں کی حد تک یہ ذمہ داریاں محدود کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ کام تو لازماً زمین اور آسمانوں کے عالم گیر انتظام کا ایک جُز ہے۔ جو ہستی ساری کائنات کی تدبیر کر رہی ہے، وہی تو انسان کی پیدائش و موت اور ان کے رزق کی تنگی و کشادگی اور ان کی قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور جس قدر چاہے اپنی معلومات کا کوئی گوشہ کھول دے، اور کسی غیب یا بعض غیوب کو اس پر روشن کر دے، لیکن علمِ غیب بحیثیتِ مجموعی کسی کو نصیب نہیں اور عالم الغیب ہونے کی صفت صرف اللہ رب العالمین کے لیے مخصوص ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ”اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں کوئی نہیں جانتا اُس کے سوا۔“ (الانعام، آیت ۵۹) اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ”اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش نازل کرنے والا ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا (پرورش پا رہا) ہے۔ اور کوئی مُتنفّس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی مُتنفّس کو خبر نہیں ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی۔“ (لقمان، آیت ۳۴) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ ”وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اور اس کے علم میں سے کسی چیز پر بھی وہ احاطہ نہیں کر سکتے، اِلّا یہ کہ وہ جس چیز کا چاہے انھیں علم دے۔“ (البقرہ، آیت ۲۵۵)

قرآنِ مجید مخلوقات کے لیے علمِ غیب کی اس عام اور مُطلَق نفی پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ خاص طور پر انبیا علیہم السلام

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ

ع ۸ / ۱

بلکہ آخرت کا تو علم ہی اِن لوگوں سے گُم ہوگیا ہے، بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے ہیں[۸۵] ع یہ منکرین کہتے ہیں: "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے

اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس امر کی صاف صاف تصریح کرتا ہے کہ وہ عالم الغیب نہیں ہیں اور اُن کو غیب کا صرف اُتنا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے جو رسالت کی خدمت انجام دینے کے لیے درکار تھا۔ سورۂ اَنعام، آیت ۵۰۔ الاعراف، آیت ۱۸۷۔ التوبہ، آیت ۱۰۱۔ ہود، آیت ۳۱۔ اَحزاب، آیت ۶۳۔ الاحقاف، آیت ۹۔ التحریم، آیت ۳۔ اور الجن، آیات ۲۶ تا ۲۸ اِس معاملے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں چھوڑتیں۔

قرآن کی یہ تمام تصریحات زیرِ بحث آیت کی تائید و تشریح کرتی ہیں، جن کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجایش نہیں رہتی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ کوئی دوسرا بھی جمیع ما کان وما یکون کا علم رکھتا ہے، قطعاً ایک غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ شیخین، ترمذی، نَسائی، امام احمد، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم نے صحیح سندوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من زعم انه (ای النبی صلی اللّٰہ علیه وسلّم) یعلم ما یکون فی غد فقد اعظم علی اللّٰہ الفریة واللّٰہ یقول قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یعنی "جس نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے، اس نے اللہ پر سخت جھوٹ کا الزام لگایا، کیونکہ اللہ تو فرماتا ہے: اے نبی! تم کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہے۔" ابن المُنذِر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگرد عِکْرِمَہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "اے محمدؐ! قیامت کب آئے گی؟ اور ہمارے علاقے میں قحط برپا ہے، بارش کب ہوگی؟ اور میری بیوی حاملہ ہے، وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں نے آج کیا کمایا ہے، کل میں کیا کماؤں گا؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں، مروں گا کہاں؟" ان سوالات کے جواب میں سورۂ لقمان کی وہ آیت حضورؐ نے سنائی جو اُوپر ہم نے نقل کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ...... پھر بخاری و مسلم اور دوسری کُتُبِ حدیث کی وہ مشہور روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے جس میں ذکر ہے کہ صحابہؓ کے مجمع میں حضرت جبریلؑ نے انسانی شکل میں آ کر حضورؐ سے جو سوالات کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے جواب دیا: ما المسئول عنها باعلم من السائل (جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا)۔ پھر فرمایا: یہ اُن پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور یہی مذکورہ بالا آیت حضورؐ نے تلاوت فرمائی۔

۸۴ – یعنی دوسرے، جن کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہیں، اور اسی بنا پر جن کو تم لوگوں نے

ءَاِنَّا لَمُخۡرَجُوۡنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدۡ وُعِدۡنَا هٰذَا نَحۡنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۶۸﴾ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانْظُرُوۡا

تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آبا و اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں، مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سُنتے چلے آ رہے ہیں۔" کہو: ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ

خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے، اُن بیچاروں کو تو خود اپنے مستقبل کی بھی خبر نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کب قیامت کی وہ گھڑی آئے گی جب اللہ تعالیٰ اُن کو دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے گا۔

۸۵- اُلُوہیّت کے بارے میں ان لوگوں کی بنیادی غلطیوں پر مُتنبّہ کرنے کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جو ان شدید گمراہیوں میں پڑے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد یہ کسی دلیل و برہان سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خدائی میں درحقیقت کچھ دوسری ہستیاں اللہ تعالیٰ کی شریک ہیں۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر ہی نہیں کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں، یا اس کی طرف سے شک میں ہیں، یا اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں، اس لیے فکرِ عُقبٰی سے بے نیازی نے ان کے اندر سراسر ایک غیر ذمّہ دارانہ رَوِیّہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی سنجیدگی رکھتے ہی نہیں۔ اِن کو اس کی پروا ہی نہیں ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اِن کا فلسفۂ حیات اُس حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک آخرِ کار مشرک اور دہریے اور موَحّد اور مُشکّک سب کو مر کر مٹی ہو جانا ہے اور کسی چیز کا بھی کوئی نتیجہ نکلنا نہیں ہے۔

آخرت کا یہ مضمون اس سے پہلے کی آیت کے اِس فقرے سے نکلا ہے کہ "وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔" اُس فقرے میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ جن کو معبود بنایا جاتا ہے ـــــ اور ان میں فرشتے، جِنّ، انبیاؑ اور اولیا سب شامل تھے ـــــ ان میں سے کوئی بھی آخرت کے وقت سے واقف نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے بعد اب عام مشرکین و کفار کے بارے میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں: اوّل یہ کہ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ آخرت کبھی ہو گی بھی یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ بے خبری اس بنا پر نہیں ہے کہ انھیں اس کی اطلاع ہی کبھی نہ دی گئی ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ جو خبر انھیں دی گئی، اس پر انھوں نے یقین نہیں کیا بلکہ اس کی صحّت میں شک کرنے لگے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے کبھی غور و خوض کر کے اُن دلائل کو جانچنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی جو آخرت کے وقوع کے بارے میں پیش کیے گئے، بلکہ اس کی طرف سے اندھے بن کر رہنے ہی کو انھوں نے ترجیح دی۔

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ

مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے[۸۶]۔ اَے نبیؐ! اِن کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ اِن کی چالوں پر

۸۶- اس مختصر سے فقرے میں آخرت کی دو زبردست دلیلیں بھی ہیں اور نصیحت بھی۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی آخرت کو نظر انداز کیا ہے، وہ مجرم بنے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ وہ غیر ذمہ دار بن کر رہیں، انھوں نے ظلم وستم ڈھائے، وہ فِسق و فُجور میں غرق ہوگئیں، اور اَخلاق کی تباہی نے آخرکار ان کو برباد کر کے چھوڑا۔ یہ تاریخِ انسانی کا مُسلسل تجَربہ، جس پر زمین میں ہر طرف تباہ شدہ قوموں کے آثار شہادت دے رہے ہیں، صاف ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے ماننے اور نہ ماننے کا نہایت گہرا تعلق انسانی رَوِیّے کی صحّت اور عَدَمِ صحت سے ہے۔ اس کو مانا جائے تو رَوِیّہ دُرست رہتا ہے۔ نہ مانا جائے تو رویّہ غلط ہو جاتا ہے۔ یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اس کا ماننا حقیقت کے مطابق ہے، اسی لیے اس کے ماننے سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے۔ اور اس کا نہ ماننا حقیقت کے خلاف ہے، اسی وجہ سے یہ گاڑی پٹڑی سے اُتر جاتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل تجَربے میں مجرم بن جانے والی قوموں کا مُسلسل تباہ ہونا اس حقیقت پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ کائنات بے شُعور طاقتوں کی اندھی بہری فرماں روائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانونِ مُکافات کام کر رہا ہے۔ جس کی حکومت انسانی قوموں کے ساتھ سراسر اَخلاقی بنیادوں پر معاملہ کر رہی ہے۔ جس میں کسی قوم کو بدکرداریوں کی کُھلی چھوٹ نہیں دی جاتی کہ ایک دفعہ عروج پا جانے کے بعد وہ ابدالآباد تک دادِعیش دیتی رہے اور ظلم وستم کے ڈنکے بجائے چلی جائے۔ بلکہ ایک خاص حد کو پہنچ کر ایک زبردست ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس کو بامِ عُروج سے گرا کر قعرِ مَذلّت میں پھینک دیتا ہے۔ اس حقیقت کو جو شخص سمجھ لے، وہ کبھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ یہی قانونِ مُکافات اِس دُنیوی زندگی کے بعد ایک دوسرے عالَم کا تقاضا کرتا ہے جہاں افراد کا اور قوموں کا اور بحیثیتِ مجموعی پوری نوعِ انسانی کا انصاف چُکایا جائے۔ کیونکہ محض ایک ظالم قوم کے تباہ ہو جانے سے تو انصاف کے سارے تقاضے پورے نہیں ہوگئے۔ اس سے اُن مظلوموں کی تو کوئی دادرسی نہیں ہوئی جن کی لاشوں پر انھوں نے اپنی عظمت کا قصر بنایا تھا۔ اس سے ان ظالموں کو تو کوئی سزا نہیں ملی جو تباہی کے آنے سے پہلے مزے اڑا کر جا چکے تھے۔ اس سے ان بدکاروں پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہوا جو پشت در پشت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے گمراہیوں اور بداَخلاقیوں کی میراث چھوڑتے چلے گئے تھے۔ دُنیا میں عذاب بھیج کر تو صرف اُن کی آخری نسل کے مزید ظلم کا سلسلہ توڑ دیا گیا۔ ابھی عدالت کا اصل کام تو ہُوا ہی نہیں کہ ہر ظالم کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ہر مظلوم کے نقصان کی تلافی کی جائے، اور اُن سب لوگوں کو انعام دیا جائے جو بدی کے اِس طوفان میں راستی پر قائم اور اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور عمر بھر اِس راہ میں اذیتیں سہتے رہے۔ یہ سب لازماً کسی وقت ہونا چاہیے، کیونکہ دُنیا میں قانونِ مُکافات کی مسلسل کارفرمائی کائنات کی فرماں روا حکومت کا یہ مزاج اور طریقۂ کار صاف بتا رہی ہے کہ وہ انسانی اعمال کو ان کی اَخلاقی قدر کے لحاظ سے تولتی اور ان کی جزا و سزا دیتی ہے۔

ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۷۱﴾ قُلۡ عَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ رَدِفَ لَكُمۡ بَعۡضُ الَّذِىۡ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

دل تنگ ہو[87] ـــــ وہ کہتے ہیں کہ ”یہ دھمکی کب پُوری ہو گی اگر تم سچے ہو؟“[88] کہو: کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو، اس کا ایک حصّہ تمھارے قریب ہی آ لگا ہو۔[89] حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[90]

ان دو دلیلوں کے ساتھ اس آیت میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ پچھلے مجرموں کا انجام دیکھ کر اس سے سبق لو اور انکارِ آخرت کے اُسی احمقانہ عقیدے پر اصرار نہ کیے چلے جاؤ جس نے اُنھیں مجرم بنا کر چھوڑا تھا۔

۸۷ – یعنی تم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ نہیں مانتے اور اپنی حماقت پر اصرار کر کے عذابِ الٰہی کے مستحق بنناہی چاہتے ہیں تو تم خواہ مخواہ ان کے حال پر کُڑھ کُڑھ کر اپنی جان کیوں ہلکان کرو۔ پھر یہ حقیقت وصداقت سے لڑنے اور تمھاری اصلاحی کوششوں کو نیچا دکھانے کے لیے جو گھٹیا درجے کی چالیں چل رہے ہیں، اُن پر کبیدہ خاطر ہونے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ تمھاری پشت پر خدا کی طاقت ہے۔ یہ تمھاری بات نہ مانیں گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

۸۸ – اس سے مراد وہی دھمکی ہے جو اُوپر کی آیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس فقرے میں ہماری خبر لینے کی جو در پردہ دھمکی دی جا رہی ہے، یہ آخر کب عمل میں لائی جائے گی؟ ہم تو تمھاری بات رد بھی کر چکے ہیں اور تمھیں نیچا دکھانے کے لیے اپنی تدبیروں میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اب کیوں ہماری خبر نہیں لی جاتی؟

۸۹ – یہ شاہانہ کلام کا انداز ہے۔ قادرِ مُطلَق کے کلام میں جب ”شاید“ اور ”کیا عجب“ اور ”کیا بعید ہے“ جیسے الفاظ آتے ہیں تو ان میں شک کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ ان سے شانِ بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی غالب ہے کہ اس کا کسی چیز کو چاہنا اور اس چیز کا ہو جانا گویا ایک ہی بات ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اس لیے اس کا یہ فرمانا کہ ”کیا عجب ایسا ہو“ یہ معنٰی رکھتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اگر تم سیدھے نہ ہوئے۔ ایک معمولی تھانیدار بھی اگر بستی کے کسی شخص سے کہہ دے کہ تمھاری شامت پکار رہی ہے تو اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ کجا کہ قادرِ مطلق کسی سے کہہ دے کہ تمھارا بُرا وقت کچھ دُور نہیں ہے، اور پھر وہ بے خوف رہے۔

۹۰ – یعنی یہ تو اللہ ربّ العالمین کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو قصور سرزد ہوتے ہی نہیں پکڑ لیتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس پر شکر گزار ہو کر اس مہلت کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال نہیں کرتے، بلکہ مواخذے میں دیر ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہاں کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے، اس لیے جو جی میں آئے کرتے رہو اور کسی سمجھانے والے

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾

بلا شبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔[91] آسمان وزمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔[92]

یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں،[93]

کی بات مان کر نہ دو۔

۹۱ – یعنی وہ اِن کی عَلانِیَہ حرکات ہی سے واقف نہیں ہے بلکہ جو شدید بغض اور کینہ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور جو چالیں یہ اپنے دلوں میں سوچتے ہیں، ان سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ اس لیے جب ان کی شامت آنے کا وقت آن پہنچے گا تو کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی جس پر ان کی خبر نہ لی جائے۔ یہ اندازِ بیان اسی طرح کا ہے جیسے ایک حاکم اپنے علاقے کے کسی بدمَعاش سے کہے: مجھے تیرے سب کرتُوتوں کی خبر ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باخبر ہونے کی اسے اطلاع دے رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آ جا، ورنہ یاد رکھ کہ جب پکڑا جائے گا تو تیرے ایک ایک جرم کی پوری سزا دی جائے گی۔

۹۲ – یہاں کتاب سے مراد قرآن نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا وہ ریکارڈ ہے جس میں ذرّہ ذرّہ ثبت ہے۔

۹۳ – اس فقرے کا تعلق مضمونِ سابق سے بھی ہے اور مضمونِ مابعد سے بھی۔ مضمونِ سابق سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اسی عالم الغیب خدا کے علم کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے اس قرآن میں اُن واقعات کی حقیقت کھولی جا رہی ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں گزرے ہیں، حالانکہ خود علمائے بنی اسرائیل کے درمیان ان کی اپنی تاریخ کے ان واقعات میں اختلاف ہے (اس کے نظائر اسی سورۂ نمل کے ابتدائی رکوعوں میں گزر چکے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے حواشی میں واضح کیا ہے)۔ اور مضمونِ مابعد سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن اختلافات کا فیصلہ فرمایا ہے، اسی طرح وہ اُس اختلاف کا بھی فیصلہ کر دے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخالفین کے درمیان برپا ہے۔ وہ کھول کر رکھ دے گا کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ چنانچہ اِن آیات کے نُزول پر چند ہی سال گزرے تھے کہ فیصلہ ساری دنیا کے سامنے آ گیا۔ اُسی عرب کی سرزمین میں، اور اسی قبیلۂ قریش میں ایک مُتنفّس بھی ایسا نہ

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَ مَآ

---

اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔[۹۴] یقیناً (اِسی طرح) تیرا رب اِن لوگوں کے درمیان[۹۵] بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۹۶] پس اے نبیؐ! اللہ پر بھروسا رکھو، یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے[۹۷]، نہ اُن بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں،[۹۸] اور نہ

---

رہا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ حق پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے، نہ کہ ابوجہل اور ابولہب۔ ان لوگوں کی اپنی اولاد تک مان گئی کہ ان کے باپ غلطی پر تھے۔

۹۴- یعنی اُن لوگوں کے لیے جو اس قرآن کی دعوت قبول کر لیں اور وہ بات مان لیں جسے یہ پیش کر رہا ہے۔ ایسے لوگ اُن گمراہیوں سے بچ جائیں گے جن میں ان کی قوم مبتلا ہے۔ ان کو اس قرآن کی بدولت زندگی کا سیدھا راستہ مل جائے گا اور ان پر خدا کی وہ مہربانیاں ہوں گی جن کا تصور بھی کفارِ قریش آج نہیں کر سکتے۔ اس رحمت کی بارش کو بھی چند ہی سال بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی لوگ جو ریگ زارِ عرب کے ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور کفر کی حالت میں زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب چھاپا مار بن سکتے تھے، اس قرآن پر ایمان لانے کے بعد یکایک وہ دنیا کے پیشوا، قوموں کے امام، تہذیبِ انسانی کے استاد اور رُوئے زمین کے ایک بڑے حصّے پر فرمانروا ہو گئے۔

۹۵- یعنی قریش کے کفار اور اہلِ ایمان کے درمیان۔

۹۶- یعنی نہ اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے، اور نہ اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی احتمال ہے۔

۹۷- یعنی ایسے لوگوں کو جن کے ضمیر مر چکے ہیں اور جن میں ضد اور ہٹ دھرمی اور رسم پرستی نے حق و باطل کا فرق سمجھنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں چھوڑی ہے۔

۹۸- یعنی جو تمھاری بات کے لیے صرف اپنے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس جگہ سے کترا کر نکل جاتے ہیں جہاں انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تمھاری بات ان کے کان میں نہ پڑ جائے۔

أَنتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَن ضَلٰلَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨١﴾ وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾ ع

ع ۶ ۱۲

اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔[99] تم تو اپنی بات اُنھی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

اور جب ہماری بات پُوری ہونے کا وقت اُن پر آپہنچے گا[100] تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔[101] ع

۹۹- یعنی اِن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اِنھیں سیدھے راستے پر کھینچ لانا اور گھسیٹ کر لے چلنا تو تمھارا کام نہیں ہے۔ تم تو صرف زبان اور اپنی مثال ہی سے بتا سکتے ہو کہ یہ سیدھا راستہ ہے اور وہ راستہ غلط ہے جس پر یہ لوگ چل رہے ہیں۔ مگر جس نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہوں اور جو دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو، اس کی رہنمائی تم کیسے کرسکتے ہو۔

۱۰۰- یعنی قیامت قریب آجائے گی جس کا وعدہ ان سے کیا جا رہا ہے۔

۱۰۱- ابنِ عمرؓ کا قول ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب زمین میں کوئی نیکی کا حکم کرنے والا اور بدی سے روکنے والا باقی نہ رہے گا۔ ابنِ مَردُویَہ نے ایک حدیث ابوسعید خُدریؓ سے نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہی بات انھوں نے خود حضورؐ سے سُنی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں گے تو قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک جانور کے ذریعے سے آخری مرتبہ حجت قائم فرمائے گا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک ہی جانور ہوگا یا ایک خاص قسم کی جنسِ حیوان ہوگی جس کے بہت سے افراد رُوئے زمین پر پھیل جائیں گے۔ دَآبَّةً مِّنَ الْأَرْضِ کے الفاظ میں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ بہرحال جو بات وہ کہے گا وہ یہ ہوگی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان آیات پر یقین نہیں کرتے تھے جن میں قیامت کے آنے اور آخرت برپا ہونے کی خبریں دی گئی تھیں، تو لو اب اس کا وقت آن پہنچا ہے اور جان لو کہ اللہ کی آیات سچی تھیں۔ یہ فقرہ کہ ''لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے'' یا تو اس جانور کے اپنے کلام کی نقل ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کلام کی حکایت۔ اگر یہ اُسی کے الفاظ کی نقل ہے تو ''ہماری'' کا لفظ وہ اُسی طرح استعمال کرے گا جس طرح ایک حکومت کا ہر کارندہ ''ہم'' کا لفظ اس معنیٰ میں بولتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے بات کر رہا ہے، نہ کہ اپنی شخصی حیثیت میں۔ دوسری صورت میں بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کلام کو چونکہ اپنے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے، اس لیے اس نے ''ہماری آیات'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰٓى إِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

---

اور ذرا تصوّر کرو اُس دن کا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک فوج کی فوج اُن لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جُھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مُرتّب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے، تو (ان کا رب ان سے) پُوچھے گا کہ "تم نے میری آیات کو جُھٹلا دیا، حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟[۱۰۲] اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟"[۱۰۳] اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا، تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔

---

اس جانور کے نکلنے کا وقت کون سا ہوگا؟ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ "آفتاب مغرب سے طُلوع ہوگا اور ایک روز دن دہاڑے یہ جانور نکل آئے گا۔ ان میں سے جو نشانی بھی پہلے ہو، وہ بہر حال دوسری کے قریب ہی ظاہر ہوگی۔" (مسلم) دوسری رِوایات جو مسلم، ابنِ ماجہ، تِرمِذی اور مُسنَدِ احمد وغیرہ میں آئی ہیں، ان میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دجّال کا خُروج، دابۃ الارض کا ظہور، دُخان (دھواں)، اور آفتاب کا مغرب سے طُلوع وہ نشانیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی۔

اس جانور کی ماہیت، شکل و صورت، نکلنے کی جگہ، اور ایسی ہی دوسری تفصیلات کے متعلق طرح طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں جو باہم بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ ان چیزوں کے ذکر سے بجز ذہن کی پراگندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور ان کے جاننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں، کیونکہ جس مقصد کے لیے قرآن میں یہ ذکر کیا گیا ہے، اس سے ان تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہا کسی جانور کا انسانوں سے انسانی زبان میں کلام کرنا، تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے نُطق کی طاقت بخش سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے تو وہ ایک جانور ہی کو نُطق بخشے گا، مگر جب وہ قیامت قائم ہو جائے گی تو اللہ کی عدالت میں انسان کی آنکھ اور کان اور اس کے جسم کی کھال تک بول اُٹھے گی، جیسا کہ قرآن میں بتصریح بیان ہوا ہے: حَتّٰٓى إِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (حٰمٓ السجدہ، آیات ۲۰-۲۱)

۱۰۲- یعنی تمھارے جھٹلانے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ کسی علمی ذریعے سے تحقیق کر کے تمھیں معلوم ہوگیا تھا کہ یہ آیات جھوٹی ہیں۔ تم نے تحقیق اور غور وفکر کے بغیر بس یوں ہی ہماری آیات کو جھٹلا دیا؟

۱۰۳- یعنی اگر ایسا نہیں ہے تو کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم نے تحقیق کے بعد ان آیات کو جھوٹا ہی پایا تھا اور

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ

کیا ان کو سُجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سُکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟[۱۰۴] اسی میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔[۱۰۵]

اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صُور پھُونکا جائے گا اور ہَول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں[۱۰۶] ــــــ سوائے اُن لوگوں کے جنھیں اللہ اس ہَول سے بچانا چاہے گا ــــــ اور سب کان دبائے اس کے حُضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تُو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں،

تمھیں واقعی یہ علم حاصل ہو گیا تھا کہ حقیقتِ نفس الامری وہ نہیں ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے؟

۱۰۴ - یعنی بے شمار نشانیوں میں سے یہ دو نشانیاں تو ایسی تھیں جن کا وہ سب ہر وقت مُشاہدہ کر رہے تھے، جن کے فوائد سے ہر آن مُتمتّع ہو رہے تھے، جو کسی اندھے، بہرے اور گونگے تک سے چھُپی ہوئی نہ تھیں۔ کیوں نہ رات کے آرام اور دن کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے وقت انھوں نے کبھی سوچا کہ یہ ایک حکیم کا بنایا ہوا نظام ہے جس نے ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کا تعلق قائم کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں مقصدیت، حکمت اور منصوبہ بندی عَلانیہ نظر آ رہی ہے جو اندھے قُوائے فطرت کی صفت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت سے خداؤں کی کارفرمائی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نظام لامحالہ کسی ایک ہی ایسے خالق و مالک اور مُدبِّر کا قائم کیا ہُوا ہو سکتا ہے جو زمین، چاند، سورج اور تمام دوسرے سیّاروں پر فرماں روائی کر رہا ہو۔ صرف اسی ایک چیز کو دیکھ کر وہ جان سکتے تھے کہ ہم نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعے سے جو حقیقت بتائی ہے، یہ رات اور دن کی گردش اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

۱۰۵ - یعنی یہ کوئی نہ سمجھ میں آسکنے والی بات بھی نہیں تھی۔ آخر انھی کے بھائی بند، انھی کے قبیلے اور برادری کے لوگ، انھی جیسے انسان ایسے موجود تھے جو یہی نشانیاں دیکھ کر مان گئے تھے کہ نبی جس خدا پرستی اور توحید کی طرف بلا رہا ہے وہ بالکل مطابقِ حقیقت ہے۔

۱۰۶ - نفخِ صُور پر مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۴۷۔ ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ سورۂ حج، حاشیہ ۱۔ یٰسین، حواشی ۴۶ - ۴۷۔ الزُّمَر، حاشیہ ۷۹۔

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَیۡءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۸۸﴾ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَهُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ یَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ ؕ هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۰﴾

---

مگر اُس وقت یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔[۱۰۷] جو شخص بھلائی لے کر آئے گا، اسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا[۱۰۸] اور ایسے لوگ اُس دن ہَول سے محفوظ ہوں گے۔[۱۰۹] اور جو بُرائی لیے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اَوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟[۱۰۹ الف]

---

۱۰۷- یعنی ایسے خدا سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ اپنی دنیا میں تم کو عقل و تمیز اور تصرّف کے اختیارات دے کر وہ تمھارے اعمال و افعال سے بے خبر رہے گا اور یہ نہ دیکھے گا کہ اس کی زمین میں تم ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے رہے ہو۔

۱۰۸- یعنی وہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہو گا کہ جتنی نیکی اس نے کی ہو گی، اس سے زیادہ انعام اسے دیا جائے گا۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی نیکی تو وقتی تھی اور اس کے اثرات بھی دنیا میں ایک محدود زمانے کے لیے تھے، مگر اس کا اجر دائمی اور اَبدی ہو گا۔

۱۰۹- یعنی قیامت اور حشر و نشر کی وہ ہولناکیاں جو منکرینِ حق کے حواس باختہ کیے دے رہی ہوں گی، ان کے درمیان یہ لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو گا۔ وہ پہلے سے اللہ اور اس کے رسولوں کی دی ہوئی خبروں کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ قیامت قائم ہونی ہے، ایک دوسری زندگی پیش آنی ہے اور اس میں یہی سب کچھ ہونا ہے۔ اس لیے ان پر وہ بدحواسی اور گھبراہٹ طاری نہ ہو گی جو مرتے دم تک اس چیز کا انکار کرنے والوں اور اس سے غافل رہنے والوں پر طاری ہو گی۔ پھر ان کے اطمینان کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ انھوں نے اس دن کی توقع پر اس کے لیے فکر کی تھی اور یہاں کی کامیابی کے لیے کچھ سامان کر کے دنیا سے آئے تھے۔ اس لیے اُن پر وہ گھبراہٹ طاری نہ ہو گی جو ان لوگوں پر طاری ہو گی جنھوں نے اپنا سارا سرمایۂ حیات دنیا ہی کی کامیابیاں حاصل کرنے پر لگا دیا تھا اور کبھی نہ سوچا تھا کہ کوئی آخرت بھی ہے جس کے لیے کچھ سامان کرنا ہے۔ منکرین کے برعکس یہ مومنین اب مطمئن ہوں گے کہ جس دن کے لیے ہم نے ناجائز فائدوں اور لذتوں کو چھوڑا تھا، اور صعوبتیں اور مشقّتیں برداشت کی تھیں، وہ دن آ گیا ہے اور اب یہاں ہماری محنتوں کا اجر ضائع ہونے والا نہیں ہے۔

۱۰۹، الف۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ آخرت میں بدی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنی کسی نے بدی کی ہو اور نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ آدمی کے عمل سے بہت زیادہ عطا فرمائے گا۔ اس کی مزید مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو:

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾ وَأَنْ أَتْلُوَا الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

(اے محمدؐ! اِن سے کہو:) ”مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اِس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اِسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے[110]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سُناؤں۔“ اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا۔ اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ ان سے کہو: تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، عنقریب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انھیں پہچان لو گے، اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے اُن اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔ؑ

یونُس، آیات ۲۶۔۲۷۔ القصص، آیت ۸۴۔ العنکبوت، آیت ۷۔ سبا، آیات ۳۷۔۳۸۔ المومن، آیت ۴۰۔

**۱۱۰** – یہ سورت چونکہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب کہ اسلام کی دعوت ابھی صرف مکّۂ معظّمہ تک محدود تھی اور مخاطَب صرف اس شہر کے لوگ تھے، اس لیے فرمایا: ”مجھے اِس شہر کے رب کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔“ اس کے ساتھ اس رب کی خصوصیّت یہ بیان کی گئی کہ اس نے اسے حرم بنایا ہے۔ اس سے کفارِ مکہ کو مُتنبِّہ کرنا مقصود ہے کہ جس خدا کا تم پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عرب کی انتہائی بدامنی اور فساد و خوں ریزی سے لبریز سرزمین میں تمھارے اِس شہر کو امن کا گہوارہ بنا رکھا ہے، اور جس کے فضل سے تمھارا یہ شہر پورے ملکِ عرب کا مرکزِ عقیدت بنا ہوا ہے، تم اس کی ناشکری کرنا چاہو تو کرتے رہو، مگر مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ بنوں اور اسی کے آگے سرِ نیاز جھکاؤں۔ تم جنھیں معبود بنائے بیٹھے ہو، ان میں سے کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ اس شہر کو حرم بنا دیتا اور عرب کے جنگجو اور غارت گر قبیلوں سے اس کا احترام کرا سکتا۔ میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اصل محسن کو چھوڑ کر اُن کے آگے جھکوں جن کا کوئی ذرّہ برابر بھی احسان مجھ پر نہیں ہے۔

# تفہیم القرآن

# القصص

(۲۸)

# القصص

**نام** آیت ۲۵ کے اس فقرے سے ماخوذ ہے: وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ، یعنی وہ سورہ جس میں القصص کا لفظ آیا ہے۔ لُغت کے اعتبار سے قصص کے معنیٰ ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لفظ باعتبارِ معنیٰ بھی اس سورہ کا عنوان ہوسکتا ہے، کیونکہ اس میں حضرت موسیٰؑ کا مفصل قصہ بیان ہُوا ہے۔

**زمانۂ نُزُول** سورۂ نمل کے دیباچے میں ابنِ عباسؓ اور جابر بن زید کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ سورۂ شعراء، سورۂ نمل اور سورۂ قصص یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ زبان، اندازِ بیان اور مضامین سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان تینوں سورتوں کا زمانۂ نُزُول قریب قریب ایک ہی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی ان تینوں میں قریبی تعلق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے مختلف اجزا جو اِن میں بیان کیے گئے ہیں، وہ باہم مل کر ایک پورا قصہ بن جاتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں نبوت کا منصب قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ عرض کرتے ہیں کہ "قومِ فرعون کا ایک جرم میرے ذمہ ہے جس کی وجہ سے میں ڈرتا ہوں کہ وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔" پھر جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے ہاں تشریف لے جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: "کیا ہم نے اپنے ہاں تجھے بچہ سا نہیں پالا تھا، اور تُو ہمارے ہاں چند سال رہا، پھر کر گیا جو کچھ کہ کر گیا۔" ان دونوں باتوں کی کوئی تفصیل وہاں نہیں بیان کی گئی۔ اِس سورہ میں اُسے بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ نمل میں قصہ یکایک اس بات سے شروع ہوگیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے اہل وعیال کو لے کر جا رہے تھے، اور اچانک انھوں نے ایک آگ دیکھی۔ وہاں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ یہ کیسا سفر تھا، کہاں سے وہ آ رہے تھے اور کدھر جا رہے تھے۔ یہ تفصیل اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ تینوں سورتیں مل کر قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی تکمیل کر دیتی ہیں۔

**موضوع اور مَباحِث** اِس کا موضوع اُن شبہات واعتراضات کو رفع کرنا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر وارد کیے جا رہے تھے، اور اُن عذرات کو قطع کرنا ہے جو آپؐ پر ایمان نہ لانے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصّہ بیان کیا گیا ہے، جو زمانۂ نُزُول کے حالات سے مل کر خود بخود چند حقیقتیں سامع کے ذہن نشین کر دیتا ہے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے وہ غیر محسوس طریقے سے اسباب و ذرائع

فراہم کر دیتا ہے۔ جس بچے کے ہاتھوں آخر کار فرعون کا تختہ اُلٹنا تھا، اسے اللہ نے خود فرعون ہی کے گھر میں اس کے اپنے ہاتھوں پرورش کرا دیا اور فرعون یہ نہ جان سکا کہ وہ کسے پرورش کر رہا ہے۔ اُس خدا کی مَشِیّت سے کون لڑ سکتا ہے، اور کس کی چالیں اس کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ نبوت کسی شخص کو کسی بڑے جشن اور زمین و آسمان سے کسی بھاری اعلان کے ساتھ نہیں دی جاتی۔ تم کو حیرت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چپکے سے یہ نبوت کہاں سے مل گئی اور بیٹھے بٹھائے یہ نبی کیسے بن گئے۔ مگر جن موسیٰ (علیہ السلام) کا تم خود حوالہ دیتے ہو کہ لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى (آیت ۴۸)، انھیں بھی اِسی طرح راہ چلتے نبوت مل گئی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ آج طورِ سینا کی سُنسان وادی میں کیا واقعہ پیش آ گیا۔ موسیٰؑ خود ایک لمحے پہلے تک نہ جانتے تھے کہ انھیں کیا چیز ملنے والی ہے۔ آگ لینے چلے تھے اور پیمبری مل گئی۔

تیسرے یہ کہ جس بندے سے خدا کوئی کام لینا چاہتا ہے، وہ بغیر کسی لاؤ لشکر اور سرو سامان کے اٹھتا ہے۔ کوئی اس کا مددگار نہیں ہوتا، کوئی طاقت بظاہر اس کے پاس نہیں ہوتی، مگر بڑے بڑے لاؤ لشکر اور سرو سامان والے آخر کار اس کے مقابلے میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ جو نسبت آج تم اپنے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان پا رہے ہو، اس سے بہت زیادہ فرق موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کی طاقت کے درمیان تھا۔ مگر دیکھ لو کہ آخر کون جیتا اور کون ہارا۔

چوتھے یہ کہ تم لوگ بار بار موسیٰؑ کا حوالہ دیتے ہو کہ ''محمدؐ کو وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔'' یعنی عصا اور یدِ بیضا اور دوسرے کھلے کھلے معجزے۔ گویا تم ایمان لانے کو تو تیار بیٹھے ہو، بس انتظار ہے تو یہ کہ تمھیں وہ معجزے دکھائے جائیں جو موسیٰؑ نے فرعون کو دکھائے تھے۔ مگر تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے تھے، انھوں نے کیا کیا تھا؟ وہ انھیں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ انھوں نے کہا تو یہ کہا کہ یہ جادو ہے۔ کیونکہ وہ حق کے خلاف ہٹ دھرمی اور عِناد میں مبتلا تھے۔ اسی مرض میں آج تم مبتلا ہو۔ کیا تم اُسی طرح کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آؤ گے؟ پھر تمھیں کچھ یہ بھی خبر ہے کہ جن لوگوں نے وہ معجزے دیکھ کر حق کا انکار کیا تھا، ان کا انجام کیا ہُوا؟ آخر کار اللہ نے انھیں تباہ کر کے چھوڑا۔ اب کیا تم بھی ہٹ دھرمی کے ساتھ معجزہ مانگ کر اپنی شامت بلانا چاہتے ہو؟

یہ وہ باتیں ہیں جو کسی تصریح کے بغیر آپ سے آپ ہر اُس شخص کے ذہن میں اُتر جاتی تھیں جو مکے کے کافرانہ ماحول میں اس قصّے کو سنتا تھا، کیونکہ اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان ویسی ہی ایک کشمکش برپا تھی جیسی اس سے پہلے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان برپا ہو چکی تھی، اور ان حالات میں یہ قصّہ سنانے کے معنٰی یہ تھے کہ اس کا ہر ہر جُز وقت کے حالات پر خود بخود چسپاں ہوتا چلا جائے، خواہ ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جائے جس سے معلوم ہو کہ قصّے کا کون سا جُز اِس وقت کے کس معاملے پر چسپاں ہو رہا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رُکوع سے اصل موضوع پر براہِ راست کلام شروع ہوتا ہے۔

پہلے اِس بات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ آپؐ اُمّی ہونے کے باوجود دو ہزار برس پہلے گزرا ہوا ایک تاریخی واقعہ اس تفصیل کے ساتھ من وعن سنا رہے ہیں۔ حالانکہ آپؐ کے شہر اور آپؐ کی برادری کے لوگ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کے پاس ان معلومات کے حاصل ہونے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی وہ نشان دہی کر سکیں۔

پھر آپؐ کے نبی بنائے جانے کو اُن لوگوں کے حق میں اللہ کی ایک رحمت قرار دیا جاتا ہے کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے اور اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ انتظام کیا۔

پھر اُن کے اُس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے جو وہ بار بار پیش کرتے تھے کہ ”یہ نبی وہ معجزے کیوں نہ لایا جو اس سے پہلے موسیٰؑ لائے تھے۔“ ان سے کہا جاتا ہے کہ موسیٰؑ، جن کے متعلق تم خود مان رہے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے معجزے لائے تھے، انھی کو تم نے کب مانا ہے کہ اب اس نبی سے معجزے کا مطالبہ کرتے ہو؟ خواہشاتِ نفس کی بندگی نہ کرو تو حق اب بھی تمھیں نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس مرض میں تم مبتلا رہو تو خواہ کوئی معجزہ آ جائے، تمھاری آنکھیں نہیں کھل سکتیں۔

پھر کفارِ مکہ کو اُس واقعے پر عبرت اور شرم دلائی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا کہ باہَر سے کچھ عیسائی مکہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر ایمان لے آئے، مگر مکے کے لوگ اپنے گھر کی اس نعمت سے مستفید تو کیا ہوتے، ان کے ابوجہل نے اُلٹی ان لوگوں کی کھلّم کھلّا بے عزتی کی۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اُس اصل عذر کو لیا جاتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ ماننے کے لیے وہ پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اہلِ عرب کے دینِ شرک کو چھوڑ کر اس نئے دینِ توحید کو قبول کر لیں تو یکایک اس ملک سے ہماری مذہبی، سیاسی اور مَعاشی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی اور ہمارا حال یہ ہو گا کہ عرب کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے کی حیثیت کھو کر اس سرزمین میں ہمارے لیے کوئی جائے پناہ تک باقی نہ رہے گی۔ یہ چونکہ سردارانِ قریش کی حق دشمنی کا اصل محرک تھا اور باقی سارے شبہات و اعتراضات محض بہانے تھے جو وہ عوام کو فریب دینے کے لیے تراشتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر آخر سورت تک مفصل کلام فرمایا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈال کر نہایت حکیمانہ طریقے سے اُن تمام بنیادی امراض کا مداوا کیا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ حق اور باطل کا فیصلہ دنیوی مفاد کے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔

---

۸۸ آیاتہا

سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ

۹ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَ نُرِيْدُ اَنْ

---

ط-س-م۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ہم موسیٰؑ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمھیں سناتے ہیں[1]، ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں[2]۔

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی[3] اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا[4]۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا[5]۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ

---

۱- تقابل کے لیے ملاحظہ ہو: البقرہ، رکوع ۶۔ الاعراف، رکوع ۱۳ تا ۱۶۔ یونُس، رکوع ۸-۹۔ ہود، رکوع ۹۔ بنی اسرائیل، رکوع ۱۲۔ مریم، رکوع ۴۔ طٰہٰ، رکوع ۱-۴۔ المؤمنون، رکوع ۳۔ الشعراء، رکوع ۲-۴۔ النمل، رکوع ۱۔ العنکبوت، رکوع ۴۔ المومن، رکوع ۳-۵۔ الزُّخرُف، رکوع ۵۔ الدُّخان، رکوع ۱۔ الذّاریات، رکوع ۲۔ النازعات، رکوع ۱۔

۲- یعنی جو لوگ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں، ان کو سنانا تو بے کار ہے۔ البتہ جنھوں نے ہٹ دھرمی کا قفل اپنے دلوں پر چڑھا نہ رکھا ہو، وہ اس گفتگو کے مُخاطَب ہیں۔

۳- اصل میں لفظ عَلَا فِي الْاَرْضِ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں سر اُٹھایا، باغیانہ رَوِش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت یعنی بندگی کے مقام سے اُٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ دھار لیا، ماتحت بن کر رہنے کے بجائے بالادست بن بیٹھا، اور جبار و متکبّر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

۴- یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں

اور سب کو برابر کے حُقوق دیے جائیں، بلکہ اس نے تمدّن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمراں گروہ ٹھیرایا جائے اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا اور لُوٹا جائے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذِمّی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حُقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان، یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اُصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ذِمّیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اُصولی حکومت میں حکمراں جماعت صرف وہی ہوسکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہوسکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے، اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اُصولوں کا منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اُس فرعونی طرزِ تفریق میں کیا وجہِ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم نسل کا کوئی فرد کبھی حکمراں گروہ میں شامل نہیں ہوسکتا۔ جس میں محکوم نسل کے لوگوں کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار، بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے، حتّٰی کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ جس میں محکوموں کے لیے کسی حق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی، تمام فوائد و منافع اور حَسَنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں، اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمراں قوم میں پیدا ہو جائے۔

۵ - بائبل میں اس کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ ہے:

> ”تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسُف کو نہیں جانتا تھا۔ اور اُس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں، سو آؤ ہم اُن کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں، ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انھیں ستائیں۔ سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پِتُوم اور رَعمسیس بنائے ...... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کرایا، اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں، جو وہ ان سے کراتے تھے، تشدّد کی تھیں...... تب مصر کے بادشاہ نے عِبرانی دائیوں سے...... باتیں کیں اور کہا کہ جب عِبرانی (یعنی اسرائیلی) عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو، تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔“ (خُروج، باب ۱۔ آیت ۸-۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسفؑ کا دَور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا تھا اور قِبطیوں کے ہاتھ میں جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾

مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انھیں پیشوا بنا دیں[6] اور انھی کو وارث بنائیں[7] اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون وہامان[8] اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دِکھلا دیں جس کا انھیں ڈر تھا۔

---

کی تھی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل وخوار کیا جاتا اور انھیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کرلیا جاتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے، تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرّف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیل کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تَلْمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدّت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا، پھر انھیں حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ور ہیں تو انھوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل وخوار کرنا شروع کیا اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے: (يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ)۔

مگر بائبل اور قرآن، دونوں اس ذکر سے خالی ہیں کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ اُلٹ جائے گا اور اسی خطرے کو روکنے کے لیے فرعون نے اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ یا فرعون نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی گئی تھی کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں ایسا اور ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ افسانہ تَلْمود اور دوسری اسرائیلی رِوایات سے ہمارے مفسّرین نے نقل کیا ہے۔ (مُلاحَظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا، مضمون ''موسیٰ'' اور The Talmud Selections. p 123-24)

۶ — یعنی انھیں دُنیا میں قیادت ورہنمائی کا مقام عطا کریں۔

۷ — یعنی ان کو زمین کی وراثت بخشیں اور وہ حکمران وفرمانروا ہوں۔

۸ — مغربی مستشرقین نے اس بات پر بڑی لے دے کی ہے کہ ہامان تو ایران کے بادشاہ اخسویرس یعنی خشیارشا

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡهِ فَاَلۡقِیۡهِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَیۡكِ وَ جَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۞ فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِیَكُوۡنَ لَهُمۡ عَدُوًّا

ہم[9] نے موسیٰؑ کی ماں کو اشارہ کیا کہ "اِس کو دُودھ پلا، پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر، ہم اسے تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں[10] گے۔" آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا، تا کہ وہ ان کا دشمن

(Xerxes) کے دربار کا ایک امیر تھا، اور اس بادشاہ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے سیکڑوں برس بعد ۴۸۶ اور ۴۶۵ قبلِ مسیح میں گزرا ہے، مگر قرآن نے اسے مصر لے جا کر فرعون کا وزیر بنا دیا۔ ان لوگوں کی عقل پر تعصب کا پردہ پڑا ہُوا نہ ہو تو یہ خود غور کریں کہ آخر ان کے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کیا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ اخسویرس کے درباری ہامان سے پہلے دنیا میں کوئی شخص کبھی اس نام کا نہیں گزرا ہے۔ جس فرعون کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اگر اس کے تمام وزرا اور امرا اور اہلِ دربار کی کوئی مکمل فہرست بالکل مستند ذریعے سے کسی مستشرق صاحب کو مل گئی ہے جس میں ہامان کا نام مفقود ہے تو وہ اسے چھپائے کیوں بیٹھے ہیں؟ انھیں اس کا فوٹو فوراً شائع کر دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کی تکذیب کے لیے اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار انھیں کوئی اور نہ ملے گا۔

۹ – بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا ہے کہ انھی حالات میں ایک اسرائیلی والدین کے ہاں وہ بچہ پیدا ہو گیا جس کو دنیا نے موسیٰ علیہ السلام کے نام سے جانا۔ بائبل اور تلمود کے بیان کے مطابق یہ خاندان حضرت یعقوبؑ کے بیٹے لاوِی کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام ان دونوں کتابوں میں عمرام بتایا گیا ہے، قرآن اسی کا تلفظ عمران کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کے ہاں دو بچے ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی مریم (Miriam) نامی تھیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان سے چھوٹے حضرت ہارونؑ تھے۔ غالباً یہ فیصلہ کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو بیٹا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے، حضرت ہارونؑ کی پیدائش کے زمانے میں نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ بچ گئے۔ پھر یہ قانون جاری ہُوا اور اس خوفناک زمانے میں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔

۱۰ – یعنی پیدا ہوتے ہی دریا میں ڈال دینے کا حکم نہ تھا، بلکہ ارشاد یہ ہوا کہ جب تک خطرہ نہ ہو، بچے کو دودھ پلاتی رہو۔ جب راز فاش ہوتا نظر آئے اور اندیشہ ہو کہ بچے کی آواز سُن کر یا اور کسی طرح دشمنوں کو اس کی پیدائش کا علم ہو جائے گا، یا خود بنی اسرائیل ہی میں سے کوئی کمینہ آدمی مخبری کر بیٹھے گا، تو بے خوف و خطر اسے ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا۔ بائبل کا بیان ہے کہ پیدائش کے بعد تین مہینے تک حضرت موسیٰؑ کی والدہ ان کو چھپائے رہیں۔ تلمود اس پر اضافہ کرتی ہے کہ فرعون کی حکومت نے اس زمانے میں جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھیں جو اسرائیلی گھروں میں اپنے ساتھ

وَحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا كَانُوۡا خٰطِئِيۡنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَيۡنٍ لِّىۡ وَلَكَ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡهُ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾

اور ان کے لیے سببِ رنج بنے[11]، واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا: "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں[12]۔" اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔

چھوٹے چھوٹے بچے لے جاتی تھیں اور وہاں کسی نہ کسی طرح ان بچوں کو رُلا دیتی تھیں، تاکہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے ہاں کوئی بچہ چھُپا رکھا ہو تو وہ بھی دوسرے بچے کی آواز سن کر رونے لگے۔ اس نئے طرزِ جاسوسی سے حضرت موسیٰؑ کی والدہ پریشان ہوگئیں اور انھوں نے اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے پیدایش کے تین مہینے بعد اسے دریا میں ڈال دیا۔ اس حد تک ان دونوں کتابوں کا بیان قرآن کے مطابق ہے۔ اور دریا میں ڈالنے کی کیفیت بھی انھوں نے وہی بتائی ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: اِقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ "بچے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دے۔" اسی کی تائید بائبل اور تَلمُود بھی کرتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اسے چکنی مٹی اور رال سے لیپ کر پانی سے محفوظ کر دیا، پھر اس میں حضرت موسیٰؑ کو لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ لیکن سب سے بڑی بات جو قرآن میں بیان کی گئی ہے، اس کا کوئی ذکر اسرائیلی روایات میں نہیں ہے، یعنی یہ کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمھارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمھارے پاس ہی پلٹا لائیں گے، اور یہ کہ تمھارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسول ہونے والا ہے۔

۱۱- یہ ان کا مقصد نہ تھا بلکہ یہ ان کے اس فعل کا انجام مقدر تھا۔ وہ اُس بچے کو اُٹھا رہے تھے جس کے ہاتھوں آخر کار انھیں تباہ ہونا تھا۔

۱۲- اس بیان سے جو صورتِ معاملہ صاف سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تابوت یا ٹوکرا دریا میں بہتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا جہاں فرعون کے محلات تھے، تو فرعون کے خدّام نے اسے پکڑ لیا اور لے جا کر بادشاہ اور ملکہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہ اور ملکہ خود اس وقت دریا کے کنارے سیر میں مشغول ہوں اور ان کی نگاہ اس ٹوکرے

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾

اُدھر موسیٰؑ کی ماں کا دل اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے، تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اُس نے بچے کی بہن سے کہا: اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتا نہ چلا۔[13]

---

پر پڑی ہو اور انھی کے حکم سے وہ نکالا گیا ہو۔ اس میں ایک بچہ پڑا ہوا دیکھ کر بآسانی یہ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یہ ضرور کسی اسرائیلی کا بچہ ہے، کیونکہ وہ اُن محلّوں کی طرف سے آ رہا تھا جن میں بنی اسرائیل رہتے تھے، اور انھی کے بیٹے اس زمانے میں قتل کیے جا رہے تھے، اور انھی کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ کسی نے بچے کو چھپا کر کچھ مدت تک پالا ہے اور پھر جب زیادہ دیر چھُپ نہ سکا تو اب اسے اس امید پر دریا میں ڈال دیا ہے کہ شاید اسی طرح اس کی جان بچ جائے اور کوئی اسے نکال کر پال لے۔ اسی بنا پر کچھ ضرورت سے زیادہ وفادار غلاموں نے عرض کیا کہ حضور! اسے فوراً قتل کرا دیں، یہ بھی کوئی بچۂ افعی ہی ہے۔ لیکن فرعون کی بیوی آخر عورت تھی، اور بعید نہیں کہ بے اولاد ہو۔ پھر بچہ بھی بہت پیاری صورت کا تھا، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ خود حضرت موسیٰؑ کو بتاتا ہے کہ وَاَلۡقَیۡتُ عَلَیۡکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیۡ ۚ (میں نے اپنی طرف سے تیرے اُوپر محبّت ڈال دی تھی) یعنی تجھے ایسی موہنی صورت دی تھی کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار تجھ پر پیار آ جاتا تھا۔ اس لیے اس عورت سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا کہ اسے قتل نہ کرو بلکہ لے کر پال لو۔ یہ جب ہمارے ہاں پرورش پائے گا اور ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے تو اسے کیا خبر ہوگی کہ میں اسرائیلی ہوں۔ یہ اپنے آپ کو آلِ فرعون ہی کا ایک فرد سمجھے گا اور اس کی قابلیتیں بنی اسرائیل کے بجائے ہمارے کام آئیں گی۔

بائبل اور تَلۡمُود کا بیان ہے کہ وہ عورت، جس نے حضرت موسیٰؑ کو پالنے اور بیٹا بنانے کے لیے کہا تھا، فرعون کی بیٹی تھی۔ لیکن قرآن صاف الفاظ میں اسے ''اِمۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ'' (فرعون کی بیوی) کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صدیوں بعد مُرتّب کی ہوئی زبانی روایات کے مقابلے میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کا بیان ہی قابلِ اعتماد ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ اسرائیلی رِوایات سے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر عربی محاورہ و استعمال کے خلاف اِمۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ کے معنٰی ''فرعون کے خاندان کی عورت'' کیے جائیں۔

۱۳ — یعنی لڑکی نے اس طریقے سے ٹوکرے پر نگاہ رکھی کہ بہتے ہوئے ٹوکرے کے ساتھ ساتھ وہ اس کو دیکھتی ہوئی چلتی بھی رہی اور دشمن یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا کوئی تعلق اس ٹوکرے والے بچے کے ساتھ ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

اور ہم نے بچّے پر پہلے ہی دُودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں[14]۔ (یہ حالت دیکھ کر) اُس لڑکی نے اُن سے کہا: "میں تمھیں ایسے گھر کا پتا بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمّہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں[15]؟ اس طرح ہم[16] موسیٰؑ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچّا تھا[17]، مگر اکثر لوگ اس بات

حضرت موسیٰؑ کی یہ بہن اس وقت ۱۰-۱۲ برس کی تھیں۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بھائی کا پیچھا کیا اور یہ پتا چلا لیا کہ وہ فرعون کے محل میں پہنچ چکا ہے۔

۱۴- یعنی فرعون کی بیوی جس اَنّا کو بھی دودھ پلانے کے لیے بلاتی تھی، بچہ اس کی چھاتی کو منہ نہ لگاتا تھا۔

۱۵- اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کے محل میں بھائی کے پہنچ جانے کے بعد بہن گھر نہیں بیٹھ گئی، بلکہ وہ اپنی اسی ہوشیاری کے ساتھ محل کے آس پاس چکر لگاتی رہی۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ بچہ کسی کا دودھ نہیں پی رہا ہے اور ملکۂ عالیہ پریشان ہیں کہ کوئی ایسی اَنّا ملے جو بچے کو پسند آئے، تو وہ ذہین لڑکی سیدھی محل میں پہنچ گئی اور جا کر کہا کہ میں ایک اچھی اَنّا کا پتا بتاتی ہوں جو اس بچے کو بڑی شفقت کے ساتھ پالے گی۔

اس مَقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قدیم زمانے میں ان مَمالک کے بڑے اور خاندانی لوگ بچوں کو اپنے ہاں پالنے کے بجائے عُموماً اَنّاؤں کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ اپنے ہاں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی یہ ذکر آتا ہے کہ مکّے میں وقتاً فوقتاً اطراف و نواح کی عورتیں اَنّا گیری کی خدمت کے لیے آتی تھیں اور سرداروں کے بچے دودھ پلانے کے لیے اچھے اچھے معاوضوں پر حاصل کر کے ساتھ لے جاتی تھیں۔ حضورؐ نے خود بھی حلیمۂ سعدیہ کے ہاں صحرا میں پرورش پائی ہے۔ یہی طریقہ مصر میں بھی تھا۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ کی بہن نے یہ نہیں کہا کہ میں ایک اچھی اَنّا لا کر دیتی ہوں، بلکہ یہ کہا کہ میں ایسے گھر کا پتا بتاتی ہوں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں گے اور اسے خیر خواہی کے ساتھ پالیں گے۔

۱۶- بائبل اور تَلمُود سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا نام "موسیٰ" فرعون کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ یہ عبرانی زبان کا نہیں بلکہ قِبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنٰی ہیں: "میں نے اسے پانی سے نکالا"۔ قدیم مصری زبان سے بھی حضرت موسیٰؑ کے نام کی یہ تخریج صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس زبان میں "مُو" پانی کو کہتے تھے اور "اوشے" کا مطلب تھا "بچایا ہوا"۔

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ

رکوع ۲

کو نہیں جانتے ؏

جب موسیٰؑ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشو و نما مکمل [18] ہو گیا تو ہم نے اسے حُکم اور علم عطا کیا، [19] ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ (ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جب کہ

۱۷ – اور اللہ کی اس حکیمانہ تدبیر کا فائدہ یہ بھی ہُوا کہ حضرت موسیٰؑ فی الواقع فرعون کے شاہزادے نہ بن سکے بلکہ اپنے ہی ماں باپ اور بہن بھائیوں میں پرورش پا کر انھیں اپنی اصلیت اچھی طرح معلوم ہو گئی۔ اپنی خاندانی رِوایات سے، اپنے آبائی مذہب سے، اور اپنی قوم سے ان کا رشتہ نہ کٹ سکا۔ وہ آلِ فرعون کے ایک فرد بننے کے بجائے اپنے دلی جذبات اور خیالات کے اعتبار سے پوری طرح بنی اسرائیل کے ایک فرد بن کر اُٹھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں: مثل الذی یعمل و یحتسب فی صنعۃ الخیر کمثل ام موسٰی ترضع ولدھا وتاخذ اجرھا۔ ”جو شخص اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرے اور اس کام میں اللہ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھے، اس کی مثال حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی سی ہے کہ انھوں نے اپنے ہی بیٹے کو دودھ پلایا اور اس کی اُجرت بھی پائی۔“ یعنی ایسا شخص اگرچہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کام کرتا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھ کر ایمان داری سے کام کرتا ہے، جس کے ساتھ بھی معاملہ کرتا ہے اس کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے، اور رزقِ حلال سے اپنے نفس اور اپنے بال بچوں کی پرورش اللہ کی عبادت سمجھتے ہوئے کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی روزی کمانے پر بھی اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ گویا روزی بھی کمائی اور اللہ سے اجر و ثواب بھی پایا۔

۱۸ – یعنی جب ان کا جسمانی و ذہنی نشو و نما مکمل ہو گیا۔ یہودی رِوایات میں اس وقت حضرت موسیٰؑ کی مختلف عمریں بتائی گئی ہیں۔ کسی نے ۱۸ سال لکھی ہے، کسی نے ۲۰ سال، اور کسی نے ۴۰ سال۔ بائبل کے نئے عہد نامے میں ۴۰ سال عمر بتائی گئی ہے۔ (اعمال ۷: ۲۳) لیکن قرآن کسی عمر کی تصریح نہیں کرتا۔ جس مقصد کے لیے قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کے لیے بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ آگے جس واقعے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے شباب کو پہنچ چکے تھے۔

۱۹ – حکم سے مراد حکمت، دانائی، فہم و فراست اور قوتِ فیصلہ، اور علم سے مراد دینی اور دُنیوی علوم دونوں ہیں، کیونکہ اپنے والدین کے ساتھ ربط ضبط قائم رہنے کی وجہ سے ان کو اپنے باپ دادا (حضرت یوسف، یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام) کی تعلیمات سے بھی واقفیت حاصل ہو گئی، اور بادشاہِ وقت کے ہاں شاہزادے کی حیثیت سے پرورش

غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۤ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۤ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ

اہلِ شہر غفلت میں[20] تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰؑ نے اس کو ایک گھونسا مارا[21] اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰؑ نے کہا: ''یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کُن ہے۔''[22] پھر وہ کہنے لگا: ''اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔''[23]

پانے کے باعث اُن کو وہ تمام دنیوی عُلوم بھی حاصل ہوئے جو اُس زمانے کے اہلِ مصر میں مُتداول تھے۔ اس حکم اور علم کے عَطِیّے سے مراد نبوت کا عَطِیّہ نہیں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت تو اس کے کئی سال بعد عطا فرمائی گئی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور اس سے پہلے سورۂ شعراء (آیت ۲۱) میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

اِس زمانۂ شاہزادگی کی تعلیم وتربیت کے متعلق بائبل کی کتاب الاعمال میں بتایا گیا ہے کہ ''موسیٰؑ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی اور وہ کلام اور کام میں قوت والا تھا۔'' (۲۲:۷) تَلْمُود کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں ایک خوب صورت جوان بن کر اُٹھے۔ شاہزادوں کا سا لباس پہنتے، شاہزادوں کی طرح رہتے، اور لوگ ان کی نہایت تعظیم وتکریم کرتے تھے۔ وہ اکثر جُشَن کے علاقے میں جاتے جہاں اسرائیلیوں کی بستیاں تھیں، اور ان تمام سختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو ان کی قوم کے ساتھ قِبْطی حکومت کے ملازمین کرتے تھے۔ انھی کی کوشش سے فرعون نے اسرائیلیوں کے لیے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انھوں نے فرعون سے کہا کہ دائماً مسلسل کام کرنے کی وجہ سے یہ لوگ کمزور ہو جائیں گے اور حکومت ہی کے کام کا نقصان ہوگا۔ ان کی قوت بحال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ہفتے میں ایک دن آرام کا دیا جائے۔ اسی طرح اپنی دانائی سے انھوں نے اور بہت سے ایسے کام کیے جن کی وجہ سے تمام ملکِ مصر میں ان کی شہرت ہو گئی تھی۔ (اقتباسات تَلْمُود، صفحہ ۱۲۹)

۲۰ - ہو سکتا ہے کہ وہ صبح سویرے کا وقت ہو، یا گرمی میں دوپہر کا، یا سردیوں میں رات کا۔ بہرحال مراد

فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ

چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی، وہ غفورٌ رحیم ہے[۲۴]۔ موسٰیؑ نے عہد کیا کہ "اے میرے رب! یہ احسان جو

یہ ہے کہ جب سڑکیں سنسان تھیں اور شہر میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔

"شہر میں داخل ہُوا"، ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالسلطنت کے شاہی محلات عام آبادی سے باہر واقع تھے۔ حضرت موسٰی علیہ السّلام چونکہ شاہی محل میں رہتے تھے، اس لیے "شہر میں نکلے" کہنے کے بجائے "شہر میں داخل ہوئے" فرمایا گیا ہے۔

**۲۱** – اصل میں لفظ "وَکَزَ" استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی تھپڑ مارنے کے بھی ہیں اور گھونسا مارنے کے بھی۔ ہم نے اس خیال سے کہ تھپڑ سے موت واقع ہو جانا گھونسے کی بہ نسبت بعید تر ہے، اس کا ترجمہ گھونسا مارنا کیا ہے۔

**۲۲** – اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھونسا کھا کر جب مصری گرا ہوگا اور اس نے دم توڑ دیا ہوگا تو کیسی سخت ندامت اور گھبراہٹ کی حالت میں یہ الفاظ حضرت موسٰیؑ کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ ان کا کوئی ارادہ قتل کا نہ تھا۔ نہ قتل کے لیے گھونسا مارا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ ایک گھونسا کھاتے ہی ایک بھلا چنگا آدمی پران چھوڑ دے گا۔ اس بنا پر حضرت موسٰیؑ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کوئی شریرانہ منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ایک بڑا فساد کھڑا کرنے کے لیے مجھ سے یہ کام کرایا ہے، تاکہ ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک قبطی کو مار ڈالنے کا الزام مجھ پر عائد ہو، اور صرف میرے ہی خلاف نہیں بلکہ تمام بنی اسرائیل کے خلاف مصر میں ایک طوفانِ عظیم اُٹھ کھڑا ہو۔ اس معاملے میں بائبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے۔ وہ حضرت موسٰیؑ کو قتلِ عَمد کا مجرم ٹھیراتی ہے۔ اس کی رِوایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسٰیؑ نے "اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔" (خُروج ۲ : ۱۲) یہی بات تَلمُود میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اب یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغدار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی، جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا اور جسے انسان کو عدل و انصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے دوسری قوم کے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے اور جان بُوجھ کر اسے قتل کر ڈالے۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی کو مصری کے پنجے سے چھڑانے کے لیے اسے قتل کر دینا تو روا نہ ہو سکتا تھا۔

**۲۳** – مغفرت کے معنٰی درگزر کرنے اور معاف کر دینے کے بھی ہیں، اور سَتر پوشی کرنے کے بھی۔ حضرت موسٰیؑ کی دعا کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس گناہ کو (جسے تو جانتا ہے کہ میں نے عَمداً نہیں کیا ہے) معاف بھی فرما دے اور اس کا پردہ بھی ڈھانک دے، تاکہ دشمنوں کو اس کا پتا نہ چلے۔

**۲۴** – اس کے بھی دو مطلب ہیں، اور دونوں یہاں مراد ہیں۔ یعنی اللہ تعالٰی نے ان کا یہ قُصور معاف بھی فرما دیا

عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ

تو نے مجھ پر کیا ہے[25] اِس کے بعد اب مَیں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔[26]"

دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہُوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے۔

اور حضرت موسیٰؑ کا پردہ بھی ڈھانک دیا، یعنی قِبطی قوم کے کسی فرد اور قِبطی حکومت کے کسی آدمی کا اُس وقت اُن کے آس پاس کہیں گزر نہ ہوا کہ وہ قتل کے اس واقعے کو دیکھ لیتا۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو خاموشی کے ساتھ موقعِ واردات سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔

۲۵ — یعنی یہ احسان کہ میرا فعل چھپا رہ گیا، اور دشمن قوم کے کسی فرد نے مجھ کو نہیں دیکھا، اور مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

۲۶ — حضرت موسیٰؑ کا یہ عہد بہت وسیع الفاظ میں ہے۔ اِس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ میں کسی مجرم فرد کا مددگار نہیں بنوں گا، بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ میری امداد و اعانت کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ ہو گی جو دنیا میں ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ابنِ جَریر اور متعدّد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک لیا ہے کہ اسی روز حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطعِ تعلق کر لینے کا عہد کر لیا، کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے خدا کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کسی ایمان دار آدمی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظالم سلطنت کا کل پُرزہ بن کر رہے اور اس کی حشمت و طاقت میں اضافے کا موجب بنے۔

علمائے اسلام نے بالعُموم حضرت موسیٰؑ کے اِس عہد سے یہ اِستِدلال کیا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعانت سے کامل اجتناب کرنا چاہیے، خواہ وہ ظالم فرد ہو، یا گروہ، یا حکومت و سلطنت۔ مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رَباحؒ سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی اُمَیَّہ کی حکومت میں کوفے کے گورنر کا کاتب (سیکرٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں، وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاءؒ نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا: تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے، رزق دینے والا اللہ ہے۔

ایک اور کاتب نے عامر شَعبیؒ سے پوچھا: "اے ابوعمرو! میں بس احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں، فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیا یہ رزق میرے لیے جائز ہے؟" انھوں نے کہا: "ہوسکتا ہے کہ کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا جائے اور وہ تمھارے قلم سے جاری ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کا مال ناحق ضبط کیا جائے، یا کسی کا گھر گرانے کا حکم دیا جائے اور وہ تمھارے

قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝١٨ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝١٩ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا

موسیٰؑ نے کہا "تُو تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے[٢٧]۔" پھر جب موسیٰؑ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے[٢٨] تو وہ پکار اُٹھا[٢٩]: "اے موسیٰؑ! کیا آج تو مجھے اُسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے، تو اس ملک میں جبّار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔" اس کے بعد ایک آدمی شہر کے

قلم سے جاری ہو۔" پھر امام موصوف نے یہ آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب نے کہا: "آج کے بعد میرا قلم بنی اُمیّہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہوگا۔" امام نے کہا: "پھر اللہ بھی تمھیں رزق سے محروم نہ فرمائے گا۔"

ضحّاک کو تو عبدالرحمٰن بن مسلم نے صرف اس خدمت پر بھیجنا چاہا تھا کہ وہ بخارا کے لوگوں کی تنخواہیں جا کر بانٹ آئیں، مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں نے کہا: آخر اس میں کیا حرج ہے؟ انھوں نے کہا: میں ظالموں کے کسی کام میں بھی مددگار نہیں بننا چاہتا۔ (روح المعانی، ج ٢٠، ص ۴٩)

امام ابوحنیفہؒ کا یہ واقعہ ان کے تمام مستند سوانح نگاروں، المُوَفَّق المکّی، ابن البزّاز الکَرْدَری، مُلّا علی قاری وغیرہم نے لکھا ہے کہ انھی کی تلقین پر منصور کے کمانڈر انچیف حسن بن قَحْطُبَہ نے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے اِستعفا دے دیا تھا کہ آج تک میں نے آپ کی سلطنت کی حمایت کے لیے جو کچھ کیا ہے، یہ اگر خدا کی راہ میں تھا تو میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں تھا تو میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید جرائم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

٢٧ — یعنی تُو جھگڑالو آدمی معلوم ہوتا ہے۔ روز تیرا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ کل ایک شخص سے بِھڑ گیا تھا، آج ایک دوسرے شخص سے جا بِھڑا۔

٢٨ — بائبل کا بیان یہاں قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ دوسرے دن کا جھگڑا دو اسرائیلیوں کے درمیان تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ جھگڑا بھی اسرائیلی اور مصری کے درمیان ہی تھا۔ قرینِ قیاس بھی یہی دوسرا بیان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ پہلے دن کے قتل کا راز فاش ہونے کی جو صورت آگے بیان ہو رہی ہے، وہ اسی طرح رونما ہو سکتی تھی کہ مصری قوم کے ایک شخص کو اُس واقعے کی خبر ہو جاتی۔ ایک اسرائیلی کے علم میں اس کے آ جانے سے یہ امکان کم تھا کہ اپنی قوم کے پشتیبان شہزادے کے اتنے بڑے قصور کی اطلاع پاتے ہی وہ جا کر فرعونی حکومت میں اس کی مخبری کر دیتا۔

الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ

ع ۲ ۸ ۵

پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا[۳۰] اور بولا: ''موسیٰؑ! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں۔'' یہ خبر سنتے ہی موسیٰؑ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دُعا کی کہ ''اے میرے رب! مجھے ظالموں سے بچا۔'' ع

(مصر سے نکل کر) جب موسیٰؑ نے مَدیَن کا رُخ کیا[۳۱] تو اُس نے کہا: ''اُمید ہے کہ میرا رب مجھے

**۲۹-** یہ پکارنے والا وہی اسرائیلی تھا جس کی مدد کے لیے حضرت موسیٰؑ آگے بڑھے تھے۔ اس کو ڈانٹنے کے بعد جب آپ مصری کو مارنے کے لیے چلے تو اُس اسرائیلی نے سمجھا کہ یہ مجھے مارنے آرہے ہیں، اس لیے اس نے چیخنا شروع کر دیا اور اپنی حماقت سے کل کے قتل کا راز فاش کر ڈالا۔

**۳۰-** یعنی اس دوسرے جھگڑے میں جب قتل کا راز فاش ہوگیا اور اس مصری نے جا کر مخبری کر دی تب یہ واقعہ پیش آیا۔

**۳۱-** بائبل کا بیان اس امر میں قرآن سے متفق ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مَدیَن کا رُخ کیا تھا۔ لیکن تَلمود یہ بے سروپا قصہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے، اور وہاں بادشاہ کے مُقرّب ہو گئے۔ پھر اس کے مرنے پر لوگوں نے ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس کی بیوہ سے ان کی شادی کر دی۔ ۴۰ سال انھوں نے وہاں حکومت کی۔ مگر اس پوری مدت میں اپنی حبشی بیوی سے کبھی مقاربت نہ کی۔ ۴۰ سال گزر جانے کے بعد اس عورت نے حبش کے باشندوں سے شکایت کی کہ اس شخص نے آج تک نہ تو مجھ سے زن وشَو کا تعلق رکھا ہے اور نہ کبھی حبش کے دیوتاؤں کی پرستش کی ہے۔ اس پر امرائے سلطنت نے انھیں معزول کر کے اور بہت سا مال دے کر ملک سے باحترام رخصت کر دیا۔ تب وہ حبش سے مَدیَن پہنچے اور وہ واقعات پیش آئے جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

اس قصّے کے بے سروپا ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اسی قصّے میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اُس زمانے میں اَسیریا (شمالی عراق) پر حبش کی حکومت تھی، اور اسیریا والوں کی بغاوتیں کچلنے کے لیے حضرت موسیٰؑ نے بھی اور ان کے پیش رَو بادشاہ نے بھی فوجی چڑھائیاں کی تھیں۔ اب جو شخص بھی تاریخ وجغرافیہ سے کوئی واقفیت رکھتا ہو، وہ نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ اسیریا پر حبش کا تسلط اور حبشی فوج کا حملہ یا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مصر اور فلسطین وشام پر

اَنۡ یَّهۡدِیَنِیۡ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ وَجَدَ عَلَیۡهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسۡقُوۡنَ ۫ وَ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمُ امۡرَاَتَیۡنِ تَذُوۡدٰنِ ۚ

ٹھیک راستے پر ڈال دے گا[۳۲]۔" اور جب وہ مَدیَن کے کنویں پر پہنچا[۳۳] تو اُس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔

اس کا قبضہ ہوتا، یا پورا ملکِ عرب اس کے زیرِ نگین ہوتا، یا پھر حَبَش کا بیڑا ایسا زبردست ہوتا کہ وہ بحرِ ہند اور خلیج فارس کو عبور کر کے عراق فتح کر لیتا۔ تاریخ اس ذکر سے خالی ہے کہ کبھی حَبشیوں کو ان مَمالک پر تسلط حاصل ہوا ہو، یا ان کی بحری طاقت اتنی زبردست رہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا علم خود اپنی تاریخ کے بارے میں کتنا ناقص تھا اور قرآن ان کی غلطیوں کی تصحیح کر کے صحیح واقعات کیسی مُنقَّح صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن عیسائی اور یہودی مستشرقین کو یہ کہتے ذرا شرم نہیں آتی کہ قرآن نے یہ قصّے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے ہیں۔

**۳۲-** یعنی ایسے راستے پر جس سے مَیں بخیریت مَدیَن پہنچ جاؤں۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں مَدیَن فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر نہ تھی بلکہ صرف اس کے مغربی اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔ خلیج عَقَبَہ کے مشرقی اور مغربی سواحل، جن پر بنی مَدیان آباد تھے، مصری اثر و اقتدار سے بالکل آزاد تھے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکلتے ہی مَدیَن کا رُخ کیا تھا، کیونکہ قریب ترین آزاد اور آباد علاقہ وہی تھا۔ لیکن وہاں جانے کے لیے انھیں گزرنا بہرحال مصر کے مقبوضہ علاقوں ہی سے تھا، اور مصر کی پولیس اور فوجی چوکیوں سے بچ کر نکلنا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایسے راستے پر ڈال دے جس سے میں صحیح و سلامت مَدین پہنچ جاؤں۔

**۳۳-** یہ مَقام جہاں حضرت موسیٰؑ پہنچے تھے، عربی رِوایات کے مطابق خلیج عَقبہ کے غربی ساحل پر مَقْنا سے چند میل بجانبِ شمال واقع تھا۔ آج کل اسے البِدْع کہتے ہیں اور وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ میں نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں تبوک سے عَقبَہ جاتے ہوئے اس جگہ کو دیکھا ہے۔ مَقامی باشندوں نے مجھے بتایا کہ ہم باپ دادا سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ مَدیَن اِسی جگہ واقع تھا۔ یُوسیفوس سے لے کر برٹن تک قدیم و جدید سیّاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی بالعموم مَدیَن کی جائے وقوع یہی بتائی ہے۔ اس کے قریب تھوڑے فاصلے پر وہ جگہ ہے جسے اب مَغائرِ شعیب یا مغاراتِ شعیب کہا جاتا ہے۔ اس جگہ ثمودی طرز کی کچھ عمارات موجود ہیں۔ اور اس سے تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کچھ قدیم کھنڈر ہیں جن میں دو اندھے کنویں ہم نے دیکھے۔ مَقامی باشندوں نے ہمیں بتایا کہ یقین کے ساتھ تو ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن ہمارے ہاں روایات یہی ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک کنواں وہ تھا جس پر حضرت موسٰی علیہ السلام نے بکریوں کو پانی پلایا ہے۔ یہی بات ابوالفِداء (مُتوَفّٰی ۷۳۲ھ) نے تَقویم البُلدان میں اور یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں ابو زید انصاری (مُتوَفّٰی ۲۱۶ھ)

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰى یُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا شَیْخٌ كَبِیْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ

موسیٰؑ نے اِن عورتوں سے پوچھا: ”تمھیں کیا پریشانی ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں[۳۴]۔“ یہ سُن کر موسیٰؑ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر ایک سایے کی جگہ جا بیٹھا اور بولا:

---

کے حوالے سے لکھی ہے کہ اس علاقے کے باشندے اسی مقام پر حضرت موسیٰؑ کے اس کنویں کی نشان دِہی کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صدیوں سے وہاں کے لوگوں میں متوارث چلی آ رہی ہے، اور اس بنا پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں جس مقام کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہے۔ مقابل کے صفحے پر اس مقام کی کچھ تصاویر مُلاحظہ ہوں۔

۳۴- یعنی ہم عورتیں ہیں، اِن چرواہوں سے مُزاحمت اور کشمکش کر کے اپنے جانوروں کو پانی پلانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ والد ہمارے اس قدر سِنّ رسیدہ ہیں کہ وہ خود یہ مَشَقَّت اُٹھا نہیں سکتے۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم عورتیں ہی یہ کام کرنے نکلتی ہیں، اور جب تک سب چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے نہیں جاتے، ہم کو مجبوراً انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس سارے مضمون کو ان خواتین نے صرف ایک مختصر سے فقرے میں ادا کر دیا، جس سے ان کی حیاداری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مرد سے زیادہ بات بھی نہ کرنا چاہتی تھیں، مگر یہ بھی پسند نہ کرتی تھیں کہ یہ اجنبی ہمارے خاندان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کر لے اور اپنے ذہن میں یہ خیال کرے کہ کیسے لوگ ہیں جن کے مرد گھر بیٹھے رہے اور اپنی عورتوں کو اس کام کے لیے باہر بھیج دیا۔

ان خواتین کے والد کے متعلق ہمارے ہاں کی رِوایات میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اشارتاً و کنایتاً بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ وہ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ حالانکہ شعیب علیہ السلام کی شخصیّت قرآن میں ایک معروف شخصیت ہے۔ اگر ان خواتین کے والد وہی ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یہاں اس کی تصریح نہ کر دی جاتی۔ بلا شبہ بعض احادیث میں ان کے نام کی تصریح ملتی ہے، لیکن علامہ ابنِ جَریرؒ اور ابن کثیرؒ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے ابنِ عباسؓ، حسن بصری، ابوعُبَیدہ اور سعید بن جُبَیر جیسے اکابر مفسرین نے بنی اسرائیل کی رِوایات پر اعتماد کر کے ان بزرگ کے وہی نام بتائے ہیں جو تَلْمُود وغیرہ میں آئے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسمِ شعیب کی تصریح منقول ہوتی تو یہ حضرات کوئی دوسرا نام نہ لے سکتے تھے۔

بائبل میں ایک جگہ ان بزرگ کا نام رعوایل اور دوسری جگہ یِترو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مَدین کے کاہن تھے۔ (خُروج باب ۲:۱۶-۱۸۔ باب ۳:۱۔ باب ۱۸:۵) تَلْمُودی لٹریچر میں رعوایل، یتھرو اور حوباب تین مختلف

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتۡهُ اِحۡدٰىهُمَا تَمۡشِیۡ عَلَی اسۡتِحۡیَآءٍ ۫ قَالَتۡ اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡكَ

''پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے میں اس کا محتاج ہوں۔'' (کچھ دیر نہ گزری تھی کہ) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی[۳۵] اور کہنے لگی: ''میرے والد آپ کو بُلا رہے ہیں

نام بتائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علمائے یہود کا خیال ہے کہ یِتھرو ہِزایکسی لینسی کا ہم معنیٰ لقب تھا، اور اصل نام رعوایل یا حوباب تھا۔ اسی طرح لفظ کاہن (Kohen Midian) کی تشریح میں بھی علمائے یہود کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو پروہت (priest) کا ہم معنیٰ بتاتے ہیں اور بعض رئیس یا امیر (prince) کا۔

تَلمُود میں ان کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے فرعون کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی اور وہ ان کے علم اور اِصابتِ رائے پر اعتماد رکھتا تھا۔ مگر جب بنی اسرائیل کا اِستیصال کرنے کے لیے مصر کی شاہی کونسل میں مشورے ہونے لگے اور ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو انھوں نے فرعون کو اس غلط کام سے روکنے کی کوشش کی، اسے اس ظلم کے بُرے نتائج سے ڈرایا اور رائے دی کہ اگر ان لوگوں کا وجود آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو انھیں ان کے باپ دادا کے ملک کَنعان کی طرف نکال دیجیے۔ اس پر فرعون ان سے ناراض ہوگیا اور اس نے انھیں ذلّت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ اس وقت سے وہ اپنے ملک مَدیَن ہی میں اقامت گُزیں ہوگئے تھے۔

ان کے مذہب کے متعلق قیاس یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ بھی دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔ کیونکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد تھے، اسی طرح وہ مِدیان بن ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ یہی تعلق غالباً اس کا موجب ہوا ہوگا کہ انھوں نے فرعون کو بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے روکا اور اس کی ناراضی مول لی۔ مفسر نیسابوریؒ نے حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انه کان رجلا مسلما قبل الدین من شعیب (وہ ایک مسلمان آدمی تھے۔ حضرت شعیبؑ کا دین انھوں نے قبول کرلیا تھا)۔ تَلمُود میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ مِدیانیوں کی بت پرستی کو علانیہ حماقت قرار دیتے تھے، اس وجہ سے اہلِ مَدیَن ان کے مخالف ہوگئے تھے۔

**۳۵-** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فقرے کی یہ تشریح کی ہے: جاءت تمشی علی استحیاء قائلة بثوبها علی وجهها لیست بسلفع من النساء دلاجة ولاجة خراجة۔ ''وہ شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اپنا منہ گھونگٹ سے چھپائے ہوئے آئی۔ ان بے باک عورتوں کی طرح دَرّانہ نہیں چلی آئی جو ہر طرف نکل جاتی اور ہر جگہ جا گھستی ہیں۔'' اس مضمون کی متعدّد روایات سعید بن منصور، ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم اور ابن المُنذِر نے معتبر سندوں کے ساتھ حضرت عمرؓ سے نقل کی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے عہد میں حیاداری کا اسلامی تصوّر، جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾

تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں[۳۶]۔" موسیٰؑ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصّہ اسے سُنایا تو اس نے کہا: "کچھ خوف نہ کرو، اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔"

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا: "ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے، بہترین آدمی، جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو[۳۷]۔"

---

تعلیم و تربیت سے ان بزرگوں نے سمجھا تھا، چہرے کو اجنبیوں کے سامنے کھولے پھرنے اور گھر سے باہر بے باکانہ چلت پھرت دکھانے کے قطعاً خلاف تھا۔ حضرت عمرؓ صاف الفاظ میں یہاں چہرہ ڈھانکنے کو حیا کی علامت اور اسے اجانب کے سامنے کھولنے کو بے حیائی قرار دے رہے ہیں۔

۳۶ - یہ بات بھی شرم و حیا ہی کی وجہ سے انھوں نے کہی، کیونکہ ایک غیر مرد کے پاس اکیلی جگہ آنے کی کوئی معقول وجہ بتانی ضروری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی نے اگر عورت ذات کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس کی کوئی مدد کی ہو تو اس کا بدلہ دینے کے لیے کہنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اور پھر اس بدلے کا نام سن لینے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے عالی ظرف انسان کا چل پڑنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس وقت انتہائی اضطرار کی حالت میں تھے۔ بے سروسامانی کے عالَم میں یکایک مصر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مَدیَن تک کم از کم آٹھ دن میں پہنچے ہوں گے۔ بھوک پیاس اور سفر کی تکان سے بُرا حال ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ فکر ہوگی کہ اس دیارِ غیر میں کوئی ٹھکانا میسر آئے اور کوئی ایسا ہمدرد ملے جس کی پناہ میں رہ سکیں۔ اسی مجبُوری کی وجہ سے یہ لفظ سُن لینے کے باوجود کہ اس ذرا سی خدمت کا اجر دینے کے لیے بلایا جارہا ہے، حضرت موسیٰؑ نے جانے میں تأمّل نہ کیا۔ انھوں نے خیال فرمایا ہوگا کہ خدا سے ابھی ابھی جو دعا میں نے مانگی ہے، اسے پورا کرنے کا یہ سامان خدا ہی کی طرف سے ہوا ہے، اس لیے اب خواہ مخواہ خودداری کا مظاہرہ کرکے اپنے رب کے فراہم کردہ سامانِ میزبانی کو ٹھکرانا مناسب نہیں ہے۔

۳۷ - ضروری نہیں کہ یہ بات لڑکی نے اپنے باپ سے حضرت موسیٰؑ کی پہلی ملاقات کے وقت ہی کہہ دی ہو۔ اغلب یہ ہے کہ اس کے والد نے اجنبی مسافر کو ایک دو روز اپنے پاس ٹھیرا لیا ہوگا اور اس دوران میں کسی وقت بیٹی نے

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ هٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِکَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ ؕ

اس کے باپ نے (موسیٰؑ سے) کہا:[38] "میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو، اور اگر دس سال پُورے کر دو تو یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم اِن شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔" موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔

باپ کو یہ مشورہ دیا ہوگا۔ اس مشورے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی کبر سنی کے باعث مجبوراً ہم لڑکیوں کو کام کے لیے نکلنا پڑتا ہے۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے کہ باہر کے کام سنبھالے۔ آپ اس شخص کو ملازم رکھ لیں۔ مضبوط آدمی ہے، ہر طرح کی مَشقّت کرے گا۔ اور بھروسے کے قابل آدمی ہے۔ محض اپنی شرافت کی بنا پر اس نے ہم عورتوں کو بے بس کھڑا دیکھ کر ہماری مدد کی، اور کبھی ہماری طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔

۳۸- یہ بھی ضروری نہیں کہ بیٹی کی بات سنتے ہی باپ نے فوراً حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہہ دی ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے بیٹی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہوگی کہ آدمی شریف سہی، مگر جوان بیٹیوں کے گھر میں ایک جوان، تندرست و توانا آدمی کو یونہی ملازم رکھ چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ جب یہ شریف، تعلیم یافتہ، مہذب اور خاندانی آدمی ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کا قصّہ سن کر انھیں معلوم ہو چکا ہوگا) تو کیوں نہ اسے داماد بنا کر ہی گھر میں رکھا جائے۔ اس رائے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے کسی مناسب وقت پر حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہی ہوگی۔

یہاں پھر بنی اسرائیل کی ایک کرم فرمائی مُلاحظہ ہو جو انھوں نے اپنے جلیل القدر نبی، اپنے سب سے بڑے محسن اور قومی ہیرو پر کی ہے۔ تَلمُود میں کہا گیا ہے کہ "موسیٰ رعوایل کے ہاں رہنے لگے، اور وہ اپنے میزبان کی بیٹی صفورا پر نظرِ عنایت رکھتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار انھوں نے اس سے بیاہ کر لیا۔" ایک اور یہودی روایت جو جیوش انسائیکلوپیڈیا میں نقل کی گئی ہے، یہ ہے کہ "حضرت موسیٰؑ نے جب یِتھرو کو اپنا سارا ماجرا سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت تباہ ہونے کی پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے اس نے فوراً حضرت موسیٰؑ کو قید کر لیا، تاکہ انھیں فرعون کے حوالے کر کے انعام حاصل کرے۔ سات یا دس سال تک وہ اس کی قید میں رہے۔ ایک تاریک تہ خانہ تھا جس میں وہ بند تھے۔ مگر یِتھرو کی بیٹی زِفورا (یا صفورا) جس سے کنوئیں پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، چپکے چپکے ان سے قید خانے میں ملتی رہی اور انھیں کھانا پانی

اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝۲۸ۧ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ

ع ۳ / ۷ / ۲

اِن دونوں مدّتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دُوں اُس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو، اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں، اللہ اس پر نگہبان ہے۔[۳۹]" ع

جب موسیٰؑ نے مدت پوری کر دی[۴۰] اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طُور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔[۴۱] اس نے اپنے گھر والوں سے کہا: "ٹھیرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے

بھی پہنچاتی رہی۔ ان دونوں میں شادی کی خفیہ قرار داد ہو چکی تھی۔ سات یا دس سال کے بعد زفورا نے اپنے باپ سے کہا کہ اتنی مدت ہوئی آپ نے ایک شخص کو قید میں ڈال دیا تھا اور پھر اس کی خبر تک نہ لی۔ اب تک اسے مرجانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر وہ اب بھی زندہ ہو تو ضرور کوئی خدا رسیدہ آدمی ہے۔ یتھرو اس کی یہ بات سن کر جب قید خانے میں گیا تو حضرت موسیٰؑ کو زندہ دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ وہ معجزے سے زندہ ہیں۔ تب اس نے زفورا سے ان کی شادی کر دی۔"

جو مغربی مستشرقین قرآنی قصّوں کے مآخِذ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، انھیں کہیں یہ کھلا فرق بھی نظر آتا ہے جو قرآن کے بیان اور اسرائیلی رِوایات میں پایا جاتا ہے؟

**۳۹**۔ بعض لوگوں نے حضرت موسیٰؑ اور لڑکی کے والد کی اس گفتگو کو نکاح کا ایجاب وقبول سمجھ لیا ہے اور یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ آیا باپ کی خدمت بیٹی کے نکاح کا مہر قرار پا سکتی ہے؟ اور کیا عقدِ نکاح میں اس طرح کی خارجی شرائط شامل ہو سکتی ہیں؟ حالانکہ آیاتِ زیرِ بحث کی عبارت سے خود ہی یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ یہ عقدِ نکاح نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی بات چیت تھی جو نکاح سے پہلے تجویزِ نکاح کے سلسلے میں بالعموم دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آخر یہ نکاح کا ایجاب وقبول کیسے ہو سکتا ہے جب کہ یہ تعیُّن بھی اس میں نہ کیا گیا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں سے کون سی نکاح میں دی جا رہی ہے۔ اس گفتگو کا ماحَصَل تو صرف یہ تھا کہ لڑکی کے باپ نے کہا: میں اپنی لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کر دینے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آٹھ دس سال میرے ہاں رہ کر میرے گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ کیونکہ اس رشتے سے میری اصل غرض یہی ہے کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، کوئی بیٹا میرے ہاں نہیں ہے جو میری جائداد کا انتظام سنبھالے، لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں جنھیں مجبوراً باہر نکالتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ داماد میرا دست و بازو بن کر رہے، یہ ذمہ داری اگر تم سنبھالنے کے لیے تیار ہو اور شادی کے بعد ہی بیوی کو لے کر چلے جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہو، تو مَیں اپنی ایک لڑکی کا نکاح تم سے

اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَۃٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیِٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۰﴾ وَ اَنۡ اَلۡقِ

کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارا ہی اُٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو۔" وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے[۴۲] پر مبارک خطے[۴۳] میں ایک درخت سے پُکارا گیا کہ " اے موسیٰؑ! میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک۔" اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے

کردوں گا۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت خود ایک ٹھکانے کے طالب تھے۔ انھوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک معاہدے کی صورت تھی جو نکاح سے پہلے فریقین میں طے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اصل عقدِ نکاح قاعدے کے مطابق ہوا ہو گا اور اس میں مہر بھی باندھا گیا ہو گا۔ اُس عقد میں خدمت کی شرط شامل ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

۴۰ — حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے آٹھ کے بجائے دس سال کی مدّت پوری کی تھی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: قضٰی موسٰی اتم الاجلین واطیبھما عشر سنین۔ "موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے وہ مدت پوری کی جو زیادہ کامل اور ان کے خُسر کے لیے زیادہ خوش گوار تھی، یعنی دس سال۔"

۴۱ — اس سفر کا رُخ طُور کی جانب ہونے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے اہل و عیال کو لے کر مصر ہی جانا چاہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ طُور اُس راستے پر ہے جو مَدیَن سے مصر کی طرف جاتا ہے۔ غالباً حضرت موسیٰؑ نے خیال کیا ہو گا کہ دس سال گزر چکے ہیں۔ وہ فرعون بھی مر چکا ہے جس کی حکومت کے زمانے میں وہ مصر سے نکلے تھے۔ اب اگر خاموشی کے ساتھ وہاں چلا جاؤں اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہ پڑوں تو شاید کسی کو میرا پتا بھی نہ چلے۔

بائبل کا بیان یہاں واقعات کی ترتیب میں قرآن کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے خسر کی بکریاں چَراتے ہوئے "بیابان کے پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورِب کے نزدیک" آ نکلے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا اور انھیں رسالت کے منصب پر مامور کر کے مصر جانے کا حکم دیا۔ پھر وہ اپنے خُسر کے پاس واپس آ گئے اور ان سے اجازت لے کر اپنے بال بچوں کے ساتھ مصر روانہ ہوئے۔ (خُروج ۳:۱۔ ۴:۱۸-۲۰) اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو لے کر مَدیَن سے روانہ ہوئے اور اس سفر میں اللہ تعالیٰ کی مُخاطَبَت اور منصبِ نبوت پر تقرر کا معاملہ پیش آیا۔

بائبل اور تَلمُود، دونوں کا مُتَّفَقہ بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانۂ قیامِ مَدین میں وہ فرعون مر چکا تھا جس کے ہاں

عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ

اپنی لاٹھی۔ جونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہُوا:) ”موسیٰؑ! پلٹ آ اور خوف نہ کر، تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔[44] اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے۔[45]

انھوں نے پرورش پائی تھی اور اب ایک دوسرا فرعون مصر کا فرماں روا تھا۔

۴۲۔ یعنی اُس کنارے پر جو حضرت موسیٰؑ کے داہنے ہاتھ کی طرف تھا۔

۴۳۔ یعنی اُس خطّے میں جو نورِ تجلّی سے روشن ہو رہا تھا۔

۴۴۔ یہ دونوں معجزے اس وقت حضرت موسیٰؑ کو اس لیے دکھائے گئے کہ اوّل تو انھیں خود پوری طرح یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہی ہستی ان سے مخاطب ہے جو کائنات کے پورے نظام کی خالق و مالک اور فرماں روا ہے۔ دوسرے وہ ان معجزوں کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ جس خطرناک مشن پر انھیں فرعون کی طرف بھیجا جا رہا ہے، اس کا سامنا کرنے کے لیے وہ بالکل نہتے نہیں جائیں گے بلکہ دو زبردست ہتھیار لے کر جائیں گے۔

۴۵۔ یعنی جب کبھی کوئی خطرناک موقع ایسا آئے جس سے تمھارے دل میں خوف پیدا ہو تو اپنا بازو بھینچ لیا کرو، اس سے تمھارا دل قوی ہو جائے گا اور رُعب و دہشت کی کوئی کیفیت تمھارے اندر باقی نہ رہے گی۔

بازو سے مراد غالباً سیدھا بازو ہے، کیونکہ مطلقاً ہاتھ بول کر سیدھا ہاتھ ہی مراد لیا جاتا ہے۔ بھینچنے کی دو شکلیں ممکن ہیں: ایک، یہ کہ بازو کو پہلو کے ساتھ لگا کر دبا لیا جائے۔ دوسری، یہ کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی بغل میں رکھ کر دبایا جائے۔ اغلب یہ ہے کہ پہلی شکل ہی مراد ہو گی۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرا کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ آدمی اپنے دل کا خوف دُور کرنے کے لیے کوئی خاص عمل کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ تدبیر اس لیے بتائی گئی کہ وہ ایک ظالم حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی لاؤ لشکر اور دنیوی سازوسامان کے بغیر بھیجے جا رہے تھے۔ بارہا ایسے خوفناک مواقع پیش آنے والے تھے جن میں ایک اولوا العزم نبی تک دہشت سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے، تم بس یہ عمل کر لیا کرو، فرعون اپنی پوری سلطنت کا زور لگا کر بھی تمھارے دل کی طاقت کو متزلزل نہ کر سکے گا۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِىْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِىْٓ ۡ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا

معانقۃ ۱۱

یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے، وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔[۴۶]" موسیٰؑ نے عرض کیا: "میرے آقا! میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔[۴۷] اور میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔" فرمایا: "ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سَطوت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے

---

۴۶- ان الفاظ میں یہ مفہوم آپ سے آپ شامل ہے کہ یہ نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اللہ کے رسول کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اور اس کے اعیانِ سلطنت کو اللہ ربّ العالمین کی اطاعت و بندگی کی طرف دعوت دو۔ اسی لیے یہاں اس ماموریت کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر صراحت کے ساتھ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نازعات میں فرمایا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ "فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔" اور الشّعراء میں فرمایا: وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ "جب کہ پکارا تیرے رب نے موسیٰؑ کو کہ جا ظالم قوم کے پاس، فرعون کی قوم کے پاس۔"

۴۷- اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس ڈر سے میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ حضور کی طرف سے ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیے کہ میرے پہنچتے ہی کسی بات چیت اور ادائے رسالت کی نوبت آنے سے پہلے وہ لوگ مجھے الزامِ قتل میں گرفتار نہ کر لیں، کیونکہ اس صورت میں تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے مجھے اس مہم پر بھیجا جا رہا ہے۔ بعد کی عبارت سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی اس گزارش کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا کہ وہ

الْغٰلِبُوْنَ ۝۳۵ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۶

پیرووں کا ہی ہوگا۔"[48]

پھر جب موسیٰؑ اُن لوگوں کے پاس ہماری کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔[49] اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سُنیں ہی نہیں۔[50]

ڈر کے مارے نبوت کا منصب قبول کرنے اور فرعون کے ہاں جانے سے انکار کرنا چاہتے تھے۔

۴۸ — اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی اس ملاقات اور گفتگو کا حال اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ طٰہٰ (آیت ۹ تا ۴۸) میں بیان ہوا ہے۔ قرآنِ مجید کے اس بیان کا جو شخص بھی اُس داستان سے مقابلہ کرے گا جو اس سلسلے میں بائبل کی کتابِ خُروج (باب ۳-۴) میں بیان کی گئی ہے، وہ اگر کچھ ذوقِ سلیم رکھتا ہو تو خود محسوس کر لے گا کہ ان دونوں میں سے کلامِ الٰہی کون سا ہے اور انسانی داستان گوئی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ نیز وہ اس معاملے میں بھی بآسانی رائے قائم کر سکے گا کہ آیا قرآن کی یہ روایت معاذ اللہ، بائبل اور اسرائیلی رِوایات کی نقل ہے، یا وہ خدا خود اصل واقعہ بیان فرما رہا ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کو باریاب فرمایا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۹)

۴۹ — اصل الفاظ ہیں: سِحْرٌ مُّفْتَرًى "افترا کیا ہُوا جادُو"۔ اس افترا کو اگر جھوٹ کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لاٹھی کا اژدہا بننا اور ہاتھ کا چمک اُٹھنا، نفسِ شے میں حقیقی تغیُّر نہیں ہے بلکہ محض ایک نمایشی شعبدہ ہے جسے یہ شخص معجزہ کہہ کر ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور اگر اسے بناوٹ کے معنیٰ میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ یہ شخص کسی کرتب سے ایک ایسی چیز بنا لایا ہے جو دیکھنے میں لاٹھی معلوم ہوتی ہے مگر جب یہ اسے پھینک دیتا ہے تو سانپ نظر آنے لگتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ پر بھی اس نے کوئی ایسی چیز مل لی ہے کہ اس کی بغل سے نکلنے کے بعد وہ یکایک چمک اُٹھتا ہے۔ یہ مصنوعی طِلسم اس نے خود تیار کیا ہے، اور ہمیں یقین یہ دلا رہا ہے کہ یہ معجزے ہیں جو خدا نے اسے عطا کیے ہیں۔

۵۰ — اشارہ ہے اُن باتوں کی طرف جو تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں حضرت موسیٰؑ نے پیش کی تھیں۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر ان باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ النازعات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا: هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ "کیا تو پاکیزہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہے؟ اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو خَشیَت اختیار کرے گا؟" سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ "ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں، اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے، اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ سزا ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔" اور اِنَّا رَسُوْلَا

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۳۷ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ

موسیٰؑ نے جواب دیا: ''میرا رب اُس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے، حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے[۵۱]۔''

اور فرعون نے کہا: ''اے اہلِ دربار! میں تو اپنے سوا تمھارے کسی خدا کو نہیں جانتا[۵۲]۔ ہامان! ذرا

رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ''ہم تیرے رب کے پیغمبر ہیں، تُو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔'' انھی باتوں کے متعلق فرعون نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فرعونِ مصر سے اُوپر بھی کوئی ایسی مُقتدِر ہستی ہے جو اس کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے دربار میں بھیجے، اور جس سے ڈرنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے کہا جائے۔ یہ تو نرالی باتیں ہیں جو آج ہم ایک شخص کی زبان سے سُن رہے ہیں۔

۵۱ – یعنی تُو مجھے ساحر اور افترا پرداز قرار دیتا ہے، لیکن میرا رب میرے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس کی طرف سے رسول مقرر کیا گیا ہے، وہ کیسا آدمی ہے۔ اور آخری انجام کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں جھوٹا ہوں تو میرا انجام بُرا ہوگا اور تُو جھوٹا ہے تو پھر خوب جان لے کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہے۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ظالم کے لیے فلاح نہیں ہے۔ جو شخص خدا کا رسول نہ ہو اور جھوٹ موٹ کا رسول بن کر اپنا کوئی مفاد حاصل کرنا چاہے، وہ بھی ظالم ہے اور فلاح سے محروم رہے گا، اور جو طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر سچّے رسول کو جھٹلائے اور مکاریوں سے صداقت کو دبانا چاہے، وہ بھی ظالم ہے اور اسے کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔

۵۲ – اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ہی تمھارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات صرف ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی تھی۔ اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ میرے سوا تمھارا کوئی معبُود نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مصر کے مذہب میں بہت سے معبُودوں کی پرستش ہوتی تھی، اور خود فرعون کو جس بنا پر معبُودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا، وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اَوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآنِ مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا: وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ ''اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تُو موسیٰؑ اور اس کی

يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ

اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اُونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اِسے جھوٹا سمجھتا[۵۳] ہوں۔"

اُس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[۵۴] اور سمجھے کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں[۵۵] ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا

قوم کو چھوٹ دے دے گا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے معبُودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاعراف، آیت ۱۲۷) اس لیے لامحالہ یہاں فرعون نے لفظ "خدا" اپنے لیے بمعنیٰ خالق و معبُود نہیں بلکہ بمعنیٰ مُطاع و حاکمِ مُطلَق استعمال کیا تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک مَیں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ میرا ہی قانون یہاں قانون مانا جائے گا۔ میری ذات ہی یہاں امر و نہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی۔ کوئی دوسرا یہاں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے۔ یہ موسیٰ کون ہے جو رب العالمین کا نمایندہ بن کر آ کھڑا ہوا ہے اور مجھے اس طرح احکام سنا رہا ہے کہ گویا اصل فرمانروا یہ ہے اور میں اس کا تابع فرمان ہوں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے دربار کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا: يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ "اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں؟" (الزُّخرُف، آیت ۵۱)، اور اسی بنا پر وہ حضرت موسیٰؑ سے بار بار کہتا تھا: اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ "کیا تُو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے؟" (یونس، آیت ۷۸) اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝ "اے موسیٰ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادُو کے زور سے ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟" (طٰہٰ، آیت ۵۷) اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔" (المومن، آیت ۲۶)

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن اُن ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمۂ قانون اور صاحبِ امر و نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، بہرحال جب تک وہ یہ مَوقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں

بلکہ ہمارا حکم چلے گا، اس وقت تک ان کے اور فرعون کے مَوقف میں کوئی اُصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور اِن کو سندِ جواز عطا کرتے رہیں۔ حقائق کی سمجھ بُوجھ رکھنے والا آدمی تو معنیٰ اور رُوح کو دیکھے گا، نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لیے ''اِلٰہ'' کا لفظ استعمال کیا تھا، اور یہ اسی معنیٰ میں ''حاکمیت'' کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۲۱)

۵۳ – یہ اسی قسم کی ذہنیت تھی جیسی موجودہ زمانے کے رُوسی کمیونسٹ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ اسپٹنک اور لُونِک چھوڑ کر دنیا کو خبر دیتے ہیں کہ ہماری اِن گیندوں کو اُوپر کہیں خدا نہیں ملا۔ وہ بے وقوف ایک مینارے پر چڑھ کر خدا کو جھانکنا چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گمراہ لوگوں کے ذہن کی پرواز ساڑھے تین ہزار برس پہلے جہاں تک تھی، آج بھی وہیں تک ہے۔ اس اعتبار سے ایک اُنگل بھر ترقی بھی وہ نہیں کر سکے ہیں۔ معلوم نہیں کس احمق نے اِن کو یہ خبر دی تھی کہ خدا پرست لوگ جس ربّ العالمین کو مانتے ہیں، وہ اُن کے عقیدے کی رُو سے اُوپر کہیں بیٹھا ہُوا ہے، اور اس اِتھاہ کائنات میں زمین سے چند ہزار فٹ یا چند لاکھ میل اُوپر اُٹھ کر اگر وہ انھیں نہ ملے تو یہ بات گویا بالکل ثابت ہو جائے گی کہ وہ کہیں موجود نہیں ہے۔

قرآن یہاں یہ نہیں کہتا کہ فرعون نے فی الواقع ایک عمارت اس غرض کے لیے بنوائی تھی اور اس پر چڑھ کر خدا کو جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بلکہ وہ اُس کے صرف اس قول کو نقل کرتا ہے۔ اِس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عملاً یہ حماقت نہیں کی تھی۔ اِن باتوں سے اس کا مدعا صرف بے وقوف بنانا تھا۔

یہ امر بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ فرعون آیا فی الواقع خداوندِ عالَم کی ہستی کا منکر تھا، یا محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر دہریت کی باتیں کرتا تھا۔ اس کے اقوال اس معاملے میں اُسی ذہنی اُلجھاؤ کی نشان دِہی کرتے ہیں جو روسی کمیونسٹوں کی باتوں میں پایا جاتا ہے۔ کبھی تو وہ آسمان پر چڑھ کر دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اُوپر دیکھ آیا ہوں، موسیٰؑ کا خدا کہیں نہیں ہے۔ اور کبھی وہ کہتا: فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ''اگر موسیٰؑ واقعی خدا کا بھیجا ہُوا ہے تو کیوں نہ اُس کے لیے سونے کے کنگن اُتارے گئے، یا اس کی اَردَلی میں ملائکہ نہ آئے؟'' یہ باتیں رُوس کے ایک سابق وزیرِ اعظم خروشچیف کی باتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں جو کبھی خدا کا انکار کرتا اور کبھی بار بار خدا کا نام لیتا اور اس کے نام کی قسمیں کھاتا تھا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے خلفا کا دورِ اقتدار گزر جانے کے بعد جب مصر میں قبطی قوم پرستی کا زور ہوا اور ملک میں اِسی نسلی و وطنی تعصُّب کی بنیاد پر سیاسی انقلاب رونما ہو گیا، تو نئے لیڈروں نے اپنے قوم پرستانہ جوش میں اُس خدا کے خلاف بھی بغاوت کر دی جس کو ماننے کی دعوت حضرت یوسفؑ اور ان کے پیرو اسرائیلی اور مصری مسلمان دیتے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ خدا کو مان کر ہم یُوسُفی تہذیب کے اثر سے نہ نکل سکیں گے، اور یہ تہذیب باقی رہی تو ہمارا سیاسی اثر بھی مستحکم نہ ہو سکے گا۔ وہ خدا کے اقرار اور مُسلِم اقتدار کو لازم وملزوم سمجھتے تھے، اس لیے ایک سے پیچھا چھڑانے کی خاطر دوسرے کا انکار ان کے نزدیک ضروری تھا، اگرچہ اس کا اقرار ان کے دل کی گہرائیوں سے کسی طرح نکالے نہ نکلتا تھا۔

۵۴ – یعنی بڑائی کا حق تو اس کائنات میں صرف اللہ ربّ العالمین کو ہے۔ مگر فرعون اور اس کے لشکر زمین کے ایک ذرا سے خطے میں تھوڑا سا اقتدار پا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں بڑے بس وہی ہیں۔

فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿٤١﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿٤٢﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٣﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ

اور سمندر میں پھینک دیا۔[56] اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انھیں جہنّم کی طرف دعوت دینے والے پیش رَو بنا دیا[57] اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اِس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔[58] ع

پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی، لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر، ہدایت اور رحمت بنا کر، تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں۔[59] (اے محمدؐ!) تم اُس وقت

۵۵ – یعنی انھوں نے اپنے آپ کو غیر مسئول سمجھ لیا اور یہ فرض کر کے خود مختارانہ کام کرنے لگے کہ انھیں جا کر کسی کے سامنے جواب دِہی نہیں کرنی ہے۔

۵۶ – ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے تکبّر کے مقابلے میں ان کی بے حقیقتی اور ہیچ میرزی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر جب وہ مہلت، جو خدا نے ان کو راہِ راست پر آنے کے لیے دی تھی، ختم ہوگئی تو انھیں اِس طرح اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۵۷ – یعنی وہ بعد کی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کر گئے ہیں کہ ظلم یوں کیا جاتا ہے، انکارِ حق پر ڈٹ جانے اور آخر وقت تک ڈٹے رہنے کی شان یہ ہوتی ہے، اور صداقت کے مقابلے میں باطل پرست لوگ ایسے ایسے ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب راستے دنیا کو دکھا کر وہ جہنّم کی طرف جا چکے ہیں، اور ان کے اَخلاف اب اُنھی کے نقشِ قدم پر چل کر اُسی منزل کے رُخ لپکے جا رہے ہیں۔

۵۸ – اصل الفاظ ہیں: قیامت کے روز وہ ''مقبوحین'' میں سے ہوں گے۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ

الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَ لٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ

مغربی گوشے میں موجود نہ [۶۰] تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل [۶۱] تھے، بلکہ اس کے بعد (تمہارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ [۶۲] تم اہلِ مَدیَن کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سُنا رہے ہوتے، [۶۳] مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی

مردود و مطرود ہوں گے۔ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم کر دیے جائیں گے۔ ان کی بُری گت بنائی جائے گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیے جائیں گے۔

۵۹ — یعنی پچھلی نسلیں جب انبیائے سابقین کی تعلیمات سے رُوگردانی کا بُرا نتیجہ بھگت چکیں، اور ان کا آخری انجام وہ کچھ ہو چکا جو فرعون اور اس کے لشکروں نے دیکھا، تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی گئی، تاکہ انسانیت کا ایک نیا دَور شروع ہو۔

۶۰ — مغربی گوشے سے مراد جزیرہ نمائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو احکامِ شریعت دیے گئے تھے۔ یہ علاقہ حجاز کے مغربی جانب واقع ہے۔

۶۱ — یعنی بنی اسرائیل کے اُن ستّر نمایندوں میں جن کو شریعت کی پابندی کا عہد لینے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بلایا گیا تھا۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۵۵ میں اُن نمایندوں کے بلائے جانے کا ذکر گزر چکا ہے، اور بائبل کی کتاب خُروج، باب ۲۴ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے)۔

۶۲ — یعنی تمہارے پاس اِن معلومات کے حُصول کا براہِ راست کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آج جو تم ان واقعات کو دو ہزار برس سے زیادہ مدّت گزر جانے کے بعد اِس طرح بیان کر رہے ہو کہ گویا یہ سب تمہارا آنکھوں دیکھا حال ہے، اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے سے تم کو یہ معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔

۶۳ — یعنی جب حضرت موسیٰؑ مَدیَن پہنچے، اور جو کچھ وہاں ان کے ساتھ پیش آیا، اور دس سال گزار کر جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے، اس وقت تمہارا کہیں پتا بھی نہ تھا۔ تم اس وقت مدین کی بستیوں میں وہ کام نہیں کر رہے تھے جو آج مکے کی گلیوں میں کر رہے ہو۔ اُن واقعات کا ذکر تم کچھ اس بنا پر نہیں کر رہے ہو کہ یہ تمہارا عینی مشاہدہ ہے، بلکہ یہ علم

بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ

اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰؑ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر یہ تمھارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں[۶۴]) تاکہ تم اُن لوگوں کو مُتنبّہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی مُتنبِّہ کرنے والا نہیں آیا،[۶۵] شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں

بھی تم کو ہماری وحی کے ذریعے سے ہی حاصل ہُوا ہے۔

۶۴ – یہ تینوں باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں، اس وقت مکے کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر پوری طرح تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو غیر نبی، اور معاذ اللہ، جھوٹا مدعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علما اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالَمِ بالا سے آ کر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے بلکہ اُسی مکّے کے رہنے والے تھے اور آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپؐ کی بستی اور آپؐ کے قبیلے کے لوگوں سے چھُپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اس وقت مکہ، اور حجاز، اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اُٹھ کر وہ بیہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ اِن سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحے کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ! تم فلاں فُلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لائے ہو، کیونکہ پورے مُلک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ! تمھارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکّے کا بچّہ بچّہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپؐ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سُریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپؐ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپؐ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے۔ کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوئے تھے۔ مکّے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپؐ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سیکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپؐ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومیوں سے

مسلمان برسرِ پیکار ہوگئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی رَبّی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رُومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمدؐ، معاذ اللہ، سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض، اُس زمانے میں جب کہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفار و مشرکین کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا اِن معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشان دہی کی جا سکتی ہو۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن نے یہ چیلنج اِسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدّد مقامات پر مختلف قصّوں کے سلسلے میں دیا ہے۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کا قصّہ بیان کر کے فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ ’’یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے سے تمھیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے آس پاس کہیں موجود نہ تھے جب کہ وہ اپنے قرعے یہ طے کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے۔ اور نہ تم اس وقت موجود تھے جب کہ وہ جھگڑ رہے تھے۔‘‘ (آلِ عمران، آیت ۴۴) حضرت یوسفؑ کا قصّہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ ’’یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے سے تمھیں دے رہے ہیں، تم ان کے (یعنی یوسفؑ کے بھائیوں کے) آس پاس کہیں موجود نہ تھے جب کہ انھوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ اپنی چال چل رہے تھے۔‘‘ (یوسف، آیت ۱۰۲) اسی طرح حضرت نوحؑ کا مفصّل قصّہ بیان کر کے فرمایا: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ؕ ’’یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، تمھیں اور تمھاری قوم کو اس سے پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا۔‘‘ (ہود، آیت ۴۹) اِس چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید اپنے من جانبِ اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے بڑے دلائل دیتا تھا، ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک اُمّی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں، ان کے علم کا کوئی ذریعہ اُس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز اُن اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے جا رہے تھے کہ واقعی آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور آپؐ پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصور کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اُس زمانے میں اِس چیلنج کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیّت رکھتا ہوگا، اور انھوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں کیا کسر اُٹھا رکھی ہوگی۔ نیز یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاذ اللہ، اِس چیلنج میں ذرا سی بھی کوئی کمزوری ہوتی تو اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے شہادتیں فراہم کرنا ہم عصر لوگوں کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

**۶۵ —** عرب میں حضرت اسماعیل اور حضرت شعیب علیہما السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ تقریباً دو ہزار برس کی اس طویل مدت میں باہر کے انبیاؑ کی دعوتیں تو ضرور وہاں پہنچیں، مثلاً حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام

اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ مُّصِيۡبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُوۡتِىَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ۚ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوۡۤا

ایسا نہ ہو کہ اُن کے اپنے کیے کرتُوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب اُن پر آئے تو وہ کہیں: ”اے پروردگار! تُو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔“[۶۶]

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے: ”کیوں نہ دیا گیا اِس کو وہی کچھ جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا؟“[۶۷] کیا یہ لوگ اُس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰؑ کو دیا گیا تھا؟[۶۸] انھوں نے کہا: ”دونوں جادُو ہیں[۶۹] جو ایک دُوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“ اور کہا:

---

کی دعوتیں، مگر کسی نبی کی بِعثتِ خاص اس سرزمین میں نہیں ہوئی تھی۔

۶۶ – اِسی چیز کو قرآنِ مجید متعدّد مقامات پر رسولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسول آنا چاہیے۔ جب تک دنیا میں ایک رسول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود رہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود رہیں، کسی نئے رسول کی حاجت نہیں رہتی، اِلّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاؑ کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا گمراہیوں میں خَلَط مَلَط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے قابل نہ رہیں، تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرنے اور صحیح راہ بتانے کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پا سکتے تھے۔ اسی عذر کو قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے، تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کج روی کا ذمہ دار ٹھیرایا جا سکے۔

۶۷ – یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارے معجزے کیوں نہ دیے گئے جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے تھے۔ یہ بھی عصا کا اژدہا بنا کر ہمیں دکھاتے۔ ان کا ہاتھ بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا۔ جھٹلانے والوں پر ان کے اشارے سے بھی پے در پے طوفانوں اور زمین و آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا، اور یہ بھی پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام لا کر ہمیں دیتے۔

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ ؕ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

ع ۸ ۵ ۸ النصف

''ہم کسی کو نہیں مانتے۔'' (اے نبیؐ!) ان سے کہو: ''اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو اِن دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچّے ہو، مَیں اسی کی پیروی اختیار کروں گا۔''[70] اب اگر وہ تمھارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اُس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ع اور (نصیحت کی) بات پے در پے ہم انھیں پہنچا چکے ہیں، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں۔[71]

جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔[72]

۶۸ — یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان معجزوں کے باوجود موسیٰؑ ہی پر تم کب ایمان لائے تھے جواب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کا مطالبہ کر رہے ہو۔ تم خود کہتے ہو کہ موسیٰؑ کو یہ معجزے دیے گئے تھے۔ مگر پھر بھی ان کو نبی مان کر ان کی پیروی تم نے کبھی قبول نہیں کی۔ سورۂ سبا، آیت ۳۱ میں بھی کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''نہ ہم اِس قرآن کو مانیں گے نہ اُن کتابوں کو جو اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں۔''

۶۹ — یعنی قرآن اور تورات۔

۷۰ — یعنی مجھے تو ہدایت کی پیروی کرنی ہے، بشرطیکہ وہ کسی کی من گھڑت نہ ہو، بلکہ خدا کی طرف سے حقیقی ہدایت ہو۔ اگر تمھارے پاس کوئی کتاب اللہ موجود ہے جو قرآن اور تورات سے بہتر رہنمائی کرتی ہو، تو اسے تم نے چھپا کیوں رکھا ہے؟

وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓىٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ

اور جب یہ اُن کو سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ”ہم اِس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔[۷۳]“ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا[۷۴] اُس

اسے سامنے لاؤ، میں بلا تأمّل اس کی پیروی قبول کرلوں گا۔

**۷۱** – یعنی جہاں تک حق نصیحت ادا کرنے کا تعلق ہے، ہم اس قرآن میں پیہم اسے ادا کر چکے ہیں۔ لیکن ہدایت تو اُسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑے اور تعصّبات سے دل کو پاک کر کے سچّائی کو سیدھی طرح قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

**۷۲** – اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بلکہ یہ اشارہ دراصل اُس واقعے کی طرف ہے جو اِس سورہ کے نزول کے زمانے میں پیش آیا تھا، اور اس سے اہلِ مکہ کو شرم دلانی مقصود ہے کہ تم اپنے گھر آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو، حالانکہ دُور دُور کے لوگ اس کی خبر سن کر آ رہے ہیں اور اُس کی قدر پہچان کر اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

اس واقعے کو ابنِ ہِشام اور بَیْہَقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکّۂ معظّمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجدِ حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآنِ مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستے میں جا لیا اور انھیں سخت ملامت کی کہ ”بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمھارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اِس لیے بھیجا تھا کہ تم اِس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انھیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اِس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔“ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ ”سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمھارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بُوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔“ (سیرت ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۳۲۔ البِدایہ والنِّہایہ، ج ۳، ص ۸۲) مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۲۳۔

**۷۳** – یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اس لیے اسلام کے سوا ہمارا کوئی

اور دین نہ تھا۔ اور اب جو نبی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

یہ قول اس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور ''مسلم'' کی اصطلاح کا اطلاق محض حضورؐ کے پیروؤں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاؑ کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانے میں ان سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہوئے تو صرف اُس وقت جب کہ کسی بعد کے آنے والے نبیِ صادق کو ماننے سے انھوں نے انکار کیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آئے، اُن کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ وہ جیسے مسلمان پہلے تھے، ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجُّب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم بھی اس حقیقت کے اِدراک سے عاجز رہ گئے ہیں، حتّٰی کہ اس صریح آیت کو دیکھ کر بھی ان کا اطمینان نہ ہُوا۔ علامہ سُیُوطیؒ نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ مسلم کی اصطلاح صرف اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔ پھر جب یہ آیت سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ میں نے پھر خدا سے دعا کی کہ اس معاملے میں مجھے شرحِ صدر عطا کر دے۔ آخر کار اپنی رائے سے رُجوع کرنے کے بجائے انھوں نے اُس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدّد تاویلیں کر ڈالیں، جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً ان کی ایک تاویل یہ ہے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ کے معنیٰ ہیں: ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے، کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ اس فقرے میں مُسْلِمِيْنَ کے بعد لفظ بِهٖ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے، کیونکہ اس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لائے ہوئے تھے، اس لیے تورات و انجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اس کے نُزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مسلم تھے۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کر لیں گے، اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی سے مسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرحِ صدر کا اس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن صرف اسی ایک مَقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اِس اُصولی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اصل دین صرف ''اسلام'' (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کی مخلوق کے لیے اِس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغازِ آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے، اور یہ کہ انبیا علیہم السلام ہمیشہ خود مسلم رہے ہیں، اپنے پیروؤں کو انھوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور ان کے وہ سب متبعین، جنھوں نے نبوت کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مسلم ہی تھے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر صرف چند آیات مُلاحظہ ہوں:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟ (آلِ عمران، آیت ۱۹) درحقیقت اللہ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہے۔

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ۚ (آلِ عمران، آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ‌ۙ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ○ (یونس، آیت ۷۲)

میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ‌ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ؕ○ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○ (البقرہ، آیات ۱۳۱ تا ۱۳۳)

جب کہ اس کے رب نے اس سے کہا کہ مسلم (تابعِ فرمان) ہو جا، تو اس نے کہا: میں مسلم ہو گیا ربّ العالمین کے لیے۔ اور اسی چیز کی وصیت کی ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اور یعقوبؑ نے بھی، کہ اے میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے اس دین کو پسند کیا ہے، لٰہذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اس نے اپنی اولاد سے پوچھا: کس کی بندگی کرو گے تم میرے بعد؟ انھوں نے جواب دیا: ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی، اس کو اکیلا معبود مان کر، اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ (آلِ عمران، آیت ۶۷)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسو مسلم تھا۔

حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خود دعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۖ (البقرہ، آیت ۱۲۸)

اے ہمارے رب! ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک اُمّت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔

حضرت لُوطؑ کے قصّے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا وَجَدۡنَا فِيۡهَا غَيۡرَ بَيۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۚ○ (الذاریات، آیت ۳۶)

ہم نے قومِ لُوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

حضرت یوسفؑ بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرتے ہیں:

تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ ○ (یوسف، آیت ۱۰۱)

مجھ کو مسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور صالحوں کے ساتھ ملا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ (یونس، آیت ۸۴)

اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسا کرو اگر تم مسلم ہو۔

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے۔ چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے، وہ یہ ہے:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (یونس، آیت ۹۰)

میں مان گیا کہ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلموں میں سے ہوں۔

تمام انبیائے بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ (المائدہ، آیت ۴۴)

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اسی کے مطابق وہ نبی جو مسلم تھے، اُن لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی ہو گئے تھے۔

یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا ان پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (النمل، آیت ۴۴)

میں سلیمانؑ کے ساتھ ربّ العالمین کی مسلم ہوگئی۔

اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کا دین تھا:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (المائدہ، آیت ۱۱۱)

اور جب کہ میں نے حواریوں پر وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر، تو انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔

اس معاملے میں اگر کوئی شک اِس بنا پر کیا جائے کہ عربی زبان کے الفاظ ''اسلام'' اور ''مسلم'' ان مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہوگی۔ کیونکہ اصل اعتبار عربی کے ان الفاظ کا نہیں بلکہ اُس معنیٰ کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات اِن آیات میں بتائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیّت یا موسویّت یا محمدّیت نہیں ہے، بلکہ انبیا اور کُتبِ آسمانی کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے، اور یہ رَویّہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالم گیر اَزَلی و اَبَدی دینِ حق کا متبع ہے۔ اس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شُعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے، ان کے لیے موسیٰ کے بعد مسیح کو، اور مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیلِ مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیا علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے

بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۵۴ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا

ثابت قدمی کے بدلے جو انھوں نے دکھائی۔[۷۵] وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں[۷۶] اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۷۷]۔ اور جب انھوں نے بیہودہ بات سنی[۷۸] تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ''ہمارے اعمال ہمارے لیے

گھس آئے یا پیدا ہو گئے، اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ان کی جہالت کی قلعی کھل گئی۔ کیونکہ انھوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آیندہ کے لیے مسلم رہنا قبول نہ کیا، بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی ''مسلم'' نہ تھے، محض ایک نبی یا بعض انبیاؑ کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آبا و اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے۔

۷۴ – یعنی ایک اجر اُس ایمان کا جو وہ پہلے سیّدنا عیسٰی علیہ السلام پر رکھتے تھے، اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبیِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسٰی اَشْعَرِیؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلثة لهم اجران، رجل من اهل الكتاب اٰمن بنبيه واٰمن بمحمد...... ''تین شخص ہیں جن کو دُہرا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا۔''

۷۵ – یعنی انھیں یہ دُہرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ قومی و نسلی اور وطنی و گروہی تعصّبات سے بچ کر اصل دینِ حق پر ثابت قدم رہے اور نئے نبی کی آمد پر جو سخت امتحان درپیش ہوا، اس میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ دراصل وہ مسیح پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے، اور شخصیتِ مسیحؑ کے گرویدہ نہیں بلکہ ''اسلام'' کے متبع تھے، اسی وجہ سے مسیحؑ کے بعد جب دوسرا نبی وہی اسلام لے کر آیا جسے مسیحؑ لائے تھے تو انھوں نے بے تکلف اس کی رہنمائی میں اسلام کا راستہ اختیار کر لیا اور اُن لوگوں کا راستہ چھوڑ دیا جو مسیحیت پر جمے رہ گئے۔

۷۶ – یعنی وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں بلکہ صداقت لاتے ہیں۔ ظلم کو ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دفع کرتے ہیں۔ شرارتوں کا سامنا شرارت سے نہیں بلکہ شرافت سے کرتے ہیں۔

۷۷ – یعنی وہ راہِ حق میں مالی ایثار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو کہ وہ لوگ

وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝٥٥ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝٥٦ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ

---

اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں[۷۹]۔

وہ کہتے ہیں: "اگر ہم تمھارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں[۸۰] گے۔"

---

محض حق کی تلاش میں حَبَش سے سفر کر کے مکہ آئے تھے۔ اس محنت اور صَرفِ مال سے کوئی مادّی منفعت ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ انھوں نے جب سنا کہ مکے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ خود جا کر تحقیق کریں، تاکہ اگر واقعی ایک نبی ہی خدا کی طرف سے مبعوث ہُوا ہو تو وہ اس پر ایمان لانے اور ہدایت پانے سے محروم نہ رہ جائیں۔

۷۸ – اشارہ ہے اُس بیہودہ بات کی طرف جو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے حبشی عیسائیوں کے اس وفد سے کی تھی، جس کا ذکر اُوپر حاشیہ ۷۲ میں گزر چکا ہے۔

۷۹ – سیاقِ کلام سے ظاہر ہے کہ حبشی عیسائیوں کے ایمان و اسلام کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطَب کر کے یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود دراصل کفارِ مکہ کو شرم دلانا تھا۔ کہنا یہ تھا کہ بدنصیبو! ماتم کرو اپنی حالت پر کہ دوسرے کہاں کہاں سے آ کر اس نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں اور تم اس چشمۂ فیض سے، جو تمھارے اپنے گھر میں بہ رہا ہے، محروم رہے جاتے ہو۔ لیکن کہا گیا ہے اِس انداز سے کہ اے محمدؐ! صلی اللہ علیک وسلم، تم چاہتے ہو کہ میری قوم کے لوگ، میرے بھائی بند، میرے عزیز و اقارب، اِس آبِ حیات سے بہرہ مند ہوں، لیکن تمھارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ اس نعمت سے انھی لوگوں کو فیض یاب کرتا ہے جن میں وہ قبولِ ہدایت کی آمادگی پاتا ہے، تمھارے رشتہ داروں میں اگر یہ جوہر موجود نہ ہو تو انھیں یہ فیض کیسے نصیب ہوسکتا ہے۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے معاملے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا جب آخری وقت آیا تو حضورؐ نے اپنی حد تک انتہائی کوشش کی کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر ایمان لے آئیں تاکہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو، مگر انھوں نے مِلّتِ عبدالمُطّلب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ۔

لیکن محدثین و مفسّرین کا یہ طریقہ معلوم و معروف ہے کہ ایک آیت عہدِ نبویؐ کے جس معاملے پر چسپاں ہوتی ہے، اسے وہ آیت کی شانِ نُزول کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت اور اِسی مضمون کی اُن دوسری روایات سے جو ترمذی اور مُسندِ احمد وغیرہ میں حضرات ابو ہریرہؓ، ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ وغیرہم سے مروی ہیں، لازماً یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ سورۂ قصص کی یہ آیت ابوطالب کی وفات کے وقت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کی صداقت سب سے زیادہ اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ اگرچہ حضورؐ کی دلی خواہش تو ہر بندۂ خدا کو راہِ راست پر لانے کی تھی، لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر خاتمہ حضورؐ کو شاق ہوسکتا تھا، اور ذاتی محبّت و تعلق کی بنا پر سب سے زیادہ کسی شخص کی ہدایت کے آپؐ آرزومند ہو سکتے تھے، تو وہ ابوطالب تھے۔ لیکن جب ان کو بھی ہدایت دینے پر آپؐ قادر نہ ہوئے تو یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ کسی کو ہدایت بخشنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا نبی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ کے ہاں سے یہ دولت کسی رشتہ داری و برادری کی بنا پر نہیں بلکہ آدمی کی قبولیت و استعداد اور مخلصانہ صداقت پسندی کی بنا پر عطا ہوتی ہے۔

۸۰- یہ وہ بات ہے جو کفارِ قریش اسلام قبول نہ کرنے کے لیے عذر کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کفروانکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔ اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ تاریخی طور پر اُس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انھیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیّت دی، وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا اَنسابِ عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا، اور اس بنا پر ان کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصَیّ بن کِلَاب کے حُسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبے کے متولی ہو گئے اور مکہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیّت پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی۔ اس لیے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ کے مُجاوِر تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مَقام حاصل تھا، اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو ان سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے رُوم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مَقام عطا کر دیا۔ اُس زمانے میں رُوم و یونان اور مصروشام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقا کے ساتھ تھی، اس کے سارے ناکے ایران نے روک دیے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا، سو یمن پر ایران کے قبضے نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اس تجارت کو جاری رکھنے کے لیے اس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیجِ فَارس کے بندرگاہوں پر پہنچائیں، اور دوسری طرف انھی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اس صورت حال نے مکّہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اس وقت قریش ہی تھے جنھیں اس کاروبار کا قریب قریب اجارہ حاصل تھا۔ لیکن عرب کی طوائف المُلُوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل وحرکت اس کے بغیر نہ ہوسکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں، ان کے ساتھ

اَوَلَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجۡبٰٓى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا، جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟

قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قریش اس غَرَض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے تمام قبائل کے ساتھ مُعاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ ان کو حصّہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور بااثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انھوں نے پھیلا رکھا تھا، جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تُجّار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

اِن حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہِ اشتعال بنی، وہ یہ تھی کہ اس دعوت کی بدولت انھیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجتوں سے شرک و بت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اِسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کُن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تَولیَت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بُت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصوں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رُسوخ و اثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری مَعاشی خوش حالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکہ ہی چھوڑ دینے پر مجبُور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انھیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں، اسے مان لو تو عرب و عجم تمھارے تابع ہو جائیں گے۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، صفحہ ۳۱۶-۳۱۷) مگر انھیں اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رُسوخ ہمیں آج حاصل ہے، یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوّے ہماری بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ ان کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابع فرمان ہونے والا تھا، پھر اسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفا سندھ سے لے کر اسپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ

---

مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[81]

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اِترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔[82]

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سُناتا۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ

---

۸۱ – یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مالِ تجارت اِس وادیِ غیر ذی زرع میں کھنچا چلا آرہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمھاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اس بے آب وگیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھر اور گارے کا ایک حجرہ تعمیر کر دیا اور پکار دیا کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے، آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسّر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزار ہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصّہ تمھارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمھیں بخشی ہے، اس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

۸۲ – یہ ان کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوش حالی پر تم اِترائے ہوئے ہو، اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور

اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ

ع ۶ ۱۰

ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔[۸۳]

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ ع بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو، کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟[۸۴]

اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اُس دن کو جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پُوچھے گا: "کہاں ہیں

ثمود اور سبا اور مدین اور قومِ لوطؑ کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمھارے پاس اس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا، انھی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور ان کی طرح تمھاری شامت کبھی نہ آئے گی؟

۸۳ – یہ ان کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں، ان کے لوگ ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انھیں مُتنبِّہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج رَوی سے باز نہ آئے تو انھیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمھیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمھیں بھی مُتنبِّہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچاؤ گے نہیں بلکہ اُلٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمھیں اندیشہ ہے، وہ ایمان لانے سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے تم پر آئے گی۔

۸۴- یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہییں:

اوّل یہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی، جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے، بہر حال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اُٹھ جانا ہے۔ اس مختصر سے عرصۂ حیات کا عیش اگر آدمی کو اس قیمت پر حاصل ہوتا ہو کہ آیندہ کی اَبدی زندگی میں وہ دائماً خستہ حال اور مبتلائے مصیبت رہے، تو کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ خسارے کا سودا نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں ایک عقل مند آدمی اِس کو ترجیح دے گا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں سے وہ بھلائیاں کما کر لے جائے جو بعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کے عیش کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اِس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر ہے اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں اسے سُرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے اَبدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آ پڑے، یعنی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم کا مطالبہ بھی ہے، کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

ان دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اُوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرماتا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اس حیاتِ دنیا میں اُٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے، وہ اس کی بہ نسبت کم و کیف (quality اور quantity) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اِس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے مُتَمَتِّع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں تمھیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لائے اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لُوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ

میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟[۸۵]" یہ قول جن پر چسپاں ہوگا[۸۶] وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ اِنھیں ہم نے اُسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے براءت کا اظہار کرتے ہیں[۸۷]۔ یہ ہماری تو بندگی نہیں کرتے تھے[۸۸]۔" پھر اِن سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو[۸۹]۔

۸۵ - یہ تقریر بھی اسی چوتھے جواب کے سلسلے میں ہے، اور اس کا تعلق اُوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بُت پرستی اور انکارِ نبوت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی اَبدی زندگی میں اِس کا کیسا بُرا نتیجہ انھیں دیکھنا پڑے گا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو، دنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو، تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو، یا سراسر خسارے کا سودا؟

۸۶ - اِس سے مراد وہ شیاطینِ جِنّ و اِنس ہیں جن کو دنیا میں خدا کا شریک بنایا گیا تھا، جن کی بات کے مقابلے میں خدا اور اس کے رسولوں کی بات کو ردّ کیا گیا تھا، اور جن کے اعتماد پر صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر زندگی کے غلط راستے اختیار کیے گئے تھے۔ ایسے لوگوں کو خواہ کسی نے الٰہ اور رب کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہرحال جب ان کی اطاعت و پیروی اُس طرح کی گئی جیسی خدا کی ہونی چاہیے تو لازماً انھیں خدائی میں شریک کیا گیا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰)

۸۷ - یعنی ہم نے زبردستی اِن کو گمراہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے نہ اِن سے بینائی اور سماعت سلب کی تھی، نہ ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں، اور نہ ایسی ہی کوئی صورت پیش آئی تھی کہ یہ تو راہِ راست کی طرف جانا چاہتے ہوں مگر ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر جبراً انھیں غلط راستے پر کھینچ لے گئے ہوں۔ بلکہ جس طرح ہم خود اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے، اسی طرح اِن کے سامنے بھی ہم نے گمراہی پیش کی اور انھوں نے اپنی مرضی سے اس کو قبول کیا۔ لہٰذا ہم ان کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ ہم اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں اور یہ اپنے فعل کے ذمہ دار۔

یہاں یہ لطیف نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سوال تو کرے گا شریک ٹھیرانے والوں سے، مگر قبل اس کے

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى

---

یہ انھیں پکاریں گے مگر وہ اِن کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش! یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پُوچھے گا کہ ”جو رسول بھیجے گئے تھے انھیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اُس وقت کوئی جواب اِن کو نہ سُوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دُوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا۔

تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے، یہ انتخاب اِن لوگوں کے کرنے کا کام نہیں[۹۰] ہے، اللہ پاک ہے اور بہت بالاتر ہے

---

کہ یہ کچھ بولیں، جواب دینے لگیں گے وہ جن کو شریک ٹھیرایا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عام مشرکین سے یہ سوال کیا جائے گا تو ان کے لیڈر اور پیشوا محسوس کریں گے کہ اب آ گئی ہماری شامت۔ یہ ہمارے سابق پیرو ضرور کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری گمراہی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ اس لیے پیرووں کے بولنے سے پہلے وہ خود سبقت کر کے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دیں گے۔

۸۸ – یعنی یہ ہمارے نہیں بلکہ اپنے ہی نفس کے بندے بنے ہوئے تھے۔

۸۹ – یعنی انھیں مدد کے لیے پکارو۔ دنیا میں تو تم نے ان پر بھروسا کر کے ہماری بات ردّ کی تھی۔ اب

عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّكَ يَعۡلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿۶۹﴾
وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الۡحَمۡدُ فِي الۡاُوۡلٰى وَالۡاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الۡحُكۡمُ

اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں[91]۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، فرماں روائی اسی کی ہے

یہاں اِن سے کہو کہ آئیں اور تمھاری مدد کریں اور تمھیں عذاب سے بچائیں۔

**۹۰-** یہ ارشاد دراصل شرک کی تردید میں ہے۔ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے جو بے شمار معبود اپنے لیے بنا لیے ہیں، اور ان کو اپنی طرف سے جو اوصاف، مراتب اور مناصب سونپ رکھے ہیں، اس پر اعتراض کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے پیدا کیے ہوئے انسانوں، فرشتوں، جِنّوں اور دوسرے بندوں میں سے ہم خود جس کو جیسے چاہتے ہیں، اوصاف، صلاحیتیں اور طاقتیں بخشتے ہیں اور جو کام جس سے لینا چاہتے ہیں، لیتے ہیں۔ یہ اختیارات آخر اِن مشرکین کو کیسے اور کہاں سے مل گئے کہ میرے بندوں میں سے جس کو چاہیں مشکل کشا، جسے چاہیں گنج بخش، اور جسے چاہیں فریاد رس قرار دے لیں؟ جسے چاہیں بارش برسانے کا مختار، جسے چاہیں روزگار یا اولاد بخشنے والا، جسے چاہیں بیماری وصحّت کا مالک بنا دیں؟ جسے چاہیں میری خدائی کے کسی حصّے کا فرماں روا ٹھیرا لیں؟ اور میرے اختیارات میں سے جو کچھ جس کو چاہیں سونپ دیں؟ کوئی فرشتہ ہو یا جنّ یا نبی یا ولی، بہرحال جو بھی ہے ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔ جو کمالات بھی کسی کو ملے ہیں، ہماری عطا و بخشش سے ملے ہیں۔ اور جو خدمت بھی ہم نے جس سے لینی چاہی ہے، لی ہے۔ اس برگزیدگی کے یہ معنیٰ آخر کیسے ہو گئے کہ یہ بندے بندگی کے مقام سے اُٹھا کر خدائی کے مرتبے پر پہنچا دیے جائیں اور خدا کو چھوڑ کر ان کے آگے سرِ نیاز جھکا دیا جائے، اِن کو مدد کے لیے پکارا جانے لگے، اِن سے حاجتیں طلب کی جانے لگیں، انھیں قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ لیا جائے، اور انھیں خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے دیا جائے؟

**۹۱-** اس سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مقصد کے لیے ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص یا گروہ دنیا میں لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس گمراہی کو اس نے اختیار کیا ہے اس کی صحّت پر وہ بڑے معقول وجوہ سے مطمئن ہے، اور اس کے خلاف جو دلائل دیے گئے ہیں ان سے فی الحقیقت اس کا اطمینان نہیں ہُوا ہے، اور اس گمراہی کو اس نے کسی بُرے جذبے سے نہیں بلکہ خالص نیک نیتی کے ساتھ اختیار کیا ہے، اور اس کے سامنے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں آئی ہے جس سے اس کی غلطی اس پر واضح ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی یہ بات نہیں چل سکتی۔

وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

---

اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اے نبیؐ! اِن سے کہو: کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبُود ہے جو تمھیں روشنی لا دے؟ کیا تم سُنتے نہیں ہو؟ اِن سے پوچھو: کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبُود ہے جو تمھیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سُکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سُوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم (رات میں) سُکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انھیں پکارے گا پھر پُوچھے گا: "کہاں ہیں میرے وہ شریک

---

وہ صرف ظاہر ہی کو نہیں دیکھتا۔ اس کے سامنے تو آدمی کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ کُھلا ہوا ہے۔ وہ اس کے علم اور احساسات اور جذبات اور خواہشات اور نیت اور ضمیر، ہر چیز کو براہِ راست جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کس شخص کو کس کس وقت کن ذرائع سے تنبیہ ہوئی، کن کن راستوں سے حق پہنچا، کس کس طریقے سے باطل کا باطل ہونا اس پر کُھلا، اور پھر وہ اصل محرکات کیا تھے جن کی بنا پر اس نے اپنی گمراہی کو ترجیح دی اور حق سے منہ موڑا۔

تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْۤا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ ع اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ص وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ق اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ

ع ۱۵/۱۰

جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" اور ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے[92]، پھر کہیں گے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل[93]۔" اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے، اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے۔ ع

یہ ایک واقعہ ہے[94] کہ قارون موسیٰؑ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا[95]۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اُٹھا سکتی تھی[96]۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا:

۹۲- یعنی وہ نبی جس نے اس اُمّت کو خبردار کیا تھا، یا انبیاؑ کے پیروؤں میں سے کوئی ایسا ہدایت یافتہ انسان جس نے اُس اُمّت میں تبلیغِ حق کا فریضہ انجام دیا تھا، یا کوئی ایسا ذریعہ جس سے اس اُمّت تک پیغامِ حق پہنچ چکا تھا۔

۹۳- یعنی اپنی صفائی میں کوئی ایسی حجت پیش کرو جس کی بنا پر تمھیں معاف کیا جا سکے۔ یا تو یہ ثابت کرو کہ تم جس شرک، جس انکارِ آخرت اور جس انکارِ نبوت پر قائم تھے، وہ برحق تھا اور تم نے معقول وجوہ کی بنا پر یہ مسلک اختیار کیا تھا۔ یا یہ نہیں تو پھر کم از کم یہی ثابت کر دو کہ خدا کی طرف سے تم کو اس غلطی پر مُتنبہ کرنے اور ٹھیک بات تم تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

۹۴- یہ واقعہ بھی کفارِ مکہ کے اُسی عذر کے جواب میں بیان کیا جا رہا ہے جس پر آیت ۵۷ سے مسلسل تقریر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے قومی مفاد پر ضرب لگنے کا خطرہ ظاہر کیا تھا، وہ دراصل مکے کے بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار اور سرمایہ دار تھے جنھیں بین الاقوامی تجارت اور سود خواری نے قارونِ وقت بنا رکھا تھا۔ یہی لوگ اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اصل حق بس یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹو۔ اس مقصد پر جس چیز سے بھی آنچ آنے کا اندیشہ ہو، وہ سراسر باطل ہے جسے کسی حال میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف عوام الناس دولت کے ان میناروں کو آرزو بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کی غایت تمنا بس یہ

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ ابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

"پھُول نہ جا، اللہ پھُولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو

تھی کہ جس بلندی پر یہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں، کاش! ہمیں بھی اس تک پہنچنا نصیب ہو جائے۔ اس زر پرستی کے ماحول میں یہ دلیل بڑی وزنی سمجھی جا رہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس توحید و آخرت کی، اور جس ضابطۂ اَخلاق کی دعوت دے رہے ہیں، اسے مان لیا جائے تو قریش کی عظمت کا یہ فلک بوس قصر زمین پر آ رہے گا اور تجارتی کاروبار تو درکنار، جینے تک کے لالے پڑ جائیں گے۔

**۹۵** — قارون، جس کا نام بائبل اور تَلْمُود میں قورح (Korah) بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ بائبل کی کتابِ خُروج (باب ۶، آیت ۱۸-۲۱) میں جو نسب نامہ درج ہے، اس کی رُو سے حضرت موسیٰؑ اور قارون کے والد باہم سگے بھائی تھے۔ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جا ملا تھا اور اس کا مُقرّب بن کر اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مُخالَفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے، ان میں سے ایک یہی قارون تھا:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ (المومن، آیت ۲۳-۲۴) | ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا۔ |

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قارون اپنی قوم سے باغی ہو کر اُس دشمن طاقت کا پٹھو بن گیا تھا جو بنی اسرائیل کو جڑ بنیاد سے ختم کر دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ اور اس قومی غداری کی بدولت اس نے فرعونی سلطنت میں یہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے علاوہ مصر کی جن بڑی ہستیوں کی طرف بھیجے گئے تھے وہ دو ہی تھیں، ایک فرعون کا وزیر ہامان، اور دوسرا یہ اسرائیلی سیٹھ۔ باقی سب اَعیانِ سلطنت اور درباری ان سے کم تر درجے میں تھے جن کا خاص طور پر نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ قارون کی یہی پوزیشن سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

پسند نہیں کرتا۔" تو اُس نے کہا: "یہ سب کچھ تو مجھے اُس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔[97] ـــــــ کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟[98] مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پُوچھے جاتے۔[99]

۹۶- بائبل (گنتی، باب ۱۶) میں اس کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس میں اس شخص کی دولت کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر یہودی روایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ شخص غیر معمولی دولت کا مالک تھا، حتٰی کہ اس کے خزانوں کی کُنجیاں اُٹھانے کے لیے تین سو خچر درکار ہوتے تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا، ج ۷، ص ۵۵۶) یہ بیان اگرچہ انتہائی مبالغہ آمیز ہے، لیکن اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسرائیلی روایات کی رُو سے بھی قارون اپنے وقت کا بہت بڑا دولت مند آدمی تھا۔

۹۷- اصل الفاظ ہیں: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ میں نے جو کچھ پایا ہے اپنی قابلیت سے پایا ہے، یہ کوئی فضل نہیں ہے جو استحقاق کے بجائے احسان کے طور پر کسی نے مجھ کو دیا ہو اور اب مجھے اس کا شکر یہ اس طرح ادا کرنا ہو کہ جن نا اہل لوگوں کو کچھ نہیں دیا گیا ہے، انھیں مَیں فضل و احسان کے طور پر اس میں سے کچھ دوں، یا کوئی خیر خیرات اس غرض کے لیے کروں کہ یہ فضل مجھ سے چھین نہ لیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک تو خدا نے یہ دولت جو مجھے دی ہے، میرے اوصاف کو جانتے ہوئے دی ہے۔ اگر میں اس کی نگاہ میں ایک پسندیدہ انسان نہ ہوتا تو یہ کچھ مجھے کیوں دیتا۔ مجھ پر اس کی نعمتوں کی بارش ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ میں اس کا محبُوب ہوں اور میری روش اس کو پسند ہے۔

۹۸- یعنی یہ شخص جو بڑا عالم و فاضل اور دانا و باخبر بنا پھر رہا تھا اور اپنی قابلیت کا یہ کچھ غَرّہ رکھتا تھا، اس کے علم میں کیا یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ اُس سے زیادہ دولت و حشمت اور قوت و شوکت والے اس سے پہلے دنیا میں گزر چکے ہیں اور اللہ نے انھیں آخر کار تباہ و برباد کر کے رکھ دیا؟ اگر قابلیت اور ہنر مندی ہی دنیوی عروج کے لیے کوئی ضمانت ہے تو ان کی یہ صلاحیتیں اُس وقت کہاں چلی گئی تھیں جب وہ تباہ ہوئے؟ اور اگر کسی کو دنیوی عروج نصیب ہونا لازماً اسی بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے خوش ہے اور اس کے اعمال و اوصاف کو

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۗ فَمَا كَانَ لَهٗ

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پُورے ٹھاٹ میں نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے: ”کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔“ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: ”افسوس تمھارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں[۱۰۰] کو۔“

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ

پسند کرتا ہے تو پھر اُن لوگوں کی شامت کیوں آئی؟

**۹۹** — یعنی مجرم تو یہی دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے لوگ ہیں۔ وہ کب مانا کرتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی بُرائی ہے۔ مگر ان کی سزا ان کے اپنے اعتراف پر منحصر نہیں ہوتی۔ انھیں جب پکڑا جاتا ہے تو ان سے پوچھ کر نہیں پکڑا جاتا کہ بتاؤ تمھارے گناہ کیا ہیں۔

**۱۰۰** — یعنی یہ سیرت، یہ اندازِ فکر اور یہ ثوابِ الٰہی کی بخشش صرف انھی لوگوں کے حصّے میں آتی ہے جن میں اتنا تحمل اور اتنی ثابت قدمی موجود ہو کہ حلال طریقے ہی اختیار کرنے پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں، خواہ ان سے صرف چٹنی روٹی میسّر ہو یا کروڑ پتی بن جانا نصیب ہو جائے، اور حرام طریقوں کی طرف قطعاً مائل نہ ہوں، خواہ ان سے دنیا بھر کے فائدے سمیٹ لینے کا موقع مل رہا ہو۔ اس آیت میں اللہ کے ثواب سے مراد ہے وہ رزقِ کریم جو حُدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے محنت و کوشش کرنے کے نتیجے میں انسان کو دنیا اور آخرت میں نصیب ہو۔ اور صبر سے مراد ہے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنا، لالچ اور حرص و آز کے مقابلے میں ایمان داری اور راست بازی پر ثابت قدم رہنا، صداقت و دیانت سے جو نقصان بھی ہوتا ہو یا جو فائدہ بھی ہاتھ سے جاتا ہو اسے برداشت کر لینا، ناجائز تدبیروں سے جو منفعت بھی حاصل ہو سکتی ہو اسے ٹھوکر مار دینا، حلال کی روزی خواہ بقدرِ سدِّ رَمَق ہی ہو اس پر قانع و مطمئن رہنا،

مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

ع ۸ ۷ ۱۱

نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: "افسوس! ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔[101] اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس! ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں[102] پایا کرتے۔"

---

حرام خوروں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر رشک وتمنّا کے جذبات سے بے چین ہونے کے بجائے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایمان دار آدمی کے لیے اِس چمک دار گندگی کی بہ نسبت وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ نے اپنے فضل سے اس کو بخشی ہے۔ رہا یہ ارشاد کہ "یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو"، تو اس دولت سے مراد اللہ کا ثواب بھی ہے اور وہ پاکیزہ ذہنیت بھی جس کی بنا پر آدمی ایمان وعملِ صالح کے ساتھ فاقہ کشی کر لینے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ بے ایمانی اختیار کر کے ارب پتی بن جائے۔

۱۰۱ – یعنی اللہ کی طرف سے رزق کی کشادگی وتنگی جو کچھ بھی ہوتی ہے، اس کی مَشِیّت کی بنا پر ہوتی ہے اور اس مَشِیّت میں اس کی کچھ دوسری ہی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کسی کو زیادہ رزق دینے کے معنٰی لازماً یہی نہیں ہیں کہ اللہ اس سے بہت خوش ہے اور اسے انعام دے رہا ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اللہ کا نہایت مغضوب ہوتا ہے مگر وہ اسے بڑی دولت عطا کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخرکار یہی دولت اس کے اوپر اللہ کا سخت عذاب لے آتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو اس کے معنٰی لازماً یہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے اور اسے سزا دے رہا ہے۔ اکثر نیک لوگوں پر تنگی اس کے باوجود رہتی ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں، بلکہ بارہا یہی تنگی ان کے لیے خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اُن لوگوں کی خوش حالی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو دراصل خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ

وہ آخرت[۱۰۳] کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے[۱۰۴] اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں[۱۰۵]۔ اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے[۱۰۶]۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے، اور جو بُرائی لے کر آئے تو بُرائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے۔

اے نبیؐ! یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے[۱۰۷] وہ تمھیں ایک بہترین انجام کو

---

۱۰۲ – یعنی ہمیں یہ غلط فہمی تھی کہ دنیوی خوش حالی اور دولت مندی ہی فلاح ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ قارون بڑی فلاح پا رہا ہے۔ مگر اب پتا چلا کہ حقیقی فلاح کسی اور ہی چیز کا نام ہے اور وہ کافروں کو نصیب نہیں ہوتی۔

قارون کے قصّے کا یہ سبق آموز پہلو صرف قرآن ہی میں بیان ہوا ہے۔ بائبل اور تلمود دونوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ان دونوں کتابوں میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو یہ شخص بھی اپنی پارٹی سمیت ان کے ساتھ نکلا، اور پھر اس نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے خلاف ایک سازش کی جس میں ڈھائی سو آدمی شامل تھے۔ آخر کار اللہ کا غضب اس پر نازل ہُوا اور یہ اپنے گھر بار اور مال اسباب سمیت زمین میں دھنس گیا۔

۱۰۳ – مراد ہے جنت جو حقیقی فلاح کا مقام ہے۔

۱۰۴ – یعنی جو خدا کی زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ جو سرکش و جبار اور متکبر بن کر نہیں رہتے بلکہ بندے بن کر رہتے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

۱۰۵ – فساد سے مراد انسانی زندگی کے نظام کا وہ بگاڑ ہے جو حق سے تجاوز کرنے کے نتیجے میں لازماً رُونما ہوتا ہے۔ خدا کی بندگی اور اس کے قوانین کی اطاعت سے نکل کر آدمی جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سراسر فساد ہی فساد ہے۔ اسی کا ایک جُز وہ فساد بھی ہے جو حرام طریقوں سے دولت سمیٹنے اور حرام راستوں میں خرچ کرنے سے برپا ہوتا ہے۔

اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً

پہنچانے والا ہے۔[108] اِن لوگوں سے کہہ دو کہ ''میرا رب خُوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کُھلی گمراہی میں کون مُبتلا ہے۔'' تم اس بات کے ہرگز اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمھارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل

۱۰۶ – یعنی ان لوگوں کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں۔

۱۰۷ – یعنی اس قرآن کو خلقِ خدا تک پہنچانے اور اس کی تعلیم دینے اور اس کی ہدایت کے مطابق دنیا کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے۔

۱۰۸ – اصل الفاظ ہیں: لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ۔ ''تمھیں ایک مَعاد کی طرف پھیرنے والا ہے۔'' مَعاد کے لُغوی معنٰی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخرکار آدمی کو پلٹنا ہو۔ اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان اور عظمت کا مقام ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد جنت لی ہے۔ لیکن اسے صرف جنّت کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کیوں نہ اسے ویسا ہی عام رکھا جائے جیسا خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، تاکہ یہ وعدہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہو جائے۔ سِیاقِ عبارت کا اقتضا بھی یہ ہے کہ اسے آخرت ہی میں نہیں، اِس دنیا میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرکار بڑی شان وعظمت عطا کرنے کا وعدہ سمجھا جائے۔ کفارِ مکّہ کے جس قول پر آیت ۵۷ سے لے کر یہاں تک مسلسل گفتگو چلی آ رہی ہے، اُس میں انھوں نے کہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبنا چاہتے ہو۔ اگر ہم تمھارا ساتھ دیں اور اس دین کو اختیار کرلیں تو عرب کی سرزمین میں ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ! جس خدا نے اس قرآن کی عَلَم برداری کا بار تم پر ڈالا ہے، وہ تمھیں برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ تم کو اُس مرتبے پر پہنچانے والا ہے جس کا تصوّر بھی یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اور فی الواقع اللہ تعالیٰ نے چند ہی سال بعد حضورؐ کو اِس دنیا میں، اُنھی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تمام مُلکِ عرب پر ایسا مکمل اقتدار عطا کر کے دکھا دیا کہ آپؐ کی مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت وہاں نہ ٹھیر سکی اور آپؐ کے دین کے سوا کسی دین کے لیے وہاں گنجایش نہ رہی۔ عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر اس کی موجود نہ تھی کہ پورے جزیرۃ العرب پر کسی ایک شخص کی ایسی بے غَلّ وغَش بادشاہی قائم ہو گئی ہو کہ ملک بھر میں کوئی اس کا مدِّمقابل باقی نہ رہا ہو، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو، اور لوگ صرف سیاسی طور پر ہی اس کے حلقہ بگوش نہ ہوئے ہوں بلکہ سارے دینوں کو مٹا کر اسی ایک شخص نے سب کو اپنے دین کا پیرو بھی بنا لیا ہو۔

مِّنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ ظَهِيۡرًا لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ہوئی ہے[109])، پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔[110] اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات

بعض مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سورۂ قصص کی یہ آیت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے راستے میں نازل ہوئی تھی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپؐ کو پھر مکہ واپس پہنچائے گا۔ لیکن اوّل تو اس کے الفاظ میں کوئی گنجایش اس امر کی نہیں ہے کہ "معاد" سے "مکہ" مراد لیا جائے۔ دوسرے، یہ سورت رِوایات کی رُو سے بھی اور اپنے مضمون کی داخلی شہادت کے اعتبار سے بھی ہجرتِ حبشہ کے قریب زمانے کی ہے، اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کئی سال بعد ہجرتِ مدینہ کے راستے میں اگر یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اسے کس مناسبت سے یہاں اِس سیاق وسباق میں لا کر رکھ دیا گیا۔ تیسرے، اِس سیاق وسباق کے اندر مکے کی طرف حضوؐر کی واپسی کا ذکر بالکل بے محل نظر آتا ہے۔ آیت کے یہ معنیٰ اگر لیے جائیں تو یہ کفارِ مکہ کی بات کا جواب نہیں بلکہ اُن کے عذر کو اور تقویت پہنچانے والا ہوگا۔ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ بے شک اے اہلِ مکہ! تم ٹھیک کہتے ہو، محمدؐ اس شہر سے نکال دیے جائیں گے، لیکن وہ مستقل طور پر جلاوطن نہیں رہیں گے، بلکہ آخرکار ہم انھیں اسی جگہ واپس لے آئیں گے۔ یہ روایت اگرچہ بخاری، نَسائی، ابنِ جَرِیر اور دوسرے محدثین نے ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے، لیکن یہ ہے ابنِ عباسؓ کی اپنی ہی رائے۔ کوئی حدیثِ مرفوع نہیں ہے کہ اسے ماننا لازم ہو۔

**۱۰۹-** یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جارہی ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انھیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی اِس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار، اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے انھیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکے کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپؐ نبوت کا پیغام لے کر اُترے، اُس سے ایک دن پہلے تک آپؐ کی زندگی کیا تھی، آپؐ کے مشاغل کیا تھے، آپؐ کی بات چیت کیا تھی، آپؐ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپؐ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں۔ یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حُقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپؐ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپؐ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپؐ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپؐ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپؐ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپؐ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپؐ سے سننے لگے۔ کبھی آپؐ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔

کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپؐ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہوسکتا تھا کہ آپؐ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح، یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپؐ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادھے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کرنے کے لیے خَلوَت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اُٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اَخلاق وتمدّن لے کر سامنے آ جانا، اتنا بڑا تغیّر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رُونما نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تدریجی ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز زندگی گزارتا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سیکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکّہ نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپؐ خود بھی نبوت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپؐ کو اس معاملے سے سابقہ پیش آ گیا، اس کا ثبوت اُس واقعے سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہُوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۂ عَلَق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپؐ غارِ حرا سے کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔" کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" وہ فوراً جواب دیتی ہیں: "ہرگز نہیں۔ آپؐ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپؐ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضُع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" پھر وہ آپؐ کو لے کر وَرَقہ بن نَوفَل کے پاس جاتی ہیں جو ان کے چچازاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راست باز آدمی تھے۔ وہ آپؐ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تأمّل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپؐ کے پاس آیا تھا، وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰؑ کے پاس آتا تھا۔ کاش! میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی۔" آپؐ پوچھتے ہیں: "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں: "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں۔"

یہ پورا واقعہ اُس حالت کی تصویر پیش کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجرِبہ پیش آ جانے سے کسی سیدھے سادھے انسان پر طاری ہوسکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے

کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپؐ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دَم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا، اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجَرِبے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوئی ہوتی کہ میاں نبوت کے اُمیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خَدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو، اب پیری کی دکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپؐ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں، اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمایش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ وَرَقہ بن نوَفل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنُّع سے مُمیّز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپؐ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے بھی آپؐ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حُصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں عَلانیَہ اِس تجَرِبے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تأمُّل اس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے، بلکہ اِس سچّے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے، وہ دراصل حقیقت ہی کا مُشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدّد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونُس میں فرمایا:

لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (آیت ۱۶)

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمھیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر مَیں اس سے پہلے ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟

اور سورۂ شُوریٰ میں فرمایا:

بَعۡدَ اِذۡ اُنۡزِلَتۡ اِلَيۡكَ وَادۡعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۚ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَىۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ ؕ لَهُ الۡحُكۡمُ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۸﴾ؑ

وقف لازم — الثانیۃ ع ۹ ۱۲

جب تم پر نازل ہوں تو کفّار تمھیں اُن سے باز رکھیں[111]۔ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبُود کو نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے۔ فرماں روائی اُسی کی ہے[112] اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہوع۔

---

مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡـكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰـكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ (آیت ۵۲)

اے نبیؐ! تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، عنکبوت حواشی ۸۸ تا ۹۲۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حاشیہ ۸۴۔

۱۱۰ – یعنی جب اللہ نے یہ نعمت تمھیں بے مانگے عطا فرمائی ہے تو اس کا حق اب تم پر یہ ہے کہ تمھاری ساری قوتیں اور محنتیں اِس کی علمبرداری پر، اس کی تبلیغ پر اور اسے فروغ دینے پر صَرف ہوں۔ اس میں کوتاہی کرنے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ تم نے حق کے بجائے منکرینِ حق کی مدد کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کسی کوتاہی کا اندیشہ تھا۔ بلکہ دراصل اس طرح اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے نبی کو یہ ہدایت فرما رہا ہے کہ تم اِن کے شوروغوغا اور ان کی مخالفت کے باوجود اپنا کام کرو اور اس کی کوئی پروا نہ کرو کہ دشمنانِ حق اس دعوت سے اپنے قومی مفاد پر ضرب لگنے کے کیا اندیشے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۱۱ – یعنی اُن کی تبلیغ واشاعت سے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔

۱۱۲ – یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ فرماں روائی اسی کے لیے ہے، یعنی وہی اس کا حق رکھتا ہے۔

# تفہیم القرآن

# العنکبوت

## (۲۹)

# العنکبوت

## نام

آیت ۴۱ کے فقرے مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ ''عنکبوت'' آیا ہے۔

## زمانۂ نُزُول

آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مُتَرَشّح ہوتا ہے کہ یہ سورت ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ پَس منظر میں اُسی زمانے کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینے میں ہُوا ہے، یہ قیاس قائم کرلیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دس آیات مَدَنی ہیں اور باقی سورت مکّی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نِفاق کا ذکر ہے، وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم وستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہوسکتا تھا، نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اسے مکے کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ مدینۂ طَیِّبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بِنا رکھی گئی ہے۔ اور یہ اندرونی شہادت، اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکے کے آخری دَور کی نہیں بلکہ اُس دَور کے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی تھی۔

## موضوع و مضمون

سورت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نُزُول کا زمانہ مکّۂ معظّمہ میں مسلمانوں پر بڑے مصائب وشدائد کا زمانہ تھا۔ کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت پورے زور شور سے ہو رہی تھی اور ایمان لانے والوں پر سخت ظلم وستم توڑے جا رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت ایک طرف صادق الایمان لوگوں میں عزم وہمت اور استقامت پیدا کرنے کے لیے، اور دوسری طرف ضعیف الایمان لوگوں کو شرم دلانے کے لیے نازل فرمائی۔ اس کے ساتھ کفّارِ مکّہ کو بھی اس میں سخت تہدید کی گئی کہ اپنے حق میں اُس انجام کو دعوت نہ دیں جو عداوتِ حق کا طریقہ اختیار کرنے والے ہر زمانے میں دیکھتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں اُن سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بعض نوجوانوں کو اُس وقت پیش آ رہے تھے۔ مثلاً اُن کے والدین اُن پر زور ڈالتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور ہمارے دین

پر قائم رہو۔ جس قرآن پر تم ایمان لائے ہو، اس میں بھی تو یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ تو ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے مانو ورنہ تم خود اپنے ہی ایمان کے خلاف کام کرو گے۔ اس کا جواب آیت ۸ میں دیا گیا ہے۔

اِسی طرح بعض نومسلموں سے ان کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ عذاب ثواب ہماری گردن پر، تم ہمارا کہنا مانو اور اس شخص سے الگ ہو جاؤ۔ اگر خدا تمھیں پکڑے گا تو ہم خود آگے بڑھ کر کہہ دیں گے کہ صاحب! اِن بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، ان کو ہم نے ایمان چھوڑنے پر مجبُور کیا تھا، اس لیے آپ ہمیں پکڑ لیں۔ اس کا جواب آیات ۱۲-۱۳ میں دیا گیا ہے۔

جو قصّے اِس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں، اُن میں بھی زیادہ تر یہی پہلو نمایاں ہے کہ پچھلے انبیاؑ کو دیکھو، کیسی کیسی سختیاں ان پر گزریں اور کتنی کتنی مدت وہ ستائے گئے۔ پھر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔ اس لیے گھبراؤ نہیں۔ اللہ کی مدد ضرور آئے گی، مگر آزمایش کا ایک دَور گزرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دینے کے ساتھ کفارِ مکہ کو بھی ان قصّوں میں مُتنَبِّہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پکڑ ہونے میں دیر لگ رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ کبھی پکڑ ہو گی ہی نہیں۔ پچھلی تباہ شدہ قوموں کے نشانات تمھارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو کہ آخر کار ان کی شامت آ کر رہی اور خدا نے اپنے نبیوں کی مدد کی۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ظلم و ستم تمھارے لیے نا قابل برداشت ہو جائے تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ جہاں خدا کی بندگی کر سکو، وہاں چلے جاؤ۔

ان سب باتوں کے ساتھ کفار کی تفہیم کا پہلو بھی چھُوٹنے نہیں پایا ہے۔ توحید اور مَعاد، دونوں حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شرک کا ابطال کیا گیا ہے، اور آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلا کر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ سب نشانات اس تعلیم کی تصدیق کر رہے ہیں جو ہمارا نبی تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

---

رکوعاتہا ۷ | سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ مَکِّیَّۃٌ | آیاتہا ۶۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿١﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿٢﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا

---

الف۔ل۔م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اِتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟[1] حالاں کہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں[2]۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچّے کون ہیں

---

۱ – جن حالات میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ تھے کہ مکّۂ معظّمہ میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا، اس پر آفات اور مصائب اور مظالم کا ایک طوفان ٹوٹ پڑتا تھا۔ کوئی غلام یا غریب ہوتا تو اس کو بُری طرح مارا پیٹا جاتا اور سخت ناقابلِ برداشت اذیتیں دی جاتیں۔ کوئی دکاندار یا کاریگر ہوتا تو اس کی روزی کے دروازے بند کر دیے جاتے، یہاں تک کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آ جاتی۔ کوئی کسی بااثر خاندان کا آدمی ہوتا تو اس کے اپنے خاندان کے لوگ اس کو طرح طرح سے تنگ کرتے اور اس کی زندگی اجیرن کر دیتے تھے۔ اِن حالات نے مکّے میں ایک سخت خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو جانے کے باوجود ایمان لاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد جب دردناک اذیتوں سے دوچار ہوتے تو پست ہمت ہو کر کفار کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ ان حالات نے اگرچہ راسخ الایمان صحابہؓ کے عزم وثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا تھا، لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اکثر ان پر بھی ایک شدید اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اسی کیفیت کا ایک نمونہ حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ کی وہ روایت پیش کرتی ہے جو بخاری، ابوداؤد اور نَسائی نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بُری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کی دیوار کے سایے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپؐ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ جوش اور جذبے سے سُرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا: تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں، ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرا چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے۔ کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آ جائے۔ خدا کی قسم! یہ کام پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک شخص صَنعا سے حضرمَوت

تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہوگا جس کا وہ خوف کرے۔

اس اضطرابی کیفیت کو ٹھنڈے صبر و تحمل میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو سمجھاتا ہے کہ ہمارے جو وعدے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کے لیے ہیں، کوئی شخص مُجرّد زبانی دعوائے ایمان کر کے ان کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر مدعی کو لازماً آزمایشوں کی بھٹی سے گزرنا ہوگا، تاکہ وہ اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے۔ ہماری جنّت اِتنی سستی نہیں ہے، اور نہ دنیا ہی میں ہماری خاص عنایات ایسی ارزاں ہیں کہ تم بس زبان سے ہم پر ایمان لانے کا اعلان کرو اور ہم وہ سب کچھ تمھیں بخش دیں۔ ان کے لیے تو امتحان شرط ہے۔ ہماری خاطر مَشَقّتیں اُٹھانی ہوں گی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہوگا۔ طرح طرح کی سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ خطرات، مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ خوف سے بھی آزمائے جاؤ گے اور لالچ سے بھی۔ ہر چیز جسے عزیز و محبوب رکھتے ہو، ہماری رضا پر اسے قربان کرنا پڑے گا، اور ہر تکلیف جو تمھیں ناگوار ہے، ہمارے لیے برداشت کرنی ہوگی۔ تب کہیں یہ بات کھلے گی کہ ہمیں ماننے کا جو دعویٰ تم نے کیا تھا، وہ سچّا تھا یا جھوٹا۔ یہ بات قرآنِ مجید میں ہر اُس مَقام پر کہی گئی ہے جہاں مصائب و شدائد کے ہُجوم میں مسلمانوں پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہُوا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے کی ابتدائی زندگی میں جب مَعاشی مشکلات، بیرونی خطرات، اور یہود و منافقین کی داخلی شرارتوں نے اہلِ ایمان کو سخت پریشان کر رکھا تھا، اس وقت فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (البقرہ، آیت ۲۱۴)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہلِ ایمان) پر گزر چکے ہیں؟ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہِلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (تب انھیں مُژدہ سنایا گیا کہ) خبردار رہو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

اِسی طرح جنگِ اُحُد کے بعد جب مسلمانوں پر پھر مصائب کا ایک سخت دَور آیا تو ارشاد ہوا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آلِ عمران، آیت ۱۴۲)

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے والے کون ہیں؟

قریب قریب یہی مضمون سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۷۹، سورۂ توبہ، آیت ۱۶، اور سورۂ محمد، آیت ۳۱ میں بھی بیان ہُوا ہے۔ ان ارشادات سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین فرمائی ہے کہ آزمایش ہی وہ کَسَوٹی ہے جس سے کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے، کھوٹا خود بخود اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور کھرا چھانٹ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ کے اُن انعامات سے سرفراز ہو جو صرف صادق الایمان لوگوں کا ہی حصّہ ہیں۔

۲ – یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو تمھارے ساتھ ہی پیش آ رہا ہو۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہُوا ہے کہ جس نے

وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٣﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٤﴾ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ

اور جھوٹے کون۔

اور کیا وہ لوگ جو بُری حرکتیں کر رہے ہیں[۴] یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں[۵] گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔

جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا

بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے، اسے آزمایشوں کی بھٹّی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا ہے۔ اور جب دوسروں کو امتحان کے بغیر کچھ نہیں دیا گیا تو تمھاری کیا خصوصیّت ہے کہ تمھیں صرف زبانی دعوے پر نواز دیا جائے۔

۳ – اصل الفاظ ہیں: فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ضرور ہے اللہ یہ معلوم کرے۔'' اس پر ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اللہ کو تو سچے کی سچّائی اور جھوٹے کا جھوٹ خود ہی معلوم ہے، آزمایش کر کے اسے معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ایک شخص کے اندر کسی چیز کی صرف صلاحیّت اور استعداد ہی ہوتی ہے، عملاً اس کا ظہور نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ازرُوئے عدل و انصاف نہ تو وہ کسی جزا کا مستحق ہو سکتا ہے نہ سزا کا۔ مثلاً ایک آدمی میں امین ہونے کی صلاحیت ہے اور ایک دوسرے میں خائن ہونے کی صلاحیت۔ ان دونوں پر جب تک آزمایش نہ آئے اور ایک سے امانت داری کا اور دوسرے سے خیانت کا عملاً ظہور نہ ہو جائے، یہ بات اللہ کے انصاف سے بعید ہے کہ وہ محض اپنے علمِ غیب کی بنا پر ایک کو امانت داری کا انعام دے دے اور دوسرے کو خیانت کی سزا دے ڈالے۔ اس لیے وہ علمِ سابق جو اللہ کو لوگوں کے اچھے اور بُرے اعمال سے پہلے اُن کی صلاحیتوں کے بارے میں اور ان کے آیندہ طرزِ عمل کے بارے میں حاصل ہے، انصاف کی اغراض کے لیے کافی نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انصاف اِس علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا کہ فُلاں شخص چوری کا رُجحان رکھتا ہے اور چوری کرے گا یا کرنے والا ہے، بلکہ اِس علم کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ اس شخص نے چوری کر ڈالی ہے۔ اسی طرح بخششیں اور انعامات بھی اس کے ہاں اِس علم کی بنا پر نہیں دیے جاتے کہ فُلاں شخص اعلیٰ درجے کا مومن و مجاہد بن سکتا ہے یا بنے گا، بلکہ اِس علم کی بنا پر دیے جاتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اپنے عمل سے اپنا صادق الایمان ہونا ثابت کر دیا ہے اور اللہ کی راہ میں جان لڑا کر دکھا دی ہے۔ اسی لیے ہم نے آیت کے ان الفاظ کا ترجمہ ''اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے'' کیا ہے۔

۴ – اس سے مراد اگرچہ تمام وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن یہاں خاص طور پر رُوئے سُخن قریش کے اُن ظالم سرداروں کی طرف ہے جو اسلام کی مخالفت میں اور اسلام قبول کرنے والوں کو اذیتیں دینے

اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

مقرر کیا ہُوا وقت آنے ہی والا ہے[6]، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[7]۔ جو شخص بھی مُجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا[8]، اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے[9]۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک

میں اُس وقت پیش پیش تھے۔ مثلاً وَلید بن مُغیرہ، ابو جہل، عُتبہ، شَیبہ، عُقبہ بن ابی مُعَیط اور حَنظَلہ بن وائل وغیرہ۔ سیاق و سباق خود یہاں تقاضا کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو آزمایشوں کے مقابلے میں صبر و ثبات کی تلقین کرنے کے بعد ایک کلمۂ زجر و توبیخ اُن لوگوں کو خطاب کر کے بھی فرمایا جائے جو ان حق پرستوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔

۵ – یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ''ہماری گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ سکیں گے۔'' اصل الفاظ ہیں: يَّسْبِقُوْنَا، یعنی ہم سے سبقت لے جائیں گے۔ اس کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں (یعنی اپنے رسول کے مشن کی کامیابی) وہ تو نہ ہو سکے اور جو کچھ یہ چاہتے ہیں (یعنی ہمارے رسول کو نیچا دکھانا) وہ ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ہم ان کی زیادتیوں پر انھیں پکڑنا چاہتے ہوں اور یہ بھاگ کر ہماری دست رس سے دُور نکل جائیں۔

۶ – یعنی جو شخص حیاتِ اُخروی کا قائل ہی نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ کوئی نہیں ہے جس کے سامنے ہمیں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہو، اور کوئی وقت ایسا نہیں آنا ہے جب ہم سے ہمارے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اس کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ اپنی غفلت میں پڑا رہے اور بے فکری کے ساتھ جو کچھ چاہے کرتا رہے۔ اپنا نتیجہ اپنے اندازوں کے خلاف وہ خود دیکھ لے گا۔ لیکن جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک وقت ہمیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی پانی ہے، انھیں اِس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ موت کا وقت کچھ بہت دُور ہے۔ ان کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بس قریب ہی آ لگا ہے اور عمل کی مہلت ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی وہ اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے کر سکتے ہوں کر لیں۔ طولِ حیات کے بے بنیاد بھروسے پر اپنی اصلاح میں دیر نہ لگائیں۔

۷ – یعنی اُن کو اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا چاہیے کہ ان کا سابقہ کسی شۂ بے خبر سے ہے۔ جس خدا کے سامنے انھیں جواب دِہی کے لیے حاضر ہونا ہے، وہ بے خبر نہیں بلکہ سمیع و علیم خدا ہے، ان کی کوئی بات بھی اس سے چُھپی ہوئی نہیں ہے۔

۸ – ''مُجاہدہ'' کے معنٰی کسی مخالف طاقت کے مقابلے میں کش مکش اور جِدّ و جُہد کرنے کے ہیں، اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشان دِہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کش مکش ہے۔ مومن کو اِس دنیا میں جو کش مکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے۔ اسے شیطان سے بھی

الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ

اعمال کریں گے، اُن کی بُرائیاں ہم ان سے دُور کر دیں گے اور انھیں اُن کے بہترین اعمال کی جزا دیں[۱۱] گے۔

ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر

---

لڑتا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے۔ اپنے نفس سے بھی لڑتا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے۔ اپنے گھر سے لے کر آفاق تک کے اُن تمام انسانوں سے بھی لڑتا ہے جن کے نظریّات، رُجحانات، اُصولِ اَخلاق، رسم و رواج، طرزِ تمدّن اور قوانینِ معیشت و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں۔ اور اُس ریاست سے بھی لڑتا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد رہ کر اپنا فرمان چلائے اور نیکی کے بجائے بدی کو فروغ دینے میں اپنی قوتیں صَرف کرے۔ یہ مُجاہدہ ایک دن دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر لمحے کا ہے۔ اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے۔ اسی کے متعلق حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ان الرجل لیجاھد وما ضرب یوما من الدھر بسیف۔ ”آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی وہ تلوار نہ چلائے۔“

**۹**- یعنی اللہ تعالیٰ اِس مجاہدے کا مطالبہ تم سے اس لیے نہیں کر رہا ہے کہ اپنی خدائی قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اسے تمھاری کسی مدد کی ضرورت ہے اور تمھاری اس لڑائی کے بغیر اس کی خدائی نہ چلے گی۔ بلکہ وہ اس لیے تمھیں اس کش مکش میں پڑنے کی ہدایت کرتا ہے کہ یہی تمھاری ترقی کا راستہ ہے۔ اسی ذریعے سے تم بدی اور گمراہی کے چکّر سے نکل کر نیکی اور صداقت کی راہ پر بڑھ سکتے ہو۔ اسی سے تم میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں خیر و صلاح کے عَلَم بردار اور آخرت میں خدا کی جنت کے حق دار بنو۔ تم یہ لڑائی لڑ کر خدا پر کوئی احسان نہ کرو گے، اپنا ہی بھلا کرو گے۔

**۱۰**- ایمان سے مراد ان تمام چیزوں کو سچّے دل سے ماننا ہے جنھیں تسلیم کرنے کی دعوت اللہ کے رسول اور اس کی کتاب نے دی ہے۔ اور عملِ صالح سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ دل و دماغ کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی فکر اور اس کے خیالات اور ارادے دُرست اور پاکیزہ ہوں۔ زبان کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی برائی پر زبان کھولنے سے بچے اور جو بات بھی کرے حق و انصاف اور راستی کے مطابق کرے۔ اور اعضاو جوارح کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی میں، اور اس کے احکام وقوانین کی پابندی میں بسر ہو۔ اس ایمان وعملِ صالح کے دو نتیجے بیان کیے گئے ہیں:

جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبُود) کو شریک ٹھیرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت[11] نہ کر۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔[12] اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے نیک

ایک یہ کہ آدمی کی بُرائیاں اس سے دُور کردی جائیں گی۔

دوسرا یہ کہ اسے اس کے بہترین اعمال کی، اور اس کے اعمال سے بہتر جزا دی جائے گی۔

بُرائیاں دُور کرنے سے مراد کئی چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان لانے سے پہلے آدمی نے خواہ کیسے ہی گناہ کیے ہوں، ایمان لاتے ہی وہ سب معاف ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے کے بعد آدمی نے بغاوت کے جذبے سے نہیں بلکہ بشَری کمزوری سے جو قصور کیے ہوں، اس کے نیک اعمال کا لحاظ کر کے اُن سے درگزر کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے نفس کی اصلاح آپ سے آپ ہوگی اور اس کی بہت سی کمزوریاں دُور ہو جائیں گی۔

ایمان و عملِ صالح کی جزا کے متعلق جو فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے، وہ ہے: وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷ اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ آدمی کے نیک اعمال میں سے جو اعمال سب سے زیادہ اچھے ہوں گے، ان کو ملحوظ رکھ کر اس کے لیے جزا تجویز کی جائے گی۔ دوسرے، یہ کہ آدمی اپنے عمل کے لحاظ سے جتنی جزا کا مستحق ہوگا، اس سے زیادہ اچھی جزا اسے دی جائے گی۔ یہ بات دوسرے مقامات پر بھی قرآن میں فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ (آیت ۱۶۰) ''جو نیکی لے کر آئے گا، اس کو اس سے دس گُنا اجر دیا جائے گا۔'' اور سورۂ قصص میں فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا (آیت ۸۴) ''جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کو اس سے بہتر اجر دیا جائے گا۔'' اور سورۂ نساء میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا (آیت ۴۰) ''اللہ ظلم تو ذرّہ برابر نہیں کرتا، اور اگر نیکی ہو تو اس کو کئی گُنا بڑھاتا ہے۔''

۱۱ — اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نَسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حَمنہ بنت سُفیان بن اُمیّہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہُوا کہ بیٹا مسلمان ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا، میں نہ کھاؤں گی، نہ پیوں گی، نہ سایے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تُو میری بات

الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿٩﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ

اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔

لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر[13]۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملے میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمایش کو اللہ کے عذاب کی طرح

---

نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔ حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوئے ہوں جو مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان میں بھی پورے زور کے ساتھ دُہرایا گیا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: آیت ۱۵)

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبُور کریں تو ان کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَاِنْ جَاهَدٰكَ ''اگر وہ دونوں تجھے مجبُور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں۔'' اس سے معلوم ہُوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اَولیٰ رد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد ان کی خدمت کرے، ان کا ادب و احترام کرے، ان کی جائز باتوں میں ان کی اطاعت بھی کرے۔ لیکن یہ حق ان کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف ان کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔

**۱۲** — یعنی یہ دنیا کی رشتہ داریاں اور ان کے حُقوق تو بس اسی دنیا کی حد تک ہیں۔ آخر کار ماں باپ کو بھی اور اولاد کو بھی اپنے خالق کے حضور پلٹ کر جانا ہے، اور وہاں ہر ایک کی باز پُرس اس کی شخصی ذمہ داری کی بنیاد پر ہونی ہے۔ اگر ماں باپ نے اولاد کو گمراہ کیا ہے تو وہ پکڑے جائیں گے۔ اگر اولاد نے ماں باپ کی خاطر گمراہی قبول کی ہے

اللّٰہِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ ؕ اَوَ

سمجھ لیا۔[14] اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ "ہم تو تمھارے ساتھ تھے۔"[15] کیا

تو اسے سزا ملے گی۔ اور اگر اولاد نے راہِ راست اختیار کی اور ماں باپ کے جائز حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی، لیکن ماں باپ نے صرف اس قصور پر اسے ستایا کہ اس نے گمراہی میں ان کا ساتھ کیوں نہ دیا، تو وہ اللہ کے مواخذے سے بچ نہ سکیں گے۔

۱۳- اگرچہ کہنے والا ایک شخص ہے، مگر "میں ایمان لایا" کہنے کے بجائے کہہ رہا ہے: "ہم ایمان لائے"۔ امام رازیؒ نے اس میں ایک لطیف نکتے کی نشاندہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منافق اپنے آپ کو ہمیشہ زُمرۂ اہلِ ایمان میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ایمان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ بھی ویسا ہی مومن ہے جیسے دوسرے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بزدل اگر کسی فوج کے ساتھ گیا ہے اور اس فوج کے بہادر سپاہیوں نے لڑ کر دشمنوں کو مار بھگایا ہے، تو چاہے اس نے خود کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو، مگر وہ آ کر یوں کہے گا کہ ہم گئے اور ہم خوب لڑے اور ہم نے دشمن کو شکستِ فاش دے دی۔ گویا آپ بھی انھی بہادروں میں سے ہیں جنھوں نے دادِ شجاعت دی ہے۔

۱۴- یعنی جس طرح اللہ کے عذاب سے ڈر کر کفر و مَعصِیَت سے باز آنا چاہیے، یہ شخص بندوں کی دی ہوئی تکلیفوں سے ڈر کر ایمان اور نیکی سے باز آگیا۔ ایمان لانے کے بعد کفار کی دھمکیوں اور مار پیٹ اور قید و بند سے جب اسے سابقہ پیش آیا تو اس نے سمجھا کہ اللہ کی وہ دوزخ بھی بس اتنی ہی کچھ ہو گی جس سے مرنے کے بعد کفر کی پاداش میں سابقہ پیش آنا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عذاب تو بعد میں بھگت لوں گا، یہ نقد عذاب جو اَب مل رہا ہے اِس سے بچنے کے لیے مجھے ایمان چھوڑ کر پھر زُمرۂ کفار میں جا ملنا چاہیے، تاکہ دنیا کی زندگی تو خیریت سے گزر جائے۔

۱۵- یعنی آج تو وہ اپنی کھال بچانے کے لیے کافروں میں جا ملا ہے اور اہلِ ایمان کا ساتھ اس نے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ دینِ حق کو فروغ دینے کے لیے وہ اپنی نکسیر تک پھُڑوانے کو تیار نہیں ہے۔ مگر جب اِس دین کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی بخشے گا تو یہ شخص فتح کے ثمرات میں حصّہ بٹانے کے لیے آ موجود ہو گا اور مسلمانوں سے کہے گا کہ دل سے تو ہم تمھارے ہی ساتھ تھے، تمھاری کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے، تمھاری جانفشانیوں اور قربانیوں کی بڑی قدر ہماری نگاہ میں تھی۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ناقابلِ برداشت اذیت یا نقصان، یا شدید خوف کی حالت میں کسی شخص کا کلمۂ کفر کہہ کر اپنے آپ کو بچا لینا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ آدمی سچے دل سے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس مخلص مسلمان میں جو بحالتِ مجبُوری جان بچانے کے لیے کفر کا اظہار کرے، اور اُس مَصلَحت پرست انسان میں جو نظریّے کے اعتبار سے اسلام ہی کو حق جانتا اور مانتا ہو مگر ایمانی زندگی کے خطرات و مہالک دیکھ کر کفار سے جا ملے۔ بظاہر ان دونوں کی حالت ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ مگر درحقیقت جو چیز ان کے درمیان

لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِىْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ

دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؟ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔[۱۶]

یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمھاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ

---

زمین و آسمان کا فرق کر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ مجبوراً کفر ظاہر کرنے والا مخلص مسلمان نہ صرف عقیدے کے اعتبار سے اسلام کا گرویدہ رہتا ہے، بلکہ عملاً بھی اس کی دلی ہمدردیاں دین و اہلِ دین کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی کامیابی سے وہ خوش اور ان کو زک پہنچنے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بھی وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اور اس تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی اس پر سے اعدائے دین کی گرفت ڈھیلی ہو، وہ اپنے اہلِ دین کے ساتھ جا ملے۔ اس کے برعکس مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے، اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دینِ حق کا ساتھ دینے کے نقصانات کفار کے ساتھ جا ملنے کے فوائد سے زیادہ ہیں، تو وہ خالص عافیت اور منفعت کی خاطر دین اور اہلِ دین سے منہ موڑ لیتا ہے، کافروں سے رشتۂ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجا لانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہلِ دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کر لیتا کہ شاید کسی وقت دینِ حق ہی کا بول بالا ہو جائے۔ اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ ان کے نظریّے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہِ حق میں ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ذرّہ برابر بخل نہیں کرتا، تاکہ یہ زبانی اعترافات سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ قرآنِ کریم ایک دوسرے موقع پر ان منافقین کی اسی سوداگرانہ ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے:

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۡ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ (النساء، آیت ۱۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کا پلّا بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف

خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۲ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳ ع

ع ۱۳/۱۲ ۱

اپنے اُوپر لینے والے نہیں ہیں[18]، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی[19]۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے اِن افترا پردازیوں کی باز پُرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں[20]۔ ع

لڑنے پر قادر نہ تھے اور ہم نے پھر بھی تمھیں مسلمانوں سے بچایا؟

۱۶- یعنی اللہ آزمایش کے مواقع اسی لیے بار بار لاتا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نِفاق کا حال کھل جائے اور جس کے اندر جو کچھ بھی چھپا ہُوا ہے وہ سامنے آجائے۔ یہی بات سورۂ آلِ عمران میں فرمائی گئی ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آیت ۱۷۹) ’’اللہ مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے جس میں تم اِس وقت ہو (کہ صادق الایمان اور منافق سب ملے جلے ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کر کے رہے گا۔‘‘

۱۷- ان کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو زندگی بعدِ موت اور حشر ونشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔ لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی باز پرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے ہم سارا عذاب ثواب اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دینِ آبائی کی طرف واپس آجاؤ۔ رِوایات میں متعدّد سردارانِ قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، ان سے مل کر یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان بن حرب اور اُمَیّہ بن خَلَف نے ان سے مل کر بھی یہی کہا تھا۔

۱۸- یعنی اوّل تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے، کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمہ دار ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو جس وقت کفر وشرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنّم کی صورت میں سامنے آئے گا، اس وقت کس کی یہ ہمت ہے کہ دنیا میں جو وعدہ اس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور! میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنت میں بھیج دیں، اور میں جہنم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔

**۱۹ –** یعنی وہ خدا کے ہاں اگرچہ دوسروں کا بوجھ تو نہ اُٹھائیں گے، لیکن دُہرا بوجھ اُٹھانے سے بچیں گے بھی نہیں۔ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا لدے گا، اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادا جائے گا۔اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص سے بھی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر نہ چھوڑ دے گی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے۔چوری کی سزا تو بہرحال اسے ملے گی اور کسی اُصولِ انصاف کی رُو سے بھی یہ درست نہ ہوگا کہ اسے چھوڑ کر اِس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔لیکن وہ پہلا چور اپنے جرم کے ساتھ اِس جرم کی سزا بھی پائے گا کہ اس نے خود چوری کی سو کی، ایک دوسرے شخص کو بھی اپنے ساتھ چور بنا ڈالا۔قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مقام پر اس قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل، آیت ۲۵) ”تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے پورے اُٹھائیں، اور اُن لوگوں کے بوجھوں کا بھی ایک حصہ اُٹھائیں جن کو وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔“ اور اسی قاعدے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ من دعا الی ھدی کان له علیه من الاجر مثل اجور من تبعه لاینقص ذٰلك من اجورھم شیئًا ومن دعا الی ضلالة کان علیه من الاثم مثل اٰثام من تبعه لا ینقص ذٰلك من اٰثامھم شیئًا۔(مسلم) ”جس شخص نے راہِ راست کی طرف دعوت دی، اس کو ان سب لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملے گا جنھوں نے اس کی دعوت پر راہِ راست اختیار کی، بغیر اس کے کہ اُن کے اجروں میں کوئی کمی ہو۔اور جس شخص نے گمراہی کی طرف دعوت دی، اس پر ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جنھوں نے اس کی پیروی کی، بغیر اس کے کہ اُن کے گناہوں میں کوئی کمی ہو۔“

**۲۰ –** ”افترا پردازیوں“ سے مُراد وہ جھوٹی باتیں ہیں جو کفار کے اِس قول میں چھُپی ہوئی تھیں کہ ”تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمھاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔“ دراصل وہ لوگ دو مفروضات کی بنیاد پر یہ بات کہتے تھے: ایک یہ کہ جس مذہبِ شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں وہ برحق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبِ توحید غلط ہے، اس لیے اُس سے کفر کرنے میں کوئی خطا نہیں ہے۔دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ کوئی حشر نہیں ہونا ہے، اور یہ حیاتِ اُخروی کا تخیُّل، جس کی وجہ سے ایک مسلمان کفر کرتے ہوئے ڈرتا ہے، بالکل بے اصل ہے۔یہ مفروضات اپنے دل میں رکھنے کے بعد وہ ایک مسلمان سے کہتے تھے کہ اچھا اگر تمھارے نزدیک کفر کرنا ایک خطا ہی ہے، اور کوئی حشر بھی ہونا ہے جس میں اِس خطا پر تم سے باز پرس ہوگی، تو چلو تمھاری اس خطا کو ہم اپنے سر لیتے ہیں، تم ہماری ذمہ داری پر دینِ محمدؐ کو چھوڑ کر دینِ آبائی میں واپس آجاؤ۔اس معاملے میں پھر مزید دو جھوٹی باتیں شامل تھیں: ایک، ان کا یہ خیال کہ جو شخص کسی کے کہنے پر جُرم کرے، وہ اپنے جرم کی ذمہ داری سے بَری ہوسکتا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جس کے کہنے پر اس نے جرم کیا ہے۔دوسرا، ان کا یہ جھوٹا وعدہ کہ قیامت کے روز وہ اُن لوگوں کی ذمہ داری

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۱۴ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا[21] اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس اُن کے درمیان رہا۔[22] آخر کار اُن لوگوں کو طوفان نے آ گھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم[23] تھے۔ پھر نوحؑ کو اور

واقعی اُٹھالیں گے جو ان کے کہنے پر ایمان سے کفر کی طرف پلٹ گئے ہوں۔ کیونکہ جب قیامت فی الواقع قائم ہو جائے گی اور ان کی اُمیدوں کے خلاف جہنّم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی، اُس وقت وہ ہرگز اس کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ اپنے کفر کا خمیازہ بھگتنے کے ساتھ اُن لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی پورا کا پورا اپنے اوپر لے لیں جنھیں وہ دنیا میں بہکا کر گمراہ کرتے تھے۔

۲۱ - تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، آیات ۳۳-۳۴۔ النساء، ۱۶۳۔ الأنعام، ۸۴۔ الاعراف، ۵۹ تا ۶۴۔ یونُس، ۷۱-۷۳۔ ہُود، ۲۵ - ۴۸۔ الانبیاء، ۷۶-۷۷۔ المومنون، ۲۳-۳۰۔ الفرقان، ۳۷۔ الشعراء، ۱۰۵ تا ۱۲۳۔ الصّافّات، ۷۵-۸۲۔ القمر، ۹-۱۵۔ الحاقّہ، ۱۱-۱۲۔ نوح، مکمّل۔

یہ قصّے یہاں جس مناسبت سے بیان کیے جا رہے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں ایک طرف اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اُن سب اہلِ ایمان کو آزمائش میں ڈالا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسری طرف ظالم کافروں سے فرمایا گیا ہے کہ تم اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم ہم سے بازی لے جاؤ گے اور ہماری گرفت سے بچ نکلو گے۔ انھی دو باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے یہ تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

۲۲ - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد سے طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے، اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہی چیز یہاں بیان کرنی مقصود ہے۔ اہلِ ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم کو تو ابھی پانچ سات برس ہی ظلم وستم سہتے اور ایک گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کرتے گزرے ہیں۔ ذرا ہمارے اس بندے کے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کو دیکھو جس نے مسلسل ساڑھے نو صدیوں تک ان شدائد کا مقابلہ کیا۔

حضرت نوحؑ کی عمر کے بارے میں قرآنِ مجید اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ وہ چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا۔ اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے۔ (پیدائش، باب ۷، آیت ۶۔ باب ۹، آیت ۲۸-۲۹) لیکن قرآن کے بیان کی رُو سے ان کی عمر کم از کم ایک ہزار سال ہونی چاہیے، کیونکہ ساڑھے نو سو سال تو صرف وہ مدت ہے جو نبوت پر مامور ہونے

اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَ جَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ اِبۡرٰهِیۡمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ

کشتی والوں[۲۴] کو ہم نے بچا لیا اور اُسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا۔[۲۵]
اور ابراہیمؑ کو بھیجا[۲۶] جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: ''اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔[۲۷] یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پُوج رہے ہو وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک

کے بعد سے طوفان برپا ہونے تک انھوں نے دعوت وتبلیغ میں صَرف کی۔ ظاہر ہے کہ نبوت انھیں پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی ملی ہو گی، اور طوفان کے بعد بھی وہ کچھ مدت زندہ رہے ہوں گے۔

یہ طویل عمر بعض لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن خدا کی اِس خدائی میں عجائب کی کمی نہیں ہے۔ جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے، اُس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آ جاتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا اوّلاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مُطلَق ہونے کا واضح تصوّر اپنے ذہن میں رکھتا ہو، وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اُس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔

۲۳ — یعنی طوفان ان پر اس حالت میں آیا کہ وہ اپنے ظلم پر قائم تھے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر وہ طوفان آنے سے پہلے اپنے ظلم سے باز آ جاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ عذاب نہ بھیجتا۔

۲۴ — یعنی ان لوگوں کو جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے اور جنھیں کشتی میں سوار ہونے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تھی۔ سُورۂ ہُود میں اس کی تصریح ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَهۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ (آیت ۴۰) ''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ (اے نوحؑ!) اِس کشتی میں سوار کر لے ہر قسم (کے جانوروں) میں سے ایک ایک جوڑا، اور اپنے گھر والوں کو سوائے اُن کے جنھیں ساتھ نہ لینے کا پہلے حکم دے دیا گیا ہے،

اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ

جھُوٹ گھڑ رہے ہو۔[۲۸] درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمھیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اُسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف

اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور اُس کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔''

۲۵- اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعے کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورۂ قمر میں یہ بات جس طریقے سے بیان فرمائی گئی ہے، اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا ٹکی ہے۔ سورۂ قمر میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے : وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَاۗءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (آیات ۱۳-۱۵) ''اور ہم نے نوحؑ کو سوار کیا تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر، وہ چل رہی تھی ہماری نگرانی میں اُس شخص کے لیے جزا کے طور پر جس کا انکار کر دیا گیا تھا، اور ہم نے اُسے چھوڑ دیا ایک نشانی بنا کر، پس ہے کوئی سبق لینے والا؟'' سورۂ قمر کی اس آیت کی تفسیر میں ابنِ جَریر نے قَتَادَہ کی یہ رِوایَت نقل کی ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقے میں گئے ہیں تو انھوں نے کوہِ جُودی پر (اور ایک رِوایَت کی رُو سے باقِرویٰ نامی بستی کے قریب) اس کشتی کو دیکھا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتیِ نوحؑ کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستانِ ارارات پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انھوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۷۔ ہُود، حاشیہ ۴۶)

۲۶- تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: البقرہ، رُکوع ۱۵-۱۶-۳۵۔ آلِ عمران، ۷۔ الاَنعام، ۹۔ ہُود، ۷۔ ابراہیم، ۶۔ الحِجر، ۴۔ مریم، ۳۔ الانبیاء، ۵۔ الشعراء، ۵۔ الصّافّات، ۳۔ الزُّخرُف، ۳۔ الذاریات، ۲۔

۲۷- یعنی اُس کے ساتھ شرک اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈرو۔

۲۸- یعنی تم یہ بُت نہیں گھڑ رہے ہو بلکہ ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ ان بتوں کا وجود خود ایک جھوٹ ہے۔ اور پھر تمھارے یہ عقائد کہ یہ دیویاں اور دیوتا ہیں، یا خدا کے اوتار یا اس کی اولاد ہیں، یا خدا کے مقرب اور اس کے ہاں شفیع ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کوئی شفا دینے والا اور کوئی اولاد بخشنے والا اور کوئی روزگار دلوانے والا ہے، یہ سب

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ

تم پلٹائے جانے والے ہو۔[۲۹] اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں،[۳۰] اور رسولؐ پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔''

کیا[۳۱] اِن لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے،

جھوٹی باتیں ہیں جو تم لوگوں نے اپنے وہم و گمان سے تصنیف کر لی ہیں۔ حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ محض بُت ہیں بے جان، بے اختیار اور بے اثر۔

**۲۹** – ان چند فقروں میں حضرت ابراہیمؑ نے بُت پرستی کے خلاف تمام معقول دلائل سمیٹ کر رکھ دیے ہیں۔ کسی کو معبُود بنانے کے لیے لامحالہ کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ایک معقول وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں معبُودیت کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کا خالق ہو اور آدمی اپنے وجود کے لیے اس کا رہینِ منّت ہو۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کی پرورش کا سامان کرتا ہو اور اسے رزق، یعنی متاعِ زیست بہم پہنچاتا ہو۔ چوتھی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آدمی کا مستقبل اس کی عنایات سے وابستہ ہو اور آدمی کو اندیشہ ہو کہ اس کی ناراضی مول لے کر وہ اپنا انجام خراب کر لے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان چاروں وجوہ میں سے کوئی وجہ بھی بت پرستی کے حق میں نہیں ہے، بلکہ ہر ایک خالص خدا پرستی کا تقاضا کرتی ہے۔ ''یہ محض بُت ہیں'' کہہ کر انھوں نے پہلی وجہ کو ختم کر دیا، کیونکہ جو نرا بُت ہو اس کو معبُود ہونے کا آخر کیا ذاتی استحقاق حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ ''تم اِن کے خالق ہو'' دوسری وجہ بھی ختم کر دی۔ اس کے بعد تیسری وجہ کو یہ فرما کر ختم کیا کہ وہ تمھیں کسی نوعیت کا کچھ بھی رزق نہیں دے سکتے۔ اور آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمھیں پلٹنا تو خدا کی طرف ہے نہ کہ اِن بتوں کی طرف، اس لیے تمھارا انجام اور تمھاری عاقبت سنوارنا یا بگاڑنا بھی اِن کے اختیار میں نہیں، صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ اس طرح شرک کا پورا ابطال کر کے حضرتِ والا نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ جتنے وجوہ سے بھی انسان کسی کو معبُود قرار دے سکتا ہے، وہ سب کے سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت کے مقتضی نہیں ہیں۔

**۳۰** – یعنی اگر تم میری دعوتِ توحید کو اور اِس خبر کو کہ تمھیں اپنے رب کی طرف پلٹنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے بھی بہت سے نبی (مثلاً نُوح، ہُود، صالح علیہم السلام) یہی تعلیم لے کر آچکے ہیں اور ان کی قوموں نے بھی ان کو اسی طرح جھٹلایا ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ انھوں نے جھٹلا کر ان نبیوں کا کچھ بگاڑا یا اپنا انجام خراب کیا۔

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ۚ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا

---

پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔[۳۲] ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اُس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے، پھر اللہ بارِ دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۳۳] جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے، اُسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ

---

**۳۱-** یہاں سے لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ان کے لیے دردناک سزا ہے) تک ایک جملۂ معترضہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا سلسلہ توڑ کر اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ اس اعتراضی تقریر کی مناسبت یہ ہے کہ کفارِ مکّہ، جنھیں سبق دینے کے لیے یہ قصّہ سنایا جا رہا ہے، دو بنیادی گمراہیوں میں مبتلا تھے: ایک، شرک و بت پرستی۔ دوسرے، انکارِ آخرت۔ ان میں سے پہلی گمراہی کا رد حضرت ابراہیمؑ کی اس تقریر میں آ چکا ہے جو اُوپر نقل کی گئی ہے۔ اب دوسری گمراہی کے رد میں یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ارشاد فرما رہا ہے، تاکہ دونوں کی تردید ایک ہی سلسلۂ کلام میں ہو جائے۔

**۳۲-** یعنی ایک طرف بے شمار اشیا عَدَم سے وجود میں آتی ہیں، اور دوسری طرف ہر نوع کے افراد کے مٹنے کے ساتھ پھر ویسے ہی افراد وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ مشرکین اس بات کو مانتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی صفتِ خلق و ایجاد کا نتیجہ ہے۔ انھیں اللہ کے خالق ہونے سے انکار نہ تھا، جس طرح آج کے مشرکین کو نہیں ہے۔ اس لیے ان کی اپنی مانی ہوئی بات پر یہ دلیل قائم کی گئی ہے کہ جو خدا تمھارے نزدیک اشیا کو عَدَم سے وجود میں لاتا ہے، اور پھر ایک ہی دفعہ تخلیق کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ تمھاری آنکھوں کے سامنے مٹ جانے والی اشیا کی جگہ پھر ویسی ہی اشیا پے در پے وجود میں لاتا چلا جاتا ہے، اس کے بارے میں آخر تم نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ تمھارے مر جانے کے بعد وہ پھر تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اُٹھا کھڑا نہیں کر سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نمل، حاشیہ ۸۰)

**۳۳-** یعنی جب خدا کی کاریگری سے بارِ اوّل کی تخلیق کا تم خود مُشاہدہ کر رہے ہو تو تمھیں سمجھنا چاہیے

فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا

ع ۲ / ۱۴

آسمان میں[۳۴]، اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے[۳۵] ع

جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں[۳۶] اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

پھر[۳۷] اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا:

---

کہ اسی خدا کی کاریگری سے بارِ دیگر بھی تخلیق ہوگی۔ ایسا کرنا اس کی قدرت سے باہَر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۳۴– یعنی تم کسی ایسی جگہ بھاگ کر نہیں جا سکتے جہاں اللہ کی گرفت سے بچ نکلو۔ خواہ تم زمین کی تہوں میں کہیں اُتر جاؤ یا آسمان کی بلندیوں میں پہنچ جاؤ، بہرحال تمھیں ہر جگہ سے پکڑ لایا جائے گا اور اپنے رب کے سامنے تم حاضر کر دیے جاؤ گے۔ یہی بات سورۂ رحمٰن میں جنّوں اور انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کے انداز میں فرمائی گئی ہے کہ تم خدا کی خدائی سے اگر نکل سکتے ہو تو ذرا نکل کر دکھاؤ، اس سے نکلنے کے لیے زور چاہیے، اور وہ زور تمھیں حاصل نہیں ہے، اس لیے تم ہرگز نہیں نکل سکتے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ع (آیت ۳۳)

۳۵– یعنی نہ تمھارا اپنا زور اتنا ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ، اور نہ تمھارا کوئی ولی و سرپرست یا مددگار ایسا زور آور ہے کہ خدا کے مقابلے میں تمھیں پناہ دے سکے اور اس کے مواخذے سے تمھیں بچا لے۔ ساری کائنات میں کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے، جنھوں نے احکامِ خداوندی کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے، جنھوں نے جرأت و جسارت کے ساتھ خدا کی نافرمانیاں کی ہیں اور اس کی زمین میں ظلم و فساد کے طوفان اٹھائے ہیں، ان کا حمایتی بن کر اُٹھ سکے اور خدا کے فیصلۂ عذاب کو ان پر نافذ ہونے سے روک سکے، یا خدا کی عدالت میں یہ کہنے کی ہمت کر سکے کہ یہ میرے ہیں اس لیے جو کچھ بھی انھوں نے کیا ہے اسے معاف کر دیا جائے۔

۳۶– یعنی ان کا کوئی حصّہ میری رحمت میں نہیں ہے۔ ان کے لیے کوئی گنجایش اس امر کی نہیں ہے کہ وہ میری رحمت میں سے حصّہ پانے کی اُمید رکھ سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب انھوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا تو خود بخود اُن وعدوں سے فائدہ اُٹھانے کے حق سے بھی وہ دست بردار ہو گئے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں

اقۡتُلُوۡهُ اَوۡ حَرِّقُوۡهُ فَاَنۡجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ

"قتل کردو اِسے یا جلا ڈالو اِس کو۔"[38] آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا،[39] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں

سے کیے ہیں۔ پھر جب انھوں نے آخرت کا انکار کیا اور یہ تسلیم ہی نہ کیا کہ انھیں کبھی اپنے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انھوں نے خدا کی بخشش و مغفرت کے ساتھ کوئی رشتۂ امید سرے سے وابستہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد جب اپنی توقعات کے خلاف وہ عالَمِ آخرت میں آنکھیں کھولیں گے اور اللہ کی اُن آیات کو بھی اپنی آنکھوں سے سچّا اور برحق دیکھ لیں گے جنھیں وہ جھٹلا چکے تھے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ رحمتِ الٰہی میں سے کوئی حصّہ پانے کے اُمیدوار ہو سکیں۔

۳۷- یہاں سے پھر سلسلۂ کلام حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کی طرف مُڑتا ہے۔

۳۸- یعنی حضرت ابراہیمؑ کے معقول دلائل کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ ان کا جواب اگر تھا تو یہ کہ کاٹ دو اُس زبان کو جو حق بات کہتی ہے، اور جینے نہ دو اُس شخص کو جو ہماری غَلَطی ہم پر واضح کرتا ہے اور ہمیں اس سے باز آنے کے لیے کہتا ہے۔ "قتل کردو یا جلا ڈالو" کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پورا مجمع اس بات پر تو متفق تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ہلاک کر دیا جائے، البتہ ہلاک کرنے کے طریقے میں اختلاف تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ قتل کیا جائے، اور کچھ کی رائے یہ تھی کہ زندہ جلا دیا جائے تاکہ ہر اُس شخص کو عبرت حاصل ہو جسے آیندہ کبھی ہماری سرزمین میں حق گوئی کا جُنون لاحق ہو۔

۳۹- اس فقرے سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ آگ میں پھینک دیے گئے تھے۔ یہاں بات صرف اتنی کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے بچا لیا۔ لیکن سورۃ الانبیاء میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ آگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی اور غیر مضر ہو گئی: قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ ۙ (آیت ۶۹) "ہم نے کہا کہ اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔" ظاہر ہے کہ اگر اُن کو آگ میں پھینکا ہی نہ گیا ہو تو آگ کو یہ حکم دینے کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں کہ تو اُن پر ٹھنڈی ہو جا اور ان کے لیے سلامتی بن جا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اشیا کی خاصیتیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں، اور وہ جس وقت جس چیز کی خاصیّت کو چاہے بدل سکتا ہے۔ معمول کے مطابق آگ کا عمل یہی ہے کہ وہ جلائے اور ہر آتش پذیر چیز اس میں پڑ کر جل جائے۔ لیکن آگ کا یہ معمول اس کا اپنا قائم کیا ہُوا نہیں ہے بلکہ خدا کا قائم کیا ہُوا ہے۔ اور اس معمول نے خدا کو پابند نہیں کر دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی حکم نہ دے سکے۔ وہ اپنی آگ کا مالک ہے۔ کسی وقت بھی وہ اسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ جلانے کا عمل چھوڑ دے۔ کسی وقت بھی وہ اپنے ایک اشارے سے آتش کدے کو گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ غیر معمولی خَرقِ عادت اس کے ہاں روز روز نہیں ہوتے۔ کسی بڑی حکمت اور مصلحت کی خاطر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن معمولات کو، جنھیں روزمرہ دیکھنے کے ہم خوگر ہیں، اس بات

لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيۡنِكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ۚ ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُ بَعۡضُكُمۡ بِبَعۡضٍ وَّيَلۡعَنُ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا وَّمَاۡوٰٮكُمُ النَّارُ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾

اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں[۴۰]۔ اور اُس نے کہا[۴۱]: ”تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بُتوں کو اپنے درمیان مَحبّت کا ذریعہ بنا لیا ہے[۴۲] مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دُوسرے پر لعنت کرو[۴۳] گے اور آگ تمھارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمھارا مددگار نہ ہوگا۔“

کے لیے ہرگز دلیل نہیں ٹھیرایا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اُن سے بندھ گئی ہے اور خلافِ معمول کوئی واقعہ اللہ کے حکم سے بھی نہیں ہوسکتا۔

۴۰ – یعنی اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں اس بات میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاندان، قوم اور ملک کے مذہب کی پیروی کرنے کے بجائے اس علمِ حق کی پیروی کی جس کی رُو سے انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حقیقت ہے۔ اور اِس بات میں کہ وہ قوم کی ہٹ دھرمی اور اس کے شدید تعصب کی پروا کیے بغیر اس کو باطل سے باز آجانے اور حق قبول کر لینے کے لیے پیہم تبلیغ کرتے رہے۔ اور اس بات میں کہ وہ آگ کی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے مگر حق وصداقت سے منہ موڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اور اِس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل علیہ السلام تک کو آزمایشوں سے گزارے بغیر نہ چھوڑا۔ اور اس بات میں کہ جب حضرت ابراہیمؑ اللہ کے ڈالے ہوئے امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے تب اللہ کی مدد ان کے لیے آئی اور ایسے معجزانہ طریقے سے آئی کہ آگ کا الاؤ ان کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا۔

۴۱ – سلسلۂ کلام سے مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ بات آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں سے فرمائی ہوگی۔

۴۲ – یعنی تم نے خدا پرستی کے بجائے بُت پرستی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کرلی ہے جو دنیوی زندگی کی حد تک تمھارا قومی شیرازہ باندھ سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی عقیدے پر بھی لوگ جمع ہوسکتے ہیں، خواہ حق ہو یا باطل۔ اور ہر اتفاق و اجتماع، چاہے وہ کیسے ہی غلط عقیدے پر ہو، باہم دوستیوں، رشتہ داریوں، برادریوں، اور دوسرے تمام مذہبی، معاشرتی وتمدُّنی اور مَعاشی وسیاسی تعلقات کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۴۳ – یعنی عقیدۂ باطلہ پر تمھاری یہ ہیئتِ اجتماعی آخرت میں بنی نہیں رہ سکتی۔ وہاں آپس کی مَحبّت،

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

وقف لازم

اُس وقت لوطؑ نے اُس کو مانا۔[۴۴] اور ابراہیمؑ نے کہا: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں،[۴۵] وہ زبردست

دوستی، تعاون، رشتہ داری، اور عقیدت و ارادت کے صرف وہی تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں جو دنیا میں خدائے واحد کی بندگی اور نیکی و تقویٰ پر قائم ہوئے ہوں۔ کفر و شرک اور گمراہی و بدراہی پر جُڑے ہوئے سارے رشتے وہاں کٹ جائیں گے، ساری محبّتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، ساری عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی، بیٹے اور باپ، شوہر اور بیوی، پیر اور مُرید تک ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر پکارے گا کہ اِس ظالم نے مجھے خراب کیا، اس لیے اسے دُہرا عذاب دیا جائے۔ یہ بات قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ زُخرُف میں فرمایا: اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (آیت ۶۷) ''دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے متقین کے۔'' سورۂ اعراف میں فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (آیت ۳۸) ''ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہوگا تو اپنے پاس والے گروہ پر لعنت کرتا ہُوا داخل ہوگا، حتّٰی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ہمارے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، لٰہذا انھیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔'' اور سُورۂ احزاب میں فرمایا: وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (آیات ۶۷-۶۸) ''اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہم کو راہ سے بے راہ کر دیا، اے ہمارے رب! تو انھیں دُہری سزا دے اور ان پر سخت لعنت فرما۔''

۴۴ – ترتیبِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ آگ سے نکل آئے اور انھوں نے اُوپر کے فقرے ارشاد فرمائے، اُس وقت سارے مجمع میں صرف ایک حضرت لوطؑ تھے جنھوں نے آگے بڑھ کر اُن کو ماننے اور اُن کی پیروی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر دوسرے بہت سے لوگ بھی اپنے دل میں حضرت ابراہیمؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے ہوں۔ لیکن پوری قوم اور سلطنت کی طرف سے دینِ ابراہیمؑ کے خلاف جس غضب ناک جذبے کا اظہار اُس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے ہُوا تھا، اُسے دیکھتے ہوئے کوئی دوسرا شخص ایسے خطرناک حق کو ماننے اور اس کا ساتھ دینے کی جراُت نہ کرسکا۔ یہ سعادت صرف ایک آدمی کے حصّے میں آئی، اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ تھے، جنھوں نے آخرکار ہجرت میں بھی اپنے چچا اور چچی (حضرت سارہ) کا ساتھ دیا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ ایک شخص سوال کرسکتا ہے کہ کیا اس واقعے

الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِىْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫

ہے اور حکیم ہے۔[۴۶] اور ہم نے اُسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ (جیسی اولاد) عنایت فرمائی[۴۷] اور اس کی نسل میں نبوّت اور کتاب رکھ دی،[۴۸] اور اسے دنیا میں اُس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔[۴۹]

اور ہم نے لُوطؑ کو بھیجا[۵۰] جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: ''تم تو وہ فُحش کام کرتے ہو جو

سے پہلے حضرت لُوطؑ کافر و مشرک تھے اور آگ سے حضرت ابراہیمؑ کے بسلامت نکل آنے کا معجزہ دیکھنے کے بعد انھیں نعمتِ ایمان میسر آئی؟ اگر یہ بات ہے تو کیا نبوت کے منصب پر کوئی ایسا شخص بھی سرفراز ہوسکتا ہے جو پہلے مشرک رہ چکا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے حضرت لوطؑ خداوندِ عالم کو نہ مانتے ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے معبُودوں کو شریک کرتے ہوں۔ بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کی تصدیق کی اور ان کی پیروی اختیار کرلی۔ ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنیٰ کسی شخص کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت لوطؑ اس وقت ایک نوعمر لڑکے ہی ہوں اور اپنے ہوش میں ان کو پہلی مرتبہ اس موقع پر ہی اپنے چچا کی تعلیم سے واقف ہونے اور ان کی شانِ رسالت سے آگاہ ہونے کا موقع ملا ہو۔

۴۵ – یعنی اپنے رب کی خاطر ملک چھوڑ کر نکلتا ہوں، اب جہاں میرا رب لے جائے گا وہاں چلا جاؤں گا۔

۴۶ – یعنی وہ میری حمایت و حفاظت پر قادر ہے اور میرے حق میں اس کا جو فیصلہ بھی ہوگا، حکمت پر مبنی ہوگا۔

۴۷ – حضرت اسحاقؑ بیٹے تھے اور حضرت یعقوبؑ پوتے۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ کی مِدیانی شاخ میں صرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے، اور اسماعیلی شاخ میں سرکارِ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ڈھائی ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی نہیں آیا۔ اس کے برعکس نبوت اور کتاب کی نعمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک مسلسل اُس شاخ کو عطا ہوتی رہی جو حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلی تھی۔

۴۸ – اس میں وہ تمام انبیاؑ آگئے جو نسلِ ابراہیمی کی سب شاخوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔

مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ ع

ع ۳ ۸ ۱۵

تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمھارا حال یہ ہے کہ مَردوں کے پاس جاتے ہو،[۵۱] اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو؟[۵۲]" پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انھوں نے کہا: "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔" لوطؑ نے کہا: "اے میرے رب! اِن مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔" ع

۴۹ – مقصودِ بیان یہ ہے کہ بابِل کے وہ حکمراں اور پنڈت اور پروہت جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا، اور اس کے وہ مشرک باشندے جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کہیں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلِمہ بلند کرنے کے جرم میں ان لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا، اور جسے آخرکار بے سروسامانی کے عالَم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اُس خلیلِ ربّ العالمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسّر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجرِ عظیم اس کو ملے گا، وہ تو ملے گا ہی، مگر اِس دنیا میں بھی اس نے وہ عزّت پائی جو حُصولِ دنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۵۰ – تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاعراف، رکوع ۱۰۔ ہود، ۷۔ الحِجر، ۴ – ۵۔ الانبیاء، ۵۔ الشعراء، ۹۔ النمل، ۴۔ الصّافّات، ۴۔ القمر، ۲۔

۵۱ – یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے: اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ "تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں کے پاس جاتے ہو۔"

۵۲ – یعنی یہ فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ عَلانیَہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سورۂ نمل میں فرمائی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ "کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ٭ۗ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ٭ۗ

اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر پہنچے[۵۳] تو انھوں نے اُس سے کہا: ''ہم اِس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں[۵۴]، اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔'' ابراہیمؑ نے کہا: ''وہاں تو لُوط موجود ہے[۵۵]۔'' انھوں نے کہا: ''ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ہم اُسے، اور اُس کی بیوی کے سوا، اُس کے باقی سب گھر والوں کو بچا لیں گے۔'' اس کی

دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فُحش کاری کرتے ہو۔''

۵۳ – سورۂ ہُود اور سورۂ حِجر میں اس کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ جو فرشتے قومِ لُوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے، وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوئے اور انھوں نے آنجناب کو حضرت اسحاقؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر یہ بتایا کہ ہمیں قومِ لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۵۴ – ''اِس بستی'' کا اشارہ قومِ لوطؑ کے علاقے کی طرف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس وقت فلسطین کے شہر حَبْرُون (موجودہ الخلیل) میں رہتے تھے۔ اس شہر کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر بُحیرۂ مردار (Dead Sea) کا وہ حصّہ واقع ہے جہاں پہلے قومِ لُوطؑ آباد تھی اور اب جس پر بحیرے کا پانی پھیلا ہُوا ہے۔ یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اور حَبْرُون کی بلند پہاڑیوں پر سے صاف نظر آتا ہے۔ اسی لیے فرشتوں نے اس کی طرف اشارہ کر کے حضرت ابراہیمؑ سے عرض کیا کہ ''ہم اِس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔'' (مُلاحظہ ہو: سورۂ شعراء، حاشیہ ۱۱۴)

۵۵ – سورۂ ہُود میں اس قصّے کا ابتدائی حصّہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہُوا کرتا ہے۔ پھر جب انھوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دُور ہوگئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہم قومِ لوطؑ کی طرف جا رہی ہے، تو آپ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے: (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○) مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملے میں اب کچھ نہ کہو، تمھارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ

كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ قف اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ

بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔[۵۶]

پھر جب ہمارے فرستادے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوا۔[۵۷] اُنھوں نے کہا: ”نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔[۵۸] ہم تمھیں اور تمھارے گھر والوں کو

---

عذاب اب ٹلنے والا نہیں ہے: (يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ) اس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ اُمید باقی نہ رہی کہ قومِ لوطؑ کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا، تب انھیں حضرت لوطؑ کی فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ ”وہاں تو لوطؑ موجود ہے“، یعنی یہ عذاب اگر لوطؑ کی موجودگی میں نازل ہُوا تو وہ اور ان کے اہل و عیال اس سے کیسے محفوظ رہیں گے۔

۵۶ - اس عورت کے متعلق سورۂ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوطؑ کی وفادار نہ تھی، اِسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی، ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود، عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ ہجرت کے بعد جب اُردُن کے علاقے میں آ کر آباد ہوئے ہوں گے تو انھوں نے اسی قوم میں شادی کر لی ہوگی۔ لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اَخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اُس قوم کے ساتھ ہُوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اَخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔

۵۷ - اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوب صورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ حضرت لوطؑ اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہوگئے کہ میں اپنے اِن مہمانوں کو ٹھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیراؤں تو یہ بڑی بے مروّتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی۔ مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان مسافروں کو اپنی پناہ میں نہ لوں گا تو رات انھیں کہیں اور گزارنی پڑے گی اور اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ گویا میں نے خود انھیں بھیڑیوں کے حوالے کیا۔ اس کے بعد کا قصہ یہاں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ ہود، الحِجر اور القمر میں بیان ہوئی ہیں کہ ان لڑکوں کی آمد کی خبر سن کر شہر کے بہت سے

اَهۡلَكَ اِلَّا امۡرَاَتَكَ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤى اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

بچالیں گے، سوائے تمھاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں، اُس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔" اور ہم نے اُس بستی کی ایک کُھلی نشانی چھوڑ دی ہے[۵۹] اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔[۶۰]

---

لوگ حضرت لُوطؑ کے مکان پر ہجوم کر کے آگئے اور اصرار کرنے لگے کہ وہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے ان کے حوالے کر دیں۔

۵۸ – یعنی ہمارے معاملے میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے فکر مند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنھیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تصریح ہے کہ جب لوگ حضرت لوطؑ کے گھر میں گُھسے چلے آرہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے، تو آپ پریشان ہو کر چیخ اُٹھے کہ لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ "کاش! میرے پاس تمھیں ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی، یا کسی زور آور کی حمایت میں پا سکتا۔" اس وقت فرشتوں نے کہا: يٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ "اے لوط! ہم تمھارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ تم تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔"

۵۹ – اس کُھلی نشانی سے مراد ہے بُحیرۂ مُردار، جسے بحرِ لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر کفارِ مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہِ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو۔

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ (الحجر) اور وَاِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ وَبِالَّيۡلِ. (الصّافات)

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جارہی ہے کہ بحیرۂ مردار کا جنوبی حصّہ ایک ہولناک زلزلے کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصّے

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ قف وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

---

اور مَدیَن کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔[۶۱] اُس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخر کے اُمیدوار رہو[۶۲] اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔" مگر انھوں نے اسے جھٹلا[۶۳] دیا۔ آخرکار ایک سخت زلزلے نے انھیں آلیا اور وہ اپنے گھر میں[۶۴] پڑے کے پڑے رہ گئے۔

اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔[۶۵] اُن کے اعمال کو شیطان نے اُن کے لیے خوش نما بنا دیا اور انھیں

---

میں قومِ لوطؑ کا مرکزی شہر سدوم (Sodom) واقع تھا۔ اس حصّے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ شُعَراء، حاشیہ ۱۱۴)

۶۰ – عملِ قومِ لوطؑ کی شرعی سزا کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۶۸۔

۶۱ – تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، رکوع ۱۱۔ ہود، ۸۔ الشعراء، ۱۰۔

۶۲ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آخرت کے آنے کی توقع رکھو، یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں تمھیں اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزا و سزا پانا ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کرو جس سے تم آخرت میں انجام بہتر ہونے کی اُمید کر سکو۔

۶۳ – یعنی اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ حضرت شعیبؑ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ تعلیم جو وہ دے رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اس کو نہ ماننے کا نتیجہ انھیں عذابِ الٰہی کی شکل میں بھگتنا ہوگا۔

۶۴ – گھر سے مراد وہ پورا علاقہ ہے جس میں یہ قوم رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ایک پوری قوم کا ذکر

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ

راہِ راست سے برگشتہ کردیا، حالانکہ وہ ہوشِ گوش رکھتے تھے۔[۶۶] اور قارون وفرعون وہامان کو ہم نے ہلاک کیا۔ موسیٰؑ اُن کے پاس بَیِّنات لے کر آیا مگر انھوں نے زمین میں اپنی بڑائی کا زعم کیا، حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے۔[۶۷] آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی،[۶۸] اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا،[۶۹] اور کسی کو

ہور ہا ہو تو اس کا گھر اس کا مُلک ہی ہو سکتا ہے۔

۶۵ – عرب کے جن علاقوں میں یہ دونوں قومیں آباد تھیں، ان سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا۔ جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اَب اَحقاف، یمن اور حَضرَمَوت کے نام سے معروف ہے، قدیم زمانے میں عاد کا مسکن تھا اور اہلِ عرب اس کو جانتے تھے۔ حجاز کے شمالی حصے میں رابِغ سے عَقَبَہ تک اور مدینہ وخیبر سے تیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہُوا ہے، اور نُزولِ قرآن کے زمانے میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوں گے۔

۶۶ – یعنی جاہل ونادان نہ تھے۔ اپنے اپنے وقت کے بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے، اور اپنی دنیا کے معاملات انجام دینے میں پوری ہوشیاری اور دانائی کا ثبوت دیتے تھے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور ان کی عقل سلب کر کے انھیں اپنے راستے پر کھینچ لے گیا۔ نہیں، انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر آنکھوں دیکھتے شیطان کے پیش کیے ہوئے اُس راستے کو اختیار کیا جس میں انھیں بڑی لذتیں اور منفعتیں نظر آتی تھیں، اور انبیاءؑ کے پیش کیے ہوئے اس راستے کو چھوڑ دیا جو انھیں خشک اور بدمزا اور اَخلاقی پابندیوں کی وجہ سے تکلیف دہ نظر آتا تھا۔

۶۷ – یعنی بھاگ کر اللہ کی گرفت سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔ اللہ کی تدبیروں کو ناکام کر دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

۶۸ – یعنی عاد، جن پر مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک سخت ہوا کا طوفان برپا رہا۔ (سورۃ الحاقّہ، آیت ۷)

خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

وقف لازم

ہم نے زمین میں دھنسا دیا[70]، اور کسی کو غرق کر دیا[71]۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کر رہے تھے[72]۔

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دُوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش! یہ لوگ

۶۹ – یعنی ثمود۔

۷۰ – یعنی قارون۔

۷۱ – یعنی فرعون اور ہامان۔

۷۲ – یہ تمام قصّے جو یہاں تک سنائے گئے ہیں، ان کا رُوئے سُخن دو طرف ہے: ایک طرف یہ اہلِ ایمان کو سنائے گئے ہیں، تاکہ وہ پست ہمت اور دل شکستہ و مایوس نہ ہوں اور مشکلات و مصائب کے سخت سے سخت طوفان میں بھی صبر و استقلال کے ساتھ حق و صداقت کا عَلَم بلند کیے رکھیں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں کہ آخرکار اس کی مدد ضرور آئے گی اور وہ ظالموں کو نیچا دکھائے گا اور کلمۂ حق کو سربلند کر دے گا۔ دوسری طرف یہ اُن ظالموں کو بھی سنائے گئے ہیں جو اپنے نزدیک تحریکِ اسلامی کا بالکل قَلع قَمع کر دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تم خدا کے حِلم اور اس کی بُردباری کا غلط مطلب لے رہے ہو۔ تم نے خدا کی خدائی کو اندھیر نگری سمجھ لیا ہے۔ تمھیں اگر بغاوت و سرکشی اور ظلم و ستم اور بداعمالیوں پر ابھی تک نہیں پکڑا گیا ہے اور سنبھلنے کے لیے محض ازراہِ عنایت لمبی مہلت دی گئی ہے تو تم اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہاں کوئی انصاف کرنے والی طاقت سرے سے ہے ہی نہیں اور اس زمین پر جس کا جو کچھ جی چاہے بلانہایت کیے جا سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی آخرکار تمھیں جس انجام سے دوچار کر کے رہے گی وہ وہی انجام ہے جو تم سے پہلے قومِ نوحؑ اور قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ دیکھ چکی ہے، جس سے عاد و ثمود دوچار ہو چکے ہیں، اور جسے قارون و فرعون نے دیکھا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ

علم رکھتے۔[۷۳] یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پُکارتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔[۷۴] یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمایش کے لیے دیتے ہیں،

۷۳ – اُوپر جتنی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شرک میں مبتلا تھیں اور اپنے معبُودوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست (guardians) ہیں، ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کی پوجا پاٹ کر کے اور انھیں نذر و نیاز دے کر جب ہم ان کی سرپرستی حاصل کرلیں گے تو یہ ہمارے کام بنائیں گے اور ہم کو ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن جیسا کہ اُوپر کے تاریخی واقعات میں دکھایا گیا ہے، ان کے یہ تمام عقائد و اوہام اُس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اُس وقت کوئی دیوتا، کوئی اَوتار، کوئی ولی، کوئی رُوح اور کوئی جن یا فرشتہ، جسے وہ پوجتے تھے، ان کی مدد کو نہ آیا اور اپنی باطل توقعات کی ناکامی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے وہ سب پیوندِ خاک ہو گئے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ مشرکین کو مُتنبّہ کر رہا ہے کہ کائنات کے حقیقی مالک و فرمانروا کو چھوڑ کر بالکل بے اختیار بندوں اور سراسر خیالی معبُودوں کے اعتماد پر جو توقعات کا گھروندا تم نے بنا رکھا ہے، اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح مکڑی کا جالا ایک اُنگلی کی چوٹ بھی برداشت نہیں کرسکتا اسی طرح تمھاری توقعات کا یہ گھروندا بھی خدا کی تدبیر سے پہلا تصادم ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ یہ محض جہالت کا کرشمہ ہے کہ تم اوہام کے اس چکّر میں پڑے ہوئے ہو۔ حقیقت کا کچھ بھی علم تمھیں ہوتا تو تم ان بے بنیاد سہاروں پر اپنا نظامِ حیات کبھی تعمیر نہ کرتے۔ حقیقت بس یہ ہے کہ اختیارات کا مالک اس کائنات میں ایک ربُّ العالمین کے سوا کوئی نہیں ہے اور اسی کا سہارا وہ سہارا ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ، آیت ۲۵۶) ”جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے وہ مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

۷۴ – یعنی اللہ کو ان سب چیزوں کی حقیقت خوب معلوم ہے جنھیں یہ لوگ معبُود بنائے بیٹھے ہیں اور مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ طاقت کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور اسی کی تدبیر و حکمت اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے: ” اللہ خوب جانتا ہے کہ اُسے چھوڑ کر جنھیں یہ لوگ

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع

ع ۱۴ ۱۲

۲۱ الجزء

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے،[۷۵] درحقیقت اِس میں ایک نشانی ہے اہلِ ایمان کے لیے۔[۷۶] ع

(اے نبیؐ!) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمھاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو،[۷۷] یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے،[۷۸] اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے[۷۹]۔ اللہ جانتا ہے

پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں ہیں (یعنی بے حقیقت ہیں) اور عزیز و حکیم بس وہی ہے۔"

۷۵ – یعنی کائنات کا یہ نظام حق پر قائم ہے نہ کہ باطل پر۔ اس نظام پر جو شخص بھی صاف ذہن کے ساتھ غور کرے گا، اس پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ زمین و آسمان اَوہام وتخیُّلات پر نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت پر کھڑے ہیں۔ یہاں اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ جو کچھ بھی سمجھ بیٹھے اور اپنے وہم وگمان سے جو فلسفہ بھی گھڑ لے وہ ٹھیک بیٹھ جائے۔ یہاں تو صرف وہی چیز کامیاب ہوسکتی ہے اور قرار وثبات پا سکتی ہے جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ خلافِ واقعہ قیاسات اور مفروضات پر جو عمارت بھی کھڑی کی جائے گی، وہ آخر کار حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ نظامِ کائنات صاف شہادت دے رہا ہے کہ ایک خدا اس کا خالق ہے اور ایک ہی خدا اس کا مالک و مدبّر ہے۔ اس امرِ واقعی کے خلاف اگر کوئی شخص اس مفروضے پر کام کرتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا یہ فرض کر کے چلتا ہے کہ اس کے بہت سے خدا ہیں جو نذر و نیاز کا مال کھا کر اپنے عقیدت مندوں کو یہاں سب کچھ کرنے کی آزادی اور بخیریت رہنے کی ضمانت دے دیتے ہیں، تو حقیقت اس کے اِن مفروضات کی بدولت ذرّہ برابر بھی تبدیل نہ ہوگی، بلکہ وہ خود ہی کسی وقت ایک صدمۂ عظیم سے دوچار ہوگا۔

۷۶ – یعنی زمین و آسمان کی تخلیق میں توحید کی صداقت اور شرک و دہریت کے بُطلان پر ایک صاف شہادت موجود ہے، مگر اس شہادت کو صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو انبیا علیہم السلام کی پیش کی ہوئی تعلیمات کو

مانتے ہیں۔ ان کا انکار کر دینے والوں کو سب کچھ دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

۷۷- خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطَب تمام اہلِ ایمان ہیں۔ ان پر جو ظلم وستم اُس وقت توڑے جارہے تھے، اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آرہا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پچھلے چار رُکوعوں میں صبر وثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انھیں عملی تدبیر یہ بتائی جارہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں، کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کرتی ہیں جن سے وہ باطل کی بڑی سے بڑی طغیانیوں اور بدی کے سخت سے سخت طوفانوں کے مقابلے میں نہ صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان کا منہ پھیر سکتا ہے۔ لیکن تلاوتِ قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی روح میں جذب کرتا چلا جائے، اور اس کی نماز صرف حرکاتِ بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اَخلاق وکردار کی قوتِ محرکہ بن جائے۔ نماز کے وصفِ مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں قرآن خود بیان کر رہا ہے۔ رہی تلاوت، تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی، وہ اسے کفر کی طغیانیوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ یَقْرَأُوْنَ القراٰن ولا یجاوز حناجرھم، یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیة۔ ’’وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، وہ دین سے اِس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔‘‘ (بخاری، مسلم، مؤطّا) درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن وفکر اور اَخلاق وکردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے جس سے قرآن منع کرتا ہے، وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ مَا اٰمن بالقراٰن من استحل محارمه۔ ’’قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرلیا۔‘‘ (ترمذی بروایت صُہَیب رُومیؓ) ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اس کی رُوح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلے میں اور زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کیرکٹر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا رہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے، اس کا معاملہ تو اس مجرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پوزیشن کو سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے کہ القراٰن حجّة لك او علیك۔ ’’قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف۔‘‘ (مسلم) یعنی اگر تُو قرآن کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجت ہے۔ دنیا سے آخرت تک جہاں بھی تجھ سے بازپُرس ہو، تو اپنی صفائی میں

قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے۔ اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہُوا تو نہ دنیا میں کوئی قاضیِ اسلام تجھے سزا دے سکے گا اور نہ آخرت میں داورِ محشر ہی کے ہاں اس پر تیری پکڑ ہوگی۔ لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو، اور تو نے اسے پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے، کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے منع کرتا ہے، اور پھر تُو اس کے خلاف رَوِیّہ اختیار کرے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجت ہے۔ یہ تیرے خدا کی عدالت میں تیرے خلاف فوجداری کا مُقدّمہ اور زیادہ مضبوط کر دے گی۔ اس کے بعد ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ جانا یا ہلکی سزا پانا تیرے لیے ممکن نہ رہے گا۔

۷۸ – یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک اہم وصف ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مکّے کے اُس ماحول میں جن شدید مزاحمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ در پیش تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں مادّی طاقت سے بڑھ کر اَخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس اخلاقی طاقت کی پیدایش اور اس کے نَشْوونَما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشان دِہی کی گئی: ایک، تلاوتِ قرآن، دوسرے، اقامتِ صلوٰۃ۔ اس کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ وہ ذریعہ ہے جس سے تم لوگ اُن بُرائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمھارے گرد و پیش اہلِ عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اِس وقت مبتلا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اَخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں رکھتا کہ یہ بجائے خود اُن لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں نافع ہے جنھیں یہ پاکیزگی حاصل ہو، بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اُن کو اُن سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیّت کے اُس ناپاک نظام کو، جو اُن بُرائیوں کی پرورش کرتا ہے، برقرار رکھنے کے لیے اِن پاکیزہ انسانوں کے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ فَحشاء اور مُنکَر کا اطلاق جن بُرائیوں پر ہوتا ہے، انھیں انسان کی فطرت بُرا جانتی ہے، اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اُصولاً ان کو بُرا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ نُزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کُلیّے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اَخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے، بدی کے مقابلے میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے، اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو بُرائی کو بھلائی سمجھتا ہو، یا بھلائی کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر کسی ایسی تحریک کا اُٹھنا جس سے وابستہ ہوتے ہی خود اُسی معاشرے کے افراد اَخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی سیرت و کردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اَخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصّبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر اُن لوگوں کا ساتھ دیے

چلے جاتے جو خود اَخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیّت کے اُس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے جو اُن برائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادّی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اَخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کرلیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر وتُفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دے دے۔

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو پہلو ہیں: ایک اس کا وصفِ لازم ہے، یعنی یہ کہ وہ فَحشاء اور مُنکَر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصفِ مطلوب ہے، یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی فَحشاء اور مُنکَر سے رُک جائے۔ جہاں تک روکنے کا تعلق ہے، نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا، وہ تسلیم کرے گا کہ انسان کو بُرائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں، ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہوسکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے کہ تو اِس دنیا میں آزاد و خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے، حتّٰی کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اُس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔ پھر اس یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اِس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھُپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اُٹھنے کے وقت سے لے کر نماز ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا آخر کسے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوئے اذکارِ نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے، تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہوسکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے لے کر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانونِ خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعے سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جارہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جارہا ہے، اسے فرض شناس انسان بنایا جارہا ہے، اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جارہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبۂ اطاعت کے زیرِ اثر خفیہ اور علانیہ ہر حال میں اُس قانون کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو، اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فَحشاء و مُنکَر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریقِ تربیت ایسا نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملے

میں اِس درجہ مؤثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رُکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اُٹھانے کی نیت رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مُترتّب ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیرِ اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہوسکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، یا جان بُوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تَغذِیَہ اور نشوونما ہے، لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے جزوِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً ہی قے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لاکر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجبِ تَغذِیَۂ بدن نہیں ہے کیونکہ فُلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جارہا ہے، اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے، کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا، جیسے کھانا کھا کر قے کر دینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو متعدّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی ہوئی ہے۔ عمرانؓ بن حُصَین کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر فلا صلاة له "جسے اس کی نماز نے فُحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا، اس کی نماز نہیں ہے۔" (ابنِ ابی حاتم) ابنِ عباسؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: من لم تنهه صلٰوته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد بها من الله الّا بعدا، "جس کی نماز نے اسے فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا، اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دُور کر دیا۔" (ابنِ ابی حاتم، طَبَرانی) یہی مضمون جناب حسن بصریؒ نے بھی حضورؐ سے مرسلاً رِوایَت کیا ہے۔ (ابنِ جَریر، بَیْہَقی) ابنِ مسعودؓ سے حضورؐ کا یہ ارشاد مروی ہے: لا صلٰوة لمن لم يطع الصلٰوة وطاعة الصلٰوة ان تنهى عن الفحشاء والمنكر "اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فَحشاء و مُنکَر سے رُک جائے۔" (ابنِ جَریر، ابنِ ابی حاتم) اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصری، قَتَادَہ اور اَعْمَش وغیرہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں: جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں، اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فَحشاء اور مُنکَر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رُک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (رُوح المعانی)

۷۹ – اس کے کئی معنیٰ ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اِس سے بزرگ تر ہے۔ اُس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر اُبھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز بھی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجائے خود بہت بڑی چیز ہے۔ خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تمھیں یاد کرنا تمھارے اُس کو یاد کرنے سے

مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا

جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔

اور اہلِ کتاب[۸۰] سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے[۸۱]۔۔۔ سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں[۸۲]۔۔۔ اور اُن سے کہو کہ ”ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے

زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ، آیت ۱۵۲) ”تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا۔“ پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا تو لامحالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اِس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے جسے حضرت ابوالدَّرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیۂ محترمہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے، یا زکوٰۃ دیتا ہے، یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لامحالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے، تبھی تو اس سے وہ عملِ نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی برائی کے مواقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یادِ الٰہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

۸۰ — واضح رہے کہ آگے چل کر اِسی سورہ میں ہجرت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اُس وقت حَبَش ہی ایک ایسا مامَن تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جا سکتے تھے، اور حبش پر اس زمانے میں عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے اِن آیات میں مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو ان سے دین کے معاملے میں بحث و کلام کا کیا انداز اختیار کریں۔

۸۱ — یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شایستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے، تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو، اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلّغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطَب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اُتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِّمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملے میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین

وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ اِلٰـہُنَا وَ اِلٰـہُکُمۡ وَاحِدٌ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یُؤۡمِنُوۡنَ

اور اُس چیز پر بھی جو تمھاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔[۸۳]" (اے نبیؐ!) ہم نے اِسی طرح تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے،[۸۴] اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان

کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآنِ مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ (النحل، آیت ۱۲۵)

دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ○ (حٰم السجدہ، آیت ۳۴)

بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مُدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ ؕ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ ○ (المومنون، آیت ۹۶)

تم بدی کو اچھے ہی طریقے سے دفع کرو، ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمھارے خلاف) بناتے ہیں۔

خُذِ الۡعَفۡوَ وَ اۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ ○ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ (الاعراف، آیات ۱۹۹-۲۰۰)

درگزر کی روش اختیار کرو، بھلائی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو، اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمھیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔

۸۲- یعنی جو لوگ ظلم کا رَوِیّہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رَوِیّہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلے میں نرم و شیریں ہی نہ بنے رہنا چاہیے کہ دنیا داعیِ حق کی شرافت کو کمزوری اور مَسْکَنَت سمجھ بیٹھے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو شائستگی، شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ وہ ہر ظالم کے لیے نرم چارا بن کر رہیں۔

۸۳- اِن فقروں میں اللہ تعالیٰ نے خود اُس عمدہ طریقِ بحث کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغِ حق

بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

لاتے ہیں[۸۵]، اور اِن لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں[۸۶]، اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں[۸۷]۔

کی خدمت انجام دینے والوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمھیں بحث کرنی ہو، اُس کی گمراہی کو بحث کا نقطۂ آغاز نہ بناؤ، بلکہ بات اِس سے شروع کرو کہ حق وصداقت کے وہ کون سے اجزا ہیں جو تمھارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں۔ یعنی آغازِ کلام نِکاتِ اختلاف سے نہیں بلکہ نِکاتِ اتفاق سے ہونا چاہیے، پھر انھی مُتّفَق عَلَیہ اُمور سے اِستِدلال کر کے مخاطَب کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جن اُمور میں تمھارے اور اس کے درمیان اختلاف ہے، ان میں تمھارا مسلک مُتّفَق عَلَیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔

اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہلِ کتاب مشرکینِ عرب کی طرح وحی و رسالت اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح اِن سب حقیقتوں کو مانتے تھے۔ اِن بُنیادی اُمور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیادِ اختلاف ہوسکتی تھی تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے ہاں آئی ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی اُنھیں دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انھیں کافر قرار دیتے۔ یہ جھگڑے کی بڑی مضبوط وجہ ہوتی۔ لیکن مسلمانوں کا مَوْقِف اس سے مختلف تھا۔ وہ تمام اُن کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہلِ کتاب کے پاس موجود تھیں اور پھر اُس وحی پر ایمان لائے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ بتانا اہلِ کتاب کا کام تھا کہ کس معقول وجہ سے وہ خدا ہی کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا یہی مَوْقِف ان کے سامنے پیش کرو۔ ان سے کہو کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی کو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔ اس کی طرف سے جو احکام و ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں ان سب کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے، خواہ وہ تمھارے ہاں آئی ہوں یا ہمارے ہاں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ملک اور قوم اور نسل کے بندے نہیں ہیں کہ ایک جگہ خدا کا حکم آئے تو ہم مانیں اور اُسی خدا کا حکم دوسری جگہ آئے تو ہم اس کو نہ مانیں۔ قرآنِ مجید میں یہ بات جگہ جگہ دہرائی گئی ہے اور خصوصاً اہلِ کتاب سے جہاں سابقہ پیش آیا ہے وہاں تو اسے زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: البقرہ، آیات ۴-۱۳۶-۱۷۷-۲۸۵۔ آلِ عمران، آیت ۸۴۔ النساء، آیات ۱۳۶-۱۵۰ تا ۱۵۲-۱۶۲ تا ۱۶۴۔ الشّوریٰ، آیت ۱۳۔

۸۴ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جس طرح پہلے انبیاؑ پر ہم نے کتابیں نازل کی تھیں، اُسی طرح اب یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اِسی تعلیم کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے کہ ہماری پچھلی کتابوں کا انکار کر کے نہیں بلکہ اُن سب کا اقرار کرتے ہوئے اِسے مانا جائے۔

۸۵ – سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد تمام اہلِ کتاب نہیں ہیں بلکہ وہ اہلِ کتاب ہیں جن کو

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ

(اے نبیؐ!) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے[۸۸]۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے

کُتُبِ الٰہیہ کا صحیح علم و فہم نصیب ہُوا تھا، جو ''چار پائے بر و کتابے چند'' کے مصداق محض کتاب بردار قسم کے اہلِ کتاب نہیں تھے، بلکہ حقیقی معنیٰ میں اہلِ کتاب تھے۔ ان کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہوئی یہ آخری کتاب آئی تو انھوں نے کسی ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصُّب سے کام نہ لیا اور اسے بھی ویسے ہی اخلاص کے ساتھ تسلیم کر لیا جس طرح پچھلی کتابوں کو تسلیم کرتے تھے۔

۸۶ – ''اِن لوگوں'' کا اشارہ اہلِ عرب کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق پسند لوگ ہر جگہ اس پر ایمان لا رہے ہیں، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا غیر اہلِ کتاب میں سے۔

۸۷ – یہاں کافر سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے تعصّبات کو چھوڑ کر حق بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، یا وہ جو اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنی بے لگام آزادیوں پر پابندیاں قبول کرنے سے جی چُراتے ہیں اور اس بنا پر حق کا انکار کرتے ہیں۔

۸۸ – یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں وہی اِستِدلال ہے جو اس سے پہلے سورۂ یونس اور سورۂ قصص میں گزر چکا ہے۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ یُونُس، حاشیہ ۲۱ و تفسیر سورۂ قصص، حاشیہ ۶۴ و ۱۰۹۔ اس مضمون کی مزید تشریح کے لیے تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ نحل، حاشیہ ۱۰۷، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۵، المومنون حاشیہ ۶۶، الفرقان حاشیہ ۱۲ اور الشّوریٰ حاشیہ ۸۴ کا مُطالَعہ بھی مفید ہوگا)۔

اس آیت میں اِستِدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ آپؐ کے اہلِ وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ، جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِّ کُہولَت کو پہنچنے تک آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ کُتُبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیائے سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدُّن و اَخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اِس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے، یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نَوِشْت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مُطالَعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمّیّت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوت کا

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ قَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے[۸۹]، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں[۹۰] اِس کے رب کی طرف سے؟" کہو: "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔" اور کیا اِن لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی

انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجے میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔

۸۹- یعنی ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مُشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش وبینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اُس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتا چلا سکتا ہے جو اُس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مَظہَر تھی، اُن کا کوئی ماخذ آپؐ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گردوپیش کے جن مُمالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں دُور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں، وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

۹۰- یعنی معجزات، جنھیں دیکھ کر یقین آئے کہ واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے نبی ہیں۔

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

جو اِنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے[۹۱]؟ درحقیقت اِس میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں[۹۲] ؏ (اے نبیؐ!) کہو کہ "میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔"

۹۱- یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا، کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمھاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنھوں نے دیکھے، ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمھارے سامنے ہے۔ تمھیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ تم ہر وقت اِسے دیکھ سکتے ہو۔

قرآنِ مجید کے اس بیان و اِستِدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپؐ کی نبوت کے حق میں ایک طاقت ور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن رِوایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ لکھے پڑھے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، وہ اوّل تو پہلی ہی نظر میں ردّ کر دینے کے لائق ہیں، کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ بجائے خود بھی اِتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی اِستِدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک، بخاری کی یہ روایت ہے کہ صُلحِ حُدَیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمایندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (یعنی حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمدؐ بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیے اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔

لیکن یہ روایت بَراءؓ بن عازِب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں:

(۱) بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال لعلی امحہ فقال علی ما انا بالذی

امحاہ فمحاہ رسول اللہ بیدہٖ۔ ''حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یہ الفاظ کاٹ دو۔ انھوں نے عرض کیا: میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انھیں کاٹ دیا۔''

(۲) اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول اللہ قال لا واللہ لا امحوك ابدا فاخذ رسول اللہ الکتاب فکتب ھٰذا ما قاضٰی علیه محمد بن عبد اللہ۔ ''پھر علیؓ سے کہا: ''رسول اللہ'' کاٹ دو۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! میں آپؐ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے وہ تحریر لے کر لکھا: یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔''

(۳) تیسری روایت انھی بَراءؓ بن عازِب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلی امح رسول اللہ فقال علی واللہ لا امحاہ ابدًا قال فارنیه قال فاراہ ایاہ فمحاہ النبی صلی اللہ علیه وسلم بیدہٖ۔ ''حضورؐ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا: ''رسول اللہ'' کاٹ دو۔ انھوں نے عرض کیا: خدا کی قسم! میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انھوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیے۔''

(۴) چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے: فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الکتاب ولیس یحسن یکتب فکتب ھٰذا ما قاضٰی محمد بن عبد اللہ۔ ''پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی، درآنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے، اور آپؐ نے لکھا: یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔''

(۵) انھی بَراءؓ بن عازِب سے مسلم، کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دیے۔

(۶) دوسری رِوایَت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں لکھا ہے، حضرت علیؓ نے آپؐ کو جگہ بتائی، اور آپؐ نے اسے مٹا کر ابنِ عبداللہ لکھ دیا۔

رِوایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت بَراء بن عازِب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے ''محمدؐ بن عبداللہ'' کے الفاظ اپنے دستِ مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ صحیح صورتِ واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹانے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے اس کی جگہ اُن سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابنِ عبداللہ کے الفاظ لکھوا دیے ہوں۔ دوسری رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؓ، دوسرے محمدؐ بن مَسْلَمَہ۔ (فتح الباری، جلد ۵، ص ۲۱۷) اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا، وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔ تاہم اگر واقعہ یہی ہو کہ حضورؐ نے اپنا نام اپنے ہی دستِ مبارک سے لکھا ہو، تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ اَن پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں، باقی کوئی چیز نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ‌ؕ وَلَوۡلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الۡعَذَابُ‌ؕ وَلَيَاۡتِيَنَّهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ‌ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَۙ ﴿۵۴﴾ يَوۡمَ يَغۡشٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ وَيَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾

---

یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔[۹۳] اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آ کر رہے گا اچانک، اِس حال میں کہ انھیں خبر بھی نہ ہو گی۔ یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ جہنّم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے (اور اِنھیں پتا چلے گا) اُس روز جب کہ عذاب انھیں اُوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی، اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے۔

---

دوسری روایت جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، مجاہد سے ابن ابی شَیبہ اور عمر بن شبہ نے نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے)۔ لیکن اول تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے، جیسا کہ حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں: فضعیف لا اصل له۔ دوسرے اس کی کمزوری یوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہؓ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عَون بن عبداللہ کے، جن سے مجاہد نے یہ بات سنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عون بھی صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں، جنھوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انھیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعے کا علم حاصل ہُوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

۹۲ – یعنی بلاشبہ اس کتاب کا نُزول اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی ہے اور یہ بندوں کے لیے بڑی پند و نصیحت پر مشتمل ہے، مگر اس کا فائدہ صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اس پر ایمان لائیں۔

۹۳ – یعنی بار بار چیلنج کے انداز میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر تم رسول ہو اور ہم واقعی حق کو جھٹلا رہے ہیں تو ہم پر وہ عذاب کیوں نہیں لے آتے جس کے ڈراوے تم ہمیں دیا کرتے ہو۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ۟ ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِیۡنَ

اَے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔[۹۴] ہر مُتنفِّس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔[۹۵] جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے[۹۶]ــــــ اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے

۹۴- یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکّے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی مَحبّت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچّا مومن ہے، وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعیِ ایمان ہے، وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا، خدا پرست انسان محبّ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے، جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

۹۵- یعنی جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لٰہذا تمھارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمھیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا، اور ایمان

صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾

صبر کیا ہے[97] اور جو اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں[98]۔ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمھارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے[99]۔

---

بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہُوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

۹۶ – یعنی اگر ایمان اور نیکی کے راستے پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی مرے، تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہوگی، اور نری تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔

۹۷ – یعنی جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہیں۔ جنھوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہے اور منہ نہیں موڑا ہے۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی طرف ذرّہ برابر التفات نہیں کیا ہے۔ کفار و فُسّاق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور ان کی دولت وحشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی ہے۔

۹۸ – یعنی جنھوں نے بھروسا اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا۔ جو اسبابِ دُنیوی سے قطعِ نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے، اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ جنھوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہوگا، اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اِس دنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

۹۹ – یعنی ہجرت کرنے میں تمھیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمھیں بھی دے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ

اگر تم [۱۰۰] اِن لوگوں سے پُوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سُورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے، تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں؟ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا

ٹھیک یہی بات ہے جو سیّدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمائی تھی۔ انھوں نے فرمایا:
''کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبّت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پییں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی مَیں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں سے کسی کے مانند مُلبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا۔ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے، یا کیا پییں گے، یا کیا پہنیں گے۔ کیونکہ اِن سب چیزوں کی تلاش میں تو غیر قومیں رہتی ہیں۔ اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم اِن سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اُس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمھیں مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو، کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔'' (متّی، باب ۶، آیات ۲۴-۳۴)

قرآن اور انجیل کے اِن ارشادات کا پَس منظر ایک ہی ہے۔ دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالَمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطعِ نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اُٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اِس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر

عِبَادِهٖ وَ يَقۡدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِهَا لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ع وَمَا هٰذِهِ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا لَهۡوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ لَهِىَ

چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو: کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا، تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔ کہو: الحمد للہ[۱۰۱]! مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ ع

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا[۱۰۲]۔ اصل زندگی کا گھر تو

خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انھی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

**۱۰۰** — یہاں سے پھر کلام کا رُخ کفارِ مکہ کی طرف مڑتا ہے۔

**۱۰۱** — اس مقام پر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ کا لفظ دو معنیٰ دے رہا ہے: ایک، یہ کہ جب یہ سارے کام اللہ کے ہیں تو پھر حمد کا مستحق بھی صرف وہی ہے، دوسروں کو حمد کا استحقاق کہاں سے پہنچ گیا؟ دوسرے، یہ کہ خدا کا شکر ہے، اس بات کا اعتراف تم خود بھی کرتے ہو۔

**۱۰۲** — یعنی اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے جیسے بچے تھوڑی دیر کے لیے کھیل کود لیں اور پھر اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔ یہاں جو بادشاہ بن گیا ہے، وہ حقیقت میں بادشاہ نہیں بن گیا ہے بلکہ صرف بادشاہی کا ڈراما کر رہا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اس کا یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور اسی بے سرو سامانی کے ساتھ وہ تختِ شاہی سے رخصت ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ اسی طرح زندگی کی کوئی شکل بھی یہاں مستقل اور پائدار نہیں ہے۔ جو جس حال میں بھی ہے، عارضی طور پر ایک محدود مدت کے لیے ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی کامرانیوں پر جو لوگ مرے مٹتے ہیں اور انھی کے لیے ضمیر و ایمان کی بازی لگا کر کچھ عیش و عشرت کا سامان اور کچھ شوکت و حشمت کے ٹھاٹ فراہم کر لیتے ہیں، ان کی یہ ساری حرکتیں دل کے بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اِن کھلونوں سے اگر وہ دس بیس یا ساٹھ ستر سال دل بہلا لیں اور پھر موت کے دروازے سے خالی ہاتھ گزر کر اُس عالم میں پہنچیں جہاں کی دائمی و ابدی زندگی میں ان کا یہی کھیل بلائے بے درماں ثابت ہو، تو آخر اِس طفل تسلی کا فائدہ کیا ہے؟

وقف لازم

الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ٚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

دارِ آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔[۱۰۳] جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس سے دُعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ اِنھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں، تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفرانِ نعمت کریں اور (حیاتِ دنیا کے) مزے لُوٹیں۔[۱۰۴] اچھا، عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنا دیا ہے، حالانکہ اِن کے گرد و پیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں؟[۱۰۵] کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر

۱۰۳- یعنی اگر یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے کہ دنیا کی موجودہ زندگی صرف ایک مہلتِ امتحان ہے، اور انسان کے لیے اصل زندگی، جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، آخرت کی زندگی ہے، تو وہ یہاں امتحان کی مدت کو اِس لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے اس کا ایک ایک لمحہ اُن کاموں میں استعمال کرتے جو اُس اَبدی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔

۱۰۴- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ اَنعام، حاشیہ ۲۹ و ۴۱، سورۂ یُونس، حاشیہ ۲۹ و ۳۱، سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۴۔

۱۰۵- یعنی کیا اِن کے شہر مکہ کو، جس کے دامن میں انھیں کمال درجے کا امن میسّر ہے، کسی لات یا ہُبُل نے حرم بنایا ہے؟ کیا کسی دیوی یا دیوتا کی یہ قدرت تھی کہ ڈھائی ہزار سال سے عرب کی انتہائی بدامنی کے ماحول میں اس جگہ کو تمام فتنوں اور فسادوں سے محفوظ رکھتا؟ اس کی حرمت کو برقرار رکھنے والے ہم نہ تھے تو اور کون تھا؟

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع

ع ۷ ۲

جھُوٹ باندھے یا حق کو جھُٹلائے، جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو؟[۱۰۶] کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنّم ہی نہیں ہے؟ جو لوگ ہماری خاطر مُجاہَدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے،[۱۰۷] اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔ ع

۱۰۶- یعنی نبی نے دعوائے رسالت کیا ہے اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ اگر نبی نے اللہ کا نام لے کر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اُس سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر تم نے سچّے نبی کی تکذیب کی ہے تو پھر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

۱۰۷- ''مُجاہَدہ'' کی تشریح اسی سورۂ عنکبوت کے حاشیہ ۸ میں گزر چکی ہے۔ وہاں یہ فرمایا گیا تھا کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا، وہ اپنی ہی بھلائی کے لیے کرے گا۔ (آیت ۶) یہاں یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دنیا بھر سے کش مکش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لیے کھول دیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر انھیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر ہر موڑ پر انھیں روشنی دکھاتا ہے کہ راہِ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں۔ جتنی نیک نیتی اور خیر طلبی ان میں ہوتی ہے، اتنی ہی اللہ کی مدد اور توفیق اور ہدایت بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔

# تفہیم القرآن

# الروم

(۳۰)

# الروم

**نام** پہلی ہی آیت کے لفظ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ سے ماخوذ ہے۔

**زمانۂ نُزُول** آغاز ہی میں جس تاریخی واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے زمانۂ نزول قطعی طور پر متعین ہوجاتا ہے۔ اس میں ارشاد ہُوا ہے کہ ’’ قریب کی سرزمین میں رُومی مغلوب ہو گئے ہیں۔‘‘ اُس زمانے میں عرب سے متصل رومی مقبوضات اُردُن، شام اور فلسطین تھے اور ان علاقوں میں رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ء میں مکمل ہُوا تھا۔ اس لیے پوری صحّت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورت اُسی سال نازل ہوئی تھی، اور یہ وہی سال تھا جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔

**تاریخی پسِ منظر** جو پیشین گوئی اس سورہ کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے، وہ قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو اِن آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Mauric) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِ عام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعے سے ایران کے بادشاہ خُسرَو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اَخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہُوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہُوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلَب اور اَنطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اَعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقا کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہِرَقل (Heraclius) کو

ایک طاقت ور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہِرَقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے مارِیس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے، اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خُسرَو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عَزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نَسطوری اور یعقوبی وغیرہ)، ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتّٰی کہ خُسرَو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہِرَقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ اَنطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دِمَشق فتح ہُوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المَقدِس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیحؑ نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انھوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خُسرَو پرویز پر چڑھا تھا، اس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المَقدِس سے ہِرَقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

”سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام رُوئے زمین کے مالک خُسرَو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بےشُعور بندے ہِرَقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسا ہے۔ کیوں نہ تیرے ربّ نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟“

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردُن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا

کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکّۂ معظّمہ میں ایک اوراس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیّت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے عَلَم بردار سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھربار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو رُوم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ رُوم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو، ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمھیں اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآنِ مجید کی یہ سورت نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ ”قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔“ اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں: ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اُسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مُٹھی بھر مسلمان تھے جو مکّے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف رُوم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابُلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورَس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انھوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خِلقِدون (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خُسرَو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ”اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔“ آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage، موجودہ تیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض، انگریز مؤرخ گِبّن کے بقول، قرآنِ مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک

حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار، اس وقت تو کسی کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی[1]۔

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفّارِ مکّہ نے ان کا خوب مذاق اُڑایا اور اُبَیّ بن خَلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بَدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اُونٹ میں دوں گا ورنہ دس اُونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہُوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اُونٹوں کی تعداد بڑھا کر سَو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سَو اُونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں اِدھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینۂ طیّبہ تشریف لے گئے اور اُدھر قیصر ہِرَقْل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اَسْوَد کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہُوا جہاں اُس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیا مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسْقُفِ اعظم سرجیس (Sergius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہِرَقْل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گُھس کر زَرتُشت کے مقامِ پیدائش اُرمیاہ (Clorumia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بَدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدّت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوا کی فیصلہ کُن لڑائی (۶۲۷ء) میں انھوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دَسْت گرد (دَسْکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہِرَقْل کے لشکر عین طیسفون (Ctesiphon)

---

1 Gibbon, Decline and Fall of the Roman Empire, Vol. II, p. 788, Modern Library, New York.

کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دار السلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خُسرَو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رُونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلحِ حُدَیبِیَہ واقع ہوئی، جسے قرآن ''فتحِ عظیم'' کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خُسرَو کے بیٹے قُباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر ''مقدّس صلیب'' کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المَقدِس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عُمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکّہ معظّمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہے کی گنجایش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچّی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَیّ بن خَلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اُونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انھیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انھیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جُوئے کی حُرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آ چکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

## موضوع اور مضمون

اس سورہ میں کلام کا آغاز اس بات سے کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور ساری دُنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ قریب ہے، مگر چند سال نہ گزرنے پائیں گے کہ پانسا پلٹ جائے گا اور جو مغلوب ہے وہ غالب ہو جائے گا۔

اس تمہید سے یہ مضمون نکل آیا کہ انسان اپنی سطح بینی کی وجہ سے وہی کچھ دیکھتا ہے جو بظاہر اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر اس ظاہر کے پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر بینی جب دُنیا کے ذرا ذرا سے معاملات میں غلط فہمیوں اور غلط اندازوں کی موجب ہوتی ہے، اور جب کہ محض اتنی سی بات نہ جاننے کی وجہ سے کہ ''کل کیا ہونے والا ہے'' آدمی غلط تخمینے لگا بیٹھتا ہے، تو پھر بحیثیتِ مجموعی پوری زندگی کے معاملے میں ظاہر حیاتِ دُنیا پر اعتماد کر بیٹھنا اور اسی کی بنیاد پر اپنے پورے سرمایۂ حیات کو داؤں پر لگا دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

اِس طرح روم و ایران کے معاملے سے تقریر کا رُخ آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل تین رُکوعوں تک طریقے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ

آخرت ممکن بھی ہے، معقول بھی ہے، اس کی ضرورت بھی ہے، اور انسانی زندگی کے نظام کو دُرست رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ آدمی آخرت کا یقین رکھ کر اپنی موجودہ زندگی کا پروگرام اختیار کرے، ورنہ وہی غَلَطی واقع ہوگی جو ظاہر پر اعتماد کر لینے سے واقع ہُوا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں آخرت پر اِستِدلال کرتے ہوئے کائنات کے جن آثار کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے، وہ بعینہٖ وہی آثار ہیں جو توحید پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے چوتھے رکوع کے آغاز سے تقریر کا رُخ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کے لیے فطری دین اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ بالکل یکسو ہو کر خدائے واحد کی بندگی کرے۔ شرک فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان کے خلاف ہے، اسی لیے جہاں بھی انسان نے اس گمراہی کو اختیار کیا ہے وہاں فساد رُونما ہُوا ہے۔ اس موقع پر پھر اُس فسادِ عظیم کی طرف، جو اُس وقت دُنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ کی بدولت برپا تھا، اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ فساد بھی شرک کے نتائج میں سے ہے اور پچھلی انسانی تاریخ میں بھی جتنی قومیں مبتلائے فساد ہوئی ہیں، وہ سب بھی مشرک ہی تھیں۔

خاتمۂ کلام پر تمثیل کے پیرایے میں لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مُردہ پڑی ہوئی زمین خدا کی بھیجی ہوئی بارش سے یکایک جی اُٹھتی ہے اور زندگی و بہار کے خزانے اُگلنے شروع کر دیتی ہے، اسی طرح خدا کی بھیجی ہوئی وحی و نبوت بھی مُردہ پڑی ہوئی انسانیت کے حق میں ایک بارانِ رحمت ہے، جس کا نُزول اس کے لیے زندگی اور نَشْوونَما اور خیر و فلاح کا موجب ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤ گے تو یہی عرب کی سُونی زمین رحمتِ الٰہی سے لہلہا اُٹھے گی اور ساری بھلائی تمھارے اپنے لیے ہی ہوگی۔ اس سے فائدہ نہ اُٹھاؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، پھر پچھتانے کا کچھ حاصل نہ ہوگا اور تلافی کا کوئی موقع تمھیں میسّر نہ آئے گا۔

---

۶ رکوعاتها ۶۰ آیاتها

سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۞۱ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞۲ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞۳ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ

ا۔ل۔م۔ رُومی قریب کی سرزمین میں مغلُوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔[1] اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور

۱ – ابنِ عباسؓ اور دوسرے صحابہؓ وتابعینؒ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم وایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفارِ مکّہ کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیت اور مسیحیت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ بیت المَقدِس کی فتح کے بعد خُسرو پرویز نے جو خط قیصرِ روم کو لکھا تھا، اس میں صاف طور پر وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اُصولی اعتبار سے مجوسیوں کا مذہب مشرکینِ مکّہ کے مذہب سے مِلتا جُلتا تھا، کیونکہ وہ بھی توحید کے منکر تھے، دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے مشرکین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے مقابلے میں مسیحی خواہ کتنے ہی مبتلائے شرک ہو گئے ہوں، مگر وہ خدا کی توحید کو اصلِ دین مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، اور وحی و رسالت کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا دین اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین سے مشابہت رکھتا تھا، اور اسی لیے مسلمان قدرتی طور پر ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان پر مشرک قوم کا غلبہ انھیں ناگوار تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی آمد سے پہلے جو لوگ سابق نبی کو مانتے ہوں، وہ اُصولاً مسلمان ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک بعد کے آنے والے نبی کی دعوت انھیں نہ پہنچے اور وہ اس کا انکار نہ کر دیں، ان کا شمار مسلمانوں ہی میں رہتا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ قصص، حاشیہ ۷۳) اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت پر صرف پانچ چھ برس ہی گزرے تھے، اور حضورؐ کی دعوت ابھی تک باہر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مسلمان عیسائیوں کا شمار کافروں میں نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہودی ان کی نگاہ میں کافر تھے، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر چکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آغازِ اسلام میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہی کا برتاؤ ہُوا تھا، جیسا کہ سورۂ قصص، آیات ۵۲ تا ۵۵ اور سورۂ مائدہ، آیات ۸۲ تا ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ کھلے دل سے

بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۵﴾ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَ هُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۷﴾ اَوَ لَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۟ قف مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ

---

بعد میں بھی[2]۔ اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے[3]۔ اللہ نُصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

لوگ دُنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں[4]۔ کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا[5]؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں، برحق اور ایک مقرّر مدّت ہی کے لیے

---

دعوتِ حق کو قبول کر رہے تھے۔ پھر ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جس طرح حبش کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی واپسی کے لیے کفارِ مکّہ کے مطالبے کو ٹھکرا دیا، اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ مسلمان مجوسیوں کے مقابلے میں عیسائیوں کے خیر خواہ ہوں۔

۲ – یعنی پہلے جب ایرانی غالب آئے تو اس بنا پر نہیں کہ معاذ اللہ! خداوندِ عالَم ان کے مقابلے میں شکست کھا گیا، اور بعد میں جب رومی فتحیاب ہوں گے تو اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا کھویا ہُوا ملک مل جائے گا۔ فرمانروائی تو ہر حال میں اللہ ہی کی ہے۔ پہلے جسے فتح نصیب ہوئی اسے بھی اللہ ہی نے فتح دی، اور بعد میں جو فتح پائے گا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے پائے گا۔ اس کی خدائی میں کوئی اپنے زور سے غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ جسے وہ اُٹھاتا ہے وہی اُٹھتا ہے، اور جسے وہ گراتا ہے وہی گرتا ہے۔

۳ – ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، سفیان ثوریؒ، سُدّیؒ وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی فتح اور جنگِ بدر میں مشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا، اس لیے مسلمانوں کو دُہری خوشی حاصل ہوئی۔

یہی بات ایران اور روم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ ۶۲۴ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگِ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصرِ روم نے زَرتُشت کا مَولِد تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدے کو مسمار کر دیا۔

۴- یعنی اگرچہ آخرت پر دلالت کرنے والے آثار و شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس سے غفلت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن یہ لوگ اس سے خود ہی غفلت برت رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے کہ دنیوی زندگی کے اس ظاہری پردے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے ہیں اور اس کے پیچھے جو کچھ آنے والا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں، ورنہ خدا کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔

۵- یہ آخرت پر بجائے خود ایک مستقل اِستِدلال ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اگر یہ لوگ باہر کسی طرف نگاہ دَوڑانے سے پہلے خود اپنے وجود پر غور کرتے تو انھیں اپنے اندر ہی وہ دلائل مل جاتے جو موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کی ضرورت ثابت کرتے ہیں۔ انسان کی تین امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو زمین کی دوسری موجودات سے مُمیّز کرتی ہیں:

ایک یہ کہ زمین اور اس کے ماحول کی بے شمار چیزیں اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور ان پر تصرف کے وسیع اختیارات اس کو بخش دیے گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اِسے اپنی راہِ زندگی کے انتخاب میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایمان اور کفر، طاعت اور مَعصِیَت، نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر بھی جانا چاہے جا سکتا ہے۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط، جس طریقے کو بھی اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ہر راستے پر چلنے کے لیے اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور اس پر چلنے میں وہ خدا کے فراہم کردہ ذرائع استعمال کر سکتا ہے، خواہ وہ خدا کی اطاعت کا راستہ ہو یا اس کی نافرمانی کا راستہ۔

تیسرے یہ کہ اس میں پیدائشی طور پر اَخلاق کی حِس رکھ دی گئی ہے جس کی بنا پر وہ اختیاری اعمال اور غیر اختیاری اعمال میں فرق کرتا ہے، اختیاری اعمال پر نیکی اور بدی کا حکم لگاتا ہے، اور بداہتاً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اچھا عمل جزا کا اور بُرا عمل سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔

یہ تینوں خصوصیتیں، جو انسان کے اپنے وجود میں پائی جاتی ہیں، اِس بات کی نشان دِہی کرتی ہیں کہ کوئی وقت ایسا ہونا چاہیے جب انسان سے محاسبہ کیا جائے۔ جب اس سے پوچھا جائے کہ جو کچھ دنیا میں اس کو دیا گیا تھا، اس پر تَصَرُّف کے اختیارات کو اس نے کس طرح استعمال کیا؟ جب یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آزادیِ انتخاب کو استعمال کر کے صحیح راستہ اختیار کیا یا غلط؟ جب اس کے اختیاری اعمال کی جانچ کی جائے اور نیک عمل پر جزا اور بُرے عمل پر سزا دی جائے۔ یہ وقت لامحالہ انسان کا کارنامۂ زندگی ختم اور اس کا دفترِ عمل بند ہونے کے بعد ہی آ سکتا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ اور یہ وقت لازماً اسی وقت آنا چاہیے جب کہ ایک فرد یا ایک قوم کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا دفترِ عمل بند ہو۔ کیونکہ ایک فرد یا ایک قوم کے مر جانے پر اُن اثرات کا سلسلہ ختم

وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾

پیدا کیا ہے۔[۶] مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔[۷]

نہیں ہو جاتا جو اس نے اپنے اعمال کی بدولت دنیا میں چھوڑے ہیں۔ اُس کے چھوڑے ہوئے اچھے یا بُرے اثرات بھی تو اس کے حساب میں شمار ہونے چاہییں۔ یہ اثرات جب تک مکمل طور پر ظاہر نہ ہولیں، انصاف کے مطابق پورا محاسبہ کرنا اور پوری جزا یا سزا دینا کیسے ممکن ہے؟ اس طرح انسان کا اپنا وجود اس بات کی شہادت دیتا ہے، اور زمین میں انسان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ آپ سے آپ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ایسی ہو جس میں عدالت قائم ہو، انصاف کے ساتھ انسان کے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اور ہر شخص کو اس کے کام کے لحاظ سے جزا دی جائے۔

۶ – اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنیٰ ہوں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے، جس کا ایک ایک ذرّہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے، جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدّن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم وفنون خود اس بات پر گواہ ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے۔ ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر ایک پُتلے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدّن کا تصوّر تک نہ کیا جاسکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمھاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اِس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجے کی ذہنی وجسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادیِ انتخاب دے کر، اَخلاق کی حِس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمھارے حوالے کیا ہے، اس نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر وتخریب، اور نیکی و بدی، اور ظلم وعدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمھارے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیا پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمھارے مرتے ہی یہ سارا دفترِ عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا بُرد کر دیا جائے گا؟

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ

اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِنھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟[8] وہ اِن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، اُنھوں نے زمین کو خوب اُدھیڑا تھا

کسی چیز کے لیے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انھیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنس دانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو اَزَلی و اَبَدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالَم کے حدوث و قِدَم کی اُس بحث میں، جو ایک مدّتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادّہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیُّل پر تھا کہ مادّہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیُّر کے بعد مادّہ مادّہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالَمِ مادّی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (atomic energy) کے انکشاف نے اس پورے تخیُّل کی بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادّہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہَیُولا۔ اب حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo-Dynamics) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالَمِ مادّی نہ اَزَلی ہو سکتا ہے نہ اَبَدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اُٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟

۷ – یعنی اس بات کے منکر کہ انھیں مرنے کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

۸ – یہ آخرت کے حق میں تاریخی اِستدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار دنیا میں دو چار آدمیوں ہی نے تو نہیں کیا ہے۔ انسانی تاریخ کے دوران میں کثیر التعداد انسان اس مرض میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ پوری پوری قومیں ایسی گزری ہیں جنھوں نے یا تو اس کا انکار کیا ہے، یا اس سے غافل ہو کر رہی ہیں، یا حیات بعد الموت کے متعلّق ایسے غلط عقیدے ایجاد کر لیے ہیں جن سے آخرت کا عقیدہ بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔

وَ عَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ؕ﴿۹﴾

تھا اور اُسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انھوں نے نہیں کیا ہے۔[10] اُن کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔[11] پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کر رہے تھے۔[12]

پھر تاریخ کا مسلسل تجرِبہ یہ بتاتا ہے کہ انکارِ آخرت جس صورت میں بھی کیا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اَخلاق بگڑے، وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر شُترِ بے مہار بن گئے، انھوں نے ظلم و فساد اور فِسق و فُجور کی حد کر دی، اور اسی چیز کی بدولت قوموں پر قومیں تباہ ہوتی چلی گئیں۔ کیا ہزاروں سال کی تاریخ کا یہ تجرِبہ، جو پے در پے انسانی نسلوں کو پیش آتا رہا ہے، یہ ثابت نہیں کرتا کہ آخرت ایک حقیقت ہے جس کا انکار انسان کے لیے تباہ کُن ہے؟ انسان کششِ ثِقل کا اسی لیے تو قائل ہوا ہے کہ تجرِبے اور مُشاہَدے سے اس نے مادّی اشیا کو ہمیشہ زمین کی طرف گرتے دیکھا ہے۔ انسان نے زہر کو زہر اسی لیے تو مانا ہے کہ جس نے بھی زہر کھایا وہ ہلاک ہوا۔ اسی طرح جب آخرت کا انکار ہمیشہ انسان کے لیے اَخلاقی بگاڑ کا موجب ثابت ہوا ہے تو کیا یہ تجرِبہ یہ سبق دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ آخرت ایک حقیقت ہے اور اس کو نظرانداز کر کے دنیا میں زندگی بسر کرنا غلط ہے؟

۹- اصل میں لفظ اَثَارُوا الْاَرْضَ استعمال ہوا ہے۔ اس کا اطلاق زراعت کے لیے ہل چلانے پر بھی ہوسکتا ہے اور زمین کھود کر زیرِ زمین پانی، نہریں، کاریزیں اور معدنیات وغیرہ نکالنے پر بھی۔

۱۰- اس میں اُن لوگوں کے اِستِدلال کا جواب موجود ہے جو محض مادّی ترقی کو کسی قوم کے صالح ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے زمین کے ذرائع کو اتنے بڑے پیمانے پر استعمال (exploit) کیا ہے، جنھوں نے دنیا میں عظیم الشان تعمیری کام کیے ہیں اور ایک شان دار تمدّن کو جنم دیا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنّم کا ایندھن بنا دے۔ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ ''تعمیری کام'' پہلے بھی بہت سی قوموں نے بڑے پیمانے پر کیے ہیں، پھر کیا تمھاری آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ قومیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدّن سمیت پیوندِ خاک ہو گئیں اور ان کی ''تعمیر'' کا قصرِ فلک بوس زمین پر آ رہا؟ جس خدا کے قانون نے یہاں عقیدۂ حق اور اَخلاقِ صالحہ کے بغیر محض مادّی تعمیر کی یہ قدر کی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اسی خدا کا قانون دوسرے جہان میں انھیں واصلِ جہنّم نہ کرے؟

۱۱- یعنی ایسی نشانیاں لے کر آئے جو ان کے نبیِ صادق ہونے کا یقین دلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس سیاق وسباق میں انبیاؑ کی آمد کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف انسان کے اپنے وجود میں، اور اس سے باہر ساری کائنات کے نظام میں، اور انسانی تاریخ کے مسلسل تجرِبے میں آخرت کی شہادتیں موجود تھیں، اور دوسری

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗاٰۗى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۱۲

ع

آخر کار جن لوگوں نے بُرائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت بُرا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ع

اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اِعادہ کرے گا[13]، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔ اور جب وہ ساعت[14] برپا ہوگی اس دن مجرم ہَک دَک رہ جائیں گے[15]،

طرف پے درپے ایسے انبیاؑ بھی آئے جن کے ساتھ ان کی نبوت کے برحق ہونے کی کھلی کھلی علامتیں پائی جاتی تھیں، اور انھوں نے انسانوں کو خبردار کیا کہ فی الواقع آخرت آنے والی ہے۔

۱۲ – یعنی اس کے بعد جو تباہی ان قوموں پر آئی وہ ان پر خدا کا ظلم نہ تھا بلکہ وہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انھوں نے اپنے اُوپر کیا۔ جو شخص یا گروہ نہ خود صحیح سوچے اور نہ کسی سمجھانے والے کے سمجھانے سے صحیح رَوِیّہ اختیار کرے، اس پر اگر تباہی آتی ہے تو وہ آپ ہی اپنے بُرے انجام کا ذمہ دار ہے۔ خدا پر اس کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ خدا نے تو اپنی کتابوں اور اپنے انبیاؑ کے ذریعے سے انسان کو حقیقت کا علم دینے کا انتظام بھی کیا ہے، اور وہ علمی و عقلی وسائل بھی عطا کیے ہیں جن سے کام لے کر وہ ہر وقت انبیاؑ اور کُتُبِ آسمانی کے دیے ہوئے علم کی صحت جانچ سکتا ہے۔ اِس رہنمائی اور ان ذرائع سے اگر خدا نے انسان کو محروم رکھا ہوتا اور اس حالت میں انسان کو غلط روی کے نتائج سے دوچار ہونا پڑتا تب بلاشبہ خدا پر ظلم کے الزام کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

۱۳ – یہ بات اگرچہ دعوے کے انداز میں بیان فرمائی گئی ہے مگر اس میں خود دلیلِ دعویٰ بھی موجود ہے۔ صریح عقل اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ جس کے لیے خلق کی ابتدا کرنا ممکن ہو، اس کے لیے اسی خلق کا اعادہ کرنا بدرجۂ اَولیٰ ممکن ہے۔ خلق کی ابتدا تو ایک امرِ واقعہ ہے جو سب کے سامنے موجود ہے، اور کفار و مشرکین بھی مانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے۔ اس کے بعد ان کا یہ خیال کرنا سراسر نامعقول بات ہے کہ وہی خدا جس نے اس خلق کی ابتدا کی ہے، اس کا اعادہ نہیں کر سکتا۔

۱۴ – یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے اور اس کے حُضور پیش ہونے کی ساعت۔

۱۵ – اصل میں لفظ اِبْلَاس استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: سخت مایوسی اور صدمے کی بنا پر

وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّهُمۡ مِّنۡ شُرَکَآئِهِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَ کَانُوۡا بِشُرَکَآئِهِمۡ

ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ان کا سِفارشی نہ ہوگا [16] اور وہ اپنے شریکوں کے

کسی شخص کا گُم سُم ہو جانا، اُمید کے سارے راستے بند پا کر حیران و ششدر رہ جانا، کوئی حجت نہ پا کر دم بخود رہ جانا۔ یہ لفظ جب مجرم کے لیے استعمال کیا جائے تو ذہن کے سامنے اس کی یہ تصویر آتی ہے کہ ایک شخص عین حالتِ جُرم میں بھرے ہاتھوں (red-handed) پکڑا گیا ہے، نہ فرار کی کوئی راہ پاتا ہے، نہ اپنی صفائی میں کوئی چیز پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتا ہے، اس لیے زبان اس کی بند ہے اور وہ انتہائی مایوسی و دل شکستگی کی حالت میں حیران و پریشان کھڑا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں مجرمین سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے دنیا میں قتل، چوری، ڈاکے اور اسی طرح کے دوسرے جرائم کیے ہیں، بلکہ وہ سب لوگ مراد ہیں جنھوں نے خدا سے بغاوت کی ہے، اس کے رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، آخرت کی جواب دِہی کے منکر یا اس سے بے فکر رہے ہیں، اور دنیا میں خدا کے بجائے دوسروں کی یا اپنے نفس کی بندگی کرتے رہے ہیں، خواہ اس بنیادی گمراہی کے ساتھ انھوں نے وہ افعال کیے ہوں یا نہ کیے ہوں جنھیں عرفِ عام میں جرائم کہا جاتا ہے۔ مزید برآں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے خدا کو مان کر، اس کے رسولوں پر ایمان لا کر، آخرت کا اقرار کر کے پھر دانستہ اپنے رب کی نافرمانیاں کی ہیں اور آخر وقت تک اپنی اس باغیانہ رَوِش پر ڈٹے رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی توقعات کے بالکل خلاف عالَمِ آخرت میں یکایک جی اُٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ یہاں تو واقعی وہ دُوسری زندگی پیش آ گئی ہے جس کا انکار کر کے، یا جسے نظر انداز کر کے وہ دنیا میں کام کرتے رہے تھے، تو ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے اور وہ کیفیت ان پر طاری ہوگی جس کا نقشہ یُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

۱۶ – شُرکا کا اطلاق تین قسم کی ہستیوں پر ہوتا ہے: ایک ملائکہ، انبیاؑ، اولیا، اور شہدا و صالحین جن کو مختلف زمانوں میں مشرکین نے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے کر ان کے آگے مراسمِ عبودیت انجام دیے ہیں۔ وہ قیامت کے روز صاف کہہ دیں گے کہ تم یہ سب کچھ ہماری مرضی کے بغیر، بلکہ ہماری تعلیم و ہدایت کے سراسر خلاف کرتے رہے ہو، اس لیے ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں، ہم سے کوئی اُمید نہ رکھو کہ ہم تمھاری شَفاعت کے لیے خدائے بزرگ کے سامنے کچھ عرض معروض کریں گے۔ دوسری قسم اُن اشیا کی ہے جو بے شعور یا بے جان ہیں، جیسے چاند، سورج، سیّارے، درخت، پتھر اور حیوانات وغیرہ۔ مشرکین نے ان کو خدا بنایا اور ان کی پرستش کی اور ان سے دعائیں مانگیں، مگر وہ بے چارے بے خبر ہیں کہ اللہ میاں کے خلیفہ صاحب یہ ساری نیاز مندیاں ان کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بھی کوئی وہاں ان کی شفاعت کے لیے آگے بڑھنے والا نہ ہوگا۔ تیسری قسم اُن اکابر مجرمین کی ہے جنھوں نے خود کوشش کر کے، مکر و فریب سے کام لے کر، جھوٹ کے جال پھیلا کر، یا

كٰفِرِيْنَ ﴿١٣﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿١٥﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ

منکر ہو جائیں گے۔[۱۷] جس روز وہ ساعت برپا ہوگی، اس دن (سب انسان) الگ الگ گروہوں میں بٹ جائیں[۱۸] گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ ایک باغ میں[۱۹] شاداں وفرحاں رکھے جائیں گے۔[۲۰] اور جنھوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے[۲۱] وہ عذاب میں حاضر

---

طاقت استعمال کر کے دنیا میں خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائی، مثلاً شیطان، جھوٹے مذہبی پیشوا، اور ظالم و جابر حکمراں وغیرہ۔ یہ وہاں خود گرفتارِ بلا ہوں گے، اپنے اِن بندوں کی سِفارش کے لیے آگے بڑھنا تو درکنار، اُن کی تو اُلٹی کوشش یہ ہوگی کہ اپنے نامۂ اعمال کا بوجھ ہلکا کریں اور داورِ محشر کے حضور یہ ثابت کر دیں کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے خود ذمہ دار ہیں، ان کی گمراہی کا وبال ہم پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس طرح مشرکین کو وہاں کسی طرف سے بھی کوئی شفاعت بہم نہ پہنچے گی۔

۱۷- یعنی اُس وقت یہ مشرکین خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ ہم ان کو خدا کا شریک ٹھیرانے میں غَلَطی پر تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ فی الواقع ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اس لیے جس شرک پر آج وہ دنیا میں اصرار کر رہے ہیں، اسی کا وہ آخرت میں انکار کریں گے۔

۱۸- یعنی دنیا کی وہ تمام جتھ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ وبرادری، اور مَعاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اَخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریّات و عقائد رکھنے والے، اور ایک ایک قسم کے جرائم پیشہ لوگ اس عظیم الشان انسانی بِھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اِس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔

اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ اور اَخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک اُمّت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں، اور کفر وفسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری اُمّت ہیں، خواہ ان کا تعلّق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیّت ایک نہیں ہوسکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہوسکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک ان کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جاہلیّت کے پرستار اس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسی بات پر مُصِر ہیں کہ جتھ بندی نسل اور وطن اور زبان کی بنیادوں پر ہونی چاہیے، ان بنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں، انھیں بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اس قومیّت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیُّل ابوجہل اور ابولہب اور سردارانِ قریش کا تھا، جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اِس شخص نے آ کر ہماری قوم میں تَفرِقَہ ڈال دیا ہے۔ اسی پر قرآن مجید یہاں مُتنَبِّہ کر رہا ہے کہ تمھاری یہ تمام جتھ بندیاں جو تم نے اس دنیا میں غلط بنیادوں پر کر رکھی ہیں، آخر کار ٹوٹ جانے والی ہیں، اور نوعِ انسانی میں مستقل تفریق اُسی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اَخلاق و کردار کی بنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دنیا کی اِس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے، ان کی راہِ زندگی آخر کیسے ایک ہوسکتی ہے؟

۱۹ – ”ایک باغ“ کا لفظ یہاں اُس باغ کی عظمت وشان کا تصوّر دلانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان کی طرح اُردو میں بھی یہ اندازِ بیان اس غرض کے لیے معروف ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی کو ایک بڑا اہم کام کرنے کو کہے اور اس کے ساتھ یہ کہے کہ تم نے یہ کام اگر کر دیا تو میں تمھیں ”ایک چیز“ دوں گا، تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ چیز عدد کے لحاظ سے ایک ہوگی، بلکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے انعام میں تم کو ایک بڑی قیمتی چیز دوں گا جسے پا کر تم نہال ہو جاؤ گے۔

۲۰ – اصل میں لفظ یُحۡبَرُوۡنَ استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں مَسَرَّت، لذّت، شان وشوکت اور تکریم کے تصوُّرات شامل ہیں۔ یعنی وہاں بڑی عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے، خوش وخرم رہیں گے اور ہر طرح کی لذّتوں سے شاد کام ہوں گے۔

۲۱ – یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایمان کے ساتھ تو عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں وہ شان دار انجام نصیب ہوگا، لیکن کفر کا انجام بد بیان کرتے ہوئے عملِ بد کا کوئی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفر بجائے خود آدمی کے انجام کو خراب کر دینے کے لیے کافی ہے، خواہ عمل کی خرابی اس کے ساتھ شامل ہو یا نہ ہو۔

مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

رکھے جائیں گے۔

پس[22] تسبیح کرو اللہ کی جب[23] کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیے حمد ہے۔ اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جب کہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔[24]

۲۲ – یہ "پس" اس معنیٰ میں ہے کہ جب تمھیں یہ معلوم ہوگیا کہ ایمان وعمل صالح کا انجام وہ کچھ، اور کفرو تکذیب کا انجام یہ کچھ ہے تو تمھیں یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ نیز یہ "پس" اس معنیٰ میں بھی ہے کہ مشرکین و کفار حیاتِ اُخروی کو ناممکن قرار دے کر اللہ تعالیٰ کو دراصل عاجز و درماندہ قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کے مقابلے میں اللہ کی تسبیح کرو اور اِس کمزوری سے اُس کے پاک ہونے کا اعلان کرو۔ اس ارشاد کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے تمام اہلِ ایمان ہیں۔

۲۳ – اللہ کی تسبیح کرنے سے مراد اُن تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے، جو مشرکین اپنے شرک اور انکارِ آخرت سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس ذاتِ بے ہمتا کے پاک اور مُنزَّہ ہونے کا اعلان و اظہار کرنا ہے۔ اِس اعلان و اظہار کی بہترین صورت نماز ہے۔ اِسی بنا پر ابنِ عباسؓ، مجاہد، قَتادَہ، ابنِ زید اور دوسرے مفسّرین کہتے ہیں کہ یہاں تسبیح کرنے سے مراد نماز پڑھنا ہے۔ اس تفسیر کے حق میں یہ صریح قرینہ خود اس آیت میں موجود ہے کہ اللہ کی پاکی بیان کرنے کے لیے اِس میں چند خاص اوقات مقرر کیے گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر محض یہ عقیدہ رکھنا مقصود ہو کہ اللہ تمام عُیوب و نقائص سے مُنزَّہ ہے، تو اس کے لیے صبح و شام اور ظہر و عصر کے اوقات کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عقیدہ تو مسلمان کو ہر وقت رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر محض زبان سے اللہ کی پاکی کا اظہار مقصود ہو، تب بھی اِن اوقات کی تخصیص کے کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ یہ اظہار تو مسلمان کو ہر موقع پر کرنا چاہیے۔ اس لیے اوقات کی پابندی کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم لامحالہ اُس کی ایک خاص عملی صورت ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ عملی صورت نماز کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

۲۴ – اس آیت میں نماز کے چار اوقات کی طرف صاف اشارہ ہے: فجر، مغرب، عصر اور ظہر۔ اس کے علاوہ مزید اشارات جو قرآنِ مجید میں اوقاتِ نماز کی طرف کیے گئے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (بنی اسرائیل، آیت ۷۸) — نماز قائم کرو آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کی تاریکی تک، اور فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا اہتمام کرو۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ (ہود، آیت ۱۱۴)

اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ، آیت ۱۳۰)

اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے، اور رات کی کچھ گھڑیوں میں پھر تسبیح کرو، اور دن کے کناروں پر۔

ان میں سے پہلی آیت بتاتی ہے کہ نماز کے اوقات زوالِ آفتاب کے بعد سے عشا تک ہیں، اور اس کے بعد پھر فجر کا وقت ہے۔ دوسری آیت میں دن کے دونوں سروں سے مراد صبح اور مغرب کے اوقات ہیں، اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشا کا وقت۔ تیسری آیت میں قبلِ طُلوعِ آفتاب سے مراد فجر، اور قبلِ غروب سے مراد عصر ہے۔ رات کی گھڑیوں میں مغرب اور عشا دونوں شامل ہیں۔ اور دن کے کنارے تین ہیں: ایک صبح، دوسرے زوالِ آفتاب، تیسرے مغرب۔ اس طرح قرآنِ مجید مختلف مقامات پر نماز کے اُن پانچوں اوقات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر آج دنیا بھر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض اِن آیات کو پڑھ کر کوئی شخص بھی اوقاتِ نماز متعین نہ کر سکتا تھا جب تک کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلّمِ قرآن، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے قول اور عمل سے ان کی طرف رہنمائی نہ فرماتے۔

یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھیر کر منکرینِ حدیث کی اِس جسارت پر غور کیجیے کہ وہ ''نماز پڑھنے'' کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں، یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ ''نظامِ رُبوبیّت'' قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کون سا نرالا نظامِ رُبوبیّت ہے جسے یا تو طلوعِ آفتاب سے پہلے قائم کیا جا سکتا ہے یا پھر زوالِ آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کون سا نظامِ رُبوبیّت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ)۔ اور نظامِ رُبوبیّت کی آخر وہ کون سی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ، اور کہنیوں تک ہاتھ، اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لے، اور سر پر مسح کر لے، ورنہ وہ اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَیۡدِیَكُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ)۔ اور نظامِ رُبوبیّت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جَنابَت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کر لے، اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ ...... وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا)۔ اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ رُبوبیّت کو قائم کرنے کے لیے اسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منہ پر ملنا ہوگا؟ (اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَیۡدِیۡكُمۡ مِّنۡهُ)۔ اور یہ کیسا عجیب نظامِ رُبوبیّت ہے کہ اگر سفر پیش آ جائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

وہ زندہ میں سے مُردے کو نکالتا ہے اور مُردے میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔[۲۵] اسی طرح تم لوگ بھی (حالتِ موت سے) نکال لیے جاؤ گے ع

اُس[۲۶] کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بَشَر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جارہے ہو۔[۲۷]

---

کے بجائے آدھا ہی قائم کرلے؟ (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ)۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے "نظامِ رُبوبیّت" قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں، اس کے بعد جب پہلا گروہ امام کے پیچھے "نظامِ رُبوبیت" قائم کرتے ہوئے ایک سجدہ کرلے تو وہ اُٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جائے، اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آکر امام کے پیچھے اس "نظامِ رُبوبیّت" کو قائم کرنا شروع کردے۔ (وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۚ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ)۔ قرآنِ مجید کی یہ ساری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں، لیکن منکرینِ حدیث ہیں کہ خود بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بالکل ہی بے باک نہ ہوجائے، وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کرسکتا جو یہ حضرات کررہے ہیں۔ یا پھر قرآن کے ساتھ یہ کھیل وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو اور محض دھوکا دینے کے لیے قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ (اس سلسلے میں آگے حاشیہ ۵۰ بھی مُلاحظہ ہو)۔

۲۵ - یعنی جو خدا ہر آن تمھاری آنکھوں کے سامنے یہ کام کررہا ہے، وہ آخر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے سے عاجز کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ ہر وقت زندہ انسانوں اور حیوانات میں سے فُضلات (waste matter) خارج کررہا ہے جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحہ بے جان مادّے (dead matter)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں[۲۸] تاکہ تم ان کے پاس سُکون حاصل کرو[۲۹] اور تمھارے درمیان محبّت اور رحمت پیدا کر دی۔[۳۰] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

---

کے اندر زندگی کی رُوح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے، حالاں کہ بجائے خود اُن مادّوں میں، جن سے اِن زندہ ہستیوں کے جسم مرکّب ہوتے ہیں، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن یہ منظر تمھیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسر آیا اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی زندگی کے خزانے اُگلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مرجانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں۔

۲۶ – خبردار رہنا چاہیے کہ یہاں سے رکوع کے خاتمے تک اللہ تعالیٰ کی جو نشانیاں بیان کی جا رہی ہیں، وہ ایک طرف تو اُوپر کے سلسلۂ کلام کی مناسبت سے حیاتِ اُخروی کے امکان و وقوع پر دلالت کرتی ہیں، اور دوسری طرف یہی نشانیاں اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ صرف ایک خدا اس کا تنہا خالق، مدبّر، مالک اور فرماں روا ہے جس کے سوا انسانوں کا کوئی معبود نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ رُکوع اپنے مضمون کے لحاظ سے تقریرِ ماسبق اور تقریرِ مابعد، دونوں کے ساتھ مربوط ہے۔

۲۷ – یعنی انسان کا مایۂ تخلیق اِس کے سوا کیا ہے کہ چند بے جان مادّے ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کچھ کاربن، کچھ کیلشیم، کچھ سوڈیم، اور ایسے ہی چند اور عناصر۔ انھی کو ترکیب دے کر وہ حیرت انگیز ہستی بنا کھڑی کی گئی ہے جس کا نام انسان ہے اور اس کے اندر احساسات، جذبات، شعور، تعقُّل اور تخیُّل کی وہ عجیب قوتیں پیدا کر دی گئی ہیں جن میں سے کسی کا منبع بھی اس کے عناصرِ ترکیبی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہی نہیں کہ ایک انسان اتفاقاً ایسا بن کھڑا ہوا ہو، بلکہ اس کے اندر وہ عجیب تولیدی قوت بھی پیدا کر دی گئی جس کی بدولت کروڑوں اور اربوں انسان وہی ساخت اور وہی صلاحیتیں لیے ہوئے بے شمار موروثی اور بے حد و حساب انفرادی خصوصیات کے حامل نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا تمھاری عقل یہ گواہی دیتی ہے کہ یہ انتہائی حکیمانہ خِلقت کسی صانع حکیم کی تخلیق کے بغیر آپ سے آپ ہو گئی ہے؟ کیا تم بحالتِ ہوش و حواس یہ کہہ سکتے ہو کہ تخلیقِ انسان جیسا

عظیم الشان منصوبہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اور زمین و آسمان کی بے حد و حساب قوتوں کو انسانی زندگی کے لیے سازگار کر دینا بہت سے خداؤں کی فکر و تدبیر کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا تمھارا دماغ اپنی صحیح حالت میں ہوتا ہے جب تم یہ گمان کرتے ہو کہ جو خدا انسان کو خالص عَدَم سے وجود میں لایا ہے، وہ اسی انسان کو موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا؟

**۲۸** – یعنی خالق کا کمال حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صِنْف نہیں بنائی، بلکہ اسے دو صنفوں (sexes) کی شکل میں پیدا کیا، جو انسانیت میں یکساں ہیں، جن کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا بھی یکساں ہے، مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت، مختلف ذہنی و نفسی اوصاف، اور مختلف جذبات و داعیات لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہے، ہر ایک کا جسم اور اس کے نفسیات و داعیات دوسرے کے جسمانی و نفسیاتی تقاضوں کا مکمل جواب ہیں۔ مزید برآں وہ خالقِ حکیم اِن دونوں صنفوں کے افراد کو آغازِ آفرینش سے برابر اِس تناسُب کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کی کسی قوم یا کسی خطۂ زمین میں صرف لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے ہوں، یا کہیں کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس میں کسی انسانی تدبیر کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان ذرّہ برابر بھی نہ اِس معاملے میں اثر انداز ہوسکتا ہے کہ لڑکیاں مسلسل ایسی زنانہ خصوصیات اور لڑکے مسلسل ایسی مردانہ خُصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے رہیں جو ایک دوسرے کا ٹھیک جوڑ ہوں، اور نہ اِس معاملے ہی میں اس کے پاس اثر انداز ہونے کا کوئی ذریعہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدایش اس طرح مسلسل ایک تناسب کے ساتھ ہوتی چلی جائے۔ ہزارہا سال سے کروڑوں اور اربوں انسانوں کی پیدایش میں اس تدبیر و انتظام کا اتنے متناسب طریقے سے پیہم جاری رہنا اتفاقاً بھی نہیں ہوسکتا، اور یہ بہت سے خداؤں کی مشترک تدبیر کا نتیجہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ چیز صریحاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک خالقِ حکیم، اور ایک ہی خالقِ حکیم نے اپنی غالب حکمت و قدرت سے ابتداءً مرد اور عورت کا ایک موزوں ترین ڈیزائن بنایا، پھر اس بات کا انتظام کیا کہ اس ڈیزائن کے مطابق بے حد و حساب مرد اور بے حد و حساب عورتیں اپنی الگ الگ انفرادی خصوصیات لیے ہوئے دنیا بھر میں ایک تناسُب کے ساتھ پیدا ہوں۔

**۲۹** – یعنی یہ انتظام اَلَل ٹَپ نہیں ہوگیا ہے بلکہ بنانے والے نے بالارادہ اِس غَرَض کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس، اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے، اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ہی سکون و اطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف انسانی نسل کے برقرار رہنے کا، اور دوسری طرف انسانی تہذیب و تمدُّن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جو اُن کے باہمی اتصال و وابستگی کے بغیر مُبَدَّل بہ سُکون نہیں ہوسکتا، تو انسانی نسل تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح چل جاتی، لیکن

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدایش،[۳۱] اور تمھاری زبانوں اور

کسی تہذیب وتمدّن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام انواعِ حیوانی کے برعکس نوعِ انسانی میں تہذیب وتمدّن کے رُونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے وہ مانگ، وہ پیاس، وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سُکون میسّر نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جُڑ کر نہ رہیں۔ یہی سُکون کی طلب ہے جس نے انھیں مل کر گھر بنانے پر مجبُور کیا۔ اسی کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدّن کا نَشو و نَما ہوا۔ اس نَشو و نَما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوئی ہیں مگر وہ اس کی اصلی محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک یہی اضطراب ہے جسے مرد و عورت کے وجود میں ودیعت کر کے انھیں ’’گھر‘‘ کی تاسیس پر مجبُور کر دیا گیا۔ کون صاحبِ عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہوگیا ہے؟ یا بہت سے خدا یہ انتظام کر سکتے تھے کہ اس گہرے حکیمانہ مقصد کو ملحوظ رکھ کر ہزارہا برس سے مسلسل بے شمار مَردوں اور بے شمار عورتوں کو یہ خاص اضطراب لیے ہوئے پیدا کرتے چلے جائیں؟ یہ تو ایک حکیم اور ایک ہی حکیم کی حکمت کا صریح نشان ہے جسے صرف عقل کے اندھے ہی دیکھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

۳۰- محبّت سے مراد یہاں جنسی محبّت (sexual love) ہے جو مرد اور عورت کے اندر جذب و کشش کی ابتدائی محرک بنتی ہے اور پھر انھیں ایک دوسرے سے چسپاں کیے رکھتی ہے۔ اور رحمت سے مراد وہ روحانی تعلق ہے جو اِزدِواجی زندگی میں بتدریج اُبھرتا ہے، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد و غم خوار اور شریکِ رنج و راحت بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب جنسی محبّت پیچھے جا پڑتی ہے اور بڑھاپے میں یہ جیون ساتھی کچھ جوانی سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کے حق میں رحیم و شفیق ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دو مثبت طاقتیں ہیں جو خالق نے اُس ابتدائی اضطراب کی مدد کے لیے انسان کے اندر پیدا کی ہیں جس کا ذکر اُوپر گزرا ہے۔ وہ اضطراب تو صرف سکون چاہتا ہے اور اس کی تلاش میں مرد و عورت کو ایک دوسرے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ دو طاقتیں آگے بڑھ کر ان کے درمیان مستقل رفاقت کا ایسا رشتہ جوڑ دیتی ہیں جو دو الگ ماحولوں میں پرورش پائے ہوئے اجنبیوں کو ملا کر کچھ اس طرح پیوستہ کرتا ہے کہ عمر بھر وہ زندگی کے منجدھار میں اپنی کشتی ایک ساتھ کھینچتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محبّت و رحمت جس کا تجرِبہ کروڑوں انسانوں کو اپنی زندگی میں ہو رہا ہے، کوئی مادّی چیز نہیں ہے جو وزن اور پیمایش میں آسکے، نہ انسانی جسم کے عناصرِ ترکیبی میں کہیں اس کے سرچشمے کی نشان دِہی کی جاسکتی ہے، نہ کسی لیبارٹری میں اس کی پیدایش اور اس کے نَشو و نَما کے اسباب کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ ایک خالقِ حکیم نے بالارادہ ایک مقصد کے لیے پوری مناسبت کے ساتھ اسے نفسِ انسانی

وَ اَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾

تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔[۳۲] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔

میں ودیعت کر دیا ہے۔

**۳۱**- یعنی اُن کا عَدَم سے وجود میں آنا، اور ایک اٹل ضابطے پر ان کا قائم ہونا، اور بے شمار قوتوں کا ان کے اندر انتہائی تناسُب و توازُن کے ساتھ کام کرنا، اپنے اندر اس بات کی بہت سی نشانیاں رکھتا ہے کہ اس پوری کائنات کو ایک خالق اور ایک ہی خالق وجود میں لایا ہے، اور وہی اس عظیم الشان نظام کی تدبیر کر رہا ہے۔ ایک طرف اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ وہ ابتدائی قوت (energy) کہاں سے آئی جس نے مادّے کی شکل اختیار کی، پھر مادّے کے یہ بہت سے عناصر کیسے بنے، پھر ان عناصر کی اس قدر حکیمانہ ترکیب سے اتنی حیرت انگیز مناسبتوں کے ساتھ یہ مدہوش کُن نظامِ عالَم کیسے بن گیا، اور اب یہ نظام کروڑہا کروڑ صدیوں سے کس طرح ایک زبردست قانونِ فطرت کی بندش میں کسا ہوا چل رہا ہے، تو ہر غیر متعصب عقل اس نتیجے پر پہنچے گی کہ یہ سب کچھ کسی علیم و حکیم کے غالب ارادے کے بغیر محض بخت و اتفاق کے نتیجے میں نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری طرف اگر یہ دیکھا جائے کہ زمین سے لے کر کائنات کے بعید ترین سیّاروں تک سب ایک ہی طرح کے عناصر سے مرکب ہیں اور ایک ہی قانونِ فطرت ان میں کارفرما ہے، تو ہر عقل جو ہٹ دھرم نہیں ہے، بلاشبہ یہ تسلیم کرے گی کہ یہ سب کچھ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا اِس پوری کائنات کا خالق اور رب ہے۔

**۳۲**- یعنی باوجودیکہ تمھارے قُوائے نُطقیہ یکساں ہیں، نہ منہ اور زبان کی ساخت میں کوئی فرق ہے اور نہ دماغ کی ساخت میں، مگر زمین کے مختلف خِطّوں میں تمھاری زبانیں مختلف ہیں، پھر ایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیاں مختلف ہیں، اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ اور تلفُّظ اور طرزِ گفتگو دوسرے سے مختلف ہے۔ اِسی طرح تمھارا مادّۂ تخلیق اور تمھاری بناوٹ کا فارمولا ایک ہی ہے، مگر تمھارے رنگ اس قدر مختلف ہیں کہ قوم اور قوم تو درکنار، ایک ماں باپ کے دو بیٹوں کا رنگ بھی بالکل یکساں نہیں ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف دو ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن اسی رُخ پر آگے بڑھ کر دیکھیے تو دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوّع (variety) پائیں گے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیا کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں، اس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتّٰی کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے، حتّٰی کہ ایک درخت کے دو پتّوں میں بھی پوری مُشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز صاف بتا رہی ہے کہ یہ دنیا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جس میں خودکار مشینیں چل رہی ہوں اور کثیر پیدا آوری (mass production) کے طریقے پر ہر قسم کی اشیا کا بس ایک ایک ٹھپّا ہو جس سے ڈھل ڈھل کر ایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آرہی ہوں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا زبردست کاریگر کام کر رہا ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اُس کی نشانیوں میں سے تمھارا رات اور دن کو سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔[۳۳] یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (غور سے) سُنتے ہیں۔

---

جو ہر ہر چیز کو پوری انفرادی توجہ کے ساتھ ایک نئے ڈیزائن، نئے نقش و نگار، نئے تناسُب اور نئے اوصاف کے ساتھ بناتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کی قوتِ ایجاد ہر آن ہر چیز کا ایک نیا ماڈل نکال رہی ہے، اور اس کی صنّاعی ایک ڈیزائن کو دوسری مرتبہ دُہرانا اپنے کمال کی توہین سمجھتی ہے۔ اس حیرت انگیز منظر کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر دیکھے گا، وہ کبھی اس احمقانہ تصور میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک دفعہ اس کارخانے کو چلا کر کہیں جا سویا ہے۔ یہ تو اس بات کا کُھلا ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت کارِ تخلیق میں لگا ہوا ہے اور اپنی خِلق کی ایک ایک چیز پر انفرادی توجہ صَرف کر رہا ہے۔

**۳۳۔** فضل کو تلاش کرنے سے مراد رزق کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ انسان اگرچہ بالعموم رات کو سوتا اور دن کو اپنی مَعاش کے لیے جِدّوجُہد کرتا ہے، لیکن یہ کُلّیّہ نہیں ہے۔ بہت سے انسان دن کو بھی سوتے اور رات کو بھی معاش کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی لیے رات اور دن کا اکٹھا ذکر کر کے فرمایا کہ ان دونوں اوقات میں تم سوتے بھی ہو اور اپنی مَعاش کے لیے دوڑ دھوپ بھی کرتے ہو۔

یہ چیز بھی اُن نشانیوں میں سے ہے جو ایک خالقِ حکیم کی تدبیر کا پتا دیتی ہیں۔ بلکہ مزید برآں یہ چیز اس بات کی نشان دِہی بھی کرتی ہے کہ وہ محض خالق ہی نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر غایت درجے رحیم و شفیق اور اس کی ضروریات اور مصلحتوں کے لیے خود اُس سے بڑھ کر فکر کرنے والا ہے۔ انسان دنیا میں مسلسل محنت نہیں کر سکتا بلکہ ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹوں کے لیے آرام درکار ہوتا ہے، تاکہ پھر چند گھنٹے محنت کرنے کے لیے اسے قوت بہم پہنچ جائے۔ اس غرض کے لیے خالقِ حکیم و رحیم نے انسان کے اندر صرف تکان کا احساس، اور صرف آرام کی خواہش پیدا کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے "نیند" کا ایک ایسا زبردست داعیہ اس کے وجود میں رکھ دیا جو اس کے ارادے کے بغیر، حتّٰی کہ اس کی مزاحمت کے باوجود، خود بخود ہر چند گھنٹوں کی بیداری و محنت کے بعد اسے آ دبوچتا ہے، چند گھنٹے آرام لینے پر اس کو مجبور کر دیتا ہے، اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد خود بخود اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس نیند کی ماہیت و کیفیت اور اس کے حقیقی اسباب کو

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔[۳۴] اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔[۳۵] یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

---

آج تک انسان نہیں سمجھ سکا ہے۔ یہ قطعاً ایک پیدائشی چیز ہے جو آدمی کی فطرت اور اس کی ساخت میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کا ٹھیک انسان کی ضرورت کے مطابق ہونا ہی اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ کسی حکیم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق یہ تدبیر وضع کی ہے۔ اس میں ایک بڑی حکمت و مصلحت اور مقصدیت صاف طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ مزید برآں یہی نیند اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے یہ مجبُور کُن داعیہ انسان کے اندر رکھا ہے، وہ انسان کے حق میں خود اس سے بڑھ کر خیر خواہ ہے، ورنہ انسان بالارادہ نیند کی مزاحمت کر کے اور زبردستی جاگ جاگ کر اور مسلسل کام کر کر کے اپنی قوتِ کار کو ہی نہیں، قوتِ حیات تک کو ختم کر ڈالتا۔

پھر رزق کی تلاش کے لیے ”اللہ کے فضل کی تلاش“ کا لفظ استعمال کر کے نشانیوں کے ایک دوسرے سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آدمی آخر یہ رزق تلاش ہی کہاں کر سکتا تھا اگر زمین و آسمان کی بے حد و حساب طاقتوں کو رزق کے اسباب و ذرائع پیدا کرنے میں نہ لگا دیا گیا ہوتا، اور زمین میں انسان کے لیے رزق کے بے شمار ذرائع نہ پیدا کر دیے گئے ہوتے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ رزق کی یہ تلاش اور اس کا اکتساب اُس صورت میں بھی ممکن نہ ہوتا اگر انسان کو اِس کام کے لیے مناسب ترین اعضا اور مناسب ترین جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں نہ دی گئی ہوتیں۔ پس آدمی کے اندر تلاشِ رزق کی قابلیت، اور اُس کے وجود سے باہر وسائلِ رزق کی موجودگی، صاف صاف ایک ربِّ رحیم و کریم کے وجود کا پتا دیتی ہے۔ جو عقل بیمار نہ ہو وہ کبھی یہ فرض نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے، یا یہ بہت سے خداؤں کی خدائی کا کرشمہ ہے، یا کوئی بے درد اندھی قوت اِس فضل و کرم کی ذمّہ دار ہے۔

۳۴۔ یعنی اس کی گرج اور چمک سے اُمید بھی بندھتی ہے کہ بارش ہو گی اور فصلیں تیار ہوں گی، مگر ساتھ ہی خوف بھی لاحق ہوتا ہے کہ کہیں بجلی نہ گر پڑے، یا ایسی طوفانی بارش نہ ہو جائے جو سب کچھ بہا لے جائے۔

۳۵۔ یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشان دہی کرتی ہے، اور دوسری طرف یہی چیز اِس امر

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔[۳۶] پھر جونہی کہ اُس نے تمھیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔[۳۷]

پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے، اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اُس پیداوار پر ہے جو زمین سے نکلتی ہے۔ اس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیتِ بار آوری پر ہے۔ اس صلاحیت کے روبکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہِ راست زمین پر برسے، یا اس کے ذخیرے سطحِ زمین پر جمع ہوں، یا زیرِ زمین چشموں اور کنووں کی شکل اختیار کریں، یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر اس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے ردّ و بدل پر، فضائی حرارت و برودت پر، ہواؤں کی گردش پر، اور اُس بجلی پر ہے جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی اِن تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر ان سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لیے صریحاً سازگار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک اِن کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل سازگاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی، حرارت، برودت، اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے؟

۳۶۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ اُس کے حکم سے ایک دفعہ وجود میں آ گئے ہیں، بلکہ ان کا مسلسل قائم رہنا اور ان کے اندر ایک عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا پیہم چلتے رہنا بھی اسی کے حکم کی بدولت ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اگر اس کا حکم انھیں برقرار نہ رکھے تو یہ سارا نظام یک لخت درہم برہم ہو جائے۔

۳۷۔ یعنی کائنات کے خالق و مدبر کے لیے تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اُٹھانا کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہے کہ اُسے اِس کے لیے بہت بڑی تیاریاں کرنی ہوں گی، بلکہ اس کی صرف ایک پکار اِس کے لیے بالکل کافی ہو گی کہ آغازِ آفرینش سے آج تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور آیندہ پیدا ہوں گے، وہ سب ایک ساتھ زمین کے ہر گوشے سے نکل کھڑے ہوں۔

وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ ؕ وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۲۷﴾ ع ضَرَبَ لَكُمۡ مَّثَلًا مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ هَلۡ لَّكُمۡ مِّنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ شُرَكَآءَ فِىۡ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ فَاَنۡتُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ تَخَافُوۡنَهُمۡ كَخِيۡفَتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ

ع ۳/۸/۲

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُس کے بندے ہیں، سب کے سب اسی کے تابعِ فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر[۳۸] ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ ع

وہ تمھیں[۳۹] خود تمھاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمھارے اُن غلاموں میں سے جو تمھاری مِلکیّت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیے ہوئے مال و دولت میں تمھارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم اُن سے اُس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو؟[۴۰] ——— اِس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں

۳۸- یعنی پہلی مرتبہ پیدا کرنا اگر اُس کے لیے مشکل نہ تھا، تو آخر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ پہلی مرتبہ کی پیدائش میں تو تم خود جیتے جاگتے موجود ہو۔ اس لیے اس کا مشکل نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ اب یہ بالکل سیدھی سادھی عقل کی بات ہے کہ ایک دفعہ جس نے کسی چیز کو بنایا ہو، اس کے لیے وہی چیز دوبارہ بنانا نسبتاً زیادہ ہی آسان ہونا چاہیے۔

۳۹- یہاں تک توحید اور آخرت کا بیان مِلا جُلا چل رہا تھا۔ اس میں جن نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ان کے اندر توحید کے دلائل بھی ہیں اور وہی دلائل یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ آخرت کا آنا غیر ممکن

لِقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۚ فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾

اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ مگر یہ ظالم بے سمجھے بُوجھے اپنے تخیُّلات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اُس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔[۴۱] ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہوسکتا۔

---

نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے خالص توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

۴۰ – مشرکین یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین و آسمان اور اس کی سب چیزوں کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے، اُس کی مخلوقات میں سے بعض کو خدائی صفات و اختیارات میں اس کا شریک ٹھیراتے تھے، اور ان سے دعائیں مانگتے، ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے، اور مراسمِ عُبودیت بجا لاتے تھے۔ اِن بناوٹی شریکوں کے بارے میں اُن کا اصل عقیدہ اُس تلبِیَہ کے الفاظ میں ہم کو ملتا ہے جو خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ زبان سے ادا کرتے تھے۔ وہ اس موقع پر کہتے تھے: لبّیك اللّٰھم لبّیك لا شریك لك الّا شریکا ھو لك تملکه وما ملك۔ (طَبَرانی عن ابنِ عباسؓ) ''میں حاضر ہوں، میرے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اُس شریک کے جو تیرا اپنا ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور جو کچھ اُس کی مِلکیّت ہے اس کا بھی تُو مالک ہے۔'' اللہ تعالیٰ اس آیت میں اِسی شرک کی تردید فرما رہا ہے۔ تمثیل کا منشا یہ ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال میں خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے وہ انسان، جو اتفاقاً تمھاری غلامی میں آ گئے ہیں، تمھارے تو شریک نہیں قرار پا سکتے، مگر تم نے یہ عجیب دھاندلی مچا رکھی ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو بے تکلف اُس کے ساتھ خدائی کا شریک ٹھیراتے ہو۔ اس طرح کی احمقانہ باتیں سوچتے ہوئے آخر تمھاری عقل کہاں ماری جاتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۶۲)

۴۱ – یعنی جب کوئی شخص سیدھی سیدھی عقل کی بات نہ خود سوچے اور نہ کسی کے سمجھانے سے سمجھنے کے لیے تیار ہو، تو پھر اس کی عقل پر اللہ کی پھٹکار پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد ہر وہ چیز جو کسی معقول آدمی کو حق بات تک پہنچنے میں مدد دے سکتی ہے، وہ اس ضدی جہالت پسند انسان کو اُلٹی مزید گمراہی میں مبتلا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے ''بھٹکانے'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ راستی پسند انسان جب اللہ سے ہدایت کی توفیق طلب کرتا ہے تو اللہ اس کی طلبِ صادق کے مطابق اس کے لیے زیادہ سے زیادہ اسبابِ ہدایت پیدا فرما دیتا ہے۔ اور گمراہی پسند انسان جب گمراہ ہی ہونے پر اصرار کرتا ہے تو پھر اللہ اس کے لیے وہی اسباب

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ

پس[۴۲] (اے نبیؐ! اور نبیؐ کے پیروو!) یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین[۴۳] کی سَمت میں جما دو،[۴۴] قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے،[۴۵]

پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو اسے بھٹکا کر روز بروز حق سے دُور لیے چلے جاتے ہیں۔

۴۲ – یہ "پس" اس معنیٰ میں ہے کہ جب حقیقت تم پر کھل چکی، اور تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کائنات کا اور خود انسان کا خالق و مالک اور حاکم ذی اختیار ایک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے تو اس کے بعد لامحالہ تمھارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے۔

۴۳ – اِس دین سے مراد وہ خاص دین ہے جسے قرآن پیش کر رہا ہے، جس میں بندگی، عبادت اور طاعت کا مستحق اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جس میں اُلوہیت اور اس کی صفات و اختیارات اور اس کے حقوق میں قطعاً کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ٹھیرایا جاتا، جس میں انسان اپنی رضا و رغبت سے اس بات کی پابندی اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی ہدایت اور اس کے قانون کی پیروی میں بسر کرے گا۔

۴۴ – "یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس طرف جما دو"، یعنی پھر کسی اور طرف کا رُخ نہ کرو۔ زندگی کے لیے اِس راہ کو اختیار کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے راستے کی طرف التفات تک نہ ہونے پائے۔ پھر تمھاری فکر اور سوچ ہو تو مسلمان کی سی اور تمھاری پسند اور ناپسند ہو تو مسلمان کی سی۔ تمھاری قدریں اور تمھارے معیار ہوں تو وہ جو اسلام تمھیں دیتا ہے، تمھارے اَخلاق اور تمھاری سیرت و کردار کا ٹھپّا ہو تو اُس طرح کا جو اسلام چاہتا ہے، اور تمھاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات چلیں تو اُس طریقے پر جو اسلام نے تمھیں بتایا ہے۔

۴۵ – یعنی تمام انسان اِس فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبُود اور مُطاعِ حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر تم کو قائم ہو جانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا رَویّہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے، اور اگر بندگیِ غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کرو گے۔

اس مضمون کو متعدّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء، ھل تحسون فیھا من جدعاء۔ یعنی ہر بچہ جو کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اصل انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی یا یہودی یا مجوسی وغیرہ بنا ڈالتے ہیں۔

لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ

اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی[۴۶]، یہی بالکل راست اور دُرست دین[۴۷] ہے، مگر اکثر لوگ

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح و سالم جانور برآمد ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا، بعد میں مشرکین اپنے اوہامِ جاہلیّت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔

مُسندِ احمد اور نَسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ ایک جنگ میں مسلمانوں نے دشمنوں کے بچوں تک کو قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: ما بال اقوام جاوزھم القتل الیوم حتّٰی قتلوا الذُّرّیّۃ، ''لوگوں کو کیا ہوگیا کہ آج وہ حد سے گزر گئے اور بچوں تک کو قتل کر ڈالا''۔ ایک شخص نے عرض کیا: کیا یہ مشرکین کے بچے نہ تھے؟ فرمایا: انما خیارکم ابناء المشرکین، ''تمھارے بہترین لوگ مشرکین ہی کی تو اولاد ہیں۔'' پھر فرمایا: کل نسمۃ تولد علی الفطرۃ حتی یعرب عنه لسانھا فابواھا یھودانھا او ینصرانھا، ''ہر مُتنفّس فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کی زبان کُھلنے پر آتی ہے تو ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔''

ایک اور حدیث جو امام احمدؒ نے عِیاضؓ بن حِمار المُجاشِعی سے نقل کی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے کے دوران میں فرمایا: ان ربی یقول انی خلقت عبادی حنفاء کلھم وانھم اتتھم الشیاطین فاضلتھم عن دینھم وحَرَّمَتْ علیھم ما احللتُ لھم وَاَمَرَتْھم ان یشرکوا بی ما لم انزل بِهٖ سُلطَانا، ''میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آ کر انھیں ان کے دین سے گمراہ کیا، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا اسے حرام کیا، اور انھیں حکم دیا کہ میرے ساتھ اُن چیزوں کو شریک ٹھیرائیں جن کے شریک ہونے پر مَیں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔''

۴۶ — یعنی خدا نے انسان کو اپنا بندہ بنایا ہے اور اپنی ہی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ساخت کسی کے بدلے نہیں بدل سکتی۔ نہ آدمی بندہ سے غیر بندہ بن سکتا ہے، نہ کسی غیر خدا کو خدا بنا لینے سے وہ حقیقت میں اس کا خدا بن سکتا ہے۔ انسان خواہ اپنے کتنے ہی معبود بنا بیٹھے، لیکن یہ امرِ واقعہ اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے۔ انسان اپنی حماقت اور جہالت کی بنا پر جس کو بھی چاہے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے لے اور جسے بھی چاہے اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ بیٹھے، مگر حقیقتِ نفس الامری یہی ہے کہ نہ اُلوہیّت کی صفات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل ہیں نہ اس کے اختیارات، اور نہ کسی دوسرے کے پاس یہ طاقت ہے کہ انسان کی قسمت بنا سکے یا بگاڑ سکے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی نہ کی جائے۔'' یعنی اللہ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے، اس کو بگاڑنا اور مسخ کرنا درست نہیں ہے۔

لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ وَاتَّقُوۡهُ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَ

جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہوئے[۴۸]، اور ڈرو اُس سے[۴۹] اور نماز قائم کرو[۵۰]، اور نہ ہو جاؤ اُن مشرکین میں سے جنھوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور

۴۷- یعنی فطرتِ سلیمہ پر قائم رہنا ہی سیدھا اور صحیح طریقہ ہے۔

۴۸- اللہ کی طرف رُجوع سے مراد یہ ہے کہ جس نے بھی آزادی و خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے انحراف کیا ہو، یا جس نے بھی بندگیِ غیر کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اصلی و حقیقی رب سے بے وفائی کی ہو، وہ اپنی اس روش سے باز آ جائے اور اُسی ایک خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے جس کا بندہ حقیقت میں وہ پیدا ہُوا ہے۔

۴۹- یعنی تمھارے دل میں اس بات کا خوف ہونا چاہیے کہ اگر اللہ کے پیدائشی بندے ہونے کے باوجود تم نے اس کے مقابلے میں خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کیا، یا اس کے بجائے کسی اور کی بندگی کی، تو اِس غداری و نمک حرامی کی سخت سزا تمھیں بھگتنی ہو گی۔ اس لیے تمھیں ایسی ہر روش سے بچنا چاہیے جو تم کو خدا کے غضب کا مستحق بناتی ہو۔

۵۰- اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے غضب کا خوف، دونوں قلب کے افعال ہیں۔ اس قلبی کیفیت کو اپنے ظہور اور اپنے استحکام کے لیے لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے جس سے خارج میں بھی ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فُلاں شخص واقعی اللہ وحدہٗ لا شریک کی بندگی کی طرف پلٹ آیا ہے، اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی اِس رجوع و تقویٰ کی کیفیت کو ایک عملی مُمارَسَت کے ذریعے سے پے در پے نَشوونُما نصیب ہوتا چلا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اُس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد فوراً ہی اِس جسمانی عمل، یعنی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال محض خیال کی حد تک رہتا ہے، اس میں استحکام اور پائداری نہیں ہوتی۔ اُس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اُس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس عقیدہ و فکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اُس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے،

كَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً

گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن[۵۱] ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رُجوع کر کے اُسے پکارتے ہیں[۵۲]، پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انھیں چکھا دیتا ہے تو

اور اس میں ایمان و اسلام کا وہ پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دُہرانا ہوتا ہے، تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ مزید برآں کفار اور اہلِ ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔ اہلِ ایمان پر اِس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں، اور ایمان و اسلام سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو، اسی وقت کوئی کُھلی علامت فوراً ہی تمام اہلِ ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔ کفار پر اِس کا ظہور اِس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے، ان پر خدا کے فرمانبرداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

اس مَقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم مکّہ معظّمہ کے اُس دَور میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کفّارِ قریش کے ظلم وستم کی چکّی میں پس رہی تھی اور اس کے بعد بھی ۹ برس تک پِستی رہی۔ اُس وقت دُور دُور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام ونشان نہیں تھا۔ اگر نماز اسلامی حکومت کے بغیر بے معنیٰ ہوتی، جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز قائم کرنا سرے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ ”نظامِ رُبوبیّت“ چلانا ہوتا، جیسا کہ منکرینِ سنّت کا دعویٰ ہے، تو اس حالت میں قرآنِ مجید کا یہ حکم دینا آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کے بعد ۹ سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اِس حکم کی تعمیل آخر کس طرح کرتے رہے؟

**۵۱** — یہ اشارہ ہے اِس چیز کی طرف کہ نوعِ انسانی کا اصل دین وہی دینِ فطرت ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دین مشرکانہ مذاہب سے بتدریج ارتقا کرتا ہوا توحید تک نہیں پہنچا ہے، جیسا کہ قیاس وگمان سے ایک فلسفۂ مذہب گھڑ لینے والے حضرات سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ جتنے مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں،

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ

یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں،[53] تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا، مزے کرلو، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟[54]

جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پُھول جاتے ہیں،

---

یہ سب کے سب اُس اصلی دین میں بگاڑ آنے سے رُونما ہوئے ہیں۔ اور یہ بگاڑ اس لیے آیا ہے کہ مختلف لوگوں نے فطری حقائق پر اپنی اپنی نَو ایجاد باتوں کا اضافہ کر کے اپنے الگ دین بنا ڈالے اور ہر ایک اصل حقیقت کے بجائے اُس اضافہ شدہ چیز کا گرویدہ ہو گیا جس کی بدولت وہ دوسروں سے جُدا ہو کر ایک مستقل فرقہ بنا تھا۔ اب جو شخص بھی ہدایت پا سکتا ہے، وہ اِسی طرح پا سکتا ہے کہ اُس اصل حقیقت کی طرف پلٹ جائے جو دینِ حق کی بنیاد تھی، اور بعد کے ان تمام اضافوں سے اور ان کے گرویدہ ہونے والے گروہوں سے دامن جھاڑ کر بالکل الگ ہو جائے۔ ان کے ساتھ ربط کا جو رشتہ بھی وہ لگائے رکھے گا، وہی دین میں خلل کا موجب ہو گا۔

**۵۲** – یہ اس بات کی کُھلی دلیل ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں توحید کی شہادت موجود ہے۔ اُمیدوں کے سہارے جب بھی ٹُوٹنے لگتے ہیں، ان کا دل خود ہی اندر سے پکارنے لگتا ہے کہ اصل فرمانروائی کائنات کے مالک ہی کی ہے اور اسی کی مدد ان کی بگڑی بنا سکتی ہے۔

**۵۳** – یعنی پھر دوسرے معبُودوں کی نذریں اور نیازیں چڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فُلاں حضرت کے طفیل اور فُلاں آستانے کے صدقے میں ٹلی ہے۔

**۵۴** – یعنی آخر کس دلیل سے ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ بلائیں خدا نہیں ٹالتا بلکہ حضرت ٹالا کرتے ہیں؟ کیا عقل اس کی شہادت دیتی ہے؟ یا کوئی کتابِ الٰہی ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ میں اپنے خدائی کے اختیارات فلاں فلاں حضرتوں کو دے چکا ہوں اور اب وہ تم لوگوں کے کام بنایا کریں گے؟

وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫

---

اور جب ان کے اپنے کیے کرتُوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں[۵۵]۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے)۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں[۵۶]۔ پس (اے مومن!) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اُس کا حق[۵۷])۔ یہ طریقہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں،

---

۵۵ — اُوپر کی آیت میں انسان کی جَہالت وحماقت اور اس کی ناشکری ونمک حرامی پر گرفت تھی۔ اس آیت میں اس کے چھچھور پن اور کم ظرفی پر گرفت کی گئی ہے۔ اِس تھُڑدِلے کو جب دنیا میں کچھ دولت، طاقت، عزت نصیب ہوجاتی ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اِس کا کام خوب چل رہا ہے، تو اِسے یاد نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میرے ہی کچھ سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں جو مجھے وہ کچھ میسر ہُوا جس سے دوسرے محروم ہیں۔ اس غلط فہمی میں فخر وغرور کا نشہ اس پر ایسا چڑھتا ہے کہ پھر یہ نہ خدا کو خاطر میں لاتا ہے نہ خلق کو۔ لیکن جونہی کہ اقبال نے منہ موڑا، اِس کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور بدنصیبی کی ایک ہی چوٹ اس پر دل شکستگی کی وہ کیفیت طاری کر دیتی ہے جس میں یہ ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتا ہے، حتّٰی کہ خودکُشی تک کر جاتا ہے۔

۵۶ — یعنی اہلِ ایمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ کفر وشرک کا انسان کے اَخلاق پر کیا اثر پڑتا ہے، اور اس کے برعکس ایمان باللہ کے اَخلاقی نتائج کیا ہیں۔ جو شخص سچّے دل سے خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اسی کو رزق کے خزانوں کا مالک سمجھتا ہو، وہ کبھی اُس کم ظرفی میں مبتلا نہیں ہوسکتا جس میں خدا کو بھولے ہوئے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اُسے کشادہ رزق ملے تو پھولے گا نہیں، شکر کرے گا، خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور فیّاضی سے پیش آئے گا، اور خدا کا مال خدا کی راہ میں صَرف کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرے گا۔ تنگی کے ساتھ رزق ملے، یا فاقے ہی پڑ جائیں، تب بھی صبر سے کام لے گا، دیانت و امانت اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے گا،

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ

اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔[58] جو سُود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر

اور آخر وقت تک خدا سے فضل و کرم کی آس لگائے رہے گا۔ یہ اَخلاقی بلندی نہ کسی دہریّے کو نصیب ہو سکتی ہے نہ مشرک کو۔

۵۷ – یہ نہیں فرمایا کہ رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہُوا ہے کہ یہ اُس کا حق ہے جو تجھے دینا چاہیے، اور حق ہی سمجھ کر تُو اسے دے۔ اس کو دیتے ہوئے یہ خیال تیرے دل میں نہ آنے پائے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اس پر کر رہا ہے، اور تو کوئی بڑی ہستی ہے دان کرنے والی، اور وہ کوئی حقیر مخلوق ہے تیرا دیا کھانے والی۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح تیرے ذہن نشین رہے کہ مال کے مالکِ حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ زائد مال اُن دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمائش کے لیے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے، تاکہ تیرا مالک دیکھے کہ تو ان کا حق پہچانتا اور پہنچاتا ہے یا نہیں۔

اس ارشادِ الٰہی اور اس کی اصلی رُوح پر جو شخص بھی غور کرے گا، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآنِ مجید انسان کے لیے اَخلاقی و روحانی ارتقا کا جو راستہ تجویز کرتا ہے، اس کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت (free economy) کی موجودگی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقا کسی ایسے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں ہے جہاں لوگوں کے حُقوقِ مِلکیّت ساقط کر دیے جائیں، ریاست تمام ذرائع کی مالک ہو جائے اور افراد کے درمیان تقسیمِ رزق کا پورا کاروبار حکومت کی مشینری سنبھال لے، حتّٰی کہ نہ کوئی فرد اپنے اُوپر کسی کا کوئی حق پہچان کر دے سکے، اور نہ کوئی دوسرا فرد کسی سے کچھ لے کر اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبۂ خیر سگالی پرورش کر سکے۔ اس طرح کا خالص کمیونسٹ نظامِ تمدّن و معیشت، جسے آج کل ہمارے ملک میں "قرآنی نظامِ رُبوبیّت" کے پُر فریب نام سے زبردستی قرآن کے سر منڈھا جا رہا ہے، قرآن کی اپنی اسکیم کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس میں انفرادی اخلاق کے نشو و نما اور انفرادی سیرتوں کی تشکیل و ترقی کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اسکیم تو اُسی جگہ چل سکتی ہے جہاں افراد کچھ وسائلِ دولت کے مالک ہوں، ان پر آزادانہ تصرّف کے اختیارات رکھتے ہوں، اور پھر اپنی رضا و رغبت سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق اخلاص کے ساتھ ادا کریں۔ اِسی قسم کے معاشرے میں یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ فرداً فرداً لوگوں میں ایک طرف ہمدردی، رحم و شفقت، ایثار و قربانی اور حق شناسی و ادائے حقوق کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوں، اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لیے خیر خواہی، احسان مندی، اور جزاء الاحسان بالاحسان کے پاکیزہ جذبات نشو و نما پائیں، یہاں تک کہ وہ مثالی حالت پیدا ہو جائے جس میں بدی کا رکنا اور نیکی کا فروغ پانا کسی قوتِ جابرہ کی مداخلت پر موقوف نہ ہو، بلکہ لوگوں کی اپنی پاکیزگیِ نفس اور ان کے اپنے نیک ارادے اس ذمہ داری کو سنبھال لیں۔

النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ

وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا،[59] اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے

۵۸- یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاح صرف مسکین اور مسافر اور رشتہ دار کا حق ادا کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز حُصُولِ فلاح کے لیے درکار نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اِن حقوق کو نہیں پہچانتے اور نہیں ادا کرتے، وہ فلاح پانے والے نہیں ہیں، بلکہ فلاح پانے والے وہ ہیں جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے یہ حقوق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

۵۹- قرآنِ مجید میں یہ پہلی آیت ہے جو سُود کی مذمّت میں نازل ہوئی۔ اس میں صرف اتنی بات فرمائی گئی ہے کہ تم لوگ تو سود یہ سمجھتے ہوئے دیتے ہو کہ جس کو ہم یہ زائد مال دے رہے ہیں اس کی دولت بڑھے گی، لیکن درحقیقت اللہ کے نزدیک سود سے دولت کی افزایش نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر جب مدینۂ طیبہ میں سُود کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا تو اس پر مزید یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ "اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔" (بعد کے احکام کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، آیت ۱۳۰۔ البقرہ، آیات ۲۷۵ تا ۲۸۱)

اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین کے دو اقوال ہیں: ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں ربٰوا سے مراد وہ سُود نہیں ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے، بلکہ وہ عَطِیّہ یا ہدیہ و تحفہ ہے جو اِس نیّت سے دیا جائے کہ لینے والا بعد میں اس سے زیادہ واپس کرے گا، یا مُعطی کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے گا، یا اس کا خوشحال ہو جانا مُعطی کی اپنی ذات کے لیے نافع ہوگا۔ یہ ابنِ عباسؓ، مجاہد، ضَحّاک، قَتادہ، عِکرِمہ، محمد بن کَعب القُرَظی اور شَعْبی کا قول ہے۔ اور غالبًا یہ تفسیر اِن حضرات نے اس بنا پر فرمائی ہے کہ آیت میں اِس فعل کا نتیجہ صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں اس دولت کو کوئی افزایش نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اگر معاملہ اُس سود کا ہوتا جسے شریعت نے حرام کیا ہے تو مثبت طور پر فرمایا جاتا کہ اللہ کے ہاں اس پر سخت عذاب دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں، اس سے مراد وہی معروف ربٰوا ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے حضرت حسن بصریؒ اور سُدّی کی ہے، اور علامۂ آلُوسی کا خیال ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے، کیونکہ عربی زبان میں ربٰوا کا لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی تاویل کو مفسّر نیسابوری نے بھی اختیار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی یہی دوسری تفسیر صحیح ہے، اس لیے کہ معروف معنٰی کو چھوڑنے کے لیے وہ دلیل کافی نہیں ہے جو اُوپر تفسیرِ اوّل کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ روم کا نُزول جس زمانے میں ہوا ہے اُس وقت قرآنِ مجید میں سود کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ اعلان اس کے کئی برس بعد ہُوا ہے۔ قرآنِ مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو بعد میں کسی وقت حرام کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے وہ پہلے سے ذہنوں کو تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ؕ ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ

ع ۱۳

ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔[۶۰]

اللہ ہی[۶۱] ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمھیں رزق دیا،[۶۲] پھر وہ تمھیں موت دیتا ہے، پھر وہ تمھیں زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟[۶۳] پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ع خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ مزا چکھائے اُن کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ

شراب کے معاملے میں بھی پہلے صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ وہ پاکیزہ رزق نہیں ہے (النحل، آیت ۶۷)، پھر فرمایا کہ اس کا گناہ اس کے فائدے سے زیادہ ہے (البقرہ، ۲۱۹)، پھر حکم دیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ (النساء، ۴۳)، پھر اس کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اسی طرح یہاں سود کے متعلق صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جس سے دولت کی افزایش ہوتی ہو، بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا۔ (آلِ عمران، آیت ۱۳۰) اور سب سے آخر میں بجائے خود سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ (البقرہ، آیت ۲۷۵)

۶۰- اس بڑھوتری کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جتنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبۂ ایثار اور جس قدر شدید طلبِ رضائے الٰہی کے ساتھ کوئی شخص راہِ خدا میں مال صَرف کرے گا، اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دے گا۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص راہِ خدا میں ایک کھجور بھی دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر اُحُد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔

۶۱- یہاں سے پھر کفار و مشرکین کو سمجھانے کے لیے سلسلۂ کلام توحید و آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے۔

يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

باز آئیں[۶۴]۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی[۶۵] تھے۔ پس (اے نبیؐ!) اپنا رُخ مضبوطی کے ساتھ جما دو اِس دینِ راست کی سَمت میں، قبل اُس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے[۶۶]۔ اُس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے[۶۷]، اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے

۶۲ – یعنی زمین میں تمھارے رزق کے لیے جملہ وسائل فراہم کیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ رزق کی گردش سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصّہ پہنچ جائے۔

۶۳ – یعنی اگر تمھارے بنائے ہوئے معبودوں میں سے کوئی بھی نہ پیدا کرنے والا ہے، نہ رزق دینے والا، نہ موت و زیست اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور نہ مر جانے کے بعد وہ کسی کو زندہ کر دینے پر قادر ہے، تو آخر یہ لوگ ہیں کس مرض کی دوا کہ تم نے اِنھیں معبود بنا لیا؟

۶۴ – یہ پھر اُس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت روم و ایران کے درمیان برپا تھی، جس کی آگ نے پورے شرقِ اَوسط کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ”لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی“ سے مراد وہ فِسق و فجور اور ظلم و جَور ہے جو شرک یا دہریّت کا عقیدہ اختیار کرنے اور آخرت کو نظر انداز کر دینے سے لازماً انسانی اَخلاق و کردار میں رونما ہوتا ہے۔ ”شاید کہ وہ باز آئیں“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا سے پہلے اِس دنیا میں انسانوں کو ان کے تمام اعمال کا نہیں بلکہ بعض اعمال کا بُرا نتیجہ اس لیے دکھاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھیں اور اپنے تخیُّلات کی غَلَطی کو محسوس کر کے اُس عقیدۂ صالحہ کی طرف رُجوع کریں جو انبیا علیہم السلام ہمیشہ سے انسان کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، جس کو اختیار کرنے کے سوا انسانی اعمال کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مَقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحَظہ ہو: التوبہ، آیت ۱۲۶۔ الرعد، ۳۱۔ السجدہ، ۲۱۔ الطّور، ۴۷۔

فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ
مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ

---

وہ اپنے ہی لیے فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں، تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے[68] اور تمھیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں[69] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[70] اور اس کے شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے[71]، پھر جنھوں نے جرم کیا[72]

---

٦٥ — یعنی روم و ایران کی تباہ کُن جنگ آج کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پچھلی تاریخ بڑی بڑی قوموں کی تباہی و بربادی کے ریکارڈ سے بھری ہوئی ہے۔ اور ان سب قوموں کو جن خرابیوں نے برباد کیا اُن سب کی جڑ یہی شرک تھا جس سے باز آنے کے لیے آج تم سے کہا جا رہا ہے۔

٦٦ — یعنی جس کو نہ اللہ تعالیٰ خود ٹالے گا اور نہ اس نے کسی کے لیے ایسی کسی تدبیر کی کوئی گنجایش چھوڑی ہے کہ وہ اسے ٹال سکے۔

٦٧ — یہ ایک جامع فقرہ ہے جو تمام اُن مَضَرّتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو کافر کو اپنے کفر کی بدولت پہنچ سکتی ہیں۔ مَضَرّتوں کی کوئی مفصّل فہرست بھی اتنی جامع نہیں ہو سکتی۔

٦٨ — یعنی بارانِ رحمت کی خوش خبری دینے کے لیے۔

٦٩ — یہ ایک اور قسم کی ہواؤں کا ذکر ہے جو جہاز رانی میں مددگار ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کی بادبانی کشتیوں اور جہازوں کا سفر زیادہ تر بادِ موافق پر منحصر تھا اور بادِ مخالف ان کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اس لیے بارش

اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ

---

اُن سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر وہ اِن بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس کے نُزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو! اللہ کی رحمت کے اثرات

---

لانے والی ہواؤں کے بعد ان ہواؤں کا ذکر ایک نعمتِ خاص کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

۷۰ – یعنی تجارت کے لیے سفر کرو۔

۷۱ – یعنی ایک قسم کی نشانیاں تو وہ ہیں جو کائناتِ فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر آن سابقہ پیش آتا ہے، جن میں سے ایک ہواؤں کی گردش کا یہ نظام ہے جس کا اُوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو انبیا علیہم السلام معجزات کی صورت میں، کلامِ الٰہی کی صورت میں، اپنی غیر معمولی پاکیزہ سیرت کی شکل میں، اور انسانی معاشرے پر اپنی حیات بخش تاثیرات کی شکل میں لے کر آئے۔ یہ دونوں قسم کی نشانیاں ایک ہی حقیقت کی نشان دہی کرتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جس توحید کی تعلیم انبیاؑ دے رہے ہیں، وہی برحق ہے۔ ان میں سے ہر نشانی دوسری کی مؤیّد ہے۔ کائنات کی نشانیاں انبیاؑ کے بیان کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور انبیاؑ کی لائی ہوئی نشانیاں اُس حقیقت کو کھولتی ہیں جس کی طرف کائنات کی نشانیاں اشارے کر رہی ہیں۔

كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ

کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جِلا اُٹھاتا ہے[۷۳]، یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں[۷۴] تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں[۷۵]۔ (اے نبیؐ!) تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے[۷۶]، نہ اُن بہروں کو اپنی پکار

۷۲ – یعنی جو لوگ ان دونوں نشانیوں کی طرف سے اندھے بن کر توحید سے انکار پر جمے رہے اور خدا سے بغاوت ہی کیے چلے گئے۔

۷۳ – یہاں جس انداز سے نبوت اور بارش کا ذکر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے، اس میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ نبی کی آمد بھی انسان کی اَخلاقی زندگی کے لیے ویسی ہی رحمت ہے جیسی بارش کی آمد اس کی مادّی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح آسمانی بارش کے نُزول سے مُردہ پڑی ہوئی زمین یکایک جی اُٹھتی ہے اور اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، اسی طرح آسمانی وحی کا نُزول اَخلاق و روحانیت کی ویران پڑی ہوئی دنیا کو جِلا اُٹھاتا ہے اور اس میں فضائل ومحامد کے گلزار لہلہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کفار کی اپنی بدقسمتی ہے کہ خدا کی طرف سے یہ نعمت جب ان کے ہاں آتی ہے تو وہ اس کا کفران کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مژدۂ رحمت سمجھنے کے بجائے پیامِ موت سمجھ لیتے ہیں۔

۷۴ – یعنی بارانِ رحمت کے بعد جب کھیتیاں سرسبز ہو چکی ہوں اس وقت اگر کوئی ایسی سخت سرد یا سخت گرم ہوا چل پڑے جو ہری بھری فصلوں کو جلا کر رکھ دے۔

۷۵ – یعنی پھر وہ خدا کو کوسنے لگتے ہیں اور اس پر الزام رکھنے لگتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی مصیبتیں ہم پر ڈال رکھی ہیں۔ حالانکہ جب خدا نے ان پر نعمت کی بارش کی تھی، اس وقت انھوں نے شکر کے بجائے اس کی ناقدری کی تھی۔ یہاں پھر ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ جب خدا کے رسول اس کی طرف سے پیامِ رحمت لاتے ہیں تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور اس نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے کفر کی پاداش میں خدا ان پر ظالموں اور جبّاروں کو مسلّط کر دیتا ہے اور وہ جَور وستم کی چکی میں انھیں پیستے ہیں اور جوہرِ آدمیّت کا قَلع قَمع کر ڈالتے ہیں، تو وہی لوگ خدا کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور اسے الزام دیتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی ظلم سے بھری ہوئی دنیا بنا ڈالی ہے۔

الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾

ع ۵ ۱۳ ۸

قرء حفص بضم الضاد وفتحها فی الثلاثة لکن الضم مختارۃ

سُنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں[۷۷]، اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہِ راست دکھا سکتے ہو۔[۷۸] تم تو صرف انھی کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ع

اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف کے بعد تمھیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمھیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔[۷۹] اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

۷۶ – یہاں مُردوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر مر چکے ہیں، جن کے اندر اَخلاقی زندگی کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے، جن کی بندگیِ نفس اور ضد اور ہٹ دھرمی نے اُس صلاحیت ہی کا خاتمہ کر دیا ہے جو آدمی کو حق بات سمجھنے اور قبول کرنے کے قابل بناتی ہے۔

۷۷ – بہروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دلوں پر ایسے قفل چڑھا رکھے ہیں کہ سب کچھ سن کر بھی وہ کچھ نہیں سنتے۔ پھر جب ایسے لوگ یہ کوشش بھی کریں کہ دعوتِ حق کی آواز سرے سے ان کے کان میں پڑنے ہی نہ پائے، اور داعی کی شکل دیکھتے ہی دُور بھاگنا شروع کر دیں، تو ظاہر ہے کہ کوئی انھیں کیا سنائے اور کیسے سنائے؟

۷۸ – یعنی نبی کا کام یہ تو نہیں ہے کہ اندھوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ساری عمر راہِ راست پر چلاتا رہے۔ وہ تو راہِ راست کی طرف رہنمائی ہی کر سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کی ہیے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہوں اور جنھیں وہ راستہ نظر ہی نہ آتا ہو جو نبی انھیں دکھانے کی کوشش کرتا ہے، ان کی رہنمائی کرنا نبی کے بس کا کام نہیں ہے۔

۷۹ – یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا، یہ ساری حالتیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ اسی کی مَشِیّت پر موقوف

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور جب وہ ساعت برپا[۸۰] ہو گی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھیرے ہیں[۸۱]، اِسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے[۸۲]۔ مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روزِ حشر ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔[۸۳]

ہے کہ جسے چاہے کمزور پیدا کرے اور جس کو چاہے طاقت ور بنائے، جسے چاہے بچپن سے جوانی تک نہ پہنچنے دے اور جس کو چاہے جوانا مرگ کر دے، جسے چاہے لمبی عمر دے کر بھی تندرست و توانا رکھے اور جس کو چاہے شاندار جوانی کے بعد بڑھاپے میں اس طرح ایڑیاں رگڑوائے کہ دنیا اسے دیکھ کر عبرت کرنے لگے۔ انسان اپنی جگہ جس گھمنڈ میں چاہے مبتلا ہوتا رہے، مگر خدا کے قبضۂ قدرت میں وہ اِس طرح بے بس ہے کہ جو حالت بھی خدا اس پر طاری کر دے، اسے وہ اپنی کسی تدبیر سے نہیں بدل سکتا۔

۸۰ – یعنی قیامت، جس کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے۔

۸۱ – یعنی مرنے کے وقت سے قیامت کی اُس گھڑی تک۔ ان دونوں ساعتوں کے درمیان چاہے دس بیس ہزار برس ہی گزر چکے ہوں، مگر وہ یہ محسوس کریں گے کہ چند گھنٹے پہلے ہم سوئے تھے اور اب اچانک ایک حادثے نے ہمیں جگا اُٹھایا ہے۔

۸۲ – یعنی ایسے ہی غلط اندازے یہ لوگ دنیا میں بھی لگاتے تھے۔ وہاں بھی یہ حقیقت کے

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

ع ۶ ۷

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اِس طرح ٹھپّا لگا دیتا ہے اللہ اُن لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں۔ پس (اے نبیؐ!) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچّا ہے،[۸۴] اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔[۸۵] ع

---

اِدراک سے محروم تھے۔ اسی وجہ سے یہ حکم لگایا کرتے تھے کہ کوئی قیامت ویامت نہیں آنی، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، اور کسی خدا کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں حساب نہیں دینا۔

۸۳- دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کرو“، اس لیے کہ توبہ اور ایمان اور عملِ صالح کی طرف رُجوع کرنے کے سارے مواقع کو وہ کھو چکے ہوں گے اور امتحان کا وقت ختم ہو کر فیصلے کی گھڑی آ چکی ہو گی۔

۸۴- اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو اُوپر آیت ۴۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی بیّنات کا مقابلہ تکذیب وتضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے، اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے (فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا)، اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نُصرت فرمائے (وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ)۔

۸۵- یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور وغوغا سے تم دب جاؤ، یا ان کی بہتان و افترا کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ، یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزا سے تم پست ہمّت ہو جاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم وستم سے تم ڈر جاؤ، یا ان کے دیے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ، یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کر رہے ہیں، ان کی بنا پر تم ان کے ساتھ مُصالَحت کر لینے پر اُتر آؤ۔

اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوش مند، اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ، اور اپنے عزم میں اتنا راسخ، اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمھیں ڈرایا جا سکے، نہ کسی قیمت پر تمھیں خریدا جا سکے، نہ کسی فریب سے تم کو پُھسلایا جا سکے، نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمھیں اپنی راہ سے ہٹا سکے، اور نہ دین کے معاملے میں کسی لین دین کا سودا تم سے چُکایا جا سکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلامِ بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ ''یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں۔'' اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ اپنے آخری نبیؐ کو بھاری بھرکم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپؐ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی، اس نے اُسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیّتِ عُظمیٰ نے وہ انقلاب برپا کر کے دکھا دیا جسے روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری طاقت صَرف کر دی اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔

---

# ضمیمہ ۱

## بسلسلۂ سورۂ کہف، حاشیہ ۹، صفحہ ۱۲

شہرِ اِفسُوس (Ephesus) جس میں اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارھویں صدی قبلِ مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بُت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی، جسے ڈائنا (Diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی کا عظیم الشان مندر عہدِ قدیم کے عجائباتِ عالَم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے، اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبُودوں میں شامل کرلیا تھا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہوکر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصّے کی جو تفصیلات مسیحی رِوایات کو جمع کر کے گریگوری آف ٹُورس (Gregory of Tours) نے اپنی کتاب (Meraculorum Liber) میں بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

''یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلیِ مذہب کا حال سُن کر قیصر ڈِیسیس نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ قیصر پیروانِ مسیحؑ کے خون کا پیاسا ہے۔ مگر انھوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبُود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہوکر کہا کہ اپنی زبان بند کرو، ورنہ میں تمھیں ابھی قتل کرا دوں گا۔ پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا: تم ابھی بچّے ہو۔ میں تمھیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدّت میں اگر تم نے اپنا رَوِیّہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر، ورنہ تمھاری گردن ماردی جائے گی۔

اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انھوں نے پہاڑوں کی راہ لی تاکہ کسی غار میں جا چُھپیں۔ راستے میں ایک کُتّا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انھوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے، مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہُوا۔ آخر کار ایک بڑے گہرے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چُھپ گئے اور کُتّا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے، اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ ۲۵۰ عیسوی کا واقعہ ہے۔ ۱۹۷ برس بعد ۴۴۷ عیسوی میں وہ یکایک بیدار ہوئے جب قیصر تھیوڈوسِیَس دوم کا عہدِ حکومت تھا، رومی سلطنت مسیحیّت اختیار کرچکی تھی، اور شہرِ افسُوس کے باشندے بھی بُت پرستی ترک کرچکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعدِ موت اور حشر ونشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا اور قیصر اس بات پر بہت فکرمند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکارِ آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک

روز اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اُٹھے۔

بیدار ہو کر انھوں نے آپس میں پوچھا: کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے؟ کسی نے کہا: دن بھر۔ کسی نے کہا: دن کا کچھ حصّہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ایک ساتھی جِین (Jean) کو چاندی کے چند سکّے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا کہ ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں لوگ تمھیں پہچان نہ جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتا چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبُور کریں گے۔ مگر جِین جب شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدلی ہوئی ہے۔ سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دکان پر پہنچ کر اس نے کچھ روٹیاں خریدیں اور دکان دار کو چاندی کا ایک سکّہ دیا جس پر قیصر ڈِیسیس کی تصویر تھی۔ دکان دار یہ سکہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے پوچھا: یہ تمھیں کہاں سے ملا؟ جِین نے کہا: یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ حتّٰی کہ کوتوالِ شہر تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا: مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکّہ لائے ہو۔ جِین نے جواب دیا: دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے، میں کسی دفینے کو نہیں جانتا۔ کوتوال نے کہا: تمھاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانا سکّہ ہے۔ تم تو ابھی جوان لڑکے ہو، ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکّہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور کوئی راز ہے۔ جِین نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈِیسیس کو مرے زمانۂ دراز گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: کل ہی تو مَیں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی، تاکہ ڈِیسیس کے ظلم سے بچے رہیں۔ جِین کی یہ بات سُن کر کوتوال بھی حیران ہو گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہو گیا کہ یہ واقعی قیصر ڈِیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ قیصر تھیوڈوسیس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود آ کر اُن سے ملا اور اُن سے برکت لی۔ اس کے بعد یکایک یہ ساتوں آدمی غار میں جا کر لیٹے اور وفات پا گئے۔ اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی زندگی کے بعد موت برحق ہے۔ پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔''

غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی رِوایات میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصّے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انھی کو اصحابِ کہف قرار دینا بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قصّہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر کا ہے، اور قرآن ان واقعات سے بحث نہیں کرتا جو سرزمینِ عرب کے باہر پیش آئے ہیں، اس لیے اس مسیحی قصّے کو اصحابِ کہف پر چسپاں کرنا قرآن کے اُسلوب سے انحراف ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض دُرست نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں دراصل جس بات کا التزام کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کو عبرت دلانے کے لیے ان قوموں اور طاقتوں کے حالات پر کلام کیا جائے جن سے وہ واقف تھے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ سرزمینِ عرب کے حُدود میں ہوں یا اس سے باہر۔ اسی بنا پر مصر کی قدیم تاریخ قرآن میں زیرِ بحث آئی ہے، حالانکہ وہ عرب سے باہر

واقع ہے۔سوال یہ ہے کہ جب مصر کے حالات قرآن میں زیرِ بحث آ سکتے تھے تو روم کے کیوں نہ آ سکتے تھے؟ اہلِ عرب جس طرح مصر سے واقف تھے، اسی طرح روم سے بھی تو واقف تھے۔ رومی سلطنت کی سرحدیں عین حجاز کی شمالی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ عربوں کے تجارتی قافلے شب و روز رومی علاقوں میں جاتے تھے۔ بہت سے عرب قبائل رومیوں کے زیرِ اثر تھے۔ روم عربوں کے لیے ہرگز اجنبی ملک نہ تھا۔سورۂ روم اس پر شاہد ہے۔ علاوہ بریں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصّہ قرآنِ مجید میں ازخود بیان نہیں فرمایا ہے بلکہ کفارِ مکہ کے پوچھنے پر اس کا ذکر کیا ہے، اور کفارِ مکہ کو اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے ایسے واقعات دریافت کرنے کا مشورہ دیا تھا جن سے اہلِ عرب قطعی ناواقف تھے۔

---

# ضمیمہ ۲

## بسلسلۂ سورہ کہف، حاشیہ ۷۱

ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار کے متعلق بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد مشہور دیوارِ چین ہے۔ حالانکہ دراصل یہ دیوار قفقاز (Caucasus) کے علاقہ داغستان میں دربند اور داریال (Darial) کے درمیان بنائی گئی تھی۔ قفقاز اُس ملک کو کہتے ہیں جو بحیرۂ اَسْوَد (Black Sea) اور بحیرۂ خَزَر (Caspian Sea) کے درمیان واقع ہے۔ اس ملک میں بحیرۂ اسود سے داریال تک تو نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان اتنے تنگ دَرّے ہیں کہ ان سے کوئی بڑی حملہ آور فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے، اس میں پہاڑ بھی زیادہ بلند نہیں ہیں اور ان میں کوہستانی راستے بھی خاصے وسیع ہیں۔قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں اور ایرانی فرماں رواؤں کو اسی طرف سے اپنی مملکت پر شمالی حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انھی حملوں کو روکنے کے لیے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی تھی جو ۵۰ میل لمبی، ۲۹ فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ یہ دیوار ابتداءً کب کس نے بنائی تھی۔ مگر مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِّ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں، اور اس کی تعمیر کی جو کیفیت قرآنِ مجید میں بیان کی گئی ہے، اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔

ابنِ جَریر طَبَری اور ابنِ کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے، اور یاقُوت نے بھی مُعْجَمُ البُلْدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲ھ میں سُراقہ بن عَمْرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا اور سُراقہ نے عبدالرحمٰنؓ بن ربیعہ کو اپنے مُقَدّمَۃُ الجیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب آرمینیا کے علاقے

میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرماں روا شَہر بَراز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے ایک آدمی کو سدِّ ذُوالقرنین کا مُشاہَدہ اور اس علاقے کے حالات کا مُطالَعَہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس شخص کو پیش کر دیا۔ (طَبَری، ج ۳،ص ۲۳۵ تا ۲۳۹۔ البِدایہ والنّہایہ، ج ۷،ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ مُعجَمُ البُلْدان، ذکر باب الابواب)

اس واقعے کے دوسو برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷-۲۳۳ھ) نے سدِّ ذُوالقرنین کا مُشاہَدہ کرنے کے لیے سلّام الترجمان کی قیادت میں ۵۰ آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے مُعْجَم البُلْدان میں اور ابنِ کثیر نے البِدایہ والنّہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامَرّہ (سُرَّ مَنْ رَاٰی) سے تفلیس، وہاں سے السّریر، وہاں سے اللّان ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا، پھر خَزَر کے ملک میں داخل ہُوا، اور اس کے بعد دربند پہنچ کر اس نے سدّ کا مُشاہَدہ کیا۔ (البِدایہ والنّہایہ، ج ۲،ص ۱۱۱۔ ج ۷،ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ مُعجَم البُلْدان، باب الابواب) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عام طور پر قَفقاز کی اس دیوار ہی کو سدِّ ذوالقرنین سمجھتے تھے۔

یاقوت نے مُعجَم البُلْدان میں متعدّد دوسرے مَقامات پر بھی اسی امر کی تصریح کی ہے۔ خَزَر کے زیرِ عنوان وہ لکھتا ہے کہ ھی بلاد الترک خلف باب الابواب المعروف بالدربند قریب من سدّ ذی القرنین۔ ”یہ ترکوں کا علاقہ ہے جو سدّ ذُوالقرنین کے قریب باب الابواب کے پیچھے واقع ہے جسے دربند بھی کہتے ہیں۔“ اسی سلسلے میں وہ خلیفہ المقتدِر باللہ کے سفیر، احمد بن فضلان کی ایک رپورٹ نقل کرتا ہے جن میں مَملکتِ خَزَر کی تفصیلی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خَزَر ایک مَملکت کا نام ہے جس کا صدر مَقام اِتِل ہے۔ دریائے اِتِل اس شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور یہ دریا روس اور بُلغار سے آ کر بحرِ خَزَر میں گرتا ہے۔

باب الابواب کے زیرِ عنوان لکھتا ہے کہ اس کو الباب اور دربند بھی کہتے ہیں۔ یہ بحرِ خَزَر کے کنارے واقع ہے۔ بلادِ کفر سے بلادِ مسلمین کی طرف آنے والوں کے لیے یہ راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ ایک زمانے میں یہ نوشیروان کی مملکت میں شامل تھا اور شاہانِ ایران اس سرحد کی حفاظت کو غایت درجہ اہمیّت دیتے تھے۔

---

# الف

## ابراہیم علیہ السلام ۲۳۴-۲۳۷



## ابلیس



## اجر



## احکام القرآن

## انفاق فی سبیل اللہ



## آیت - آیات

# ب

## بائبل



## بت پرستی



## برزخ



## برکت



## بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



## بشارت



## بنی اسرائیل

## ت

### تسبیح



### تعزیر



### تقدیر

## شریعت



## شعائر اللہ



## شعر



## شعیب علیہ السلام - ان کا قصہ ۵۳۱ تا ۵۳۴-۶۹۹

## ع

## قتال فی سبیل اللہ



## قذف



## قرآن - اس کے نام:

## قرآنی تمثیلات



## قرآنی دعائیں



## قرآنی قصے

○○○

① اصحابِ کہف کا غار (واقع اِفسس، تُرکی)

② اصحابِ کہف کا غار (واقع عمان، اُردُن)

دورِ حاضر کے اکثر محققین کا رجحان اس جانب ہے کہ اصحابِ کہف کا غار اردن کے دارالحکومت عمان میں ہے

متعلقہ صفحہ ۱۲ (جلد سوم)

# نقشہ بسلسلۂ قصۂ ذوالقرنین

سیتھیا
سیتھیا
بحیرۂ آرال
صُغد (ماوراء النہر)
باختر (بلخ)
آریا
پارتھیا (خراسان)
آراکوسیا (قندھار وسیستان)
گدروشیا (مکران وکرمان)
فارس
کلدان (کالڈیا)
میڈیا (الجبال)
بابل
آرمینیا
اَشُّور (اسیریا)
قباذق (کیپڈوشیا)
لیڈیا (ایشیائے کوچک)
اِفسُوس
بحیرۂ اسود (بُنطس)
تھریس
مقدونیا
یونان
بحیرۂ ایجین
روم
بحیرۂ (میڈیٹرینین)
شام
فلسطین
لیبیا
مصر
بحیرۂ قلزم
عرب
فارس
خلیج
بحیرۂ خزر (کیسپین)
0 200 400
میل

خورس اور اُس کے جانشینوں کی سلطنت چھٹی صدی قبل مسیح کے آخری زمانے میں

متعلقہ صفحہ ۴۳ (جلد سوم)

جبالِ قفقاز (Caucasus Mountains) میں واقع درّہ داریال جہاں سدِّ ذوالقرنین تعمیر کی گئی

متعلقہ صفحہ ۴۶ (جلد سوم)

# نقشہ خانہ کعبہ



نقشہ متعلقہ صفحہ ۲۱۸ (جلد سوم)

# نقشہ غزوۂ بنی المُصطلِق



نقشہ متعلقہ صفحہ ۳۰۹ (جلد سوم)

مدائن صالح کی چند ثمودی عمارات

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

العُلاء کے پہاڑ

مدائن صالح کے پہاڑ

مدائن صالح کی چند ثمودی عمارات

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

مدائن صالح میں ثمودی عمارت

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

مدین میں ثمودی طرز کی عمارات

مدائن صالح میں ثمودی عمارات

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

مدائن صالح میں ترکی عہد کی فوجی چوکی (قلعہ اسلامیہ) کے درمیان واقع وہ کنواں جس پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

مدائن صالح میں ترکی عہد کی فوجی چوکی (قلعہ اسلامیہ) کے درمیان واقع وہ کنواں جس پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

## پیٹرا میں ثمودی طرز کی عمارات

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت

متعلقہ صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ (جلد سوم)

سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھاڑی میں آگ لگی ہوئی نظر آئی تھی

وہ درخت جس کے متعلق مقامی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر سے کلام الٰہی کی آواز آئی تھی

خانقاہ میں یہ روایت نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہے کہ یہ درخت صدیوں سے ہرا بھرا ہی دیکھا جاتا رہا ہے

سینٹ کیتھرائن کے حدود میں واقع کنیسہ اور مسجد

کنیسہ کے عقب میں مسجد دکھائی دے رہی ہے

متعلقہ صفحہ ۵۵۸ (جلد سوم)

کوہِ طور کے دامن میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ

متعلقہ صفحہ ۵۵۸ (جلد سوم)

کوہِ طور کے دامن میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ

متعلقہ صفحہ ۵۵۸ (جلد سوم)

وادیِ مدین کے قریب مَغائرِ شعیب میں واقع کنویں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کنواں وہ تھا جہاں حضرت موسیٰؑ نے بکریوں کو پانی پلایا تھا

متعلقہ صفحہ ۶۲۷ (جلد سوم)

مدین کی وادی

متعلقہ صفحہ ۶۲۷ (جلد سوم)